ادارۂ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان فون: 4540513-4519240

حقیقتِ عبادت

بسلسلہ خطبات حکیم الامت جلد-۷

حقیقتِ عبادت

(جدید ایڈیشن)

حکیم الامت مجدد الملت

حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ

عنوانات

منشی عبدالرحمن خاںؒ

تصحیح وتزئین

صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہ

تخریج احادیث

مولانا زاہد محمود قاسمی

اِدارۂ تالیفاتِ اَشرفیہ

چوک فوارہ ملتان پاکستان

(061-4540513-4519240

حقیقتِ عبادت

تاریخ اشاعت.................. ربیع الاول ۱۴۲۸ھ

ناشر............................ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان

طباعت.......................سلامت اقبال پریس ملتان

قارئین سے گذارش

ادراہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاک اللہ

ادارہ تالیفات اشرفیہ....چوک فوارہ....ملتان   مکتبہ رشیدیہ........راجہ بازار........راولپنڈی
ادارہ اسلامیات.........انارکلی........لاہور   یونیورسٹی بک ایجنسی.....خیبر بازار.......پشاور
مکتبہ سید احمد شہید.......اردو بازار.....لاہور   ادارۃ الانور.........نیوٹاؤن.......کراچی نمبر 5
مکتبہ رحمانیہ.......اُردو بازار.......لاہور   مکتبہ المنظور الاسلامیہ....جامعہ حسینیہ....علی پور
مکتبہ المنظور الاسلامیہ..........بلاک زیڈ.......مدینہ ٹاؤن.......جھنگ موڑ.......فیصل آباد

ادارہ اشاعت الخیر - حضوری باغ روڈ - ملتان

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K   119-121- HALLIWELL ROAD
(ISLAMIC BOOKS CENTERE   BOLTON BL1 3NE. (U.K.)

عرض ناشر

خطبات حکیم الامت جلد نمبر ۷ ''حقیقت عبادت''
جدید اشاعت سے مزین اپ کے ہاتھوں میں ہے۔
اللہ کے فضل وکرم اور اپنے اکابرین کی دعاؤں کے طفیل کافی عرصہ سے خطبات کی اشاعت کا ادارہ کو شرف حاصل ہورہا ہے۔
بہت سے بزرگوں کی تمنا تھی کہ ان کی احادیث مبارکہ کی تخریج ہو جائے۔ ادارہ نے زرکثیر خرچ کر کے یہ کام محترم جناب مولانا زاہد محمود صاحب (فاضل جامعہ قاسم العلوم ملتان) سے یہ کام کرایا اور فارسی اشعار اور عربی عبارات کا ترجمہ اور اس کے ساتھ ساتھ تصحیح کا کام حضرت صوفی محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہ نے سرانجام دیا۔
اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے آمین

احقر: محمد اسحٰق عفی عنہ
ربیع الاوّل ۱۴۲۸ھ بمطابق اپریل 2007ء

مختصر سوانح حیات

آبائی وطن: حضرت حکیم الامتؒ کے حسب ونسب کا تعلق تھانہ بھون (ضلع مظفرنگر یوپی انڈیا) کے ایک مقتدر خاندان سے تھا آپ کے آباؤ اجداد صاحب علم ووجاہت واہل منصب تھے۔

آپ نسباً فاروقی تھے اور مسلکاً صابری چشتی تھے حضرت شاہ حاجی محمد امداداللہ مہاجر مکی کے خلیفہ ارشد تھے اور منجانب اللہ تعالیٰ تمام علوم ظاہری وباطنی سے متصف ہوکر زبان اہل حق پر حکیم الامت مجدد ملت محی السنۃ اور حجۃ اللہ فی الارض تھے۔ ان تمام اوصاف کا شاہد ناطق ان کا دین متین کا تحریری وتقریری اصلاحی وتجدیدی کارنامہ تبلیغ واشاعت دین ہے جوان کی حیات ہی میں مسلمانوں کے ہر طبقہ کے خواص وعوام میں اپنی جامعیت ونافعیت کی بناء پر مقبول ہوااور ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلا اور شائع ہوااور خلق اللہ کو مستفیض کیا۔

پیدائش: آپکی ولادت باسعادت ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ چہارشنبہ کی صبح صادق کے وقت بمقام تھانہ بھون ظہور میں آئی۔ بچپن میں فارسی وحفظ قرآن سے وطن ہی میں فارغ ہوئے پھر علوم دینیہ کی تکمیل دارالعلوم دیوبند سے ۱۲۹۵۔ ۱۳۰۱ھ میں ہوئی اس وقت آپ کی عمر تقریباً ۲۰ سال تھی۔

دستار فضیلت: آپ کی دستار فضیلت حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے متبرک ہاتھوں سے ہوئی آپ کے اساتذہ میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ اور مولانا محمد یعقوب صاحبؒ دیوبندی کی توجہات خصوصی آپ کے ساتھ وابستہ رہیں۔

خانقاہ امدادیہ میں قیام: قیام کانپور میں حضرتؒ نے اس طرح اپنی ابتدائی زندگی کے چودہ سال گزارے پھر خود اپنے شیخ حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے ایما اور منشاء سے صفر ۱۳۵۱ھ میں مدرسہ کانپور سے قطع تعلق کرکے اپنے وطن اور اپنے پیرومرشد کی یادگار خانقاہ امدادیہ میں قیام پذیر ہوگئے اور تھانہ بھون میں مستقل سکونت اختیار کرلی حضرت شیخ نے مکۃ المکرمہ سے تحریر فرمایا۔

''بہتر ہوا کہ آپ تھانہ بھون تشریف لے گئے امید ہے کہ خلائق کثیر کو آپ سے فائدہ ظاہری وباطنی ہوگا اور آپ ہمارے مدرسہ اور مسجد کو از سرنو آباد کریں گے میں ہر وقت آپ کیلئے دعا کرتا ہوں''۔

حضرت کا سانحہ ارتحال: وفات سے چند سال قبل ہی سے حضرت مرض اسہال میں مبتلا رہے اور کسی علاج سے صحت نہ ہوئی بالآخر ۱۶۔ ۱۷ رجب ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۔ ۲۰ جولائی ۱۹۴۳ء سہ شنبہ کی شب نماز عشاء کے وقت ۸۲ سال ۳ ماہ ۱۱ دن کی عمر میں یہ سواد ہند کا نیراعظم تقریباً نصف صدی تک دین مبین کی ضوفشانی کے بعد غروب ہوگیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مدفن: قصبہ تھانہ بھون میں خانقاہ امدادیہ کے شمال جانب قبرستان موسومہ تکیہ میں حضرت رحمۃ اللہ کی آخری آرام گاہ ہے۔ (مآثر حکیم الامت)

حکیم الامت خود اپنی نظر میں

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے تھانہ میں متعینہ ایک پولیس افسر نے بیعت کی درخواست کی تھی جس کے جواب میں آپ نے انہیں اپنا تعارف کراتے ہوئے لکھا۔

''میں ایک خشک طالب علم ہوں اس زمانہ میں جن چیزوں کو لوازم درویشی سمجھا جاتا ہے جیسے میلاد شریف، گیارہویں، عرس، نیاز، فاتحہ، قوالی وتصرف ومثل ذالک میں ان سب سے محروم ہوں اور اپنے دوستوں کو بھی اس خشک طریقہ پر رکھنا پسند کرتا ہوں۔''

میں نہ صاحب کرامت ہوں اور نہ صاحب کشف نہ صاحب تعریف ہوں اور نہ عامل صرف اللہ اور رسولؐ کے احکام پر مطلع کرتا رہتا ہوں اپنے دوستوں سے کسی قسم کا تکلف نہیں کرتا نہ اپنی حالت نہ اپنی کوئی تعلیم۔ نہ امور دینیہ کے متعلق کوئی مشورہ چھپانا چاہتا ہوں۔ عمل کرنے پر کسی کو مجبور نہیں کرتا۔ البتہ عمل کرتا ہوا دیکھ کر خوش اور عمل سے دور دیکھ کر رنجیدہ ضرور ہوتا ہوں۔

میں کسی سے نہ کوئی فرمائش کرتا ہوں نہ کسی کی سفارش اس لئے بعض اہل الرائے مجھ کو خشک کہتے ہیں میرا انداق یہ ہے کہ ایک کو دوسرے کی رعایت سے کوئی اذیت نہ دوں خواہ حرفی ہی اذیت ہو۔

سب سے زیادہ اہتمام مجھ کو اپنے لئے اور اپنے دوستوں کے لئے اس امر کا ہے کہ کسی کو کسی قسم کی اذیت نہ پہنچائی جائے خواہ بدنی ہو جیسے مار پیٹ خواہ مالی ہو جیسے کسی کا حق مار لینا یا ناحق کوئی چیز لے لینا۔ خواہ آبرو کے متعلق ہو جیسے کسی کی تحقیر۔ کسی کی غیبت خواہ نفسانی ہو جیسے کسی کو کسی تشویش میں ڈالنا یا کوئی ناگوار رنج دہ معاملہ کرنا اور اگر اپنی غلطی سے ایسی بات ہو جائے تو معافی چاہنے سے عار نہ کرنا۔

مجھے ان کا اس قدر اہتمام ہے کہ کسی کی وضع خلاف شرع دیکھ کر تو صرف
شکایت ہوتی ہے مگر ان امور میں کوتاہی دیکھ کر بے حد صدمہ ہوتا ہے اور
دعا کرتا ہوں کہ اس سے نجات دے یہ ہے کچا چٹھا ورنہ لوگوں نے تو۔

منش کردہ ام رستم داستاں وگرنہ یلے بود در سیستاں

اجمالی فہرست

فہرست مضامین

اصل العبادۃ

اسرار العبادۃ

شعبان

شرائط الطاعت

العبادة

عبادت کے متعلق یہ وعظ حضرت تھانوی نے حکیم عبدالرحمن کے مکان واقع ترب بازار حیدرآباد دکن میں مورخہ ۲۵ ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ بروز پنج شنبہ بعد ظہر کرسی پر بیٹھ کر بیان فرمایا جو اڑھائی گھنٹہ میں ختم ہوا۔ رجال ونساء کا مجمع ۱۰۰ کے قریب تھا۔ اسے محمد عبدالحلیم نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ نحمدہ و نستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھدان لاالہ الااللہ وحدہ لاشریک لہ ونشھدان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالی علیہ وعلی الہ واصحابہ و بارک وسلم.

امابعد فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم بسم. اللہ الرحمن الرحیم.

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَابَیْنَھُمَا فَاعْبُدْہُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِہٖ ھَلْ تَعْلَمُ لَہٗ سَمِیًّا. (سورہ مریم آیت ۶۵)

ترجمہ: ''وہ رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور ان سب چیزوں کا جو ان دونوں کے درمیان میں ہیں۔ سو تو اس کی عبادت کیا کر اور اس کی عبادت پر قائم رہ، بھلا تو کسی کو اس کا ہم صفت جانتا ہے۔''

تمہید: چونکہ وقت مختصر ہے لہٰذا مختصر مضمون اختیار کیا گیا ہے لیکن اختصار پر بھی وہ کافی وافی ہے کیونکہ وہ اصل ہے تمام ضروری مضامین کی اور اصل اس وجہ سے ہے کہ اس کا ذہن میں راسخ کر لینا تمام عمر کی رہبری کے لیے کافی ہے اور ہر چند کہ وہ مضمون تمام فروع اور جزئیات کے احاطہ کے لیے کافی نہیں مگر فروع کے تجسس و تفحص اور تحقیق کے لیے کافی ہے۔ یعنی اس اصل کے نہ جاننے سے ہم جیسے اب غفلت کر رہے ہیں کہ یہ جانتے ہی نہیں کہ ہم کچھ کوتاہی بھی کر رہے ہیں۔ اس اصل کے جان لینے کے بعد فکر تو پیدا ہو جائے گی کہ ہم میں کسی چیز کی کمی ہے۔ پھر اس کوتاہی کی اصلاح اس اصل کے مستحکم کر لینے سے ہو جائے گی اور اسی سے اس مضمون کی اہمیت بھی معلوم ہو جائے گی۔ لہٰذا اس اختصار پر نظر نہ کی جاوے بلکہ بیداری اور توجہ کے ساتھ سننا چاہیے۔ نیز ہمارے اندر ایک کمی تو غفلت اور جہل

کی ہے اور ایک کمی یہ ہے کہ اگر علم بھی ہو جاتا ہے تو وہ علم درجہ قال ہی تک محدود رہتا ہے، حال نہیں بنتا یعنی عمل کی توفیق نہیں ہوتی۔ حاصل یہ ہے کہ اگر کبھی اپنی کوتاہی اور غفلت کا علم بھی ہو جاتا ہے تو وہ تنبہ درجہ قال ہی تک محدود رہتا ہے۔

معنیٰ قال وحال

کیونکہ قال سے صرف زبان ہی سے کہنا مراد نہیں تاکہ علم کے قال ہونے پر اشکال ہو بلکہ قال دونوں کو عام ہے۔ قال باللّسان کو بھی اور قال بالجنان کو بھی۔ جیسے کلام کی دو قسمیں ہیں لفظی اور نفسی بلکہ اصل تو قال بالجنان ہی ہے جیسے کلامِ نفسی اصل ہے اور کلامِ لفظی محض دلیل ہے۔ کلام نفسی پر جیسا کہا گیا ہے۔

ان الکلام لفی الفؤاد وانما جعل اللّسان علی الفؤاد دلیلا

(کلام تو انسان کے دل میں ہوتا ہے اور زبان محض دل کی بات کا پتہ دینے والی ہے۔ یعنی دل کی ترجمان ہے۔)

اسی قال کے لفظ کو ہم تصور سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ اب خواہ آپ تصور کہئے یا قال بالفؤاد کہیے بس ہمارا علم اس درجہ سے آگے نہیں بڑھتا۔ یعنی حال نہیں ہوتا۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی شخص پر قتل کا مقدمہ ہوا اور اس کا علم اس کے پڑوسی کو بھی ہے مگر صاحب معاملہ اور پڑوسی کے علم میں بہت فرق ہے۔ صاحب معاملہ کا تو وہ حال بن جاتا ہے کہ اسے کسی وقت چین نہیں ہر وقت اسی کے تدبر واہتمام میں لگا رہتا ہے۔ کہیں گواہوں کی تلاش ہے کہیں پیروی کے واسطے اچھے وکیل کی جستجو اور کہیں بیان تحریری وغیرہ کی فکر اور کہیں وسائل وسفارش کی کوشش غرض وہی ہر وقت اسی کی دھن میں لگا رہتا ہے، وہ کھاتا ہے مگر اس کا کھانا نہ کھانے سے بدتر، وہ سوتا ہے مگر سونا جاگنے سے بدتر۔ بہرحال اپنی تمام ضروریات وحوائج بھی پورے کرتا ہے مگر دھن اور فکر کسی اور ہی چیز کی ہے اور ایک اسی کا پڑوسی ہے کہ اسے بھی اس معاملہ کی اطلاع ہے پھر ایک تو وہ پڑوسی ہے جسے اس کے ساتھ عناد ہے وہ الٹا خوش ہوگا اور ایک پڑوسی وہ ہے جسے اس سے ہمدردی ہے اور اس کو علم ہے کہ

ایسا سنگین مقدمہ قائم ہے اور خوف عقلی بھی ہے کہ ایسا نہ ہو مقدمہ اس کے خلاف فیصل ہو۔ مگر اسے وہ بھی دھن نہیں ہے سو یہ دو حالتیں ہیں ایک حالت قال ہے اور دوسری حال اس صاحب معاملہ کے لیے تو یہ مقدمہ حال بن گیا ہے اور پڑوسی کے لیے قال ہے۔

اسی طرح ہماری حالت بھی دوسری درجہ کی حالت ہے۔ پھر افسوس ہے کہ اپنا ہی معاملہ اور ایسی بے فکری تو یہ بھی ایک فرد ہے غفلت کی کہ توجہ اس درجہ کی نہ ہو جس درجہ کی ضرورت ہے۔

غرض جس طرح عدم العلم ایک کوتاہی ہے اسی طرح عدم الالتفات یا عدم التوجہ بھی ایک کوتاہی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ ہمارے اندر دونوں کوتاہیاں ہیں کہ یا تو علم ہی نہیں یا علم ہے تو التفات نہیں۔ اس اصل کے راسخ کرنے سے اس کا بھی تدارک ہو جائے گا کیونکہ عبادت کی حقیقت علم و عمل کے جمع کرنے ہی سے حاصل ہو سکتی ہے اس لیے اس مضمون کو بہت ضروری سمجھا جاوے اور اس کے اختصار پر نظر نہ کی جاوے۔

آخر مباحث علمیہ میں بھی تو یہی بات ہے کہ مقدمات میں طول ہوتا ہے اور مقصود میں اختصار ہوتا ہے۔ اسی طرح مقاصد معاشیہ میں بھی ہے چنانچہ کھانے کو لیجئے کہ اس کے مقدمات کتنے طویل ہیں، زمین درست کرو، ہل چلاؤ، چھ مہینے تک پانی سے سینچو اور کھیت کی حفاظت کرو، پھر غلہ کاٹو، پھر اس کا بھوسہ الگ کرو، پھر پیسو، پھر پکاؤ تب کھاؤ۔ مقصود کتنا مختصر ہے کہ ایک منٹ میں لقمہ بنا کے کھا جاؤ اور مقدمات کس قدر طویل ہیں جس میں چھ مہینے صرف ہوتے ہیں۔

جیسے ایک پیر جی تھے، تین تین سیر کھا جاتے اور چلتے تھے، چالیس چالیس کوس دونوں کام میں کامل تھے، وہ کہا کرتے تھے کھانا کون سا مشکل ہے منہ میں رکھا نگل لیا، منہ میں رکھا نگل لیا، اور چلنا کیا مشکل ہے پاؤں اٹھایا آگے رکھ دیا، پاؤں اٹھایا آگے رکھ دیا۔

یہ کھانے کے اختصار پر یاد آ گیا۔ دیکھئے کھانے کے مقدمات تو چھ مہینے میں ختم ہوتے ہیں اور خود مقصود کتنا مختصر ہے۔

مقصود بالبیان

آج کل یہ بھی ایک مرض ہے کہ تقریر کو اس کے طول عرض سے مہتم بالشان سمجھتے ہیں

حالانکہ مقصود اس میں بھی مختصر ہی ہوتا ہے۔ بہر حال یہ مضمون بھی مختصر ہے اور اس کا مجمل عنوان ہے ''عبادت'' اسے بھی سن کر ایک وسوسہ ہوا ہوگا کہ ارے یہ تو وہی پرانا مضمون ہے جسے رات دن سنتے رہتے تھے یہ بھی آج کل ایک مرض ہے کہ ہر چیز میں جدت کی تلاش ہے۔ حتیٰ کہ مضمون بھی نیا ہی چاہتے ہیں حالانکہ مضمون کا نیا ہونا تو آفت ہے کیونکہ وہ اگر مستند الی الوحی ہو تو پرانا ہوگا اور اگر نہ ہو تب نیا ہوگا۔ تو جو مستند الی الوحی نہیں وہ تو بدعت ہوگا اور کل بدعۃ ضلالۃ کے تحت میں داخل ہو کر گمراہی پھیلانے والا ہوگا۔ غرض جو مضمون مستند الی الوحی ہوگا' وہ تو پرانا ہی ہوگا مگر میں اطمینان دلاتا ہوں کہ مضمون بھی نیا ہی ہوگا۔ باعتبار معنون و تدوین و تحقیق کے نہیں بلکہ نیا باعتبار عنوان و علم کے ہوگا۔ یعنی ہے تو پرانا ہی مگر سامعین کو اب معلوم ہوگا۔ اس لیے علم کے اعتبار سے نیا ہے۔

جیسے کوئی مریض جسے مختلف نسخہ جات استعمال کرنے کے بعد بھی شفا نہ ہوئی ہو کسی طبیب کے پاس جائے اور یہ درخواست کرے کہ حکیم صاحب کوئی نیا نسخہ لکھئے، ان پرانے نسخوں سے تو شفا نہیں ہوتی اور حکیم جی اسے نیا نسخہ کہہ کر لکھ دیں۔ مگر وہ بھی پرانا ہی ہوگا کہ منقول تو قدماء ہی سے ہے۔ ہاں باعتبار حاصل ہونے کے مریض کو نیا معلوم ہوگا۔

غرض جدت کی حیثیتیں مختلف ہیں سو اگر اس اعتبار سے کوئی جدت کا متمنی ہو تو بے جا نہ ہوگا تو اس درجہ میں یہ مضمون بھی نیا ہے۔ ایک رسم اور ہو گئی ہے کہ اصلاح کرنے والوں کی حالت یہ ہے کہ نئے مضمونوں میں بھی وہ مضمون انتخاب کرتے ہیں جس میں ذرا گرمی ہو حالانکہ وہ مضامین انتخاب کرنا چاہئیں جن کی ضرورت ہو۔ سو جو مضمون بیان ہوگا الحمدللہ وہ ضروری بھی ہے اور اس میں دونوں حیثیتیں بھی جمع ہو گئیں کہ حقیقت کے اعتبار سے قدیم اور عارض کے اعتبار سے جدید غرض اس میں جدت کی بھی حیثیت ہے اب تو جدت پسندوں کے مذاق میں بھی توجہ کے لیے کافی ہوگا۔

اگر کوئی کہے کہ معنون کی طرح عنوان بھی تو پرانا ہے یعنی عبادت تو جواب یہ ہے کہ عنوان گو پرانا ہے مگر جب اس کی حقیقت ہم نہیں سمجھتے تو اس اعتبار سے وہ جدید ہی ہے۔ پھر حقیقت نہ سمجھنے کی بھی دو حالتیں ہیں۔ ایک نہ سمجھنا اور ایک مستحضر نہ رکھنا کہ میں نے اوپر اس کو بھی نہ سمجھنے

سے تعبیر کر دیا۔ پھر اس کے بعد جو عملی کوتاہی ہوگی وہ تیسرے درجہ میں ہوگی اس لیے اس مضمون میں جو اول درجہ ہے یعنی عبادت کی حقیقت نہ سمجھنا وہ اول سمجھائی جائے گی کیونکہ حقیقت ہی سے سب کو غفلت ہے۔ ضرورت تو قریب قریب سب جانتے ہیں کیونکہ یہ آیت بہت مشہور ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ.

''میں نے جن اور انسان کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں۔''

غایت آفرینش

عبادت ایسی ضروری چیز ہے کہ غایت خلق جن وانس کی بھی ہے اور یہاں جن کو بھی انسان کے ساتھ ذکراً شریک کیا گیا ہے اور دوسرے اکثر مقامات میں باوجودیکہ جن بھی انسان کی طرح تمام احکام شرعیہ کے مکلّف ہیں مگر پھر بھی تعبیر میں جو جن کا ذکر نہیں آتا تو وہ اکتفاء ہے۔ لہٰذا انسان ہی کا ذکر آتا ہے ورنہ احکام شرعیہ دونوں ہی میں مشترک ہیں۔ اس آیت سے یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ آفرینش کی غایت محض عبادت ہے اب اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ بجز اس کے اور کوئی مقصود ہی نہیں تمام مقاصد کا انحصار کر کے فرمایا کہ صرف عبادت کیا کریں اور اس حصر سے باوجود یکہ سب غایت کی نفی ہوگئی مگر پھر بھی جن غایات کی مقصودیت کا باعتبار عادات کے کچھ شبہ ہو سکتا تھا۔ اس مقام پر ان سب کی نفی تصریحاً بھی فرمادی۔ کلام الٰہی میں ہمارے عادات ومحاورات کی بے حد رعایت کی گئی ہے۔ بعض غایات کو تو انسان بھی غایت نہیں سمجھتا، اس کی نفی کی ضرورت نہ تھی جن کو مقصود سمجھنے کا احتمال تھا، صرف انہیں کی نفی کی گئی۔ چنانچہ آگے ارشاد ہے:

مَا أُرِيْدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ وَمَا أُرِيْدُ أَنْ يُطْعِمُوْنِ. إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ.

''(میں ان سے دوسری مخلوق کی) رزق رسانی کی درخواست نہیں کرتا اور نہ یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ مجھ کو کھلایا کریں، اللہ خود ہی سب کو رزق پہنچانے والا ہے، قوت والا نہایت قوت والا ہے۔'' سبحان اللہ کیسی بلاغت ہے کہ

بریں طرز گرجاں فشانم رواست

(اگر اس طرز پر میں اپنی جان قربان کردوں تو جائز ہے)

یہاں یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ اس حصر اور اس وعدہ پر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی فی الدنیا اکثروں کا مذہب ہو گیا ہے، کفار و ملاحدہ تو دنیا پرست ہیں ہی ان سے دنیا طلبی کچھ بھی بعید نہیں، تعجب تو مسلمان پر ہے کہ باوجود اسلام کے پھر طالب دنیا کیوں ہے۔

کسب دنیا اور طلب دنیا کا فرق

میرا سب دنیا پر اعتراض نہیں ہے اس کے لیے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے ہیں "کسب الحلال فریضة بعد الفریضة" دیکھئے کسب حلال کو فرض تک فرمایا لیکن طلب کے درجہ کی کس قدر صریح عنوان سے مذمت فرمائی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں "حب الدنیا راس کل خطیئة" اب اس میں یہ غلطی ہو جاتی ہے کہ غیر محقق علماء تو مطلقاً دنیا چھوڑاتے ہیں کہ دنیا کی ثروت اصلاً نہ حاصل کرو بلکہ ذلیل بن کر رہو، استغفر اللہ! یہ ہرگز رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا مقصود نہیں۔ ہاں آپ کا مقصود یہ ضرور ہے کہ فرعون بن کے نہ رہو اس لیے یہ ضرور کہا جاتا ہے کہ اس قدر ترقی دنیا کے درپے نہ ہو کہ اسی کو مقصود بالذات قرار دے لو۔ یہ درجہ حب دنیا ہے خواہ جاہ کی طلب ہو یا مال کی، اس درجہ میں اس کی تحصیل وطلب، یہی حب دنیا ہے اور اس کے یہ دونوں شعبے دین کو خراب کرنے والے ہیں۔ غرض حب الدنیا کو منع کیا گیا ہے نہ کہ کسب الدنیا کو بلکہ اس کو تو فرض قرار دیا گیا اور اب تو کھلم کھلا حب الدین کی ترغیب وتعلیم دی جارہی ہے۔

اگر کوئی اس پر بھی کہے کہ ہم تو حب الدنیا کی ترغیب نہیں دیتے کسب الدنیا کی ترغیب دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اس کا ایک معیار ہے وہ یہ کہ دیکھ لیا جاوے کہ جب دین اور دنیا میں تزاحم ہوتا ہے تو کس کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا ہی کو ترجیح دی جاتی ہے اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ دنیا مقصود بالذات ہے اس پر حب دین کا دعویٰ سو اس کی بالکل وہی حالت ہے کہ گھر یار تمہارا مگر کوٹھی کٹھلے کو ہاتھ نہ لگانا جو وقت دنیا کے کاموں سے بچ گیا، آ ؤ بھئی نماز بھی پڑھ لو، خواہ وقت تنگ ہی ہو گیا ہو بلکہ نکل ہی گیا ہو اور جماعت کا فوت ہونا تو کوئی بات ہی نہیں تو یہ تحصیل دنیا یہی حب دنیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اگر تزاحم کے وقت کسی نے دین کو ترجیح دی اور دنیا کی اس کے مقابلے میں پروا نہیں کی تو اس کی تحصیل دنیا یہ کسب الدنیا ہے اور اگر دنیا کو ترجیح دی اور دین کو مؤخر رکھا تو

یہ حب دنیا ہے۔ بہر حال یہ اجمالی تقریر بھی حب الدنیا اور کسب دنیا کے فرق کے لیے کافی ہے چونکہ ایک بہت بڑی جماعت ایسی بھی تھی جو اس طرح دنیا کو مقصود بنائے ہوئے ہے اس لیے اس کا تدارک فرماتے ہیں۔

مَا اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ ای لانفسهم ولا لعيالهم وَمَا اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ای وما اردت بخلقهم ان يطعمونی.

''یعنی میں نے اس لیے نہیں پیدا کیا کہ وہ اپنے اور اپنے عیال کے لیے رزق ڈھونڈیں نہ اس لیے پیدا کیا کہ وہ مجھے کھلاویں۔''

یہاں ایک نکتہ سمجھنا چاہیے کہ اطعام حق کے غایت ہونے کا تو احتمال ہی نہ تھا، پھر اس کی نفی کی کیا ضرورت تھی۔ سونکتہ یہ ہے کہ یہاں دونوں میں دو غایتوں کی نفی کو قرین فرمایا، ان میں ایک ایسا امر ہے کہ اس کے غایت ہونے کا احتمال ہی نہیں اور ایک میں اس کا احتمال تھا سو دونوں کو قریب فرمانا اشارہ اس طرف ہے کہ جیسا ایک امر یقیناً منفی ہے۔ ایسا ہی دوسرے کو سمجھو کیونکہ دونوں کی علت مشترک ہے چنانچہ اس علت کو اس طرح ذکر فرمایا کہ "ان الله هو الرزاق" یعنی وہ تو خود بڑے رازق ہیں کہ تم کو اور تمہارے عیال کو سب کو رزق دیتے ہیں۔

دوسری آیت میں ارشاد ہے:

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ.

''اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیجئے اور خود بھی اس پر قائم رہیے، ہم آپ سے رزق کا سوال نہیں کرتے، ہم آپ کو رزق دیتے ہیں۔''

یہ آیت بھی اس کے قریب قریب ہے۔ خلاصہ یہ کہ نہایت تاکید و اہتمام کے ساتھ اس مقصود کو ثابت فرمادیا کہ انسان کو حق جل و علیٰ شانہ نے صرف عبادت کے واسطے پیدا کیا ہے تو عبادت اتنا بڑا امر اہم ہے۔

عبادت کے معنی و حقیقت

اب صرف یہ سمجھنا باقی رہا عبادت ہے کیا چیز؟ سو اس میں غلطی یہ واقع ہوئی ہے کہ اس کی حقیقت کو نہیں سمجھا سو جو عربی جاننے والے ہیں ان کو تو اس کی حقیقت سمجھنا آسان ہے مگر

حق تعالی کی تعلیم ایسی سہل ہے کہ اس کا فیض سب کو پہنچتا ہے۔ چنانچہ لفظ عبادت ہی کو محاورات میں ایسا جاری کر دیا گیا کہ اب کوئی بھی اس سے ناواقف نہیں ہے مگر غایت ظہور کی وجہ سے اس کی حقیقت سمجھنے میں خفا ہو گیا چنانچہ اس کا مفہوم سب کے لیے بہت ہی آسان ہے، جو لوگ عربی دان ہیں وہ تو لغت میں دیکھ لیں گے کہ اس کے معنی ہیں غایت التذلل مگر عوام جو لغت نہیں جانتے اگر ان کے سامنے صرف اسی کو پیش کیا جائے تو ان کو یہ شبہ ہوگا کہ یہ ابھی تراشا گیا ہے اس لیے میں ان کے مستعمل محاورہ کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ عبد کے معنی سب کو معلوم ہے کہ غلام ہیں۔ چنانچہ عوام میں بھی عبداللہ، عبدالرحمٰن نام اسی واسطے رکھے جاتے ہیں اور عبادت اسی عبد کا مصدر ہے اور عبد اسی مصدر سے مشتق ایک صفت ہے۔ جب عبد کے معنی غلام ہیں تو عبادت کے معنی عبد شدن یعنی غلام ہو جانا یا بندہ ہو جانا ہوئے۔ بندہ فارسی ہے اور عبد اور غلام عربی ہے مگر غلام کو اردو میں بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ اردو میں سب زبانوں کے الفاظ مستعمل ہیں اور غلام کا لفظ بہ نسبت عبد بلکہ بہ نسبت بندہ کے بھی بوجہ کثرت استعمال کے زیادہ اقرب الی الفہم ہے۔ بہر حال ان تینوں لفظوں کے ایک ہی معنی ہیں اس لیے عبادت کی حقیقت منجملہ تو سمجھ میں آ گئی کہ غلام ہونا ہے۔

اب تفصیل سمجھ لی جاوے اور اس کے لیے مقدمات علمیہ کی حاجت نہیں بلکہ میں روزمرہ کے معاملات سے واضح کر دوں گا۔ وہ یہ کہ جب غلام کی حقیقت واضح ہو گئی تو جو لوازم ہیں غلام کے انہیں بھی اپنے اوپر لازم سمجھنا چاہیے۔ یہاں تک عنوان کی تعیین ہو گئی کہ وہ عبادت ہے جس پر میں بحث کروں گا۔

اگرچہ اس مبحث کے لیے آیت (وماخلقت الجن الخ) زیادہ مناسب تھی کیونکہ مشہور بھی ہے اور عموم میں صریح بھی ہے مگر صرف جدت کے خیال سے میں نے دوسری آیت پڑھی کیونکہ جدت پسندی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ کثیر التلاوت نصوص سے بھی لوگوں کو وحشت ہونے لگی ہے اس لیے آیتیں بھی نئی نئی تلاش کرنا پڑتی ہیں چنانچہ جو آیت میں نے شروع میں تلاوت کی ہے یہ سورہ مریم کی ہے اور سورہ مریم کون پڑھتا ہے حافظ بھی تو رمضان ہی میں مشق کرتے ہیں، روزمرہ کون قرآن پڑھتا ہے۔ چنانچہ ایک حافظ فخراً کہتے تھے کہ میں صرف

رمضان ہی میں پڑھتا ہوں مگر یہ کہنا ایسا ہی ہوا جیسے کوئی کہے کہ فلاں میرا محبوب ہے مگر میں اسے سال بھر کے بعد دیکھتا ہوں اور پہچان لیتا ہوں۔ اب تو اس پر فخر کرتے ہیں کہ سال بھر قرآن نہیں پڑھتے اور رمضان میں تراویح میں سنا دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اگر محض حافظ ہو جانا کمال ہے تو بہت سے بھوت بھی حافظ ہوتے ہیں۔ چنانچہ بہت سے واقعات سنے ہوں گے کہ فلاں عورت پر جن آتا ہے اور وہ قرآن پڑھتا ہے تو اصل کمال حافظ ہونا نہیں ہے بلکہ تعلق مع اللہ اور تعلق مع القرآن ہے اسی کی تکمیل و تسہیل کے لیے حافظ بنائے جاتے ہیں۔ سو اگر ایسا تعلق ناظرہ خواں رکھے وہ ہزار درجہ افضل ہے ایسے حافظ سے۔

بہر حال یہ آیت حافظ صاحب کے اعتبار سے بھی نئی ہے کیونکہ وہ اول تو سال بھر تک پڑھتے ہی کہاں ہیں اور جب پڑھتے بھی ہیں تو اس پر التفات کب ہوتا ہے اور اگر التفات بھی ہو تو ترجمہ کے اعتبار سے تو ضرور ہی ہے۔ بہر حال حق و تعالیٰ فرماتے ہیں:

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَابَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا.

"وہ رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور ان سب چیزوں کا جو ان دونوں کے درمیان میں ہیں۔ سو تو اس کی عبادت کیا کر اور اس کی عبادت پر قائم رہ، بھلا تو کسی کو اس کا ہم صفت جانتا ہے۔"

اصل محض فائدہ اور ماسیق لہ الکلام اس آیت میں فاعبد (پس اس کی عبادت کر) ہے اور اس کا سباق تمہید کے لیے ہے اور سیاق یعنی **واصطبر لعبادتہ** (اور اس کی عبادت پر قائم رہ) اس کا متمم ہے اور **ھل تعلم لہ سمیا** (کیا تو اس کا ہم صفت جانتا ہے) اس کی تائید ہے۔ بہر حال سباق و سیاق تمہید و تائید کے لیے ہے اور اصل مقصود **فاعبدہ** (پس تو اس کی عبادت کیا کر) ہے اور ابتدا اس کی جو **رب السموات الخ** سے کی گئی ہے تو وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے کلام کی عادت ہے کہ جب کوئی مشکل کام بتاتے ہیں تو اس کے آسان کرنے کا بھی اس جگہ اہتمام فرماتے ہیں اور اہتمام میں نے مجازاً کہہ دیا ورنہ اہتمام مشتق ہے ہم بمعنی فکر سے اور حق تعالیٰ اس سے منزہ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کلام الٰہی میں یہ بھی التزام ہے کہ سہولت کی بھی رعایت کی جاتی ہے۔

شفقت ربی

اس کو یوں سمجھئے کہ جیسے ایک شخص تو سکول کا ماسٹر ہے گو بچوں کو وہ تعلیم دیتا ہے مگر چونکہ پبلک کا نوکر ہے اس لیے اسے کوئی خاص انس و شفقت نہیں بلکہ محض ضابطہ اور وقت کا پابند ہے اسے اس سے بھی بحث نہیں کہ میں نے جو کچھ پڑھایا وہ بچوں کی سمجھ میں آیا یا نہیں کیونکہ تنخواہ دار استاد کو بچوں سے بالکل اجنبیت ہوتی ہے۔ محض اپنی تنخواہ سے مطلب ہوتا ہے اور ایک تعلیم ہے باپ کی کہ وہ یہ کوشش کرتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح میرا بیٹا سمجھ ہی جائے۔ ان دونوں کی تعلیم میں بڑا فرق ہے، ماسٹر تو اپنے گھنٹہ میں آئے اور لڑکوں کو تقریر سنا کر چل دیئے اور باپ کی تعلیم یہ نہیں کہ الفاظ ادا کر دیئے اور چل دیئے بلکہ وہ سوچتا ہے کہ کون سے عنوان سے سمجھانا زیادہ مؤثر ہوگا۔ وہ یہی سوچے گا کہ آخر اتنے دن پڑھتے ہوئے ہو گئے، نفع کیوں نہیں ہوتا، میں کون سی تدبیر اختیار کروں جو نافع ہو، کبھی ترغیب دیتا ہے، کبھی ترہیب کرتا ہے، کبھی یہ سوچتا ہے کہ میرے کہنے کا اثر نہیں ہوتا تو لاؤ اس کے کسی دوست سے کہلواؤں۔

حق تعالیٰ کی تعلیم اسی رنگ کی ہے حالانکہ حق تعالیٰ کے غنا کو اگر دیکھا جاوے تو معلوم ہوگا کہ ان کو کیا ضرورت ہے اس قدر اہتمام کی مگر کیا ٹھکانہ ہے ان کی شفقت کا کہ وہ یہ نہیں چاہتے کہ ہمارا کوئی بندہ ہم سے جدا رہے اور کیوں نہ ہو انہوں ہی نے تو ان تمام شفقتوں کو پیدا کیا۔ بس جس نے باپ کے دل میں اتنی شفقت پیدا کر دی وہ خود کیسا شفیق ہوگا۔

چہ باشد آں نگار خود کہ بندد ایں نگار یھا

(وہ کیسا محبوب ہوگا کہ جس نے اپنے محبوب پیدا کیے)

سبحان اللہ! مشکل سے مشکل تعلیم کو کیسا سہل کر دیا ہے۔ مقصود تو یہ تھا کہ عبادت کیا کرو یعنی غلام بنو۔ اس غلام بننے پر ایک حکایت یاد آئی۔ کانپور میں ایک بزرگ نقشبندی تھے ان سے ایک طالب علم نے بیعت کی درخواست کی۔ ان بزرگ نے ان سے کہا استخارہ کر لو اور اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ استخارہ میں یہ ضرورت نہیں کہ دعا پڑھ کر سو بھی رہے۔ حدیث میں اس کا کہیں ذکر نہیں بلکہ اس رواج کی اصل یہ ہے کہ سونے میں ذرا یکسوئی زیادہ ہوتی ہے اس لیے یہی معمول ہو گیا ہے ورنہ سونا لازم نہیں۔ حدیث میں صرف اتنا ہے کہ دو رکعت نماز پڑھے

اور یک سوئی کا منتظر رہے۔ بعض جو جانب قلب میں راجح ہو جاوے اس پر عمل کرے۔

چنانچہ انہوں نے وہاں سے ذرا ہٹ کر پھر واپس آ کر عرض کیا کہ میں نے استخارہ کرلیا۔ ان بزرگ نے کہا ایسا مختصر استخارہ کیسے کرلیا، وہ کہنے لگا کہ اس استخارہ کو سمجھ لیجئے میں نے الگ بیٹھ کر نفس سے پوچھا کہ بیعت کے معنی فروخت شدن کے ہیں (یعنی بکنا) اور بکنے سے تو غلام ہو جاوے گا پھر غلام ہو جانے کے بعد اگر پیر بتاوے گا کہ جا گو جا گنا پڑے گا، اگر کہے گا کہ بھوکے رہو تو بھوکا مرنا ہوگا، اگر ٹھنڈا پانی پینے کو منع کرے گا پیاسا رہنا ہوگا، مثلاً تو کیوں بیوقوف ہوا ہے کہ اچھی خاصی آزادی کو چھوڑ کر دوسرے کے قبضے میں اپنے کو دیئے دیتا ہے۔ نفس نے یہ جواب دیا کہ یہ سب کچھ سچ ہے مگر خدا تو ملے گا، میں نے کہا اگر خدا بھی نہ ملے تو کیونکہ وہ تیرا قرض دار تو نہیں تو اس نے جواب دیا:

ملنے کا اور نہ ملنے کا مختار آپ ہے   پر تجھ کو چاہیے کہ تگ و دو لگی رہے

(وہ نہ ملیں ان کو اختیار ہے مگر ان کو یہ تو خبر ہو جاوے گی کہ یہ کم بخت بھی ہمارا طالب ہے بس اتنا ہی کافی ہے۔)

ہمینم بس کہ داند ماہر ویم   کہ من نیز از خریداران اویم
ہمینم بس اگر کاسد قماشم   کہ من نیز از خریدارانش باشم

(یہی بہت ہے کہ محبوب کو معلوم ہو جائے کہ میں بھی اس کے خریداروں میں ہوں۔ یہی بہت ہے اگر میں کھوٹی پونجی یعنی غریب ہوں کہ اس کی خریداروں کی لڑی میں بھی ہو جاؤں۔)

ان بزرگ نے فرمایا کہ بھائی تیرا استخارہ عجیب ہے اور بیعت کرلیا اور غلامی کی حقیقت تو بیعت سے بھی دشوار ہے مگر حق تعالیٰ کو یہ معلوم تھا کہ اگر ہم ابتدا ہی سے یہ کہہ دیں گے کہ **اعبده** (اس کی عبادت کرو) تو نفس آمادہ نہ ہوگا اس لیے حق تعالیٰ نے اس کی تمہید میں اپنی عظیم الشان صفت ارشاد فرمائی یعنی **رَبُّ السَّمٰوٰتِ** الخ یہاں پر **ھو** مبتدا مقدر ہے اور **رَبُّ السَّمٰوٰتِ** اس کی خبر ہے اور اس نے جس صفت کی خبر دی ہے وہ صفت **اعبده** کو مقتضی ہے اور وہ صفت ہے مسلم تو اس کا اثر یہ ہوگا کہ اب نفس کو امتثال الامر میں خلجان نہ رہے گا کیونکہ اس سے حق تعالیٰ کے صفات و کمالات بھی معلوم ہو گئے اور اس کا امر بھی معلوم ہو گیا۔

احسان ربی

اور یہ طبعی امر ہے کہ صاحب عظمت وکمال کی اطاعت طبعاً سہل ہوتی ہے اور یوں تو حق تعالیٰ کے صفات کمال بے شمار ہیں مگر ان کو فاعبدہ (پس تو اس کی عبادت کیا کر) کی تسہیل میں اتنا بین دخل نہیں جتنا صفت ربوبیت کو ہے کیونکہ محسن کی اطاعت کی طرف آدمی زیادہ دوڑتا ہے۔ چنانچہ حکماء کی بھی اس پر نظر گئی ہے اور اسی لیے ان کا قول ہے۔ **الانسان عبدالاحسان** (انسان احسان کا بندہ ہے) اور یہ اقتضاء صرف قول ہی نہیں بلکہ عملی ہے کہ محسن کی تعظیم وتکریم صرف زبان ہی سے نہیں بلکہ عملاً بھی کی جاتی ہے کیونکہ احسان میں یہ اثر ہے کہ وہ اپنی طرف کھینچتا ہے اور ربوبیت سماء وارض سے بڑھ کر کیا احسان ہوگا اور اسی لیے ربکم یا ربک نہیں فرمایا بلکہ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فرمایا اس واسطے کہ ربکم فرمانے سے یہ ہوتا کہ بعض صورتوں کو حق تعالیٰ کا احسان سمجھتے اور بعض کو نہ سمجھتے۔

مثلاً اس کو تو احسان سمجھتے کہ جنگل میں بھوکے بیٹھے تھے کہ ایک خوان کھانے کا نازل ہوگیا مگر اس کو نہ سمجھتے کہ مثلاً پانچ سو روپے کی تنخواہ ہے اور اس سے اجناس خریدے گئے اور طرح طرح کے اسباب معیشت مہیا کیے گئے اور کھا پی رہے ہیں تو یہ ان وسائط کی ترتیب پر نظر کرکے یہ سمجھتا کہ میں نے بی اے پاس کیا تھا اس سے پانچ سو کی نوکری ملی اور اس سے کھا پی رہے ہیں اس میں کسی کا کیا دخل اور کیا احسان اور یہ مذہب مسلمان کا تو ہے نہیں قارون کا مذہب ہے کیونکہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اس سے فرمایا:

اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ''تو بھی خلق کے ساتھ احسان کر جیسا خدا نے تجھ پر احسان کیا۔''

تو اس نے جواب دیا اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِىْ ''کہ اور کچھ نہیں صرف یہی بات ہے کہ مجھے جو کچھ ملا ہے میرے علم کی بدولت ملا ہے۔''

اس میں خدا کے احسان کو کیا دخل ہے (نعوذ باللہ) اس میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ وہ علم کیا تھا ایک قول یہ ہے کہ کیمیا ہے کوئی کہتا ہے کہ فن تجارت ہے، غرض مختلف اقوال ہیں مگر چونکہ کسی کی تعیین دلیل صحیح سے نہیں اس لیے علم کو عام ہی رکھا جائے تو مناسب ہوگا خواہ

وہ علم کیمیا ہو، خواہ علم زراعت ہو، خواہ فن تجارت ہو، خودسود لینا دینا۔ بہر حال کوئی تدبیر تھی ترقی مال کی جس کو اس نے کہا عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِی. (میرے علم کی بدولت)

خیر وہ کافر تھا افسوس تو مسلمان پر ہے۔ ایک مسلمان صاحب جواب انتقال کر گئے ہیں وہ ہندوستانی ہو کر اردو غلط بولنا فخر سمجھتے تھے۔ چنانچہ آج کل یہ بھی ایک فیشن ہے کہ کوشش کرکے فخریہ اردو غلط بولتے ہیں تا کہ صاحبان بہادر سے تشبہ ہو چنانچہ میں نے ایک زبان دان ہندوستانی کو بولتے سنا کہتا تھا کہ ہم سنتا نہیں مانگتا غرض وہ صاحب تھے مسلمان ان کے سامنے کسی نے کہا انشاء اللہ ایسا ہوگا کہنے لگا کم بخت اس میں انشاء اللہ کا کیا بات ہے یہ تو تدبیر کا بات ہے مگر انجام اس شخص کا ایسا ہوا کہ اگر وہ زندہ رہتا تو پھر کوئی بات بھی انشاء اللہ سے خالی نہ چھوڑتا۔

جیسے ایک شخص کی حکایت ہے کہ وہ نخاس کی طرف جا رہے تھے کسی نے پوچھا کہاں جا رہے ہو؟ کہا گھوڑا خریدنے کہا، انشاء اللہ کہہ لو تو آپ کہتے ہیں کہ اس میں انشاء اللہ کی کیا بات ہے کہ روپے میری جیب میں اور گھوڑا نخاس میں، اتفاق سے راستہ میں کسی گرہ کٹ نے جیب کتر کے روپے کی تھیلی غائب کردی، اب یہ ناکام واپس آ رہا تھا کہ راستہ میں اتفاق سے پھر وہی شخص مل گیا۔ اس نے پوچھا کہ کہو بھئی گھوڑا لائے، کہنے لگا میں بازار جا رہا تھا، انشاء اللہ کسی نے روپے کی تھیلی چرالی، انشاء اللہ میں ناکام واپس آ رہا ہوں، انشاء اللہ یا تو مستقبل پر بھی انشاء اللہ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے یا اب ماضی پر بھی انشاء اللہ کہنے لگے۔ خدا تعالیٰ کبھی ان مغروروں کو ایسی زک پہنچاتے ہیں کہ دماغ سیدھا ہو جاتا ہے۔

سو آج کل بعض تو ربوبیت کے معتقد ہی نہیں بعض کو اگر ربوبیت کا اعتقاد بھی ہے تو حال نہیں ہے حال کی حقیقت ایک مثال سے سمجھئے کہ مثلاً سرکار عالی کسی کو ایک خوان بھیج دیں کہ اسے دو تین وقت کھاوے تو بتایئے اس وقت دل میں سرکار عالی کی ایک خاص طور کی یاد ہوگی یا نہیں اور خاص درجہ کی ممنونیت کا اثر ہوگا کہ نہیں اس کیفیت کو حال کہتے ہیں۔

اب میں پوچھتا ہوں کہ رات دن خدا کے بھیجے ہوئے خوان استعمال کرتے ہیں یا نہیں تو کیا خدا کے ساتھ بھی یہی حالت ہوتی ہے کہ نہیں ظاہر ہے کہ نہیں جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے خوان میں وسائط ایسے ہو گئے ہیں کہ ان سے حق تعالیٰ تک نظر نہیں پہنچتی حالانکہ مثال

مذکور میں بھی وسائط ہیں کہ سرکار عالی نے وزیر کو حکم دیا، وزیر نے امیر کو امیر نے مشیر کو مشیر نے دبیر کو اور دبیر نے لاکر بشیر کو دے دیا تو وسائط یہاں بھی ہیں مگر پھر بھی ذی واسطہ پر فوراً نظر پہنچ جاتی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ وسائط دو قسم کے ہوتے ہیں ایک یہ کہ بادشاہ نے تملیکاً وزیر کو دیا اور وزیر سے آخر تک سب نے دوسروں کو، اسی طرح تملیکاً دیا پھر بشیر تک پہنچ گیا اور ایک یہ کہ بادشاہ نے وزیر کو حکم دیا کہ یہ چیز فلاں فلاں وسائط سے فلاں کو پہنچا دو، تو پہلی صورت میں تو یہ وسائط فی العطاء ہیں یعنی ہر ایک نے دوسرے کو عطاء کیا اور دوسری صورت میں یہ وسائط فی الحکم ہیں۔ تو اول قسم میں معطی اصل تک نظر نہیں جاتی اور دوسری قسم میں جاتی ہے تو لوگ وسائط عطاء نعمت حق کو قسم اول سمجھ رہے ہیں حالانکہ بعد غور قسم ثانی کے وسائط ہیں۔

اب تو یہ شبہ رفع ہو گیا ہو گا کہ صاحب واسطوں کی وجہ سے حق تعالیٰ کا استحضار نہیں ہوتا۔ وجہ رفع یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ دیا وہ آپ ہی کے لیے دیا اور جس شخص کے ذریعے سے آپ کو ملا وہ حقیقتاً مالک نہیں محض واسطہ فی الحکم ہے پھر بہت سی نعمتیں تو ایسی ہیں جہاں واسطہ قسم اول کا احتمال ہی نہیں ہو سکتا۔ مثلاً بارش، سورج، چاند، ستارے یہ سب یقیناً آپ ہی کے نفع کے لیے ہیں اور ان میں کسی کا واسطہ نہیں ہے۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرمانبردار شرط انصاف بناشد کہ تو فرماں نبری

(بادل ہوا، چاند اور سورج اور آسمان کام میں ہیں تاکہ تو روٹی ہاتھ میں لائے اور غفلت سے نہ کھائے، یہ سب تیسرے لیے برگزشتہ اور فرمانبرداریاں میں انصاف کی شرط نہیں کہ تو رب آقا کا فرمانبردار نہ ہو۔)

مسئلہ جبر و قدر

جب یہ حقیقت ہے تو اب کیا وجہ ہے منعم اصل سے غافل ہونے کی، صرف وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ بعض عطاؤں کا ظہور آپ کے ہاتھ سے ہوا ہے مگر یہ نہ دیکھا کہ آسمان و زمین جس طرح خدا کے مسخر ہیں اسی طرح آپ بھی خدا کے مسخر ہیں تو آپ کا ہاتھ بھی محض مسخر

قدرت ہی ہوا پھر اس پر نظر پڑنا سبب غفلت کا کیوں ہو جاتا ہے۔

دیکھئے میرا ہی ہاتھ ہے کہ آج کل اس میں ایسا درد ہے کہ میں اپنی پیٹھ تک نہیں کھجلا سکتا۔ اگر یہ پورے طور سے میرا ہوتا تو میرے تابع ہوتا۔ اگر انسان ذرا بھی سوچے سمجھے تو واقعات خود رہبری کرتے ہیں کہ گو ہمارے افعال اختیاریہ ہیں مگر خود اختیار ہی غیر اختیاری ہے پھر اس کو حجاب سمجھنا چہ معنی مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ برے افعال پر سزا جائز نہ ہو کیونکہ اس کا بے غبار جواب ہمارے پاس یہ کافی ہے کہ وہ مالک ہیں انہیں اپنی ملک میں تصرف کرنے کا اختیار ہے مگر ساتھ ہی یہ سمجھنا بھی فرض ہے کہ وہ حکیم بھی ہیں جو کچھ کرتے ہیں اسی میں مصلحت ہوتی ہے باقی اس کے آگے ذات وصفات کی بحث چھڑ جاتی ہے جہاں کسی کی رسائی نہیں بقول حافظ

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں   کانجا ہمیشہ باد بدست ست دام را

''جس طرح عنقا کو کوئی شکار نہیں کرسکتا اس کے لیے جال پھیلانا اور کوشش کرنا لاحاصل ہے''۔

اور ان ہی کا قول ہے:

بحریست بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست   آنجا جزایں کہ جاں بسپارند چارہ نیست

''دریائے عشق ایسا دریا ہے کہ اس کا کوئی کنارہ نہیں ہے، اس جگہ جان سونپنے کے سوا چارہ نہیں''۔

غرض اس میں کسی کی عقل کو رسائی نہیں ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبر وقدر کے مسئلہ میں خوض بحث سے روک دیا ہے کسی ایسے ہی مسئلہ کے متعلق ایک بزرگ سے پوچھا گیا۔ فرمایا کہ:

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں   بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد

''اب کس کا دماغ ہے کہ باغباں سے پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا اور پھول نے کیا سنا اور صبا نے کیا کہا''

جب گل وبلبل کے رموز ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں تو اسرار الٰہیہ کو کون سمجھ سکتا ہے۔

اسی لیے کہا ہے:

حدیث مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو   کہ کس نکشود ونکشاید بحکمت ایں معمارا

بہرحال مقصود یہ تھا کہ سب چیزیں حق تعالیٰ کے قبضہ میں ہے۔ حتیٰ کہ حرکت وسکون بھی کہ جب تک ان کی اجازت تھی ہاتھ ہلتا تھا اور اب اجازت نہیں ہے تو وہ پیٹھ تک نہیں کھجلا سکتا۔

رشتہ درگردم نم افگندہ دوست　　می برد ہرجا کہ خاطر خواہ اوست

''محبوب حقیقی نے یہ حرکات پیدا کررکھی ہیں جس طرف چاہتے ہیں متحرک کردیتے ہیں''

مولانا اسی کوفرماتے ہیں:

ماہمہ شیراں ولے شیر علم　　حملہ شاں ازباد باشد دمبدم

ہماری مثال ایسی ہے جیسے پرچم کا شیر ہوتا ہے ہوا چلنے سے حملہ کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

(قاعدہ ہے کہ پرچم میں اکثر شیر کی تصوری بنادیتے ہیں کہ وہ جب ہوا سے ہلتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ شیر حملہ کررہا ہے۔) اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

حملہ شاں پیدا و ناپیداست باد　　انکہ ناپیداست ہرگز کم مباد

''ان کا حملہ نظر آتا ہے اور ہوا حملہ کرنیوالی نظر نہیں آتی آگے بطور دعا کے فرماتے ہیں یعنی جو چیز نظر نہیں آتی یعنی مؤثریت حق وہ ہمارے دل سے کبھی کم نہ ہو''

دوسرے مصرعہ کی تفسیر حضرت حاجی صاحب قدس سرہ نے فرمائی ہے ''اے از دل ما'' یعنی جو ذات ظاہر نہیں ہے ہمارے دل سے اس کا تصور ہرگز کم نہ ہو ورنہ اس کی ذات کے کم نہ ہونے کی دعا کے کوئی معنی نہیں۔

انت کالریح ونحن کالغبار　　یختفی الریح وغبراء جھار

(یہ تو مثل ہوا ہے اور ہم مثل غبار کے ہوا پوشیدہ ہے اور اس کا غبار ظاہر ہے۔)

بس یہی حالت ہماری ہے ہم کیا اور ہمارا کمال ہی کیا کہا جاتا ہے کہ فلاں بڑے محاسب ہیں، ارے ہمارا حساب ہی کیا اگر حق تعالیٰ چاہے قلب کو بدل دے، بس سب بھول بھال جاویں تو بس یہ سارے انتظام حق سبحانہ ہی کررہے ہیں اس واسطے وہ وسائط ان کی معرفت میں کیوں حاجب ہوں کچھ بھی نہیں محض ہماری غفلت ہے۔

وسائط و وسائل کا راز

اگر کوئی کہے کہ مجازی بادشاہ کو تو ضرورت ہوتی ہے وسائط کی۔ حق تعالیٰ کو اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اگر یہ نہ ہوتے حجاب نہ ہوتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو ہم حکمت کے احاطہ کے مدعی نہیں لیکن تبرعاً اگر اتنا بتلا دیا جاوے تو مضائقہ بھی نہیں کہ حق تعالیٰ نے جو

وسائط تجویز کیے ہیں وہ آپ کی تسلی کے لیے تجویز کیے ہیں۔ چونکہ انہیں بندوں سے کمال محبت ہے اس لیے ان کی راحت کے لیے وسائط کا انتظام کر دیا کہ آگ تم جلا دو کھانا ہماری قدرت سے پک جاوے گا۔ باقی طبخ طعام میں حقیقتاً آگ کا کچھ دخل نہیں۔ حضرات صوفیائے کرام نے اسے خوب سمجھا ہے۔ آپ اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔

مثلاً سرخ جھنڈی ریل کے روکنے کے واسطے استعمال کی جاتی ہے اور سبز جھنڈی تیز کرنے کے واسطے جو اس کی حقیقت جانتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اصل میں ڈرائیور چلاتا ہے اور وہی روکتا ہے اور جھنڈی محض ایک اصطلاحی علامت ہے اس کے چلانے یا روکنے کے لیے۔ اب دیکھنے والوں میں ایک تو انجینئر ہے جو انجن کے کل پرزوں کا ماہر ہے اور ایک دیہاتی گنوار ہے۔ دیہاتی تو یہ سمجھے گا کہ جھنڈی سے ریل رکتی ہے اور جھنڈی سے ہی چلتی ہے۔ یہ گنوار اس کافر سائنس دان کے مشابہ ہے جس نے خدا کو ایک پنشنر سے بھی کم کر دیا ہے وہ وسائط کو مؤثر حقیقی سمجھتا ہے اور خدا کو اگر مانتا بھی ہے تو بالکل بے کار سمجھتا ہے۔ (نعوذ باللہ) اور جو سائنس دان ذرا مسلمان ہے وہ خدا کو بیکار تو نہیں سمجھتا مگر وہ بھی اتنا ہی سمجھتا ہے کہ جیسے کوئی گھڑی میں کوک دے کر الگ ہو گیا۔ اب جس طرح کوک دینے والے کی مدد کے بعد گھڑی کے افعال بغیر کوک دینے والے کی مدد کے جاری رہتے ہیں اسی طرح ان کے زعم میں عالم کی بھی حالت ہے کہ ایک بار اشیاء کو پھیلا کر کے اور ان میں خواص ودیعت کر کے پھر ان کا کچھ دخل نہیں رہا۔ باقی جو محققین ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہر آن و ہر شان میں خدا کی تعریف کی ضرورت رہے۔ جس طرح سرخ جھنڈی کی محض علامت و اصطلاح ہے اسی طرح آگ بھی محض ایک علامت ہے، باقی اثر اس کا خاص تصرف حق سے ہوتا ہے اور اگر آگ مؤثر بالذات ہوتی تو ہم پوچھتے ہیں کہ اس کی تاثیر اس وقت کہاں گئی تھی جب ابراہیم علیہ السلام کو اس میں ڈالا گیا تھا۔ باقی قصہ میں کسی کو شبہ ہو تو یہ خبر صادق سے ثابت ہے جس کا صدق قطعی ہے جس میں مجال انکار نہیں۔

اسی واقعہ کے مشابہ مولانا نے ایک حکایت تحریر فرمائی ہے کہ ایک بادشاہ لوگوں سے بت پرستی کراتا تھا۔ چنانچہ ایک عورت سے کہا گیا۔ اس نے انکار کیا۔ اس کے پاس ایک بچہ

تھا اس بچے کو چھین کر آگ میں ڈال دیا۔ قریب تھا کہ وہ عورت مبتلائے فتنہ ہو جاوے، قدرت خدا سے وہ بچہ آگ میں صحیح سالم اپنی ماں سے کہنے لگا:

خواست تا او سجدہ آرد پیش بت　　بانگ برزد طفل کانی لم امت
اندر آ اسرار ابراہیم بیں　　کوز آتش یافت ورد و یاسمین

(اس عورت نے چاہا کہ بت کے سامنے سجدہ کرلوں، فوراً لڑکے نے پکارا کہ میں مرا نہیں ہوں۔ اے اماں تو بھی اندر چلی آ اور دیکھ تو کہ یہ آگ نہیں گلزار ابراہیمی ہے۔)

پھر تو ماں بھی کود پڑی اور جو بچہ کہتا تھا سب کو مخاطب کر کے وہ بھی کہنے لگی۔ اب تو لوگ بھی لگے گرنے اور کوئی بھی نہ جلتا تھا۔ جب یہ رنگ دیکھا تو بادشاہ بہت جھنجھلایا اور آگ سے کہنے لگا کہ کہاں گئی تیری وہ تیزی اور حرارت تو جلاتی کیوں نہیں؟ آگ جواب دیتی ہے:

گفت آتش من ہمانم آتشم　　اندر آ تا تو بہ بینی تابشم!

(آگ نے کہا میں وہی آگ ہوں، آپ تشریف لائیں اور میری تپش کو دیکھئے)

یعنی میں آگ ہی ہوں تو آکے دیکھ لے کہ میں کیا ہوں مگر

طبع من دیگر نہ گشت و عنصرم　　تیغ حقم ہم بدستوری برم

(میری طبیعت اور عنصر نہیں بدلا، میں اللہ کی تلوار ہوں اور اجازت سے ہی کاٹ سکتی ہوں۔)

یعنی خدا کی تلوار ہوں، بغیر حکم کے نہیں کاٹ سکتی۔ مولانا فرماتے ہیں:

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند　　با من و تو مردہ با حق زندہ اند

(خاک، ہوا، پانی اور آگ یہ چاروں عنصر حق تعالیٰ کے بندے ہیں، ہمارے تمہارے روبرو گو مردہ ہیں مگر حق تعالیٰ کے روبرو زندہ ہیں۔)

اور واقعی اگر زندہ نہ ہوتے تو ان میں ادراک کیسے ہوتا اور ادراک نہ ہوتا تو (قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَى إِبْرَاهِيمَ) ''یعنی ہم نے کہا اے آگ! تو ابراہیم پر سرد اور سلامتی ہو جا۔'' اس کے کیا معنی ہوتے۔ چنانچہ فرشتوں سے نہیں کہا گیا کہ وہ آگ کو سرد کر دیں یا ابراہیم علیہ السلام کو بچالیں بلکہ خود آگ سے خطاب کیا گیا اور خطاب میں مجاز خلاف اصل ہے جس کی کوئی دلیل نہیں۔ مفسرین نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ اگر بردا کے بعد سلاما کا لفظ نہ ہوتا تو

آ گ برف بن جاتی اوراس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو برودت کی اذیت ہوتی۔ سلاماً فرمانے سے وہ بردوسلام ہوگئی۔ تو یہ صاف دلیل ہے ان جمادات کے ذی شعور ہونے کی۔

خیر یہ مسئلہ استطر اداً آ گیا۔ اصل مضمون یہ تھا کہ کوئی چیز بالذات مؤثر نہیں محتاج ہے تصرف حق کے۔ پس کھانے کے نیچے آگ جلانے سے کھانا نہیں پکتا بلکہ پکانے والے حقیقت میں وہی ہیں لیکن اگر آگ جلانے کی اصطلاح نہ ہوتی تو یہ پتہ نہ لگتا کہ اس وقت کس واسطے سے مقصود حاصل ہوگا اور یہ ایک بڑی مصیبت ہوتی۔ پس یہ آگ جلانا ایک دعا ہے کھانا پکانے کی۔ گو قولی دعا نہیں مگر حالی وعملی دعا ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کسی نے بادشاہ کو سلام کیا اور اس نے اسے دس روپے دیدیئے کہ:

سلام روستائی بے غرض نیست

(گنوار کا سلام بے غرض نہیں ہوتا)

اسی طرح اگرچہ آگ جلانے والا حق تعالیٰ کا منکر ہی ہو مگر وہ جب حالاً درخواست کرتا ہے کھانا پکا دیتے ہیں۔ اگر آگ نہ ہوتی تو ضرورت کے وقت قولاً دعاء کرنا پڑتی کہ اے اللہ کھانا پکا دیجئے مگر اس سے تسلی نہ ہوتی کہ خدا جانے اس سے پکے گا بھی یا نہیں۔ نیز درخواستوں میں تعارض ہوتا کہ ایک تو یہ درخواست کرتا کہ پکا دیجئے اور اس کا پڑوسی یہ کہتا کہ کچا رہنے دیجئے۔ اس لیے ایک ایسا قاعدہ مقرر کردیا جس نے تشویش سے بچا دیا۔

اس رعایت وشفقت کی قدر کی ہے صوفیاءکرام نے کہ ترک اسباب کی اجازت نہیں دیتے۔ جیسے خلاۃ فی الزہد کرتے ہیں۔ محققین کا مذہب یہی ہے کہ ایسا زاہد بے ادب ہے۔ کمال ان ہی حضرات کا ہے کہ انہوں نے زہد کو جمع کیا، اسباب کے ساتھ چنانچہ وہ کہتے ہیں سنسان جنگل میں بیٹھنا توکل میں جائز نہیں، گھر ہی بیٹھو اور دروازہ کھول کے بیٹھو مگر دروازے کو دیکھو مت، اسی کی نسبت غیر عارفین نے تنگ ہو کر کہہ دیا ہے۔

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ بازمی گوئی کہ دامن ترمکن ہوشیار باش

(دریا میں تختہ باندھ کر ڈال دیا ہے پھر کہتے ہیں خبردار دامن تر نہ ہو۔)

مگر یہ دشواری اس کو ہے جو تیرنا نہیں جانتا اور جو تیرنا جانتے ہیں اور ان کے دامن بھی

اونچے ہیں وہ کھڑے ہوکر تیرتے ہیں اور دامن کو صاف بچالتے ہیں کیونکہ محققین ہمیشہ جامع بین الاضداد ہوتے ہیں۔اسی واسطے اسباب سے استعمال کا تعلق بھی رکھتے ہیں اور توجہ کا تعلق نہیں بھی رکھتے۔ بہرحال یہ تو معلوم ہوگیا کہ وسائط برائے نام اسباب ہیں اور درحقیقت کرتے سب کچھ وہی ہیں۔

کارزلف تست مشک افشانی اما عاشقاں مصلحت را تہمتے برآہوئے چین بستہ اند

(مشک افشانی دراصل تیری زلف کا کام ہے، مصلحت کی بنا پر عشاق نے ہرن کی طرف منسوب کردیا ہے۔)

اسی واسطے فرمایا: رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَابَيْنَهُمَا

''کہ سب کا مربی حق تعالیٰ ہے، خواہ وہ آسمان ہو خواہ زمین، خواہ ان کے درمیان کی چیزیں ہوں۔''

اس میں تمام اعیان واغراض واسباب آگئے۔تو تمام وسائط بھی انہی کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔تو ان کا کتنا بڑا احسان ہوا۔تو یہ بات رب السموات فرمانے سے حاصل ہوئی ربکم میں یہ حاصل نہیں ہوتا کیونکہ اس میں وسائط کا تخلل احسان تام پر نظر نہ جانے دیتا۔اب اس تخلل کا بھی جواب ہوگیا کہ گو یہ وسائط ہیں مگر ہیں سب بے اثر اور مربوب محض۔تو ان کے اسباب مسببات میں بھی وہی مربی ہیں۔

مداومت کی ضرورت

آگے تفریح فرماتے ہیں فاعبده یعنی اس احساس کا مقتضا یہ ہے کہ ان کے آگے غایت تذلل اختیار کرو اور یہاں پر سموات کو جمع لانے اور ارض کو مفرد لانے میں ایک نکتہ ہے۔وہ یہ کہ یہاں پر مناظرین کو ادب سکھایا گیا ہے کہ گو واقع سموات کی طرح ارض بھی متعدد ہیں مگر چونکہ وہ اس جگہ مقصود بالبحث نہیں اور ان کے تعدد میں فلاسفہ کا اختلاف ہے۔اس لیے ہم نے اس کے تعدد کی تصریح نہیں کی کہیں ایسا نہ ہو کہ منکرین جو مقصود بالخطاب ہیں اسی بحث میں الجھنے لگیں اور مقصود رہ جائے اس لیے ہم مقدمات مقصود کے ایسے لاتے ہیں جس میں جھگڑا ہی نہ ہو سکے کیونکہ ارض کے وجود کا تو انکار کر ہی نہیں سکتے۔

پس اس میں مناظرین کو تعلیم ہے کہ مخالف سے کلام کرنے کے وقت ان امور کا لحاظ

رکھا کرو۔ مگر ہم لوگوں نے ان آداب کو بالکل ہی چھوڑ دیا ہے۔ اب تو بحث میں زوائد ایسے لاتے ہیں کہ ان میں اتنا جھگڑا بڑھ جاتا ہے کہ مقصود کا وقت ہی نہیں آنے پاتے۔

بہر حال **فاعبدہ** میں حکم ہے کہ غلام بن جاؤ۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا کیونکہ ہم لوگوں میں ایسے حیلہ جو اور بہانہ باز بھی ہیں کہ صرف **فاعبدہ** سن کر ایک مرتبہ نماز پڑھ لینے ہی کو یہ سمجھ کر بس امتثال امر ہو گیا۔ اس لیے آگے فرماتے ہیں **واصطبر لعبادتہ** (یعنی اپنی غلامی پر مداومت رکھو) پس ایک درجہ غلام بننے کا ہے اور دوسرا درجہ غلامی پر قائم رہنے کا۔ اسی لیے میں نے کہا تھا کہ یہ تتمہ ہے ماسبق کا تاکہ کوئی یہ نہ سمجھ سکے کہ فقط غلام ہونا مقصود نہ تھا بلکہ غلام بننے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے آزاد کر دیا اور میں کہتا ہوں کہ اگر واقع میں بھی آزاد کر دیتے ہیں تو کیا اس کے یہ معنی ہوتے کہ **اعتقہ اللہ من رقہ** یعنی خدا نے غلامی سے آزاد کر دیا۔ یا یہ معنی ہوتے کہ **اعتقہ اللہ من النار** یعنی خدا نے عذاب دوزخ سے آزاد کر دیا۔ جیسے آقا اپنے غلام کو بدل کتابت ادا کر کے اس کو سلاسل واغلال سے آزاد کر دے۔ سو ظاہر ہے کہ یہ معنی تو ہونا محال ہی ہے کہ اس نے اپنی غلامی سے بھی آزاد کر دیا۔ چنانچہ استحالہ اس کا ظاہر مخلوق ومربوب کے لیے مملوک ومحکوم ہونا لازم عقلی ہے۔ جب یہ آزادی محال ہے تو ظاہر ہے کہ غلام رہنا واجب ہے تو اگر **واصطبر** بھی نہ ہوتا تب بھی اس کے معنی کا تحقق واجب ہوتا۔

یہاں سے حریت کی بھی تحقیق معلوم ہو سکتی ہے جس کی تمام دنیا میں ہلچل ہے اور اس کو مذہبی وفطرتی حق ٹھہرایا جاتا ہے۔ تو سمجھ لیجئے کہ وہ حریت کونسی آزادی ہے۔ اس حریت کے معنی غیر حق سے آزاد ہونا ہے یا حق سے آزاد ہونا۔ واقع میں غلامی ہی میں ہمارا فخر ہے نہ آزادی میں۔ چنانچہ جن کو اس غلامی کی حقیقت کا مزہ آ گیا ہے وہ کہتے ہیں:

اسیرش نخواہد رہائی زبند شکارش نجوید خلاص از کمند

(اس کا قیدی قید سے آزادی نہیں چاہتا، اس کا شکار کمند سے رہائی نہیں چاہتا۔)

اس کو ایک مثال سے سمجھئے کہ ایک عاشق جس کو معشوق کبھی منہ بھی نہیں لگاتا تھا۔ اتفاق سے ایک مرتبہ وہ اس کو کہیں راستہ میں مل گیا اور اس نے عاشق کو اس زور سے دبوچا کہ ایک پہلو کی پسلیاں دوسرے پہلو سے مل گئیں اور یہ معلوم ہونے لگا کہ اب دم گھٹ کر

نکل جائے گا۔ اس حالت میں محبوب پوچھتا ہے کہ اگر تکلیف ہوتی ہو تو تم کو چھوڑوں اور کسی دوسرے عاشق کو اسی طرح دبوچوں تو یہ اس وقت یہی کہے گا:

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت　　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کو یہ نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو، دوستوں کا سر سلامت رہے کہ تو اس پر خنجر آزمائی کرے۔)

یعنی اس دبوچنے میں تو اگر مر بھی جائے تو میری عین سعادت ہے۔ اسی طرح جو محبین خدا کی عبادت میں مقید ہیں اور یہ بھی فرض کر لیا جاوے کہ انہیں اس میں تکلیف بھی ہے۔ اگرچہ اسے تو وہی جانتے ہیں کہ تکلیف ہے یا راحت۔ مگر میں علیٰ سبیل التنزل کہتا ہوں کہ فرض کر لیا جائے کہ تکلیف ہی ہے تو وہ تکلیف ایسی ہی ہے جیسے مثال مذکور میں۔ اور یہ بات خدا کی محبت میں پیدا ہوتی ہے محبت پیدا کرو اس سے معلوم ہوگا۔

اب یہ بات کہ محبت کیسے پیدا کریں۔ سو وہ محبت بھی اس غلطی ہی سے پیدا ہوگی اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ اول اہتمام عبادت سے بہ تکلف محب کی صورت بنایئے۔ پھر انشاء اللہ حقیقی محبت بھی پیدا ہو جائے گی۔ بس یہی طریق ہے جو اپنے کرنے سے ہوگا نہ پیر کی توجہ سے ہوگا نہ فقیر کے تعویذ گنڈوں سے ہوگا۔ ہاں یہ خدا کی محبت ہے کہ وہ ہادی برحق تک پہنچا دیں، اس میں ہمارا زیادہ دخل نہیں۔ بہرحال **فاعبده** کے ساتھ **واصطبر لعبادته** کا بھی ارشاد ہے یعنی اس کی عبادت پر دوام کرو اور ہمیشہ کے لیے پابند بن جاؤ۔

اثبات توحید

اب آگے بطور مزید تاکید کے فرماتے ہیں یا یوں کہیے کہ کسی امر کے لیے جس طرح کوئی امر مقتضی ہوتا ہے اسی طرح کبھی کوئی امر مانع بھی ہوتا ہے تو پہلے **رب السموات** میں مقتضی کا ذکر کر چکے اب آگے مانع کو مرتفع فرماتے ہیں کہ

هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا. (تم اس کا کوئی مثل یا ہم نام بھی جانتے ہو۔)

یعنی جب خدا کا مثل یا ہم نام تک تمہارے علم میں نہیں تو اس سے کیوں اعراض کرتے ہو۔ یہ تاکید تو اس طرح ہے کہ اب وہ بے مثل ہے تو غایت اطاعت کا مستحق بھی وہی ہے اور

رفع مانع اس طرح ہے کہ اس کی عبادت کا مانع یہ ہوسکتا تھا کہ دوسرا کوئی ایسا ہی ہوتا تو پھر یہ سوال ہوسکتا تھا کہ دوسرے کی عبادت کیوں نہ کریں۔ اب یہ مانع بھی متحقق نہیں۔

اس میں دوسری تفسیر پر ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ اس کی ہستی ایسی یکتا ہے کہ مسمی میں تو کون شریک ہوتا اسم میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں ہوا۔ چنانچہ آج تک دنیا بھر میں اللہ کے نام نہیں ہوا۔ رحمان تو بعض نے اپنا نام رکھ لیا تھا۔ چنانچہ مسیلمہ کو اس کے معتقد رحمان الیمامہ کہا کرتے تھے مگر اللہ کا نام کسی نے نہیں رکھا۔ اگر کوئی کہے کہ اچھا ہم اب رکھ دیں گے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس وقت اس (**هل تعلم**) کا نزول ہوا ہے اس وقت تو نہیں تھا۔ اب رکھنے سے آیت کا معارضہ لازم نہیں آتا۔ یہاں سے یہ شبہ کا بھی جواب ہوگیا کہ قرآن میں ہے:

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ

''خدا نے کسی کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے''

اخبار میں چھپا تھا کہ امریکہ میں ایک شخص کے دو دل تھے۔ جواب کی تقریر یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ماضی کا صیغہ اختیار کیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وقت تکلم سے زمانہ گزشتہ میں خدا نے ایک سینہ میں دو دل نہیں بنائے اور آئندہ کے متعلق نفی سکوت ہے۔

بہر حال مقصود یہ ہے کہ جب وہ ہستی ایسی یکتا ہے تو پھر اس کی عبادت کے ترک کی کیا وجہ۔ اس مقصود کے لیے ارشاد فرمایا: (**هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا**) اور اس عنوان میں ایک شبہ ہوتا ہے کہ وہ یہ کہ ممکن ہے کہ خدا کا ہم نام ہو مگر ہمیں اس کی خبر نہ ہو تو عدم العلم سے علم العدم تو لازم نہیں آتا اور مقصود موقوف ہے۔ علم العدم پر تو وہ جملہ مقصود کے لیے کافی نہ ہوا۔

جواب یہ ہے کہ یہ عنوان قانونی نہیں ہے۔ یہ محض آپ کی شفقت کے واسطے اختیار کیا گیا ہے کہ بفرض محال اگر کوئی ہمنام ہو بھی تو اے مخاطب جب تجھے اس کی خبر نہیں تو تجھے تو اپنے علم کا پابند ہونا چاہیے تو پھر اعراض عن العبادۃ چہ معنی اگر یہ عنوان نہ اختیار کرتے تو یہاں بھی ایک مناظرہ کا مسئلہ چھڑ جاتا کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ کوئی خدا کا ہم نام نہیں اور اس سے وہی خرابی لازم آتی ہے جوارض کے جمع کے لانے میں مذکور ہوئی کیونکہ یہ مقدمہ مقصد ہے اس کی کاوش سے مقصود کی طرف توجہ نہ رہتی۔ اس لیے صورت مناظرہ کو بچایا ہے اور یہ

کمال بلاغت ہے کہ مقدمہ کو خدشہ سے بھی محفوظ رکھ کر مقصود تک پہنچا دیا۔

بہر حال یہ تو نکات ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے غلامی کی تعلیم دی ہے۔ بس ہمیں غلام بننا چاہیے۔ اب آگے غلامی کی تعریفات رہ گئیں کہ غلام کرتا کیا ہے۔ سو وہ تعریفات گو اس مقام پر مذکور نہیں مگر ہر شخص عقل سے معلوم کر سکتا ہے۔ چنانچہ میں ان کو مختصراً بیان کر کے ختم کرتا ہوں۔

غلام یہ کرتا ہے کہ اپنے آقا پر کامل اعتماد رکھتا ہے۔ اسے اپنا پشت و پناہ سمجھتا ہے۔ آقا اس کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہوتا ہے اور آقا پر اس کے بھروسہ کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ خواہ کیسا ہی قحط ہو اور اس میں اگرچہ آقا بھی فکرمند ہو مگر اسے یہ سمجھ کر مطلق فکر نہیں ہوتی کہ ہمارا آقا موجود ہے اسے خود ہمارا خیال ہے۔ اگر آقا صاحب قدرت ہوتا ہے تو غلام بھی اس کے بھروسہ دلیر ہوتا ہے۔ کسی مخالف سے ڈرتا نہیں اور اس کے قلب میں آقا کی عظمت کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ اس کے احکام بغیر لم اور کیف کے بجالاتا ہے اور اس سے کسی خدمت کا عوض نہیں پوچھتا اور آقا اس میں جو تصرف کرے اس پر ذرا چوں چرا نہیں کرتا، آقا کو کبھی گھر کی صفائی مقصود ہوتی ہے تو غلام کو بھنگی کا لباس پہناتا ہے تو یہ اس میں بھی خوش ہے۔ غرض ہر حال میں اس کا یہ مذہب ہے اور کبھی اپنی بجائے دعوت میں بھیجتا ہے تو اپنا لباس پہناتا ہے تو یہ اس میں بھی خوش ہوتا ہے۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(زندہ رکھیں آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں، میں آپ پر فدا ہوں، دل آپ پر فریفتہ ہے آپ جو کریں میں اس سے راضی ہوں۔)

بس حق تعالیٰ کی غلامی میں ہمارا یہ مذہب ہونا چاہیے۔ اب آپ اس مختصر کو اپنے تمام احوال میں پھیلا لیجئے اور ہر حال میں یہ دیکھ لیجئے کہ ہم مقتضائے غلامی کے خلاف تو نہیں کر رہے ہیں۔

اب میں ختم کر چکا۔ حق تعالیٰ سے علم و عمل اور توفیق غلامی کی دعا کیجئے۔ (آمین یارب العالمین)

آثار العبادۃ

آثار العبادت کے متعلق یہ وعظ ۲۷ ذی الحجہ ۱۳۴۱ھ بروز شنبہ بعد نماز عشاء مدرسہ نظامیہ شبلی گنج حیدر آباد دکن میں کرسی پر بیٹھ کر چار ہزار کے مجمع میں بیان فرمایا جو چار گھنٹے میں ختم ہوا۔ جسے عبدالحلیم اور حاجی محمد یوسف نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمدلله نحمده و نستعينه ونستغفره ونومن به ونتوكل عليه و نعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له ونشهدان لااله الاالله وحده لاشريک له ونشهدان سيدنا ومولانا محمدا عبده ورسوله صلى الله تعالى عليه وعلى اله واصحابه و بارک و سلم.

امابعد فاعوذ بالله من الشيطن الرجيم بسم. الله الرحمن الرحيم.

رَبُّ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَمَابَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا. (سوره مريم آيت ٦٥)

ترجمہ: ''وہ رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور ان سب چیزوں کا جو ان دونوں کے درمیان میں ہیں۔ سوتو اس کی عبادت کیا کر اور اس کی عبادت پر قائم رہ، بھلا تو کسی کو اس کا ہم صفت جانتا ہے۔''

ایک عجیب رحمت

یہ ایک آیت ہے سورہ مریم کی جس کی تلاوت اس کے قبل ایک نہایت مختصر جلسہ میں یہاں کی گئی تھی چونکہ مضمون نہایت ضروری تھا اس لیے اسی کی شرح کو یہاں بھی کافی سمجھا گیا اور اسی کی تلاوت بھی کی گئی اور اس مضمون کا خلاصہ آیت کے سننے ہی سے معلوم ہوگیا ہوگا اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ یہ کس قدر ضروری مضمون ہے اور ضرورت بھی ایسی ویسی معمولی نہیں بلکہ اس کا بڑا شدید درجہ ہے جس کے اعتبار سے اس کو اہم کہہ سکتے ہیں اور جو مقصود ہے آیت سے اس کا مادہ خود آیت میں موجود ہے اس لیے مجھے اس کے تعیین کی ضرورت نہیں اور وہ مادہ کیا ہے وہ عبادت ہے جو **فاعبده** میں مذکور ہے اور اس کا سیاق و

سباق اسی کی تمہید کے لیے ہے یا تاکید کے لیے۔ باقی مقصود صرف فاعبدہ ہے جس میں عبادت کا امر ہے جو عام طور پر اس کے سننے ہی سے مسلمانوں کے ذہنوں میں آ گیا ہوگا۔ یہ دوسری بات کہ کسی کو فاعبدہ (پس اس کی عبادت کر) کا صیغہ اور ترکیب نہ معلوم ہو مگر یہ تو سب ہی کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس میں عبادت کا ذکر ہے اور عبادت گو ایک شرعی اصطلاح ہے مگر خفی نہیں ہے کون مسلمان ایسا ہے جو لفظ عبادت کا استعمال نہ کرتا ہو۔ متعدد موقعوں پر اس کا برابر استعمال کیا جاتا ہے اس لیے آیت کا مفہوم تو سب کے ذہنوں میں متعین ہو گیا ہوگا کہ اس آیت میں عبادت کا امر اور یہی اس کا خلاصہ ہے جب مقصود کی تعیین ہوگئی تو اس کا ضروری ہونا بھی معلوم ہو گیا کیونکہ حق تعالیٰ اس کا امر فرما رہے ہیں۔

مگر غور طلب بات ہے کہ عبادت کا مفہوم تو اس قدر سہل کہ روزمرہ کی بول چال میں آتا ہے اور اس قدر ضروری کہ ہر وقت انسان اس کا مکلّف ہے مگر پھر کیوں اس کی طرف توجہ نہیں اور یہ ایک عجیب رحمت حق ہے کہ جو چیز جتنی زیادہ عام ضرورت کی ہوتی ہے اسی قدر زیادہ سہل ہوتی ہے مگر غافلین کی بے قدری سے یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جو چیز جس قدر سہل ہوتی ہے اسی قدر اس کی وقعت گھٹتی جاتی ہے حالانکہ سہولت واقع میں وقعت گھٹنے کا سبب نہیں بلکہ اور زیادہ توجہ کا سبب ہے کیونکہ سہولت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے طبائع واذہان میں زیادہ مناسبت پیدا کردی گئی ہے اور مناسبت عامہ اسی چیز سے پیدا کی جاتی ہے جو اہم ہو جو چیز جس قدر زیادہ اہم ہے اتنی ہی زیادہ عام ہے۔ یہ ایک قدرتی انتظام ہے اور یہ انتظام بھی عام ہے تکوین کو بھی تشریع کو بھی۔

چنانچہ سب جانتے ہیں کہ انسان کی زندگی کے لیے ہوا کی ہر وقت کس درجہ ضرورت ہے۔ چنانچہ سانس کی آمدورفت ہی پر قوام عیش کا دارومدار ہے۔ چنانچہ اگر سانس بند کردی جائے تو ہلاکت یقینی ہے اور اگر ہوا معدوم کردی جاوے تو سانس بند ہونا یقینی ہے۔ غرض ہوا کی عناصر اربعہ میں ضرورت سب سے اشد ہے مگر باجود اس کے کتنی ارزاں اور کس قدر عام ہے کہ ہر جگہ ہے اور مفت ہے کہ کہیں بھی نہیں بکتی۔ گو اس کے آلات بکتے ہوں مگر وہ آلات ہوا پیدا کرنے کے لیے نہیں ہوتے صرف ساکن ہوا کو حرکت دینے کے لیے ہوتے ہیں۔ مثلاً پنکھا کہ اس کے

ذریعے سے ہوا میں حرکت پیدا کی جاتی ہے جس سے راحت میں زیادتی ہوجاتی ہے مگر نفس راحت پنکھے پر منحصر نہیں وہ محض ہوا سے ہے۔ چنانچہ اگر پنکھا نہ ہوتو یہ اور بات ہے کہ گرمی کی تکلیف ہومگر ہلاکت نہیں ہوسکتی، بخلاف ہوا کے کہ اگر یہ نہ ہوتو انسان ہلاک ہی ہوجاوے۔

بہر حال ہوا چونکہ مدار زندگی ہے اس لیے قدرتی انتظام ہے کہ اس کا ایک کرہ ہے جو جُو میں بھرا ہوا ہے جس کی نہ قیمت نہ تخصیص بلکہ بے حد تعمیم ہے حالانکہ چاہیے تو یہ تھا کہ جس قدر زیادہ ضرورت کی چیز ہو اسی قدر زیادہ مہنگی اور دشوار یاب ہومگر نہیں قدرتی انتظام بالکل اس کے برعکس ہے کہ جو چیز جس قدر زیادہ ضرورت کی ہے اسی قدر زیادہ ارزاں ہے۔ چنانچہ ہوا کی کیفیت آپ نے دیکھ لی۔

پھر ہوا کے بعد پانی کا درجہ ہے۔ سو چونکہ اس کا درجہ ہوا سے کم تھا اس لیے کہیں کہیں کبھی کبھی بکتا بھی ہے۔ پھر دیکھئے سب سے کم کام آنے والی چیز جواہرات اور موتی ہیں۔ چنانچہ ہزاروں آدمیوں نے شاید زندگی بھر بھی جواہرات نہ دیکھے ہوں گے اور نہ استعمال کیے ہوں گے تو کسی کی ضرورت اس پر اٹکی نہیں مگر باوجود اس کے دیکھ لیجئے کس قدر قیمتی ہیں۔

ایمان کی اہمیت

جیسے تکوین میں آپ نے دیکھا کہ ضروری چیزیں ارزاں ہیں اور غیر ضروری گراں یہی انتظام حق تعالیٰ نے تشریع میں بھی رکھا ہے۔ چنانچہ تشریع میں سب سے ضروری اور اہم اور سب سے بڑا ایمان ہے کہ کوئی وقت اور کوئی حالت ایسی نہیں جس میں یہ ساقط ہوجائے اس لیے اس میں اس قدر تعمیم ہے کہ اگر زبان سے نہ ہوسکے تو قلب سے ہو اور ایک دفعہ زبان و قلب سے ہوجانے کے بعد اگر غفلت کی وجہ سے قلب میں دوام استحضار نہ ہوتو مضر نہیں بلکہ ایک دفعہ کا استحضار بھی کافی ہے۔ ہاں شرط یہ ہے اس کی ضد کا استحضار نہ ہو چنانچہ کوئی شخص ایک مرتبہ ایمان کا اعتقاد کر کے سوگیا یا کسی دوسرے شغل میں منہمک ہوگیا تو ظاہر ہے اس وقت اس کو ایمان کا استحضار نہیں کیونکہ قاعدہ ہے "النفس لاتتوجه الی شیئین فی آن واحد عادةً" (نفس ایک وقت میں دو طرف متوجہ نہیں ہوتا) اور عادۃً کی قید اس لیے لگائی کہ نفس کی توجہ آن واحد میں دو چیزوں کی طرف ہونے میں کوئی امتناع عقلی ثابت نہیں ہے

بلکہ عقلاً ایسا ممکن ہے یہ اور بات ہے کہ توجہ تام نہ ہو غیر تام ہو مگر توجہ دو طرف ہو سکتی ہے۔ گو عادۃً ایسا کم ہوتا ہے اس لیے یہ قید بڑھائی تو سو جانے کے بعد یا کسی اور ایسے کام میں مشغول ہو جانے کے بعد جس میں انہماک کی ضرورت ہو کہ اس کو انجام دیتے ہوئے اور کوئی بات ذہن میں نہ رہ سکتی ہو، ایمان سے بجائے استحضار کے ذہول محض ہو جاتا ہے مگر یہ ذہول حکم بالا یمان میں مضر نہیں تو حق تعالیٰ کی کیا رحمت ہے کہ ایمان کے استحضار دوامی کو فرض نہیں کیا ورنہ اگر استحضار دواماً فرض ہوتا تو نہ سونا جائز ہوتا اور نہ کوئی ایسا کام کرنا جائز ہوتا جس میں شدید انہماک ہو اس لیے اس میں اس قدر وسعت کر دی کہ اگر کسی وقت کی کسی عذر کی وجہ سے تصدیق باللسان بھی نہ ہو سکے تو تصدیق بالجنان بھی کافی ہے اور اگر تصدیق بالجنان ایک دفعہ کر کے پھر ذہول ہو گیا تو یہ بھی کافی ہے کہ ضد تصدیق کا یعنی تکذیب کا استحضار نہ ہو بس یہ عدم استحضار ضد ہی استحضار ایمان سمجھا جائے گا حالانکہ ان کی شان عظمت کا تو یہ حق تھا کہ

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی　　　شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

(ایک پلک جھپکنے کی مقدار اس محبوب حقیقی سے غافل نہ ہو، شاید وہ توجہ کریں اور تو آگاہ نہ ہو۔)

کیونکہ جتنے تعلقات یا کمالات موجب یاد داشت ہو سکتے ہیں وہ سب یہاں بدرجہ اتم واکمل موجود ہیں۔ مثلاً انعام واحسان، حسن وجمال، فضل وکمال، علم وغنا، جود وسخا، رحم وعدل وقدرت، قہر وغیرہ یہ تمام اوصاف کمال علیٰ وجہ الکمال حق تعالیٰ میں پائے جاتے ہیں۔ جب تمام اسباب موجب ذکر ان میں موجود ہیں تو عقل اس کو مقتضی ہے کہ ذکر بھی ہر وقت ہونا چاہیے کیونکہ جب کمالات احسانات میں کسی آن انقطاع نہیں تو ذکر وتوجہ میں انقطاع کیوں ہو اس میں بھی کسی آن انقطاع نہ ہونا چاہیے۔

موازنہ عقل وشریعت

یہاں ایک مسئلہ استطراداً بیان کیے دیتا ہوں وہ یہ کہ آج کل ہر بات میں عقل پرستی کا زور ہے۔ ہر معاملہ میں اسی کو فیصلہ کے لیے حکم بنایا جاتا ہے حتیٰ کہ شریعت کے معاملات میں بھی اور پھر عقل بھی کونسی وہ جو دنیا کے معاملات میں بھی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے۔ تعجب ہے اس کو حکم بنایا گیا ہے ایسے عظیم فیصلہ کے واسطے اور تمنا کی جاتی ہے کہ اگر عقل کے موافق

احکام ہوتے تو خوب ہوتا لیکن میں دعوے سے کہتا ہوں کہ بڑی مصیبت ہوتی کیونکہ اگر غور کرکے دیکھا جائے تو عقل ہماری اتنی خیر خواہ نہیں ہے جتنی شریعت خیر خواہ ہے۔ دیکھئے اسی مقام پر عقل کا فتویٰ تو یہ ہے کہ استحضار تصدیق دواماً ضروری ہو۔ ایک ساعت بھی غفلت جائز نہ ہو۔ جیسا ایک بزرگ غلبہ میں کہتے ہیں۔

ہر آں کو غافل از حق یک زمان ست　　　　در آں دم کافر است اما نہاں است

(جو شخص اللہ تعالیٰ سے تھوڑے زمانہ میں بھی غافل ہے اس وقت وہ مؤمن کامل نہیں ہے۔)

یہاں کافر سے کافر اصطلاحی مراد ہے یعنی مومن کامل کے مقابل اور کامل بھی کیسا جو اکملیت کے درجہ پر پہنچا ہوا ہو کیونکہ کمال کے بھی درجات مختلف ہیں ایک درجہ کامل کا ہے اور ایک اکمل کا اور پھر اکملیت کے بھی مختلف درجے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جو حق تعالیٰ کو ہر وقت یاد رکھے وہ مؤمن اکمل ہے اس کے مقابلہ میں جو شخص یاد میں غفلت کرے اسے اضافتاً کافر کہہ دیا ہے اس سے حقیقی و فقہی کافر مراد نہیں۔ غرض غلبہ حال کا جو اقتضاء ہے کہ استحضار دواماً ہو، عقل کا بھی وہی اقتضاء ہے تو اگر شریعت مقدسہ نہ ہوتی اور محض عقل حاکم ہوتی تو وہ سب کو عاصی قرار دیتی۔ شریعت مقدسہ نے یہ رحمت فرمائی کہ آپ کو ذہول کی اجازت دیدی اور عدم تصدیق کو بھی جبکہ تکذیب نہ ہو، تصدیق کا قائم مقام کردیا، اب بتلایئے عقل زیادہ خیر خواہ ہوئی یا شریعت مقدسہ۔

یہ تو ان عقل پرستوں کو خطاب تھا جن پر سائنس کا غلبہ ہے اور عقل کو شرع پر ترجیح دیتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور جماعت ہے جو حقیقت کو شریعت پر ترجیح دیتے ہیں اور اس بات کے مدعی ہیں کہ شریعت اور ہے حقیقت اور ہے۔ میں ان کو بھی بتلانا چاہتا ہوں کہ جس شرع کی وہ جڑیں اکھیڑتے ہیں وہی ان کی خیر خواہ ہے۔ چنانچہ دیکھ لیجئے کہ اگر حقیقت محضہ کو حکم بنایا جاوے تو زندگی تلخ اور زیست وبال اور حرام ہوجاوے۔ مثلاً آپ یہ کہتے ہیں کہ یہ چیز میری ہے اور یہ زید کی۔ اگر حقیقت کے اعتبار سے دیکھئے نہ آپ کی ہے نہ زید کی کیونکہ:

فی الحقیقت مالک ہر شے خداست　　　　ایں امانت چند روزہ نزد ماست

(حقیقت میں مالک ہر شے کے خدا ہیں، یہ امانت چند روز کے لیے ہمارے پاس ہے)

زید و عمر کی طرف محض مجازی نسبت ہے مگر شریعت کے قربان جایئے کہ اس نے اس ملک مجازی کے ساتھ بھی معاملہ حقیقت کا سا کیا ہے اور اس کا بھی پورا اعتبار کیا ہے نہ کسی کی چیز غصب کرنا جائز نہ بے اجازت استعمال کرنا جائز اور اگر حقیقت سے پوچھئے تو ہر چیز کا وہ حال ہوتا ہے جیسے مسجد کے لوٹے اور فرش جن کا کوئی مالک ہی نہیں نہ آپ نہ میں بلکہ ہر شخص کو ان کے استعمال کا حق ہے۔ گو یہ جائز نہ ہو کہ آپ اٹھا کر گھر میں رکھ لیں لیکن استعمال کا حق تو سب کو ہے۔

اسی طرح جو کپڑے آپ نے گٹھڑی میں باندھ کر گھر میں رکھے ہیں ان کا بھی یہی حال ہوتا کہ چونکہ وہ بھی آپ کے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے ہیں اور خدا کی چیز میں ہر شخص کا حق مساوی ہے۔ سو آپ نے جو انہیں باندھ کر گھر میں رکھا ہے اگر حقیقت ہی حکمراں ہوتی تو یہ آپ کا فعل کیسے جائز ہوتا اور اگر پھر بھی ایسے ہی حقیقت پرست ہیں تو کوئی شخص آپ کی اچکن آپ کے بدن پر سے اتارنے لگے کہ اتنے دن آپ پہنے رہے، اب میں پہنوں گا تو آپ اسے منع نہ کیجئے۔ واقعی اگر شریعت نہ ہوتی تو دنیا میں لوٹ اور غارت کا بازار گرم ہو جاتا اور امن وچین رخصت ہو جاتا۔

مولانا رومیؒ نے ایک ایسے ہی حقیقت پرست جبری کی حکایت لکھی ہے کہ وہ کسی کے باغ میں گھس گیا اور جا کے درختوں کے پھل توڑ توڑ کر کھانا شروع کر دیئے۔ مالک کو خبر ہوئی اس نے منع کیا تو آپ کہتے ہیں کہ باغ بھی خدا کا اور درخت بھی خدا کا اور پھل بھی خدا کا اور میں بھی خدا کا۔ غرض آکل بھی خدا کا اور ماکول بھی خدا کا، تو ہے کون منع کرنے والا اور تیرا اس میں ہے ہی کیا مالک تھا حکیم، اس نے نوکر سے ڈنڈا اور رسا منگایا اور باندھ کر مارنا شروع کر دیا، اب تو لگا غل مچانے اس نے کہا کہ ڈنڈا بھی خدا اور رسا بھی خدا کا تو بھی خدا کا میں بھی خدا کا، غرض ضارب بھی خدا کا اور مضروب بھی تو کیوں غل مچاتا ہے۔

گفت توبہ کردم از جبر اے عیار　　　اختیارست اختیارست اختیار

(میں نے جبر سے توبہ کی اختیار ہے اختیار ہے اختیار)

ہوش درست ہو گئے یہیں سے توحید وجودی خالی از شریعت کے اثر کا مسئلہ حل ہوتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

سر پنہاں است اندر زیر بم　　فاش اگر گویم جہاں برہم زنم

(عشاق اپنے کلمات عشقیہ کو اجمالاً کہہ رہے ہیں۔ اگر اس کے راز کو اور حقیقت کو ظاہر اور مفصل کہہ دوں تو عالم تباہ ہو جائے)

اس کی تفسیر میں نے حضرت حاجی صاحب قدس سرہ سے یہ سنی ہے کہ سر پنہاں سے مراد توحید وجودی ہے مگر وہ نہیں جو ملحدین کی ہے بلکہ توحید وجودی حقیقی جو محققین کی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ چونکہ افہام صحیح نہیں ہیں اس لیے میں اسے اگر صاف بیان کر دوں تو اس کو غلط سمجھ کر لوگ عالم میں فساد مچا دیں۔ یہ نہیں کہ توحید وجودی کا مسئلہ مضر ہے بلکہ افہام ٹھیک نہیں ہیں ان میں اس کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اس لیے اندیشہ ہے کہ اس کے اظہار سے ایک طوفان بے تمیزی عالم میں مچ جائے جس کو ابھی اوپر بیان کیا گیا ہے۔ یہی معنی ہیں جہاں برہم زنم کے بطور اسناد الی السبب کے تو یہ شریعت کی رحمت ہے کہ اس نے ملک مجازی کے ساتھ بھی معاملہ ملک کا حقیقی کا سا کیا ہے کہ مثلاً میراث کے ذریعے سے جو چیز کسی کے پاس آوے وہ اس کی ملک ہے یا بیع کے یا ہبہ کے ذریعے سے اس کے پاس آوے وہ بھی اس کی ملک ہے۔

رہے مباحات عامہ وہ کسی کی ملک نہیں مگر قبضہ کرنے کے بعد وہ بھی قابض کی ملک ہیں۔ مثلاً پانی یا خودرو گھاس یا جنگل کا جانور، شکار اور مچھلیاں ان پر جو اول قبضہ کرے اسی کی ملک ہے۔

دیکھئے شریعت کی بدولت کسی قدر انتظام درست ہے۔ اگر یہ نہ ہو تمدن ہی درست نہ ہو، ایک غدر مچ جاوے اور ہر وقت وہ کیفیت رہے جیسے ڈاکہ پڑا کرتا ہے کہ آپ نے مجھ سے چھین لیا اور آپ سے اس نے چھین لیا، غرض ہر وقت جنگ کا سامنا رہتا، اب بتلائیے حقیقت ہم پر زیادہ شفیق ہے یا شریعت مقدسہ۔

خوب سمجھ لیجئے حق تعالیٰ کو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ دنیا میں عقل پرست اور حقیقت پرست دونوں گروہ پیدا ہوں گے اور دونوں کے مقتضا پر عمل کرنے سے یہ تنگی ہو گی۔ اس لیے شریعت کو نازل فرمایا جس نے ہر قسم کی تنگی کو دور کر دیا۔ اسی احسان کا اعلان فرماتے ہیں۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ اور وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ

''اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ آسانی کرنا منظور ہے اور تمہارے ساتھ دشواری منظور

نہیں،'' ''اورتم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی''

کتنے بڑے دعویٰ کے لفظ ہیں۔ حضرت یہ دعویٰ آسان نہیں ہے کیونکہ ہر جگہ ہر طبیعت کے لوگ موجود ہیں اور ہر زمانے میں ہوتے آئے ہیں۔ اگر اس دعویٰ میں کچھ بھی خامی ہوتی تو اس شد ومد سے تاکید کے ساتھ نہ بیان فرماتے۔

دین میں تنگی کی حقیقت

شاید اس مقام پر کسی کو شبہ ہو کہ ہم تو دین میں تنگی کا کھلا مشاہدہ کرتے ہیں کیونکہ جو شخص شریعت پر عمل کرتا ہے اس کے ہر کام میں روڑے اٹکتے ہیں ہم اپنے معاملات کے لیے چند مسائل پوچھنے گئے تھے تو مولانا نے جو جواب دیئے کہ فلاں کام جائز ہے اور فلاں ناجائز تو ان میں زیادہ جواب یہی ملا تھا کہ ناجائز ہے۔

چنانچہ ہم قرض لیتے ہیں مگر سود کے بغیر نہیں ملتا اور بغیر قرض کے کام نہیں چلتا۔ شریعت سود کو حرام بتلاتی ہے اب اس موقع پر عقل پرست تو یہ کہے گا کہ دین میں سخت حرج ہے بلکہ آج کل تو عقل پرستوں کا اجماع ہے کہ ساری خرابی شریعت ہی کی بدولت ہے۔

چنانچہ لکھنؤ کا ایک قصہ یاد آیا۔ ایک صاحب میرے پاس روزانہ آتے تھے۔ وہ ایک روز ذرا دیر میں آئے، میں نے تاخیر کا سبب پوچھا، تو کہا کہ ایک جلسہ کی شرکت کی وجہ سے دیر ہوگئی جس میں مسلمانوں کے اسباب تنزل پر غور کیا جارہا تھا، میں نے پوچھا: آخر کیا طے ہوا۔ انہوں نے کہا آخر یہ طے ہوا تھا کہ (نعوذ باللہ، نعوذ باللہ)! مسلمانوں کے تنزل کا سبب اسلام ہے۔ وجہ یہ کہ ہم ہر جگہ دیکھتے ہیں کہ اسلام کی وجہ سے ہر کام میں رکاوٹ ہے چنانچہ جس نوکری کے فرائض بیان کر کے مسئلہ پوچھتے ہیں تو فتویٰ عدم جواز کا ملتا ہے، تجارت کے طریقوں کے متعلق پوچھنے پر کسی کو قمار بتایا جاتا ہے کسی کو ربوا جب ہر قدم پر لایجوز کا فتویٰ ہے تو اب بجز اس کے کہ بے کار بیٹھ رہیں اور کیا کریں۔

اب شبہ یہ ہے کہ جب ہر قدم پر تنگی اور حرج ہے تو پھر قرآن میں حرج کی نفی کیسے کی گئی۔ اب اس شبہ کا جواب سنئے کہ خدا تعالیٰ کو اس زمانہ کا بھی علم تھا اور باوجود اس کے پھر جو فرماتے ہیں۔

وَمَا جَعَلَ عَلَيۡكُمۡ فِي الدِّيۡنِ مِنۡ حَرَجٍ
''اورتم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی''

سوکوئی تو بات ہے جس پر اتنا بڑا دعویٰ کیا گیا ہے ورنہ نزول قرآن کے زمانہ سے آج تک کسی نے اس نفی پر کیوں نہ اعتراض کیا حالانکہ ہر زمانہ میں مخالفین بکثرت رہے ہیں پھر نفی بھی معمولی نہیں نکرہ ہے، تحت میں نفی کے جس کے معنی یہ ہیں کہ ذرا سی اور چھوٹی سے چھوٹی تنگی بھی نہیں ہے، سواس کی حقیقت یہ ہے کہ آپ کو جو یہ پہاڑ کے برابر تنگی نظر آتی ہے یہ تنگی واقع میں آپ میں ہے شریعت میں نہیں۔ جیسا مولانا فرماتے ہیں:

حملہ برخودے کنی اے سادہ مرد   ہمچوآں شیرے کہ برخود حملہ کرد

(اے احمق اپنے ہی اوپر حملہ کرتا ہے جیسا کہ اس شیر نے اپنے اوپر حملہ کیا تھا)

حقیقت میں تنگی ادھر سے ہے ادھر سے نہیں ہے۔ معترض نے تنگی کا محل نہیں دیکھا، اپنی تنگی کو شریعت کی تنگی سمجھ گیا۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے ہماری بستی میں ایک واقعہ ہوا کہ ایک عورت بچہ کو پاخانہ پھرا رہی تھی، چاند دیکھنے کا وقت تھا، سب چاند دیکھنے لگے، وہ بھی چیتھڑے سے پاخانہ صاف کر کے چاند دیکھنے کھڑی ہوئی تو اتفاق سے کچھ پاخانہ اس کی انگلی میں لگا رہ گیا تھا، عورتوں کی عادت کے موافق ناک میں انگلی رکھ لی تو انگلی سے بو آئی کہنے لگی اے ہے آج سڑا ہوا چاند کیوں نکلا، اب تمام عقلاء سمجھتے ہیں کہ چاند سڑا ہوا نہ تھا، اس کی انگلی سڑی ہوئی تھی اور یہ اس کی حماقت تھی جو اسے اپنی انگلی کی گندگی کی خبر نہ ہوئی اور چاند کو سڑا ہوا کہنے لگی۔

اسی طرح تنگی ہمارے اندر ہے شریعت میں نہیں ہے۔ اس کی ایک اور مثال لیجئے۔ ایک طبیب حاذق کے پاس ایک مریض گیا، کسی کوردہ کا رہنے والا جہاں نہ دوا ملتی ہے نہ پرہیزی غذا ملتی ہے، تخم کاسنی، اسطوخدوس بھی دستیاب نہیں ہوتا۔ اب حکیم صاحب نے اسے نسخہ لکھ دیا اس نے کہا حکیم صاحب کیا کھائیں؟

حکیم............''بکری کا گوشت''

مریض............''یہ تو ہمارے یہاں نہیں ملتا''

حکیم............اچھا ترئی کا سالن

مریض............"یہ بھی نہیں ملتا"

حکیم............"اچھا کدو یا لک کا ساگ"

مریض............"اجی یہ کچھ بھی نہیں ملتا"

حکیم............"آخر کیا ملتا ہے؟"

مریض............"کریلے ملتے ہیں"

حکیم............"دیکھو کریلے نہ کھانا"

مریض............"بینگن ملتے ہیں"

حکیم............"بینگن بھی نہ کھانا"

"اس نے کہا ارے صاحب اس کے سوا کچھ ہوتا ہی نہیں"

اب یہ مریض صاحب بہت تنگ دل ہو کے اور ناک منہ چڑھا کے آئے اور لوگوں سے کہنے لگے کہ طب یونانی بہت تنگ ہے، حکیم صاحب سے جو کچھ بھی پوچھو اس کے کھانے کو منع کرتے ہیں۔ اہل عقل سمجھ سکتے ہیں کہ حکیم صاحب کا مطب تنگ ہے یا اس دیہاتی کا گاؤں تنگ ہے۔

اب سمجھئے کہ شریعت کی تنگی تو جب ثابت ہوتی کہ سب لوگ مل کر شریعت پر عمل کرتے، پھر بھی نہ ہوسکتا۔ بتلائیے یہ تنگی ہے کہ وسعت ہے۔ یقیناً اس کو کوئی تنگی نہیں کہہ سکتا۔

مثلاً بیع ہے کہ بعت واشتریت سے ہو جاتی ہے بلکہ اس کے کہے بغیر بھی ہو جاتی ہے جیسے بیع تعاطی کہتے ہیں تنگی تو جب ہوتی کہ ایسا ہوتا کہ جب تک ایک ہزار مرتبہ بائع بعت اور مشتری اشتریت نہ کہے اس وقت تک بیع نہ ہوگی ریل پر بیٹھے ہیں سودا لیا ہے اور اس وظیفہ کے پورا ہونے تک ریل ٹھہرتی نہیں۔ تب واقعی مشکل ہوتی اب کیا مشکل ہے اور جس جگہ آپ کو اشکال نظر آتا ہے اس کا منشا یہ ہے کہ آپ تنہا شریعت کے موافق معاملہ کرنا چاہتے ہیں اور دوسرا شخص اس کی پروا نہیں کرتا تو اس طرح تو ہر قانون تنگ ہو جائے گا۔ آپ کوئی قانون شریعت کا ایسا بتلا دیجئے کہ سب مل کر اس پر عمل کرنا چاہیں اور نہ ہو سکے اس لیے نہایت قوت کے ساتھ فرماتے ہیں۔ (ماجعل علیکم فی الدین من حرج)" اور

تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی''

بہر حال اتنا بڑا دعویٰ عقل پرستی کے زمانہ میں اگر واقعی دین میں سہولت نہ ہوتی تو ہو نہیں سکتا تھا۔ بحمد اللہ شبہ کا جواب ہو گیا۔

مقام عقل

اس سے پہلے یہ بیان ہو رہا تھا کہ شریعت کی سہولت و رعایت اس قدر ہے کہ عدم اعتقاد ضد کو قائم مقام کر دیا۔ اعتقاد توحید کا یہ تو شریعت کی شفقت ہے اور عقل کا فتویٰ یہ ہے کہ ہم اعتقاد توحید کا دواماً استحضار رکھیں تو زیادہ خیر خواہ کون ہوا، عقل کے ان ہر آثار کو دیکھ کر تو مولانا فرماتے ہیں:

آزمودم عقل دور اندیش را   بعدازاں دیوانہ سازم خویش را

(عقل دور اندیش کو بار بار آزمالیا جب اس سے کام نہ چلا تو اپنے آپ کو دیوانہ بنالیا)

اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ عقل کو پھینک ہی دیں کہ محض بے کار ہے، نہیں وہ بہت کارآمد ہے مگر ایک حد کے اندر۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص پہاڑ پر چڑھنا چاہتا ہے اور اس پر اتنی چھوٹی اور ایسی اونچی سیڑھیاں ہیں کہ ان پر گھوڑا نہیں چڑھ سکتا، ہاں دامن کوہ تک تو پہنچ سکتا ہے، کیا پہاڑ پر کارآمد نہ ہونے سے گھوڑا بالکل بیکار ہو گیا ہرگز نہیں کیونکہ دامن کوہ تک بھی بہت مسافت ہے جس سے گھوڑے سے مدد ملتی ہے۔

بس یہی حال عقل کا ہے کہ توحید و رسالت اور اصول اسلام کے سمجھنے میں بہت کارآمد ہے، اصول کو تو عقل سے سمجھ لیجئے اس کے بعد اس کو بالکل چھوڑ دیجئے ورنہ گھوڑے کی طرح گرے گی اور خواہ مخواہ آپ کی بھی ہڈیاں پسلیاں توڑے گی۔ جب خدا کا خدا ہونا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا برحق اور مطاع ہونا عقل سے ثابت ہو گیا، بس اب اسے چھوڑ دیجئے اور آگے عشق و محبت سے کام لیجئے اور اس طرح سے اپنے آپ کو سپرد کر دیجئے۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو   جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں تو آپ پر فدا ہیں، جان آپ پر فریفتہ ہے جو کچھ کریں آپ سے راضی ہیں)

یعنی جب توحید و رسالت کو سمجھ لیا تو اس کے بعد اب ضرورت اس کی ہے کہ جو ارشاد ہوا آمنا و صدقنا نہ یہ کہ خواہ مخواہ اس میں شبہات پیدا کریں کہ صاحب پل صراط پر چلنا عقل کے خلاف ہے، عذاب قبر عقل کے خلاف ہے جب مردہ میں جان ہے نہیں تو عذاب کس پر اور اگر کہو جسم پر عذاب ہے تو ہم جسم کو بھی فنا کر دیں گے اور ہم نہ کریں تو چار دن میں وہ خود ہی فنا ہو جاوے گا پھر عذاب کسے ہوگا۔

جیسے کسی افیونی کی ناک پر مکھی بار بار بیٹھتی تھی اور وہ بار بار اڑا دیتا تھا۔ آخر کار جھنجھلا کر ناک ہی کاٹ ڈالی کہ لے اب اڈا ہی نہیں رہا اب کہاں بیٹھے گی۔ اسی طرح جب وہاں قبر میں وہی مردہ ہی گل سڑ کے ختم ہو گیا تو اب عذاب کس پر ہوگا۔

عالم بالقانون

صاحبو! ہمارے پاس جواب ہر شبہ کا ہے۔ بحمد اللہ علماء جواب سے قاصر نہیں ہیں مگر یہ غور کرو کہ آیا ان شبہات کا جواب دینا علماء کا فرض منصبی ہے بھی یا نہیں۔ اس کو بھی ایک مثال سے سمجھئے۔ آپ کا ایک مقدمہ ہے کسی جج کے اجلاس پر اس نے آپ کا مقدمہ ہرا دیا اور دفعہ کا حوالہ بھی دیدیا، اب آپ جج کے پاس جاویں کہ صاحب فیصلہ تو قانون کے موافق ہے مگر خود قانون میں سقم عقلی ہے اس لیے مجھے اس میں کلام ہے تو جج کیا کرے گا وہ کہے گا کہ ہم اور کچھ نہیں جانتے بس جو قانون ہے ہم اس کے پابند ہیں اور تمام عقلاء جج کے اس جواب کو معقول اور صحیح کہیں گے اور اس دفعہ پر جو اس شخص کے اعتراضات ہیں اس کا جواب دینا جج کے ذمہ نہ سمجھیں گے۔ تو تعجب کی بات ہے کہ جج کا یہ کہنا تو کافی سمجھا جائے گا اور علماء کا یہ کہنا کہ حکم الٰہی ہے یہی کافی نہ سمجھا جاوے کیونکہ جس طرح حاکم عالم بالقانون ہے، واضع قانون نہیں ہے اسی طرح علماء بھی عالم بالقانون ہیں، واضع قانون نہیں ہیں ان کے ذمے قانون کا بتلا دینا ہے، لم اور وجہ کا بتلانا نہیں ہے۔ گو وہ احکام کی لمیات کو بکثرت جانتے ہیں لیکن جاننے کے بعد بتلا دینا ان پر ضروری نہیں بلکہ سوال عن العلل کے جواب میں ان کا یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ۔۔۔ ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(راز کا ظاہر کرنا مصلحت نہیں ورنہ علماء کی مجلس میں کوئی خبر ایسی نہیں کہ نہ ہو)

پس علماء پر ضروری نہیں ہے اسرار کا ظاہر کرنا بلکہ صوفیاء کرام جو زیادہ غیور ہیں وہ تو اظہار کی ممانعت کرتے ہیں اور یہاں تک کہتے ہیں:

بامدعی مگوئید اسرار عشق و مستی بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

(مدعی اسرار عشق و مستی مت بیان کر اس کو تکبر اور خود پرستی میں مرنے دو)

دیکھئے صوفیاء تو اظہار اسرار سے بالکل منع ہی کرتے ہیں اور علماء بچارے تو کبھی کبھی بتا بھی دیتے ہیں مگر حیرت ہے کہ صوفیاء پر کچھ اعتراض نہیں کیا جاتا جو کچھ کم بختی ہے علماء ہی کی ہے کہ ان کی تو نماز بھی ناجائز اور صوفیاء کی گالیاں بھی جائز۔ بس جی اب تو علماء بھی صوفیاء بنیں تو کچھ کام چلے گا مگر خدا کے لیے دُکاندار صوفی نہ بنیں بلکہ سچ مچ کے صوفی بنیں تو جب علماء کا یہ اظہار علل فرض منصبی نہیں تو وہ کیوں ظاہر کریں بلکہ صرف ضابطہ کا جواب دے کر بات کو ختم کردیں۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ کے درس میں ایک طالب علم تھے۔ غبی انہوں نے پوچھا کہ حضرت ایام حیض کے روزہ کی تو قضا ہے اور نماز کی قضا نہیں ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے، فرمایا: کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر اس کے خلاف کرو گے تو اتنی جوتیاں لگیں گی کہ سر میں ایک بال نہ رہے گا۔ مولانا حکیم تھے اسی باب میں ان کا ایک شعر ہے:

الوعظ ینفع لو بالعلم والحکم والسیف ابلغ وعاظ علی القمم

(نصیحت اگر علم و حکمت کے ساتھ ہو تو نفع پہنچاتی ہے اور تلوار سروں پر پڑنی نصیحت گروں میں سب سے بلیغ نصیحت ہے)

تو ضرورت ضابطہ کے جواب کی بھی ہے تاکہ لوگوں کو اپنی غلطی پر تنبہ ہوتا رہے۔ بہر حال ایمان لانے کے بعد ضرورت نہیں لم و کیف کی بلکہ وہ مسلک رکھنا چاہیے جیسا عارف گنجوری فرماتے ہیں:

زباں تازہ کردن باقرار تو نینگیختن علت از کار تو

(آپ کی ربوبیت کا اقرار کرنا آپ کے کاموں میں علتیں نکالنے کو مانع ہے)

مسلک عاشقاں

غور سے سننے کی بات ہے کہ اگر کسی کو تعشق ہو جاوے کسی مرد کے ساتھ یا کسی بڑے مرد کے ساتھ یعنی امرد کے ساتھ کہ جس میں افعل التفضیل کا ہمزہ بھی لگا ہوا ہے یا کسی

بازاری عورت کے ساتھ اور وہ کہتی ہو کہ میں اس وقت ملوں گی کہ تم پہلے کرتہ ٹوپی اتار کے سات دفعہ بازار کے بیچ سے ننگے طواف کرتے ہوئے نکل جاؤ، اگر یہ واقعی محبّ ہے تو کبھی یہ نہیں پوچھے گا کہ مجھے اس طرح رسوا کرانے میں تیرا کیا نفع؟ بلکہ کہے گا بہت اچھا اور پاجامہ بھی اتارنے کو تیار ہو جائے گا اور اگر کوئی ملامت بھی کرے گا تو اسے یہ جواب دے گا۔

نہ سازد عشق را کنج سلامت خوشا رسوائی کوئے ملامت

(عشق کا گوشہ سلامتی کے موافق نہیں، آپ کے مناسب کوچہ ملامت کی رسوائی بہت اچھی ہے)

اسی طرح وہ اگر پچاس چپت بھی لگاوے تو برا نہ مانے گا بلکہ اگر قتل بھی کرے تو راضی رہے گا اور یہ کہے گا:

ناخوش تو خوش بود برجان من دل فدائے یار دل رنجان من

(تیرا ناخوش ہونا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے ایسے محبوب پر دل قربان ہے جو میرے دل کو رنجیدہ کرنے والا ہے)

تنویر میں ابن عطاءؒ نے ایک حکایت لکھی ہے کہ کوئی شخص کسی پر عاشق ہوا تھا۔ اتفاق سے وہ پکڑا گیا اور اس کو سو کوڑوں کی سزا دی گئی، جب کوڑے مارے جا رہے تھے تو وہ بالکل خاموش تھا، یہاں تک کہ ننانوے کوڑے لگ چکے جب سواں کوڑا مارا گیا تو آہ کی، کسی نے پوچھا یہ کیا کہ ننانوے کا تو تحمل کر لیا اور ایک کا تحمل نہ کر سکا، کہا ننانوے تک محبوب دیکھ رہا تھا اور جب سواں لگا تو وہ چلا گیا تھا۔

بجرم عشق توام میکشند وغوغائیست تو نیز برسر بام آ کہ خوش تماشائیست

(تیری محبت کے جرم میں قتل کرتے ہیں اور اسی کا شوروغل ہے تو بھی بام پر آجا اچھا تماشائی تو ہی ہے)

محبوب کے سامنے تکلیف میں بھی مزہ ہے یہی وہ مراقبہ ہے جس کی تعلیم حق تعالیٰ نے اپنے محبوب (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دی ہے۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا

یعنی آپ صبر کیجئے (مخالفین کی باتوں پر) اور یہ صبر اس لیے آسان ہو سکتا ہے کہ آپ

ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں جو کچھ ہو رہا ہے ہمارے دیکھتے ہوئے ہو رہا ہے تو کشتن کی تکلیف تو ہے مگر تو نیز بر سر بام آ کی راحت بھی ہے جس سے یہ کلفت سہل ہو جاتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ معشوق کی امرونہی بھی ناگوار نہیں ہوتی۔ اس کی مار پیٹ بھی ناگوار نہیں ہوتی۔ یہ جو احکام تشریعیہ ہیں یہ تو محبوب کے اوامر ونواہی ہیں اور احکام تکوینیہ محبوب کی مار پیٹ ہے کہ آج بیمار ہیں آج زخم ہے آج دنبل ہے اور جو ان کا واقعی عاشق ہے اس کا ان دونوں میں یہ مسلک ہے۔

خوشاوقت شوریدگان غمش | کہ گرریش بینندو گر مرہمش
گدایان از بادشاہی نفور | بامیدش اندر گدائی صبور
دمادم شراب الم درکشند | وگر تلخ بینند دم درکشند

تو بس بعد تحقیق اصول کے کہ وہ عقلی ہیں ایسی چیز کی ضرورت ہے جو آگے پہاڑ پر چڑھانے والی ہو تو معلوم ہو گیا کہ عقل کی عملداری کہاں تک ہے اور عشق کی کہاں تک اب لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جہاں ہوائی جہاز کی ضرورت ہے وہاں گھوڑے کو لے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ گھوڑے کو ماریں گے اور اپنی بھی ہڈی توڑیں گے، اسی لیے تو کہتے ہیں

آزمودم عقل دور اندیش را | بعد ازاں دیوانہ سازم خویش را

اب تو آپ کو عقل کی حد معلوم ہو گئی کہ یہ بے کار تو نہیں ہے مگر ایک خاص حد تک کارآمد ہو سکتی ہے۔ اس سے آگے نہیں اب یہ بھی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ عقل شریعت سے زیادہ شفیق نہیں جیسا کہ اوپر اس کی دلیل بھی مذکور ہوئی ہے۔

رحمت شریعت

پھر مع شے زائد ذکر کرتا ہوں کہ عقل کا مقتضاء تو یہ تھا کہ کسی وقت بھی ذکر و توجہ سے غافل نہ ہو مگر شریعت مقدسہ نے عدم توجہ کی بھی اجازت دے دی ہے پھر اجازت بھی مطلق نہیں بلکہ اس کا بھی بڑا درجہ کیونکہ اجازت کے دو مرتبے ہیں، ایک تو یہ کہ یوں کہا جائے کہ یہ حالت بے توجہی معصیت نہیں، گو ناقص ہے سو شریعت نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس پر رنج کرنے سے بھی ممانعت فرمادی ہے حالانکہ یہ شخص اکمل کے مقابلہ میں ناقص ہے مگر خود

اسے ناقص سمجھنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ یہ اجازت کا دوسرا مرتبہ ہے کہ معصیت کی نفی کر کے اپنے کو ناقص سمجھنے سے بھی منع کر دیا۔

چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ حضرت حنظلہ کی ملاقات ہوئی۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے انہوں نے پوچھا اے حنظلہ کیسے ہو؟ جواب دیا نافق حنظلۃ، حنظلہ (یعنی میں) تو منافق ہوگیا، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا یہ کیسے؟ فرمایا کہ جب ہم حاضر ہوتے ہیں دربار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تو یہ حالت ہوتی ہے کہ گویا جنت و دوزخ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور جب وہاں سے آتے ہیں بال بچوں میں مشغول ہو کر سب بھول جاتے ہیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اگر یہ نفاق ہے تو پھر میں بھی منافق ہوں کیونکہ میں بھی اس میں مبتلا ہوں، آؤ چلو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا علاج پوچھیں، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور سب حال بیان کیا، آپؐ نے فرمایا یاد رکھو:

لو کنتم کما تکونون عندی لصافحتکم الملئکة ولکن یاحنظلة ساعة ساعة (مسند امام احمد بن حنبل ۴:۱۷۸)

''یعنی اگر ایسا نہ ہوتا بلکہ تمہاری ہر وقت وہی حالت رہتی جو میرے سامنے ہوتی ہے، تم سے ملائکہ مصافحہ کیا کرتے مگر اے حنظلہ! ایک ساعت کیسی اور ایک ساعت کیسی''

اس حدیث کے سمجھنے میں علماء قشر پریشان ہوگئے، اول تو ان کو نافق حنظلہ پر اشکال ہوا کہ محض تفاوت حالت کو انہوں نے نفاق کیسے کہہ دیا، پھر حضورؐ کا حضرت حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تسلی کرنا ہے مگر سوال یہ ہے کہ اس جواب سے تسلی کیسے ہوگئی۔

اول تو یہ سمجھئے کہ یہاں نفاق سے حقیقی نفاق مراد نہیں کیونکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ و حضرت حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ضرور یہ بات جانتے تھے کہ نفاق نام ہے، **ابطان الکفر و اظهار الایمان** کا اور جب ہم جانتے ہیں تو کیا وہ نہیں جانتے تھے اور ظاہر ہے کہ اس حالت میں ابطان الکفر نہ تھا مگر مجازاً اس کو نفاق کہہ دیا اور اس کا منشاء یہ تھا کہ حالت حضورؐ میں ایمان کامل معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس وقت عالم غیب رائے العین ہوتا ہے تو تصدیق بھی کامل ہوتی ہے اور حالت غیبت میں تصدیق کی یہ شان نہیں ہوتی، صرف

عقلی تصدیق ہوتی ہے جو علم کا درجہ ہے، معائنہ ومشاہدہ کی سی کیفیت نہیں ہوتی اس تفاوت کی وجہ سے وہ یہ سمجھے کہ ہمارا ایمان حضورؐ کے سامنے اور طرح کا ہوتا ہے پیچھے اور طرح کا ہوتا ہے۔ گویا کبھی کامل ہے کبھی ناقص ہے اور مطلوب ایمان کامل ہے تو جب اس میں نقص ہوگا وہ نفاق کے مشابہ ہوگا۔ گو حقیقی نفاق نہ ہو یہ تو نافق حنظلہؓ کی تفسیر ہوئی۔

اب سوال یہ ہے کہ حضرت حنظلہؓ نے اپنی حالت ادنیٰ درجہ کی سمجھ کر اس پر تاسف کا اظہار کیا تھا تو جواب میں کوئی تسلی کا مضمون ہونا چاہیے اور جو جواب حدیث میں مذکور ہے بظاہر وہ تسلی کے لیے کافی نہیں کیونکہ ساعۃً ساعۃً ہی پر تو انہیں تاسف ہے۔ پھر یہ جواب وجہ تسلی کیوں کر ہوسکتا ہے۔

میرے استاد حضرت مولانا یعقوب صاحبؒ نے اس کی حقیقت بیان فرمائی تھی کہ حکمت حق اس کی مقتضی ہے کہ ملکوت سے ناسوت میں انسان کو آباد کیا جائے اور اگر ہر وقت وہی حالت رہتی جو حضورؐ کے سامنے رہتی ہے تو انسان ناسوت میں نہ رہتا بلکہ ملکوت میں پہنچا دیا جاتا۔

اس کی تفصیل کا یہ وقت نہیں ہے اجمالاً یہ بتائے دیتا ہوں کہ باہم دو شخصوں میں مصافحہ جب ہوتا ہے کہ عادتاً ایک عالم میں ہوں اور جس عالم میں ہم ہیں یہ محسوس ہے۔ اگر یہ مصافحہ یہاں ہو تو ملائکہ جب تک محسوس نہ ہوں گے عادتاً مصافحہ نہیں ہوگا۔ اگر کوئی کہے کہ محسوس ہونے کی کیا ضرورت ہے یوں ہی مصافحہ کرتے تو سمجھو کہ محسوس کے معنی مرئی یا مبصر کے نہیں ہیں، لمس بھی تو حواس میں سے ہے تو مصافحہ کم از کم بغیر لمس کے نہیں ہوتا جو لوگ آنکھ سے معذور ہیں وہ بھی حواس کے حصہ دار ہیں۔ گو لامسہ ہی سہی۔ بہرحال اس عالم میں مصافحہ ہونا عادتاً موقوف اس پر ہے کہ ملائکہ محسوس ہوں اور عادتاً ملائکہ صرف ملکوت میں محسوس ہوتے ہیں، ناسوت میں محسوس نہیں ہوتے تو وہ مصافحہ اس طرح ہوتا کہ ہم ملکوت میں منتقل کر دیئے جاتے۔

تو اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ اگر ایک ہی حالت پر قائم رہتے تو تم ملکوت میں منتقل کر دیئے جاتے اور ایسا ہوتا تو تمہارے ناسوت میں رہنے کی جو حکمت تھی اس کا ابطال لازم آتا تو اس غیبت پر تاسف وقلق کرنا گویا اس ابطال حکمت کی تمنا کرنا ہے جو کہ غیر محمود ہے تو اس ذہول وغیبت کی اجازت کا بڑا درجہ اس سے ثابت

ہو گیا تو کتنی بڑی رحمت ہے، شریعت کی بمقابلہ عقل کے اور صوفیاء نے اس حکمت کو اس تقریر سے بھی زیادہ واضح و سہل عنوان سے ظاہر کر دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

از دست ہجر یار شکایت نمی کنم گر نیست غیبتے نہ دہد لذتے حضور

(محبوب کی جدائی کی شکایت نہیں، اگر جدائی نہ ہوتی تو وصل میں لطف و لذت نہ ہوتی)

یعنی جس طرح بدون پیاس کے پانی کی قدر نہیں اسی طرح غیبت ہی کی بدولت حضور کی لذت ہے۔ گو حضورؓ کی حالت فی نفسہ واکمل ہے مگر حضورؓ کی روح و لذت خود غیبت پر موقوف ہے اس لیے اس عارض پر نظر کر کے حالت اکمل اعلیٰ یہی ہے کہ کبھی غیبت ہو کبھی حضور ہو۔

اسی واسطے حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے اپنے ایک خادم کو جواب دیا تھا جنہوں نے یہ عرض کیا تھا کہ حضرت اب ذکر میں ویسا مزہ نہیں آتا جیسے پہلے آیا کرتا تھا، آپ نے فرمایا میاں! تم کو خبر نہیں پرانی جورو ماں ہو جاتی ہے۔

میں کہتا ہوں پرانی سے مراد بڑھیا نہیں بلکہ جوان بھی رہے تب بھی ویسا ذوق وشوق باقی نہیں رہتا اور اگر کچھ دنوں کے لیے جدائی ہو جاوے مثلاً کہیں سفر سے آویں تو اس وقت پھر ایک خاص کیفیت شوق کی عود کر آتی ہے۔ سو یہ حکمت ہے اس انقطاع توجہ میں کہ غیبت ہی پر حضور کی لذت موقوف ہے۔

کمال انسان

اس کے علاوہ دوسری حکمت یہ ہے کہ انسان کا کمال یہ ہے کہ باوجود عدم تقاضا کے حق کی عبادت کرتا رہے۔ تیسرے یہ کہ حضورؓ کے وقت معاصی کا تقاضا بھی نہیں ہوتا اس لیے اگر اس وقت معاصی سے بچے تو کیا کمال ہے وہ تو فرشتے بھی کرتے ہیں۔ انسان کا کمال یہی ہے کہ تقاضائے معصیت کے ساتھ معاصی سے بچے، پس اگر حضور دائم ہوتا تو انسان گویا فرشتہ بن جاتا انسان نہ رہتا اور جب آپ نہ رہے تو آپ کا کمال ہی کیا ہوا۔

غرض یہ کہ اگر یہ حالت غیبت نہ ہوتی تو آپ بھی فرشتہ بن جاتے۔ حکمت مقتضی تھی انسان کو بسانے کی اس لیے اس حکمت حق کا تقاضا دوسرے انسانوں کے بنانے کا ہوتا جو انسان بن کر کام کرتے ہیں تو آپ ہی کیوں نہ انسان رہیں اور خدا کو خبر کہ اس میں کیا کیا

حکمتیں ہوں گی۔ یہ تو وہ ہیں جو ہم جیسے ضعفاء بھی سمجھ لیتے ہیں ورنہ حکمتیں تو غیر متناہی ہیں۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیجئے کہ اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کیلئے سمندر روشنائی ہوتو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہوجائے اگرچہ اس سمندر کی مثل دوسرا سمندر مدد کے لیے ہم لے آئیں''

سوحق تعالیٰ کے کلمات واسرار وحکم کا کون احاطہ کرسکتا ہے۔ اگر تمام دنیا کے موجودات کاتب ہوں اور تمام روئے زمین کے سمندر روشنائی بن جائیں تو سب ختم ہوجائیں گے مگر وہ ختم نہ ہوں۔ مگر اہل اللہ کی عادت ہے کہ جو کچھ وہ سمجھتے ہیں اس میں سے کچھ ہم لوگوں کی قناعت کے لیے بیان بھی کردیتے ہیں۔ اب سمجھ میں آ گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب کیسا تسلی بخش جواب ہے کہ یہی حالت قرین حکمت ہے کہ کبھی کچھ ہو کبھی کچھ ہو۔

مقام ذہول واستحضار

اسی واسطے جو عارف ہیں وہ ایسے ذہول کو مضر نہیں سمجھتے مگر ان کا ذہول ہمارا سا ذہول نہیں کہ ہمیں بالکل کچھ پتہ ہی نہیں رہتا ان کا ذہول بس اتنا ہوتا ہے کہ استحضار کا غلبہ نہیں رہتا۔ جیسے عاشق کو معشوق کا ذہول کلی تو کبھی نہیں ہوتا مگر پھر بھی کبھی بے کلی ہوتی ہے اور کبھی کچھ سکون بھی ہوجاتا ہے۔ بس وہی عارف کا ذہول ہے اور اسی کو وہ فراق کہتے ہیں۔ ان میں جو محقق نہیں ہیں وہ اس حالت پر متاسف ہوتے ہیں اور محقق کو گو طبعاً قلق ہوتا ہے مگر وہ اسے عقلاً دفع کرتا ہے۔ چنانچہ اسی غلبہ استحضار کا نام اصطلاح میں وصل اور ذہول کا نام فراق ہونے کی بنا پر عارف محقق کہنے لگتا ہے۔

فراق ووصل چہ باشد رضائے دوست طلب　　　　که حیف باشد ازو غیر او تمنائے

(کیسا وصل اور کس کا فراق رضائے محبوب کی تمنا ہونی چاہیے، اسے اس کی تمنا کے بغیر افسوس ہوگا)

یہ فراق حقیقی نہیں بلکہ فراق صوری مراد ہے یعنی جب غلبہ استحضار کا نہ ہو بس وہ ان کی

اصطلاح میں فراق ہے اور جس فراق کی علی الاطلاق حافظ نے مذمت کی ہے وہ اصطلاحی فراق نہیں ہے بلکہ وہ لغوی فراق ہے۔ یعنی ذہول محض چنانچہ کہتے ہیں۔

شنیدہ ام سخن خوش کہ پیر کنعاں گفت فراق یار نہ آں میکند کہ بتواں گفت

حدیث ہول قیامت کہ گفت واعظ شہر کنایتے است کہ روزگار ہجراں گفت

تو دونوں قولوں میں اب تعارض نہیں رہا۔ ابتدائے عشق میں یہی اصطلاحی فراق قلق میں ڈالتا ہے اور انتہائے عشق میں رضا کا غلبہ تسلی دیتا ہے۔ تفصیل یہ ہے کہ عشق کے مقتضیات میں سے یہ بھی ہے کہ جو محبوب پسند کرے اسے یہ بھی پسند کرے۔ مثلاً محبوب نے دو روپے دیئے کہ آم خرید لاؤ تو جو محقق تھا وہ تو چلا گیا اور جو ہوس ناک تھا وہ وہیں مچل گیا کہ ہائے میں دولت دیدار کو چھوڑ کر بازار کیسے جاؤں۔ یہ تو بعد ہے وصل کے بعد فراق کو کیسے گوارا کروں اور محقق اس وقت یوں کہتا ہے۔

ارید وصالہ ویرید ھجری فاترک ما ارید لما یرید

میں پاس رہنا چاہتا ہوں اور محبوب دور رکھنا چاہتا ہے۔ میں اپنی مراد کو اس کی مراد پر فدا کرتا ہوں اور جو اس کی تجویز ہے وہی مناسب ہے۔ اسی کا ترجمہ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے:

میل من سوئے وصال و میل او سوئے فراق ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست

تو محقق عاشق اس فراق ہی کو ترجیح دے گا گو اس میں بے کلی ہی ہو ہوا کرے کیونکہ محبوب تو خوش ہے اور محققین نے اسی اصل پر جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تفسیر کی ہے کہ:

انہ لیغان علی قلبی وانی استغفر اللّٰہ فی کل یوم سبعین مرۃ[1]

''یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ میرے قلب پر بھی ایک پردہ سا پڑتا ہے جس کے لیے میں استغفار کرتا ہوں دن میں سو مرتبہ یا ستر مرتبہ۔''

علماء تو یہاں گھبرا گئے کہ حضورؐ کے قلب پر پردہ کیسا مگر صوفیاء نے اس کی شرح کی ہے۔ اس غین یا غیم کی پوری حقیقت تو وہی بیان کرسکتا ہے جس کو وہ مقام حاصل ہو مگر

---

[1] اتحاف السادة المتقین الزبیدی ۸:۵۱۷

"مالا یدرک کله لایترک کله" (اگر کُل نہ پا سکے تو کُل بھی ترک نہ کردے)
کچھ کچھ نمونہ کے طور پر بیان کرنے میں مضائقہ بھی نہیں۔

صوفیاء کہتے ہیں کہ آپ کا جو درجہ علیا ہے اس کے اعتبار سے بھی ایک مرتبہ ذکر کا ایک مرتبہ ذہول کا تھا، گو واقع میں وہ ذہول نہ تھا کیونکہ آپ کی شان تو یہ تھی (کان یذکر اللہ فی کل احیانہ) آپؐ ہر وقت ذکر کرتے تھے مگر ذکر بھی دو قسم کا ہے ایک ذکر بواسطہ ایک ذکر بلا واسطہ جیسے محبوب کا مشاہدہ کہ ایک بواسطہ ایک بلا واسطہ۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک مشاہدہ تو یہ ہے کہ چہرہ پر نگاہ اٹھا کر دیکھ لیا اور ایک یہ ہے کہ محبوب کہتا ہے کہ اس وقت ہماری طرف نگاہ مت کرو۔ آئینہ میں ہمارا جو چہرہ نظر آتا ہے اسے دیکھو۔ ہے تو یہ بھی مشاہدہ ہی، مگر دونوں درجوں میں بڑا فرق ہے اور عاشق کو طبعاً یہ واسطہ گراں ہوتا ہے۔ گو عقلاً گراں نہ ہو مگر طبیعت یہ چاہتی ہے کہ بلا واسطہ مشاہدہ ہو۔ وہ تو وسائط کے ارتفاع کی تمنا میں یہ کہتے ہیں:

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن نہ دہم — گوش را نیز حدیث تو شنیدن نہ دہم

(مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کا چہرہ انور نہ دیکھنے دوں اور کانوں کو بھی ان کی باتیں نہ سننے دوں)

سو گو عاشق طبعاً اس واسطہ کو بھی گراں سمجھتا ہے مگر حکم ہے محبوب کا کہ ہمیں اس وقت آئینہ ہی میں دیکھو اس لیے عقلاً اس سے راضی ہوتا ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔

دوسرا مقدمہ یہ کہ اہل اللہ نے ثابت کر دیا ہے کہ مخلوقات مرأۃ جمال الٰہی ہیں کہ ان میں غور کرنے سے حق تعالیٰ کے وجود اور اس کے کمالات کا پتہ چلتا ہے۔ پھر مراتب میں بھی مختلف درجے ہیں عوام کے لیے اور ہیں خواص کے لیے اور چنانچہ ارشاد ہے:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ

"بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات دن کے آنے میں عقل مندوں کے لیے دلائل ہیں"

اس میں اولی الالباب کی قید سے فرق مراتب کا بھی پتہ چلتا ہے اور اسی آیت سے

مخلوقات کا مرأۃ ہونا بھی معلوم ہوتا ہے۔ جب یہ دونوں مقدمے سمجھ میں آ گئے تو اب یہ سمجھئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مامور ہیں اصلاح امت کے اور یہ کام ہو نہیں سکتا تاوقتیکہ شفقت نہ ہو اور شفقت کے لیے ضروری ہے۔ توجہ الی المخلوق گو اس وقت بھی توجہ الی الخالق ہوتی تھی مگر تھوڑی سی توجہ مخلوق کی طرف بھی کرنا پڑتی تھی اور اس وقت مشاہدہ حق بواسطہ مرأۃ کے ہوتا تھا۔ اسی توجہ الی المخلوق کو آپ غین یا غیم (پردہ) سے تعبیر فرماتے ہیں اور چونکہ اس پر آپ کو طبعاً قلق ہوتا تھا اس لیے استغفار کی کثرت فرماتے تھے تاکہ اس کا تدارک ہو جاوے تو جس کیفیت کا نام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درجہ کے اعتبار سے ذہول رکھا تھا وہ توجہ الی الحق بواسطہ تھی، یہ حالت اگر نقص کی ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نہ تجویز ہوتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ بھی کمال ہے اور انسان کے لیے اس حالت کا ہونا حکمت ہے۔

بہرحال دواماً استحضار ذکر تو کیا واجب ہوتا جو کہ فی ذاتہ مستحب ہی ہے۔ استحضار تصدیق بھی دواماً واجب نہیں جو کہ فی ذاتہ واجب ہے۔ چنانچہ اسی لیے شریعت نے اس حالت میں فتویٰ دیا ہے کہ مومن جاگنے میں بھی مومن ہے اور سونے میں بھی مومن اور حقیقت اور عقل کا فتویٰ یہ تھا کہ جاگنے میں مومن ہے اور سونے میں کافر۔

اب دیکھی آپ نے شریعت کی رحمت (ہائے لوگ ایسی شریعت سے بھاگتے ہیں) اور آپ کو تحقیق ہو گیا کہ مثل تکوینات کے تشریعات میں بھی قدرت نے اس کی رعایت کی ہے کہ جو چیز جس قدر بھی زیادہ ضروری اور نافع ہوتی ہے اسی قدر اس میں سہولت فرما دیتے ہیں اور سہولت کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ عبادت کی حقیقت سب کے ذہن میں ہے جیسا مفصلاً بالکل شروع تمہید میں بیان کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ عبادت کوئی بڑا ہی امر مہم ہے پس فاعبدہ (پس اس کی عبادت کر) میں اس بڑی مہم چیز کا ذکر ہے اور اصل مقصود یہی حصہ ہے باقی سیاق وسباق اسی کی تاکید وتمہید کے واسطے ہیں اور اسی آیت کے متعلق ہیں۔

اس سے پہلے بھی ایک مختصر جلسہ میں بیان کر چکا ہوں جس سے آج کی تقریر گو ایک گونہ تکریر تو ہوئی مگر ہر تکریر موجب ملال نہیں ہے۔ دیکھئے دونوں ہاتھوں میں سے ایک پر اگر فالج گر جاتا ہے تو علاج کیوں کرتے ہیں، اگر محبوب کی دو آنکھوں میں سے ایک آنکھ

پھوٹ گئی ہوتو کیوں کہتے ہو کہ حسن کم ہوگیا تو اسی طرح تکرار تلاوت یا بیان بھی موجب ملال نہ ہونا چاہیے پھر تکرار بھی من کل الوجوہ نہیں کیونکہ گو آیت تو وہی تلاوت کی ہے مگر آج کے بیان میں جدت ضرور ہے۔ چنانچہ اس بیان سابق میں عبادت کی حقیقت اجمالاً بیان کی تھی مگر تفریعات رہ گئی تھیں۔ اس لیے آج پھر وہی آیت اختیار کی تاکہ جو مضمون اس کے متعلق رہ گیا ہے اسے بھی بیان کردیا جائے، سوعرض کرتا ہوں۔

حقیقت عبدیت

ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ جل علیٰ شانہ تربیت کرنے والے ہیں آسمانوں کے اور زمین کے اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے جب یہ شان ہے کہ وہ سب کے مربی و محسن ہیں اور ومابینھما میں وہ تمام چیزیں آ گئیں جن سے تمہیں بھی منافع پہنچ رہے ہیں تو وہ مربی ہیں تمہارے بواسطہ بھی اور بلاواسطہ بھی کیونکہ جو اسباب تمہارے حدوث و بقاء کے ہیں وہ ان کے بھی مربی ہیں تو وہ اعلیٰ درجہ کے محسن ہوئے تو اس شان کا مقتضا یہ ہے کہ ان کا حق ادا کرو یعنی فاعبدہ (پس اس کی عبادت کر) عبادت کے معنی ہیں عبد شدن مگر بعضے محاورات جو کثیر الاستعمال ہے ان کے مفصل معنی کا ذہن سے اکثر ذہول ہوجاتا ہے اور وہ لفظ بھی خود اپنے معنی کا قائم مقام ہوجاتا ہے۔ لفظ عبادت بھی ایسا ہی ہے کہ اس کے مفصل معنی عبد شدن ہیں۔ مگر بجائے اس معنی کے اب خود لفظ عبادت ہی ذہن میں آکر رہ جاتا ہے۔ کلام لفظی کے درجہ میں بھی دونوں درجوں میں صرف عبادت ہی آتا ہے اور اس کا دوسرا عنوان اتنا مستعمل نہیں اس لیے وہ ذہن میں نہیں آتا یعنی عبد شدن غلام ہوجانا اسی عارض کے سبب حقیقت عبادت کی بہت لوگوں پر مخفی ہوگئی تو اب فاعبدہ کے معنی یہ ہوئے کہ غلام ہوجاؤ یہ حاصل ہوا اس آیت کا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ امر اس درجہ تو ضروری ہے کہ حق تعالیٰ نہایت تمہید و تاکید کے ساتھ اس کا حکم فرما رہے ہیں مگر ہماری حالت کیا ہے کہ اس کی ذرا قدر نہیں اور قدر اس لیے نہیں کہ توجہ نہیں۔ شاید کوئی کہے کہ ہم تو عبادت کو ضروری سمجھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں محض اعتقاد و تلفظ کافی نہیں کیونکہ جو غایت ہے ضروری سمجھنے کی جب وہ حاصل نہ ہوئی تو کیوں کر

معلوم ہو کہ آپ نے اس کو ضروری سمجھا۔ ''مسلم ہے کہ الشئی اذا خلاعن فائدة لغا'' (جب کوئی شے اپنے فائدہ سے خالی سمجھی جاتی ہے تو وہ منتفی ومعدوم ہو جاتی ہے۔'' ضروری سمجھنا تو ایسا ہوتا ہے جس طرح تم دوا کو ضروری اور مفید سمجھتے ہو اور استعمال کرتے ہو اور قاعدہ کے موافق نسخہ بناتے ہو، حکیم کے کہنے پر چلتے ہو، پرہیز بھی کرتے ہو اور جب اس کی ضرورت نہیں سمجھتے تو استعمال بھی نہیں کرتے۔ اسی طرح عبادت ہے کہ جو ضروری سمجھے گا وہ اس کو پابندی سے ادا کرے گا اور قاعدہ کے موافق ادا کرے گا اور جو اس کے ساتھ پرہیز ہیں ان کو بھی لازم سمجھے گا۔ اگر ایسا نہ کیا تو وہ ضروری سمجھنا معتبر نہ ہوا۔

اس پر شاید آپ اپنے دل میں خوش ہوں گے کہ ہم تو پانچوں وقت نماز پڑھتے ہیں۔ اس لیے ہم تو عبادت کرتے ہیں ہاں لغتہً بے شک آپ پر مصلّی صادق آ گیا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ جو لوگ صرف عید بقرعید کی نماز پڑھ لیتے ہیں لغت کے اعتبار سے تو مصلّی وہ بھی ہیں مگر انہیں آپ بھی نمازی نہ کہیں گے کیونکہ محاورہ میں نمازی اسی کو کہتے ہیں جو ہمیشہ نماز پڑھتے ہوں۔

اگر کسی نے ایک دن باپ کی اطاعت کی اور حاکم کی تعظیم کی اور ایک دن نہ کی تو کیا اسے مؤدب ومہذب کہیں گے۔ لغتہً تو کہیں گے مگر محاورہ میں نہیں کہیں گے کیونکہ اس محاورہ میں لغت سے کچھ اضافہ ہے ادب کرنے والا محاورہ میں اس کو نہیں کہیں گے جو ایک دن کرے اور ایک دن نہ کرے، اسی طرح قرآن وحدیث بھی محاورات میں ہے تو شرعاً عابد اسی کو کہیں گے جو دوام کرے۔

غلامی پر دیکھئے اگر کوئی غلام ایسا کرے کہ کھانا تو آقا کے سامنے لا کر رکھ دے اور پانی مانگنے کے وقت انکار کر دے کہ پانی میں نہیں لاؤں گا۔ اسے آپ فرمانبردار کہیں گے یا سرکش؟ یقیناً سرکش کہیں گے۔ اسی طرح ننانوے حکم آقا کے مانے اور صرف ایک نہ مانے تب بھی وہ سرکش ہی کہلائے گا۔ چہ جائیکہ ہماری طرح ایک مانے ننانوے نہ مانے۔

اگر کوئی کہے کہ ہم تو خدا کے احکام مانتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ آپ تمام اوامر ونواہی میں اپنی حالت جانچ لیں کہ کل کو مانتے ہیں یا نہیں، جانچنے کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ واقع میں تم اپنے کو محض زبان سے غلام بناتے ہو مگر حقیقت بھی غلامی کی نہیں سمجھتے۔ بس وہی

حالت ہے کہ ہجے تو کریں گے تے بے زبر تب اور بے تے زبر بت اور رواں کہیں گے بطخ، کہ ہجے میں تو ہم غلام بنتے ہیں اور جب غلامی کرنے کا وقت آتا ہے تو بطخ بن جاتے ہیں۔ ارے بھائی یہ تو تبت ہوا تھا بطخ کہاں سے ہوا۔

یادرکھو! غلام تو وہی ہے کہ جو بغیر اگر مگر کے ہر امر میں آقا کی اطاعت کرے، اس معیار کو سمجھ کر دیکھئے کیا آپ واقعی غلام ہیں تو بہت سے تو ایسے نکلیں گے جو عبادت کرتے ہی نہیں اور بعضے کرتے آپ تو پابندی سے نہیں کرتے ہیں اور جو پابندی سے کرتے ہیں وہ قاعدہ سے نہیں کرتے ہیں۔ یونہی بے ڈھنگی ادا کرتے ہیں اور بعضے وہ ہیں جو احکام الٰہیہ میں شبہات نکالتے ہیں۔ صاحبو! کیا اسی کا نام غلامی ہے؟ ہرگز نہیں! یہ تو غلامی کا دعویٰ ہے، حقیقت غلامی نہیں اور ضرورت اس حقیقت کی ہے۔

بااثر طبقے

گواس کا اہتمام فرداً فرداً ہر شخص پر فرض ہے مگر اس کے اہتمام و انتظام میں جن جماعتوں کا زیادہ دخل ہے وہ دو گروہ ہیں جو مخلوق کو خدا کا حقیقی غلام بنا کے اطاعت کرا سکتے ہیں۔ اس میں ایک تو علماء کا گروہ ہے ان کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ اگر یہ خدانخواستہ گمراہ ہوں تو سارے عالم کو گمراہ کر سکتے ہیں۔ "ذلة العالم ذلة العالم" (عالم کی لغزش جہاں کی لغزش ہے) اور دوسرا امراء کا ہے علماء کا عوام پر دینی اثر ہے اور امراء کا دنیوی علماء کا دینی اثر تو یہ ہے کہ ان کی اعتقادی وجاہت ہے اور ان کے احکام کی قلب میں قدر و وقعت ہے، وہ عوام کو وعظ و نصیحت کرتے ہیں تو اس سے کچھ آخرت کے اجر کی طمع اور کچھ وہاں کے عذاب کا خوف پیدا ہوتا ہے اور امراء کے احکام کا اثر ان کے دنیوی اقتدار کے خوف یا طمع سے ہوتا ہے۔ بہرحال دونوں جگہ خوف بھی ہے اور طمع بھی۔ ایک جگہ آخرت کا ایک جگہ دنیا کا بس یہ دو گروہ تھے، خود غلام بن کر اپنا نمونہ پیش کرتے تو پھر عوام بھی ان۔ کے ساتھ ہوتی۔

اب تو ایک تیسرا فرقہ خواہ مخواہ پیدا ہو گیا ہے اور وہ فرقہ کون ہے، وہ صوفیاء کرام کا گروہ ہے حالانکہ یہ کوئی نیا گروہ نہیں تھا بلکہ حقیقت میں یہ وہی علماء ہیں۔ مگر علماء نے ایک کام چھوڑ دیا اس وجہ سے یہ تیسرا گروہ پیدا ہو گیا، وہ کام کیا ہے مجاہدہ و ریاضت کیونکہ ذرا یہ کام ہے مشکل کہ

کھانا چھوڑ دو، لوگوں سے ملوجلو نہیں، اچھا کپڑا مت پہنو، ٹھنڈا پانی مت پیو اور چند روز سے صوفیت کی یہی تعریف رہ گئی ہے تو جن لوگوں نے اس کو اختیار کرلیا وہ صوفی کہلانے لگے، خواہ ان کو علم ہو نہ عمل تو اس طرح سے یہ تیسرا فرقہ ہوگیا۔ حالانکہ صوفیت واقع میں اور ہی چیز ہے جسے ان باتوں سے کچھ بھی تعلق نہیں اور یہ بھی تصوف کی تعریف کچھ دنوں پہلے تک تھی اور اب تو اس سے بھی سہل صوفیت نکلی ہے کہ کپڑے رنگ لیے، بال بڑھا لیے، تسبیح پڑھ لی، تھوڑا سا ذکر کرلیا، بس لوگ معتقد ہوگئے اور وہ گناہ بھی کریں تو بھی بزرگی نہیں ڈھلتی، بس ہیں یہ بڑے مزہ میں۔ نہ بولے تو چپ شاہ اور اگر بولے اور بے ڈھنگی بولے تو صاحب رموز ہیں اور اگر ڈھنگ کی بولے تو عارف ہیں۔ خرابی تو بے چارے مولوی کی ہے کہ کہیں ایک بھی مسئلہ غلط کہا تو قلعی کھل گئی اور صوفی صاحب کیسی ہی غلطیاں کریں گے مگر وہ صاحب رموز ہیں۔ پھر اوپر سے معتقدین کا ہر بات میں حضور حضور کرنا وطرہ بردستار ہوگیا۔ یہ انہیں اور زیادہ خراب کرتے ہیں۔

جیسے ایک امیر تھے وہ جھوٹ بہت بولا کرتے تھے اور ان کا ایک مصاحب ان کے جھوٹ کی توجیہ کیا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ انھوں نے بیان کیا کہ میں شکار کو گیا، ایک ہرن پر جو گولی چلائی تو سم کو توڑ کے ماتھے کو پھوڑ کر نکل گئی۔ لوگ اس پر ہنسنے لگے کہ کہاں سم کہاں ماتھا، مصاحب نے فوراً توجیہ کی کہ ہاں حضور اس وقت وہ کھجلا رہا تھا۔

امراء کے یہاں تو رات دن ایسے خوشامدی مصاحب رہتے ہیں مگر مشائخ کے یہاں بھی اب ایسے ہی معتقد رہ گئے ہیں کہ خواہ مخواہ رات دن ان کی کرامتوں کا تذکرہ کیا کرتے ہیں اور ان کے عیب کو ہنر بتلاتے ہیں۔

تو بہر حال علماء میں سے ایک شاخ نکل کر فقراء بن گئی مگر واقع میں صوفیاء علماء ہی ہیں اور جو جاہل ہیں وہ صوفی ہیں نہیں اور احادیث میں جن علماء کی فضیلت آئی ہے وہ واقع میں وہی علماء ہیں جو صوفی بھی ہیں۔ خود جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

ان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله الا وھی القلب[1]

---

[1] الصحیح للبخاری ۱: ۲۰

''یعنی جسم انسانی میں ایک پارہ گوشت ہے۔ جب وہ درست ہوتا ہے تو سارا بدن درست رہتا ہے اور جب وہ بگڑتا ہے تو سارا بدن بگڑ جاتا ہے، خبردار رہو وہ قلب ہے۔''

تو جس نے اپنے قلب کی اصلاح نہ کی ہو اور اس لیے اس کی تمام عملی حالت تباہ ہو وہ کیونکر عالم مورد فضائل وارده کہلانے کا مستحق ہوسکتا ہے۔ بہرحال علماء ہی ہیں جو صوفیاء ہیں اور جن علماء کے فضائل نصوص میں وارد ہیں وہی علماء ہیں جو درویش بھی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:

اِنَّمَا یَخۡشَى اللّٰهَ مِنۡ عِبَادِهِ الۡعُلَمٰٓؤُا

''یعنی خوف خشیت خدا سے صرف علماء ہی کو حاصل ہے۔''

اس سے خود معلوم ہوتا ہے کہ صوفیہ مراد ہیں کیونکہ خشیت کاملہ ان ہی میں ہے۔ اسی طرح علماء کو ورثۃ الانبیاء کہا گیا ہے۔ اس بناء پر کہ انبیاء نے نہ دینار چھوڑا نہ درہم نہ زراعت نہ تجارت، انہوں نے صرف علم چھوڑا تو جن کے پاس یہ علم موروث انبیاء ہوگا وہی لقب عالم کا مستحق ہوگا اور یہ ظاہر ہے کہ انبیاء کا علم، یہ علم رسمی نہ تھا، علم حقیقی و قلبی تھا جس کی شان یہ ہے۔

علم چوں برتن زنی مارے شود   علم چوں بردل زنی یارے شود

دوسرے محقق کہتے ہیں:

علم رسمی سربسر قیل است و قال   نے ازو کیفیتے حاصل نہ حال

علم چہ بود آن کہ راہ بنمایدت   زنگ گمراہی زدل برباید ت

ایں ہوس ہا ازسرت بیروں کند   خوف وخشیت در دلت افزون کند

اور ہماری حالت کیا ہے اسے بھی بیان کرتے ہیں:

تو ندانی جز یجوز ولا یجوز   خود ندانی کہ تو حوری یا عجوز

ایّها القوم الذی فی المدرسہ   کلما حصلتموہ وسوسہ

علم نبود غیر علم عاشقی   مابقی تلبیس ابلیس شقی

تو حضرت وہ علم جو انبیاء نے چھوڑا وہ یہ ہے جس کے خواص آپ نے سنے اور جو اس علم کے حامل ہیں وہ ہیں نائب رسول اور ورثۃ الانبیاء تو حقیقت میں درویش بھی علماء ہوئے، غرض دو طبقے ایسے ثابت ہوئے جن کی اصلاح سب سے مقدم ہے کیونکہ ان کا اثر

سب سے زیادہ ہے اس لیے اگر یہ گمراہ ہوں گے تو سب کو گمراہ کریں گے۔ سو افسوس یہ ہے کہ عبادت کے متعلق یہ طبقے بھی غلطیوں میں مبتلا ہیں تو عوام کیوں کر غلطیوں سے بچتے۔

عالم و جاہل کی غلطیاں

چنانچہ منجملہ ان کی غلطیوں کے ایک یہ بھی ہے کہ وہ عبادت کے معنی صحیح نہیں سمجھتے۔ عوام کی تو غلطی یہ تھی کہ وہ عبادت کے معنی غلط سمجھتے ہیں کہ صرف نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ خاص اعمال میں منحصر سمجھتے ہی اس لیے دوسرے اعمال میں کوتاہی کرنا عجیب نہیں کہ وہ ان کو عبادت ہی نہیں سمجھتے مگر لکھے پڑھوں کی غلطی نہایت سخت ہے کہ وہ عبادت کے معنی بھی جانتے ہیں کہ اطاعت مطلقہ ہیں۔ پھر اس میں غلطی کرتے ہیں کہ اس کے محل سے ناواقف ہیں یا بے پروا ہیں اور یہی مراد ہے۔ صحیح معنے نہ سمجھنے سے یعنی معنی تو سمجھے مگر صحیح نہیں سمجھے۔ اس لیے ضرورت سمجھی گئی کہ اس جلسہ میں جس میں زیادہ تر طلبہ موجود ہیں عرض کروں کہ اطاعت مطلقہ کے محل کیا کیا ہیں۔

سو سنئے کہ سب سے اول محل تو عقائد ہیں یعنی جس طرح شریعت نے عقائد سکھلائے ہیں اسی کے موافق اعتقاد رکھیں۔

دوسرا محل اعمال دیانات ہیں۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ انہیں بھی شریعت کے موافق پابندی سے صحیح طور پر ادا کریں۔

تیسرا محل معاملات ہیں، بیع وشراء وغیرہ کہ ان کو بھی احکام شرع کے مطابق کریں اور یہ معلوم کریں کہ کون سی بیع فاسد ہے اور کون سی باطل، کون سا معاملہ صحیح ہے اور کون سا فاسد، کس معاملہ میں ربوا لازم آتا ہے اور کس میں قمار یہ سب شریعت سے معلوم کر کے اسی کے موافق کیا کریں۔

چوتھا محل معاشرت ہے کہ اٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا، ملنا جلنا اس کو معلوم کریں کہ اس کے شریعت میں کیا آداب ہیں۔

پانچواں محل اخلاق ہیں، اخلاق کے یہ معنی نہیں کہ نرمی سے بول لیے یا تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے یا ادب سے سلام کر لیا، یہ تو آثار ہیں اخلاق کے خود اخلاق نہیں۔ اخلاق یہ

ہیں کہ تواضع، صبر، شکر، زہدوقناعت، شوق ورضا وغیرہ یہ ہیں۔ اخلاق یعنی اعمال باطنی، ان کے مقابلہ میں ان کے اضداد ہیں، کبر، بے صبری، ناشکری، طمع وحرص، حسد، بغض، کینہ یہ اخلاق ذمیمہ ہیں۔

تو اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ عبادت کیا ہے۔ عبادت ان تمام شعبوں کی تکمیل کا نام ہے۔ اب اس میں غلطی کی دو قسمیں ہیں، ایک تو یہ کہ بعضے یہی نہیں جانتے کہ ان پانچ میں اصل کیا ہے اسی لیے بعض لوگ تصحیح عقائد کی فکر نہیں کرتے، گو کسی قدر اعمال کا اہتمام کرتے ہیں اور بعضے یہ تو جانتے ہیں کہ ان میں اصل عقیدہ ہے۔ یہی راس العبادات اور اساس العبادات ہے کہ بغیر اس کے کچھ بھی صحیح نہیں مگر ان سے یہ غلطی ہوتی ہے کہ جب اسے بڑا سمجھ لیا تو ان کے نفس نے یہ کہا کہ بڑے کے سامنے چھوٹے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ننانوے کے ہوتے ہوئے ایک کی کمی چنداں مضر نہیں تو ان کی نظر سے اعمال کا اہتمام جاتا رہا۔ چنانچہ بہت لوگ جو عقائد حق رکھنے والے اور ان کے اعمال بھی درست ہیں وہ اگر کسی کے عقائد درست دیکھتے ہیں گو اعمال درست نہ ہوں تو تسامح کرتے ہیں اور اس سے نفرت نہیں کرتے یعنی اتنی نفرت بھی نہیں کرتے جتنی شرعاً کرنی چاہیے بلکہ تعریف کے طور پر کہہ دیتے ہیں کہ فلاں کے عقائد صحیح ہونے کی وجہ سے اس کی کسی بات سے نفرت نہیں۔

مثلاً کوئی نماز نہ پڑھے تو اس سے انہیں نفرت نہیں حالانکہ **من ترک الصلوٰۃ متعمدا فقد کفر** میں **فقد کفر** نفرت ہی تو دلیل ہے کہ شریعت نے تارک الصلوٰۃ کو مثل کافر کے اسی لیے تو فرمایا تاکہ مصلین ترک صلوٰۃ نہ کریں اور تارک صلوٰۃ نمازی بن جاوے اور تارک صلوٰۃ کو بھی اپنی حالت سے نفرت ہو اور نماز شروع کردے۔ مصلّی اس سے نفرت ظاہر کرے، تعلق قطع کرے اور خلا ملا نہ رکھے مگر ساتھ ہی اپنے کو مقدس اور اس کو حقیر نہ سمجھے، یہاں تو قدم قدم پر لغزشیں اور رہزن موجود ہیں یا تو بے نمازی سے نفرت نہ کریں گے یا کریں گے تو اپنے کو مقدس سمجھیں گے جو کہ کبر ہے جو کہ ترک نماز سے بھی قبیح ہے۔

چنانچہ ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ بے نمازی کو سلام کرنا کیسا ہے؟ اور سوال کیا تحقیر کے لہجہ میں مجھے لب ولہجہ سے معلوم ہوگیا کہ منشاء اس سوال کا کبر ہے۔ اگر مجھ سے پوچھتے

کہ اس کی دلیل کیا تو یہ میں نہیں بتا سکتا تھا اس کی ایسی مثال ہے جیسے نبض دیکھ کر طبیب کہتا ہے کہ تم کو پرانا بخار ہے۔ اب تم عطائی ہو وہ تمہیں کیوں کر سمجھائے۔ اسی طرح میں دلیل نہیں بتا سکتا لیکن ہاں حق تعالیٰ کی یہ ایک نعمت ہے کہ مجھے لب ولہجہ سے اکثر قلبی حالت کا پتہ چل جاتا ہے اور یہ فیض ہے محبت سنت کا۔ حق تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں فرماتے ہیں۔

وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ

''اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو ان کے طرز کلام سے ضرور پہچان لیں گے۔''

جب سنت سے ایسا فہم حاصل ہو جاتا ہے اس کا کوئی قاعدہ کلیہ بیان نہیں ہو سکتا۔ اگر اس کے لیے کوئی دلیل بیان کی جائے گی تو اس کی وہ گت ہوگی جیسے ایک طبیب کے صاحبزادے تھے، اناڑی ان کے باپ کسی مریض کو دیکھنے گئے، انہیں بھی ساتھ لے گئے، جا کے مریض کی نبض دیکھی تو نبض سے اتنا معلوم ہوا کہ کوئی بد پرہیزی ہوئی ہے۔ اتفاق سے وہاں چارپائی کے نیچے نارنگی کے چھلکے بھی پڑے تھے تو طبیب نے کا یاں کہا معلوم ہوتا ہے تم نے نارنگی کھائی ہے، واقعی مریض نے نارنگی کھائی تھی۔ اب صاحبزادے نے ایک قاعدہ کلیہ اخذ کیا کہ جو چیز چارپائی کے نیچے پڑی ہو وہ ضرور مریض کی کھائی ہوئی ہوتی ہے۔ اتفاق سے وہ طبیب مر گئے، اب صاحبزادے ان کے قائم مقام ہوئے، ایک مریض کو دیکھنے گئے، اس کی چارپائی کے نیچے نمدہ پڑا تھا، کہنے لگے معلوم ہوتا ہے آپ نے نمدہ کھایا ہے، اس نے کہا واہ صاحب! کہیں نمدہ بھی کھایا جاتا ہے، کہنے لگے صاحب نبض سے تو یہی پتہ چلتا ہے، مریض نے کہا نکالو اس کو اس کی دم میں نمدہ۔

تو جس طرح بخار پہچاننے کے لیے محض سرعت نبض کافی نہیں بلکہ ایک ذوق کی ضرورت ہے جس سے طبیب کو پتہ چل جاتا ہے۔ اسی طرح لب ولہجہ سے پہچان لینا یہ بھی ذوقی امر ہے اور یہ کوئی بزرگی کی دلیل نہیں ہے یہ تو مناسبت سے حاصل ہو جاتا ہے جو خدمت خلائق کے کام کرنے والے کو حق تعالیٰ عطا فرما دیتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مجھے معلوم ہو گیا کہ اس سوال کا سبب کبر ہے۔ اس لیے میں نے کہا کہ تمہارے واسطے تو یہی ضروری ہے کہ فاسق کو ابتداء سلام کیا کرو۔

نفرت کی قسمیں

غرض نفرت کی بھی قسمیں ہیں۔ یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ کبھی متکبرین کو سند مل جائے چنانچہ جنہیں تقویٰ کا ہیضہ ہوتا ہے وہ خدا جانے مسلمانوں کو کیا سمجھتے ہیں، یاد رکھو اہل معاصی سے نفرت کا یہ مطلب نہیں کہ اپنے کو بڑا سمجھے اور تکبر کرے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اپنے کو تو سب سے کم سمجھے اور پھر شریعت کے حکم کی وجہ سے نفرت کرے۔

یہاں بڑا زبردست اشکال ہے وہ یہ کہ تواضع کا اقتضا یہ ہے کہ کسی سے بھی نفرت کرے اور بغض فی اللہ کا مقتضا یہ ہے کہ عاصی سے نفرت کرے اور نفرت جب کرے گا تو ضرور اسے کمتر سمجھے گا اور جب اسے معصیت کے سبب کمتر سمجھے گا تو پھر اپنے کو کہ معصیت سے محفوظ ہے اس سے کیسے کمتر سمجھے گا۔ اسی واسطے کسی غیر محقق نے تنگ ہو کر کہہ دیا ہے:

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ   بازمے گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

(گہرے دریا میں تختہ باندھ کر ڈال دیا پھر کہتے ہو خبردار رہ کہ دامن تر نہ ہو)

مگر محقق دونوں کو جمع کر کے دکھلا دیتا ہے کہ دریا میں بھی جائے اور خشک دامن بھی رہے۔ اس کو ایسا تیرنا آتا ہے کہ کھڑے ہو کر تیرتا ہے اس کی حقیقت نہایت ہی آسان ہے۔ محققین نے اس کو بھی حل کر دیا ہے۔

ایک مثال اس کے لیے کافی ہے کہ مثلاً بادشاہ نے جلاد کو حکم دیا کہ شہزادے نے فلاں جرم کیا ہے اس کو ایک درجن بید لگاؤ۔ اب یہاں دو حکم ہیں، ایک تو یہ کہ یہ شہزادہ ہے اسے عظیم الشان سمجھو اور دوسرا یہ کہ اس نے ایک قصور کیا ہے اس لیے مجرم بھی سمجھو۔ اب وہ بھنگی جانتا ہے کہ یہ سزا کے قابل اور میں سزا کے قابل نہیں۔ اس حیثیت سے میں افضل ہوں مگر باوجود اس کے یہ بھی جانتا ہے کہ یہ شہزادہ ہے اور میں بھنگی ہوں اس لیے باوجود مجرم ہونے کے بھی یہ مجھ سے بدرجہا افضل ہے۔ دیکھئے دونوں امر کس طرح جمع ہو گئے وہ بھنگی بادشاہ کے امتثال کے لیے تو مارتا ہے اور اپنے اعتقاد سے تعظیم کرتا ہے۔

جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اب یہ سمجھو کہ جب تم کسی مسلمان سے معصیت کی وجہ سے نفرت کرو تو اس کے ساتھ یہ بھی سمجھو کہ ممکن ہے کہ عنداللہ اس کا رتبہ مجھ سے اس لیے

بڑھا ہوا ہو کہ اس میں کوئی دوسرا کمال ایسا ہو جو مجھ میں نہ ہو۔ مگر اس حیثیت سے کہ یہ بے نمازی ہے حکم شاہی ہے کہ بے نمازی کو سلام نہ کرو، اس لیے میں سلام نہیں کرتا۔ باقی میں اس سے افضل نہیں ہوں ممکن ہے کہ کسی خفی عمل کی بدولت یہ عنداللہ مجھ سے افضل ہو کیونکہ اعمال کا انحصار نماز پر ہی نہیں ہے ممکن ہے کہ توحید اس کی اتنی خالص ہو کہ بلامحاسبہ بخشا جاوے۔ تو آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ عنداللہ بھی میں اس سے افضل ہوں اور وہ تو پھر مسلمان ہے، محققین تو کفار کے بارے میں بھی یہ خیال رکھتے ہیں۔

ہیچ کافر رابخواری منگرید   کہ مسلماں بودنش باشد امید

(کسی کافر کو حقارت سے نہ دیکھو اس لیے کہ اس کے مسلمان ہونے کی امید ہے)

ممکن ہے کہ وہ مسلمان ہو کر مرے تو پھر کیا خبر ہے کہ وہ افضل ہوگا یا آپ۔

لعنت اور غیبت

ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کہ یزید پر لعنت کرنا کیسا ہے، میں نے کہا اس شخص کو جائز ہے جسے یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارا خاتمہ یزید سے اچھا ہوگا، ارے اپنا کام میں لگو، لعنت کا وظیفہ پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔

حضرت رابعہ سے کسی نے پوچھا تو ابلیس پر لعنت نہیں کرتیں، کہنے لگیں جتنی دیر میں اس پر لعنت کروں میں اپنے محبوب کی یاد ہی نہ کروں، لعنت کے باب میں بعضوں کا دوسرا مذاق بھی ہے۔

ایک شخص تھا وہ روز ایک ہزار مرتبہ شیطان پر لعنت کیا کرتا تھا۔ ایک دن اس دشمن نے بھی کیسا بدلا لیا کہ دیوار کے نیچے سو رہا تھا، اس نے آ کر جگا دیا کہ اٹھو اٹھو بھاگو، یہ جیسے ہی وہاں سے ہٹا دیوار گر پڑی، یہ بہت خوش ہوا کہ یہ تو کوئی بڑا خیر خواہ ہے، پوچھا کون ہو؟ کہا نام نہ پوچھو، نام سن کر تم خوش نہ ہو گے، کہا صاحب بتلاؤ بھی، کہا میں وہی شیطان ہوں جس پر تم ہزار مرتبہ روزانہ لعنت بھیجا کرتے ہو، کہا تم تو میرے بڑے خیر خواہ نکلے۔ اس نے کہا میں نے خیر خواہی سے نہیں بچایا بلکہ اس خیال سے بچایا کہ دیوار کے نیچے دب کر مرو گے تو شہید ہو جاؤ گے اور بے حساب بخشے جاؤ گے، تو مجھے فکر ہوئی کہ کسی طرح اتنے بڑے ثواب سے محروم کر دوں، دوسرے اگر جیتا رہے گا تو تجھ پر خوب مشق کیا کروں گا، ابھی بہت دن

نچاؤں گا جیسے بندر ریچھ کہ اگر مر جاوے تو بندر والا پھر کہاں سے کمائے گا۔

بہر حال کسی پر لعنت کرنا فضول حرکت ہے جبکہ اپنے ہی حال کی خبر نہیں کسی نے خوب کہا ہے:

گہ رشک برد فرشتہ بر پاکئی ما گہ خندہ زند دیوز ناپاکئی ما

ایماں چو سلامت بہ لب گور بریم احسنت بریں چستئی و چالاکئی ما

(کبھی ہماری پاکی پر فرشتہ رشک کرتا ہے اور کبھی ہماری ناپاکی پر شیطان ہنستا ہے، ایمان اگر قبر میں سالم لے جائیں تو اس وقت ہماری چستی اجالا پر آفریت ہے)

جب خاتمہ ہوگا اس وقت معلوم ہوگا کہ کس حالت میں گئے بس تو پھر کیا منہ لے کے کسی کو کہیں جس پر پھانسی کا مقدمہ ہو وہ میونسپلٹی کے چار آنہ آٹھ آنہ والے جرمانہ کے مجرم پر ہنسے تو کیا یہ حماقت ہی نہیں۔ جب یزید و ابلیس پر بھی لعنت کرنا فضول یا خطرناک ہے تو مسلمان کی غیبت کیا کچھ ہوگی اور آج کل تو اس سے بڑھ کر یہ تماشا ہے کہ غیبت کے لیے بھی صلحاء اتقیا ہی تجویز کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ مشائخ کی مجلسوں میں اکثر دوسرے مشائخ ، علماء کی ہی غیبتیں ہوا کرتی ہیں جہاں فساق کی بھی پردہ دری جائز نہیں تھی۔ غرض کسی کو حقیر مت سمجھو ابھی خود تمہاری ہی کشتی منجدھار میں ہے۔ البتہ جہاں شریعت اجازت دے وہ مواقع مستثنیٰ ہیں باقی جہاں اجازت نہیں وہاں غیبت کرنا خصوصاً سب کام چھوڑ کے اسی کا شغل کر لینا میں اس کو منع کر رہا ہوں، بالخصوص جبکہ نہ اپنا انجام معلوم ہو نہ اس کا جس کی غیبت کر رہے ہو اسی پر کسی نے متنبہ کیا ہے۔

غافل مرو کہ مرکب میدان مردرا در سنگلاخ بادیہ پیا بریدہ اند

نومید ہم مباش کہ رندان بادہ نوش ناگہ بیگ خروش بمنزل رسیدہ اند

(غافل مت چل اس لیے کہ مرد میدان نے سخت جنگلوں میں گھوڑا دوڑانا ہے، نا امید بھی مت ہو کہ رند شرابی ایک نالہ وفریاد میں منزل مقصود پر پہنچ گئے ہیں)

تو جن کے لیے ترک سلام کا حکم ہے وہاں دو حیثیتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ترک اہل حیثیت سے کہ ہم اس سے افضل ہیں۔ یہ تو ممنوع ہے اور ایک اس حیثیت سے کہ یہ حکم شرع ہے۔ یہ مطلوب و مامور بہ ہے اور وہ بھی وہاں جہاں ترک میں مصلحت ہو ورنہ جہاں مفسدہ کا احتمال ہو وہاں

جائز نہیں۔ مثلاً یہ اندیشہ ہو کہ اس سے اور ضد بڑھ جاوے گی اور اس شخص کا دین اور تباہ ہوگا۔

دینی رہبر کی ضرورت

اسی واسطے تو دین میں ہر جگہ حکیم کی ضرورت ہے۔ ہر کام میں کسی محقق کو رہبر بناؤ اور اس سے ایک ایک جزئی پوچھو۔ البتہ اس کے انتخاب میں بڑے غور وخوض کی ضرورت ہوگی۔ اب اول تو انتخاب ہی میں غلطی ہوتی ہے اور اگر انتخاب بھی صحیح ہو تو اتخاذ شیخ اس واسطے کرتے ہیں کہ ان سے مقدمات میں دعا کرایا کریں گے، تعویذ گنڈے کرایا کریں گے۔ گویا شیخ ان کے نوکر ہیں، ششماہی نذرانہ تنخواہ میں پاتے ہیں اور اگر زیادہ خوش اعتقاد ہوئے تو اس خیال سے پیر بناتے ہیں کہ بس وہ خدا کے ہاں بخشالیں گے، چاہے وہ خود بھی نہ بخشے جائیں۔ حضرت شیخ ان کاموں کے لیے نہیں ہے وہ تو طبیب ہے ان کے سامنے اپنے امراض ظاہر کرو اور ان سے اپنی حالت کا فیصلہ کراؤ اور جو وہ علاج بتائیں اس پر عمل کرو، جب ایسا انتظام ہوگا تو حضرت اس بارے میں شیخ ہی کے مشورہ پر عمل ہوگا کہ کہاں سلام نہ کریں اور کہاں کریں کہاں مصلحت ہے اور کہاں مفسدہ۔

یار باید راہ را تنہا مرو　　　　بے قلاوز اندریں صحرا مرو

(ساتھی ضرور چاہیے، تنہا راستہ مت چل خصوصاً اس طریق میں بلا رہبر کے قدم مت رکھ)

اور اگر کسی کے پاس رہبر محقق نہیں ہے تو وہ اگر دین پر عمل کرنا چاہے گا تو ہر صورت میں بہت چیزیں متشابہ ہیں جو واقع میں اضداد ہیں۔

گہ چنیں بنماید وگہ ضد ایں　　　　جز کہ حیرانی نباشد کار دیں

(کبھی یہ دکھلاتے ہیں کبھی اس کی ضد، دین کے کاموں میں سوائے حیرانی کے اور کچھ نہیں)

نگاہ بد کے اثرات

یہ کلام اس پر چلا تھا کہ معاصی پر گرانی ہونا ضروری ہے لیکن حدود و قیود کی رعایت سے مگر اب تو یہ حالت ہے کہ اہل حق نے اعمال کو عقائد پر اکتفا کر کے اتنا ترک کر دیا ہے کہ کسی کے ترک اعمال سے گرانی بھی نہیں ہوتی اور جو مبتلا ہے وہ تو کیوں گراں سمجھتا۔ بس یہ حالت ہے کہ جو جس میں مبتلا ہے اسے گراں نہیں سمجھتا، بے نمازی نماز پڑھنے کو گراں نہیں سمجھتا اور

جونمازی ہے مگر دوسری آفتوں میں مبتلا ہے وہ انہیں گراں نہیں سمجھتا۔ مثلاً امارد و نساء پر نظر کیا کرتا ہے اور اسے برا نہیں سمجھتا اور یہ گناہ گو ہے تو صغیرہ بعض اوقات صغیرہ میں اتنے مفاسد ہوتے ہیں کہ وہ ان مفاسد میں کبیرہ سے بھی بڑھ جاتا ہے اور حقیقت اس کی یہ ہے کہ گناہ میں دو درجے ہوتے ہیں ایک امتداد اور ایک اشتداد سو کبیرہ میں جو سختی ہے وہ اشتداد کی وجہ سے ہے اور جس گناہ میں اشتداد کم ہے وہ صغیرہ ہے مگر گناہ میں ایک درجہ ہے امتداد کا اور یہ اکثر صغیرہ ہی میں زیادہ ہوتا ہے کیونکہ اشتداد کا تدارک اکثر اس لیے آسان ہے کہ اس کا معصیت ہونا بین ہے اس لیے ڈر کر ایک مرتبہ دل سے **اللھم اغفرلی** کہہ لیا گویا پہاڑ کو بارود سے توڑ دیا لیکن امتداد کا تدارک اس لیے مشکل ہے کہ اس کو سرسری سمجھ کر کرتا رہتا ہے اور اس عادت کے سبب اس کا اثر راسخ ہوتا رہتا ہے پھر توبہ کا عزم سست ہو جاتا ہے۔

مثلاً بدنگاہی کو لیجئے کہ اس میں گو اشتداد نہیں مگر امتداد کبیرہ سے بڑھ کر ہے، سرسری سمجھنے سے بھی اور خود اس کی خصوصیت سے بھی۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ نماز نہ پڑھنے سے کوئی ایسا اثر قلب میں نہیں ہوتا جس سے نجات نہ ہو سکے مگر نگاہ بد کے اثر سے بعض اوقات عمر بھر بھی نجات مشکل ہو جاتی ہے اور اس کی تو وہ شان ہو جاتی ہے۔

درون سینہ من زخم بے نشاں زدہ　　　بحیرتم کو عجب تیر بے کماں زدہ

(تو نے میرے سینہ میں بے نشان زخم کیا ہے، حیرت میں ہوں کہ عجیب تیر کمان سے مارا ہے)

چنانچہ ہزاروں قصے ہیں کہ بس ایک دفعہ نگاہ پڑ گئی اور عمر بھر کو بے چینی لگ گئی کیونکہ محبوب کے نہ محلّہ کی خبر نہ کچھ پتہ اب فکر ہے کہ دوبارہ کہاں دیکھ لیں، اب گھل رہے ہیں یا مثلاً پردہ دار ہے اور وہ فوراً چھپ گئی تو اسے پھر کیونکر دیکھیں اب اس نے اس پر ایک اور غضب یہ کیا کہ اس خیال کو اپنے دل میں پالا اسے جمایا کہ بت پرست کی طرح سوچتا رہا کہ ہائے اس کا ایسا رخسار ہے اور ایسی ادا اور ایسی زلف جب وہ اچھی طرح دل میں جم گیا تو پھر یہ حالت ہوتی ہے کہ نہ ملامت نافع ہے نہ خوف نہ حیا نہ شرم کما قیل۔

عزل العو اذل حول قلب التائه　　　وھوی الاحبته منه فی سودائه

(ملامت کرنے والوں کی ملامت قلب کے اردگرد ہے، دوستوں کی محبت سودائے

قلب یعنی دل کے اندر ہے)

اب مرض بڑھا کہ نہ نماز میں جی لگتا ہے نہ روزہ میں نہ اللہ یاد رہا نہ رسولؐ، بس ہر وقت وہی مردار ہے حتیٰ کہ اب نماز روزہ بھی ترک ہونے لگا، اعمال پر اثر پڑا، پھر صحت پر اثر پڑا اور بیمار پڑ گیا اور بیماری بھی اتنی بڑھی کہ حالت مایوسی کی ہوگئی، غرض ایمان اور جان سب اسی کی نذر ہوگیا، یہ سب خرابی اسی نگاہ بد منحوس کی بدولت ہوئی مگر اس میں اسے وہ لذت ہے کہ ترک کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا جیسے خارش والے کو کھجلانے سے خارش بڑھتی ہے مگر اس میں وہ مزہ ہے جیسے شاعر نے کہا ہے:

لڈو میں نہ برفی میں نہ پیڑے میں مزہ ہے ۔۔۔ جو حضرت کھجلی کے کھجانے میں ہے

(مگر کسی مبتلا کو اب بھی مایوس نہ ہونا چاہیے کیونکہ یہ مرض بھی گو سخت ہے مگر لاعلاج نہیں)

عشق مجازی کے نتائج

"ماجعل الله داء الاوقد جعل له دواء" (خدا نے کوئی مرض ایسا نہیں بنایا جس کا علاج نہ ہو) چنانچہ اس عشق مجازی کی بھی دوا ہے اگر کوئی کرنا ہی نہ چاہے تو اور بات ہے جیسے مجنوں کہ وہ اپنی محبت کو خود زائل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ اس کے باپ نے اس سے کہا کہ خانہ کعبہ کا غلاف پکڑ کر دعا کرو۔ اللّٰھم ازل عنی حب لیلیٰ (اے اللہ! مجھ سے لیلیٰ کی محبت دور کردے) تو آپ فرماتے ہیں اللّٰھم زدنی حب لیلیٰ (اے اللہ! مجھ میں لیلیٰ کی محبت بڑھا دے) اور فی البدیہہ یہ شعر پڑھا۔

الٰہی تبت من کل المعاصی ۔۔۔ ولکن حب لیلیٰ لا اتوب

(یعنی اے اللہ! میں سب گناہوں سے توبہ کرتا ہوں مگر لیلیٰ کی محبت سے توبہ نہیں کرتا)

گو وہ فاسق نہ تھا، پاک عاشق تھا اور اپنے عشق میں اتنا کامل ہوگیا تھا کہ اسے بجائے محبوب کے خود محبت ہی مقصود ہوگئی۔ چنانچہ ایک مرتبہ لیلیٰ خود اس کے پاس پہنچ گئی تھی، پوچھا من انت تو کون، اس نے کہا انا لیلیٰ (میں لیلیٰ ہوں) کہا الیک عنی فان حبک شغلنی عنک (ہٹ مجھے تیری محبت نے تجھ سے بے نیاز کردیا) تو یہ عشق تھا اور اب تو سراسر فسق ہوتا ہے۔

ایں نہ عشق است آنکہ در مردم بود　　ایں فساد خوردن گندم بود

(یہ عشق جو عام لوگوں میں ہے یہ عشق نہیں بلکہ گندم کھانے کا فساد ہے)

سو مجنوں نے علاج نہ چاہا، مبتلائے معصیت رہا لیکن وہ فاسق نہ تھا اس لیے علاج نہ کرنا صرف اس کی جان ہی تک مضر رہا اور اب تو فسق کے سبب ایمان کی بھی خیر نہیں اس لیے علاج کی سخت ضرورت ہے ورنہ یاد رکھو کہ اگر یہ عشق ختم نہ ہوا تو عجب نہیں اعمال اور ایمان ہی ختم ہو جائیں۔

چنانچہ کانپور میں ایک بوڑھے آدمی تھے۔ وہ ایک یہودن پر عاشق ہوئے، میں ان کے بڑھاپے کی وجہ سے ان کا ادب باپ کا سا کرتا تھا اور وہ طالب علم سمجھ کر میرا ادب کرتے تھے مگر اس حیا سوز عشق میں یہاں تک نوبت پہنچی کہ وہ سب ادب وحیا کو بالائے طاق رکھ کر ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ اگر وہ یہودن ہے تو میں یہودی ہوں، اگر وہ عیسائن ہے تو میں عیسائی ہوں، نعوذ باللہ! وہ تھے تہجد گزار مگر دیکھیے ایک بدنگاہی سے سب ختم ہو گیا، اسی لیے میں کہتا ہوں کہ اس سے بہت بچنا چاہیے۔

ابن القیم نے دواء الکافی میں ایک حکایت لکھی ہے۔ ایک نہایت حسین عورت نے ایک آدمی سے حمام منجاب کا راستہ پوچھا، کچھ نظر اور کچھ اس کی باتوں سے اور کچھ اس کی صورت سے یہ گرویدہ ہو گیا اور اسے دھوکہ دیا کہ اپنے ہی مکان کو حمام منجاب بتا دیا۔ جب وہ مکان میں گئی یہ بھی اندر گھس گیا، وہ تھی عفیفہ اس کی بدنیتی کو سمجھ گئی۔ اس نے کہا کہ میں تو خود تجھ پر فریفتہ ہوں مگر اس وقت میں بہت بھوکی ہوں، پہلے میرے لیے کچھ کھانے کو لاؤ، آپ بازار میں گئے جب اس نے گھر اکیلا پایا تو چپکے نکل کے چل دی، اب جو کھانا لے کر آیا اور اسے نہ پایا تو مارے غم کے بیمار پڑ گیا اور یہاں تک کہ وقت اخیر ہو گیا۔ لوگوں نے کہا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہو، تو یہ بجائے اس کے یہ کہتا ہے:

یارب سائلۃ یوما وقد تعبت　　این الطریق الی حمام منجاب

(اے رب حمام منجاب کو پوچھنے والی کہاں ہے)

اور اسی پر خاتمہ ہو گیا۔

انہوں نے ایک اور حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص ایک لڑکے پر عاشق تھا۔ اس کے فراق میں بیمار ہوگیا، کسی نے اس لڑکے کو سمجھایا کہ تمہارے سامنے چلے جانے سے اسے افاقہ ہوجائے گا۔ چنانچہ وہ راضی ہوگیا۔ اس کو بھی کسی نے خبر دے دی کہ وہ لڑکا آرہا ہے یہ مارے خوشی کے اٹھ بیٹھا، پھر وہ راستہ ہی سے لوٹ گیا کہ جانے میں رسوائی ہے میری بھی اور اس کی بھی اسے کسی نے خبر دے دی وہ پھر گر پڑا اور یہ شعر پڑھنے لگا۔

رضاک اشھی الی فوادی　　　من رحمتہ الخالق الجلیل

(تیری خوشنودی میرے دل کی زیادہ خواہش مند ہے، خالق جلیل کی رحمت سے) نعوذ باللہ

بس اسی پر دم نکل گیا۔

ایک اور حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص شہوات و معاصی میں منہمک تھا، اس سے اخیر وقت کلمہ پڑھنے کو کہا گیا تو کہتا کہ اتنے معاصی کے ہوتے ہوئے کلمہ ہی سے کیا ہوگا اور اسی پر دم نکل گیا، کم بخت معاصی میں بھی خاصیت ہے کہ رحمت خداوندی سے مایوس کردیتی ہے تب ہی تو کلمہ سے انکار کردیا اور اس کو بے کار سمجھا۔

اسی کے مناسب ایک واقعہ یاد آیا، ہمارے یہاں قریب کے ایک قصبہ میں ایک خون ہوگیا تھا، اس میں دو آدمی ماخوذ ہوئے اور دونوں کو پھانسی کا حکم ہوگیا۔ حکم کے بعد پوچھا گیا تم کیا کچھ چاہتے ہو تو ایک نے تو کہا کہ میرے بھائی کو بلا دو اور مجھے غسل و نماز کی اجازت دو، چنانچہ اجازت ہوگئی، اس نے اپنے بھائی کو چند وصیتیں کیں اور کہا کہ میاں آج میرا وقت پورا ہوچکا تھا، اگر پھانسی نہ ہوتی تو میں اور کسی طرح مرتا پھر اس نے دو رکعت نماز پڑھی اور کلمہ پڑھ کے پھانسی پر چڑھا دیا گیا اور دوسرے نے اپنے عزیزوں سے اس قسم کی خرافات وصیتیں کیں کہ مثلاً میرا بیٹا کبھی کسی مسجد میں لگنے نہ پائے اس سے کہا گیا کہ کلمہ پڑھ تو کہتا ہے عمر بھر پڑھا تو کیا ہوا اور اب پڑھوں گا تو کیا ہوگا، اسی کے بعد پھانسی ہوگئی۔ نعوذ باللہ!

عشق نفسانی کا علاج

تو بہر حال بڑی ضرورت ہے ایسی چیزوں سے بچنے کی جن میں یہ آثار ہوں اور سب ہی معاصی ایسے ہیں خصوصاً یہ عشق نفسانی اور اس میں ایک اور بڑی آفت ہے وہ کہ اگر کسی نے

جوانی میں احتیاط اور توبہ نہ کی ہو تو یہ مرض بڑھاپے میں اور بڑھ جاتا ہے۔ اس پر ایک تفریع فقہی کرتا ہوں وہ یہ کہ بوڑھے آدمی سے اپنے سیانے لڑکے اور سیانی لڑکی کو زیادہ بچانا چاہیے۔ وجہ یہ کہ جوانی میں اگر شہوت زیادہ ہوتی ہے تو قوت ضبط بھی ہوتی ہے اور اس قوت ضبط ہی سے قوت شہوت میں لذت ہوتی ہے تو اگر کوئی خوف حق سے ابھی ضبط نہ کرے گا تو لذت ہی کے لیے ضبط کرے گا اور یہ لذت معین ہو جاوے گی، ادامت ضبط پر اور اس سے رفتہ رفتہ وہ اس ضبط میں خوف حق کی نیت کر کے متقی بن جائے گا اور بوڑھے میں گو قوت شہوت کم ہے مگر قوت ضبط بھی کم ہے کیونکہ شہوت اور ضبط کا دار و مدار حرارت غریزیہ پر ہے اور وہ بڑھاپے میں کم ہو جاتی ہے اس لیے اس میں ضبط کم ہو گا پس وہ زیادہ احتیاط کے قابل ہے۔ گو وہ بزرگ ہی کیوں نہ ہو۔

لیکن اب تو یہ غضب ہے کہ لوگ اپنی بہو، بیٹیوں کو پیروں سے تو بالکل پردہ نہیں کراتے، پیر خواہ جوان ہوں یا بوڑھے عورتیں ان کے ہاتھ پیر دباتی ہیں، اے اللہ! کہاں گئی شریعت اور کہاں گئی شرم و غیرت ہم نے مانا کہ پیر صاحب ایسے پیر اور ایسے متقی ہیں کہ ان سے خطرہ نہیں ہے مگر دوسروں کو اپنی بے حیائی کے لیے سند تو ہو جاوے گی۔

بہر حال یہ مرض نظر بد عشق نفسانی سخت مرض ہے مگر علاج اس کا بھی البتہ ذرا داروئے تلخ ہے مگر اس تلخی کے ساتھ اس میں دین کی لذت بھی ہے سو اس کی لذت کے لیے تلخی کو تو گوارا کر لو۔

شاید کوئی کہے کہ تلخی میں لذت کہاں؟ میں کہتا ہوں کہ کیا تم مرچ نہیں کھاتے کہ منہ سے بھی نہر جاری ہے اور ناک سے بھی اور آنکھ سے بھی مگر چھوڑتے نہیں تو دیکھئے تلخ ہے اور مزہ دار کسی کو مرچ کی عادت نہ ہو تو تمبا کو لے لیجئے اس میں جتنی زیادہ تلخی ہو اتنا ہی زیادہ مزے دار ہوتا ہے، میں نے کبھی پیا نہیں مگر کھانے والوں، پینے والوں کے قصے سنے ہیں اس لیے تقلیداً کہتا ہوں ہائے افسوس! لذت کے سبب مرچوں کی تلخی تو مطلوب اور تمبا کو کی تلخی مطلوب مگر دین کی لذت کے لیے علاج کی تکلیف سے نفرت کیا دین کی تمبا کو اور مرچوں کے برابر بھی وقعت نہیں؟

اب وہ علاج بتاتا ہوں جس سے اس مرض عشق نفسانی سے شفا ہو جائے وہ علاج صرف یہ ہے کہ اس کی طرف بالکل توجہ نہ کرے اور توجہ کی بھی قسمیں ہیں، توجہ بالقلب، توجہ

باللسان، توجہ بالبصر، توجہ بالید، توجہ بالرجل، تو ان سب کوترک کرے یعنی نہ تو اس کا تصور کرے نہ تذکرہ کرے نہ اس کی طرف دیکھے، نہ اسے ہاتھ سے چھوئے، نہ پیروں سے چل کے اس تک جائے، خلاصہ یہ کہ جتنا اس سے بعد ہوگا اتنا ہی نفع ہوگا۔

اس میں مجھ کو ایک احتمال پیدا ہوتا ہے کہ شاید کوئی یہ علاج شروع کر کے اگلے ہی دن کہنے بیٹھ جائے کہ علاج تو کیا مگر اب تک وہی حال ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ایسا تو امراض حسیہ میں بھی بہت ہوتا ہے کہ ایک مسہل میں درد نہیں جاتا بلکہ بعض دفعہ اکیس اکیس مسہل ہوتے ہیں تب کہیں مادہ خارج ہوتا ہے کوئی علاج نہیں چھوڑ دیتا تو اس میں بھی جلدی نہ کرو علاج کرتے رہو۔ انشاء اللہ تعالیٰ ضرور نفع ہوگا۔

وساوس کا علاج

ایک اشکال اور رہ گیا وہ یہ کہ اور سب باتیں تو آسان ہیں مثلاً ہاتھ، پاؤں، زبان، آنکھ سب قابو میں ہیں مگر دل کو کیا کریں کہ خیال آتا ہی ہے میں کہتا ہوں "النفس لاتتوجه الی شیئین فی آن واحد" (نفس ایک آن میں دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا) یہ قضیہ لازمہ عادیہ ہے۔ اب تم یہ کرو کہ کسی دوسری شے کا تصور کیا کرو اور اس کی طرف قصداً توجہ نہ کرو قصداً دوسری طرف توجہ رکھو۔ اس سے وہ آپ دفع ہوجائے گا بلکہ یہ بھی نہ کرو کہ اس کو قصداً دفع کرو کیونکہ اس سے تو پھر ادھر توجہ ہوگئی، غرض دفع کے قصد سے بھی ادھر متوجہ نہ ہو۔

اس کی مثال تار بجلی جیسے ہے کہ اگر ہٹانے کے لیے ہاتھ لگا دیا جب بھی لپٹے گا اور کھینچنے کے لیے لگایا تب بھی لپٹے گا۔ اس کا علاج یہی ہے کہ ہاتھ ہی مت لگاؤ نہ ہٹانے کے قصد سے نہ لانے کے قصد سے اور یہی علاج ہے بعینہ وساوس کا کہ ادھر توجہ نہ کی جائے، اس سے خود دفع ہوجاویں گے۔ اس میں بھی بعضے ایسے ہی غلطی کرتے ہیں کہ قصداً انہیں ہٹاتے ہیں حالانکہ اس کا یہ علاج نہیں، یہ لوگ علاج ہی میں غلطی کرتے ہیں بقول مولانا:

گفت ہر دارو کہ ایشاں کردہ اند | آں عمارت نیست ویراں کردہ اند
بے خبر بودند از حال دروں | استعیذ اللہ مما یفترون

مولانا نے یہاں ایک حکیم کی حکایت لکھی ہے کہ اس نے ایک مریض کو دیکھ کر کہا تھا کہ جتنا لوگوں نے علاج کیا ہے سب الٹا ہی کیا۔ اسی طرح غیر محقق کے علاج کو محقق کہتا ہے، تصوف واقعی ہمت ہے اس میں بڑے ماہر محقق کی ضرورت ہے۔ پس وسوسہ کا صحیح علاج یہ ہے کہ اس کو قصداً دفع نہ کرو بلکہ دوسری طرف توجہ کرلو۔ اب ایک اشکال اور رہ گیا وہ یہ کہ ہم نے یہ بھی کر کے دیکھا ہے کہ جب وساوس آتے ہیں تو الفاظ قرآنیہ کی طرف توجہ منصرف کر دیتے ہیں مگر اس وقت بھی سامنے وساوس ہوتے ہیں۔

اس کے جواب کی حقیقت سمجھنے کے لیے اول ایک مثال سمجھئے اور وہ بھی مسئلہ فلسفہ ہی کا ہے کہ آنکھ سے شعاعیں نکل کر مرئی کو محیط ہو جاتی ہیں مگر جو چیزیں مرئی کے گرد و پیش ہیں وہ بھی کچھ نہ کچھ نظر آتی رہتی ہیں۔ مثلاً ایک نقطہ ہے، آپ ٹکٹکی باندھ کر اسی کو دیکھ رہے ہیں مگر اس کے آس پاس کے دوسرے نقطے بھی بلا قصد نظر آتے ہیں اگر کوئی استاد حکم دے کہ اور لفظ کو مت دیکھو تو مطلب یہ ہے کہ بالقصد مت دیکھو کیونکہ **"لایکلف اللہ نفسا الاوسعھا"** (اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) اسی طرح نفس کی حالت ہے کہ جب قصداً تم مثلاً قرآنیہ کو ذہن سے دیکھ رہے ہو تو علاج پر عمل ہو گیا۔ گو اور چیزیں جو متخیلہ میں جمع ہیں وہ بھی ذہن کے سامنے آجاویں، پس ان کا خیال آنا منع نہیں ہے ہاں لانا منع ہے۔

اب اس پر کوئی کہے کہ جب وساوس آ گئے خواہ لانے سے یا بے لائے تو پھر علاج کا فائدہ کیا ہوا، میں کہتا ہوں کہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ چند روز تک تو وہ آتے ہیں اور اس کے بعد پھر خود بخود غائب ہو جاتے ہیں اور یہی فرق ہے بصیرت و بصارت میں کہ بصر سے تو وہ گرد و پیش کی چیزیں غائب نہیں ہوتیں مگر بصیرت سے غائب ہو جاتی ہیں۔ پھر اس وقت یہ حالت نصیب ہو جاتی ہے۔

دل آرائے کی داری دل درو بند   دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

اسی طرح تمام وساوس کے ہجوم کے وقت کسی دوسری چیز کی طرف توجہ منعطف کرلیا کرو، چاہے وہ دوسری چیز کلام ہو چاہے ڈھیلا مٹی اور چاہے تصور شیخ ہو اس اثر میں سب برابر ہیں۔

یہاں سے مسئلہ تصور شیخ کی تحقیق بھی ہوگئی کہ وہ کوئی مستقل شغل نہیں ہے بلکہ اس کا تصور اس لیے دل میں لاتے ہیں تا کہ خطرات دفع ہو جاویں اور گو یہ غرض دوسرے تصورات سے بھی حاصل ہوسکتی ہے مگر شیخ محبوب ہے اور محبوب کے تصور کو اس غرض میں زیادہ دخل ہے اس لیے اہل طریق نے اس کو اختیار کیا پھر جب خطرات دفع ہو گئے جس کی ضرورت سے تصور شیخ کیا تھا اب شیخ کو بھی رخصت کرو اور خالص ذات الٰہی کی طرف توجہ کرو جیسے دولہا اور دلہن کے بیچ میں مشاطہ اور نائن ہوتی ہے مگر جب خلوت کا وقت آتا ہے تو صرف دولہا اور دلہن رہ جاتے ہیں اور نائن باہر کر دی جاتی ہے تو تصور شیخ مشاطہ تھا توجہ بحق کے وقت یہ بھی رخصت بقول مولانا:

جلوہ بیند شاہ وغیر شاہ نیز　　　وقت خلوت نیست جز شاہ عزیز

(بادشاہ اور بادشاہ دونوں جلوہ دیکھتے ہیں، لیکن خلوت کے وقت سوائے بادشاہ کے اور کوئی عزیز نہیں ہوتا)

مقاومت کا اجر

یہاں سے یہ بھی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ پیر کا حق اس کو رہبر بنانا ہے، پرستش نہیں کیونکہ معبود کبھی علیحدہ نہیں کیا جاتا، اسی طرح عشق نفسانی میں جب محبوب کا خیال بلاقصد آئے تو اس وقت دوسرے کسی مباح التصور امر کا تصور کر لے تو اس سے محبوب مجازی کی صورت آہستہ آہستہ اکھڑ کر جاتی رہتی ہے اور یہ امر بھی قابل تنبیہ ہے کہ جاتے رہنے کی بھی یہ صورت ہوتی ہے کہ اول بتدریج میلان میں کمی ہوگی پھر چند روز کے بعد میلان بالکل نہیں رہے گا مگر اس کے بعد کچھ کچھ محبت معلوم ہوا کرے گی مگر ادنیٰ اہتمام سے وہ مضمحل ہو جاوے گی اس میں بھی بعضوں کو غلطی ہوتی ہے کہ جب دوبارہ پھر میلان ہوا تو وہ سمجھا کہ میرا مرض پھر عود کر آیا مگر نہیں وہ مطمئن رہے کہ مرض نے عود نہیں کیا ورنہ ادنیٰ اہتمام سے دفع نہ ہوتا، ازالہ رذائل کے معنی یہی ہیں کہ غلبہ جاتا رہے باقی جڑ باقی رہتی ہے اور اس قدر اصل کا باقی رہنا بھی حکمت الٰہیہ ہے کیونکہ اگر رذائل کی اصل ہی نہ رہے تو پھر مقاومت کا اجر کیسے ملے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

شہوت دنیا مثال گلخن است　　　کہ ازو حمام تقویٰ روشن است

(دنیا کی طلب اور خواہش مثل انگیٹھی کے ہے کیونکہ اس سے تقویٰ کا حمام روشن ہے)

گوبر کے اپلے اور کنڈے نجس تو ہیں مگر یہ نہ ہوں تو حمام کا پانی گرم نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح تقویٰ کا نور بھی شہوت ہی سے ہے بشرطیکہ اس کو جلاتے رہو، جمع کرکے دل میں نہ رکھو۔ الحمد للہ ہر پہلو سے یہ مسئلہ صاف ہوگیا اور عشق کا علاج معلوم ہوگیا، یعنی اس طرف التفات نہ کرو اس سے محبت مغلوب ہوجاوے گی اور مطلق میلان نہ ہونا مطلوب نہیں اگر اتنا میلان بھی نہ ہو تو بے حسی ہے جیسے گلاب میں سے کسی کو خوشبو کی بجائے بدبو آنے لگے تو معلوم ہوا اس کی قوت شامہ خراب ہوگئی ہے کیونکہ اچھی چیز تو اچھی ہی لگنی چاہیے اگر ایسا ہو تو یہ شخص سلیم الحواس نہیں پس میلان سے تو نہ گھبراؤ ہاں اس کے مقتضی پر عمل نہ کرو یعنی میلان کے بعد اس کو دیکھنے میں مشغول نہ ہو کہ خدا تعالیٰ سے تعلق رکھ کر قصداً دوسری طرف مشغول ہونا بڑی بے غیرتی کی بات ہے۔ اگر خود غیرت نہیں رہی تو غیرت حق کو سوچو۔

دیکھو اگر کسی کو بادشاہ کا قرب میسر ہوجاوے اور اس کو محل میں جانے کی اجازت ہوجاوے اور وہ وہاں سے جاکے لونڈیوں کو دیکھنے لگے تو بادشاہ کیا کہے گا۔ اسی طرح خدا کو بھی غیرت آتی ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے لوگ فواحش میں مبتلا ہوں، حقیقت میں خدا کے ہوتے ہوئے کسی اور پر نظر کرنا بڑی سخت بات ہے۔

اختتام مثنوی میں ایک حکایت لکھی ہے کہ:

ایک خوبصورت عورت جارہی تھی ایک شخص اس کے پیچھے ہولیا، وہ سمجھ گئی اس نے کہا کہ مجھے کیا دیکھتا ہے میرے پیچھے میری دوسری بہن آرہی ہے وہ مجھ سے بہت زیادہ حسین ہے، یہ اس کے دیکھنے کے لیے پلٹا اس نے ایک دھول رسید کیا اور کہا کہ

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی   در بیان دعوئے خود صادقی
پس چرا برغیر افگندی نظر   ایں بود دعوائے عشق اے بے ہنر

(اس نے کہا اگر تو عاشق ہے اور اپنے دعویٰ کے بیان میں سچا ہے تو پھر تو نے غیر کی طرف کیوں نظر ڈالی، بے غیرت کیا عشق کا یہی دعویٰ ہے)

جب اس عورت کو غیر پر نظر کرنے سے اتنا غیظ ہوا تو کیا حق تعالیٰ کو غیظ نہ ہوگا۔ غرض

یہ مرض بڑا شدید ہے اصل میں گفتگو اس پر تھی کہ ایک شخص بے نمازی کو برا سمجھتا ہے مگر اپنی بدنگاہی سے نفرت نہیں کرتا جس کے اتنے مفاسد ہیں۔

عقائد کی اہمیت

بعضے ایسے لوگ جن کے عقائد تو درست ہیں اور یہ غلطی بکثرت اہل علم کو یا ان کی صحبت والوں کو ہوتی ہے یعنی اگر وہ کسی کی نسبت مثلاً یہ سن لیں کہ یہ شخص بدعات سے مجتنب ہے گو اس کے تمام اعمال تباہ ہوں بس پھر اسے اس اہل بدعت پر بھی ترجیح دینے لگتے ہیں جہاں منشاء بدعت کا محض خطائے اجتہادی ہی ہو۔ یہ غلو فی الدین نہیں تو کیا ہے۔ انہوں نے عبادت کے درجات کو چھوڑ کر عقائد کو اساس قرار دے کر فروع کو بے وقعت سمجھ لیا ہے جیسے کوئی درختوں کی شاخیں کاٹ دیا کرے اور صرف تنہ دیکھ کر خوش ہوا کرے کہ باغ لگا ہوا ہے حالانکہ اس باغ دین کی تو یہ شان ہے۔

بردل سالک ہزاراں غم بود　　　گر زباغ دل خلالے کم بود

(عارف کے دل پر ہزاروں غم ٹوٹ پڑتے ہیں اگر اس کے باغ دل سے ایک تنکا بھی کم ہو جاتا ہے)

کہاں تو یہ حالت کہ ایک تنکا بھی کم ہونا گوارا نہیں اور کہاں یہ کہ تمام شاخیں کاٹ کے بھی خوش ہیں کہ جڑیں تو ہیں۔

ان کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص بنیاد بھر کر خوش ہو کہ میں نے مکان بنالیا ہے اگر کسی نے بنیادیں بھر دیں اور مکان بنایا نہیں تو برسات آنے دو، اب پانی برسا تو کپڑے بہے بہے پھرتے ہیں، سب سامان بھیگ رہا ہے اب سمجھ میں آیا کہ میں نے بڑی غلطی کی جو بنیاد کو کافی سمجھا۔ کام تو دیواروں اور چھت سے پڑے گا، گو بقاء ان کا بے شک بنیاد سے ہے، میں نے بڑی نادانی کی کہ پہلے ہی بنیاد کے ساتھ دیواریں نہ بنالیں۔

ہاں البتہ اس سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوگا کہ جس کی بنیادیں بھری ہوئی ہیں اس کی عمارت جب بنے گی جلدی تیار ہوگی اور مضبوط بنے گی اور جس کی جڑ ہی کھوکھلی ہوگی اس کو مشکل ہوگی۔ خلاصہ یہ کہ اہم الاجزاء عقائد بے شک ہیں مگر ان کے بعد دوسرا درجہ اعمال کا

بھی تو آخر کچھ ہے۔

ایک غلطی اس کے برعکس ہوتی ہے وہ یہ کہ بعض لوگ تصحیح عقائد کو ضروری نہیں سمجھتے، تسبیح نماز روزہ تو کرتے ہیں مگر عقائد کی تصحیح کی فکر نہیں کرتے اور اکثر اس میں ان کا زیادہ قصور نہیں ہے، قصور ان کا ہے جو بیعت کر کے کچھ وظائف بتلا کے خالی چھوڑ دیتے ہیں اس کی فکر ہی نہیں کہ عقائد اس شخص کے کیسے ہیں جن کی یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے کہ ایک درویش صاحب نے مجھ سے پوچھا تصور شیخ جائز ہے یا ناجائز، میں نے کہا پہلے آپ اس کے معنی بتایئے تو کہتے ہیں کہ خدا کو پیر کی شکل میں سمجھنا، نعوذ باللہ! وہ حضرت تو پابند صوم وصلوٰۃ بھی تھے اور تہجد و ذکر والے بھی تھے اور عقیدہ یہ اور پھر مزہ یہ کہ اس بدعقیدگی کو مضر نہیں سمجھتے۔

ایک شخص نے مجھے خط لکھا کہ جب نماز تنہا پڑھتا ہوں تو وساوس نہیں آتے اور جماعت سے پڑھتا ہوں تو وساوس بہت آتے ہیں تو جی چاہتا ہے جماعت چھوڑ دیں تو یہ بزرگ خلاف سنت کو سنت سے افضل سمجھ رہے تھے۔

نماز کی روح

درحقیقت یہ طریق بہت نازک ہے۔ عارف شیرازی نے خوب کہا ہے:

درراہ عشق وسوسہ اہرمن بسے است   ہشدار گوش رابہ پیام سروش دار

(راہ سلوک میں شیطان کے وسوسے بہت ہوتے ہیں، ہوشیار رہو اور وحی کی طرف کان لگائے رہو)

یعنی ہر قدم پر وسوسہ ہے شیطان کا، بس وحی کا اتباع کرو، دیکھئے کتنے بڑے دھوکے میں مبتلا کیا شیطان نے کہ حضور قلب نماز کی روح ہے اور ہر شے میں مقصود روح ہوتی ہے تو نماز میں بھی زیادہ مقصود حضور قلب ہی ہے اس کے بعد دیکھا کہ جماعت میں یہ روح ملتی نہیں اور قاعدہ ہے کہ:

الشیء اذا خلا عن فائدة انتفی

''یعنی جو شے مقصود سے خالی ہوگی وہ منتفی ہو جائے گی۔''

بس یہ نتیجہ نکال کر گمراہ ہوا کہ جماعت ہی سے نماز نہ پڑھے، اس کا جواب قاطع بحث تو یہ ہے کہ ترک جماعت جب شریعت کے خلاف ہے تو اس میں ہزار مصالح ہوں، سب لغو

ہیں، یہ تو سنار کی سوکھٹ کھٹ کے مقابلہ میں لوہار کی ایک سٹ ہے، خیر میں کھٹ کھٹ کا ہی جواب دیتا ہوں کہ حقیقت میں یہ بناء الفاسد علی الفاسد ہے، اول تو مجھے اسی میں کلام ہے کہ حضور قلب کے یہی معنی ہیں کہ جو سائل نے سمجھے یعنی وساوس کا نہ آنا لفظ حضور قلب تو ایک تعبیر ہے اور حقیقت اس کی احضار القلب ہے، اہل علم تو اتنے ہی سے سمجھ گئے ہوں گے مگر میں سب کے سمجھنے کے لیے تفصیل بھی کیے دیتا ہوں یعنی ایک تو ہے وساوس کی آمد اور ایک ہے آورد سو آورد مضر ہے۔ آمد مضر نہیں تو مقصود نماز میں صرف قلب کو اپنے قصد سے حاضر کرنا ہے پھر خواہ حاضر ہو یا نہ ہو اور یہ احضار خواہ ذکر کی طرف توجہ کرنے سے ہو خواہ مذکور کی طرف توجہ کرنے سے ہو یعنی اس کے دو طریقے ہیں۔

مبتدی کے لیے تو یہ ہے کہ ذکر کی طرف توجہ کرے اس کا طریقہ نہایت سہل ہمارے استاد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے بتایا کہ نماز کے ہر جزو کو اپنے قصد سے ادا کرو۔ صرف یاد سے مت پڑھو یعنی اب تو یہ عادت ہے کہ گھڑی کی کوک کی طرح اللہ اکبر کہہ لیا کہ یہ تو نماز کی کوک ہے اور **الحمد** اور **انا اعطینا** اور **قل ھو اللہ** یہ سب ہی کو ازبر ہے۔ بس شروع سے آخر تک سب خود بخود نکلتا چلا گیا تو ایسا مت کرو بلکہ اللہ اکبر کہو تو سوچ کے اور ارادہ سے کہو کہ میں اللہ اکبر کہہ رہا ہوں اس کے بعد **سبحانک اللّٰھم** پڑھو تو اس طرح پڑھو کہ ایک ایک لفظ کو مستقل ارادہ سے کہو، پھر اسی طرح الحمد پڑھو پھر اسی طرح سورت ملاؤ۔ غرض ہر ہر لفظ ارادہ سے ادا کرو یہ تو مبتدی کا طریقہ تھا۔

منتہی کا یہ ہے کہ بلاواسطہ حضرت حق کی طرف توجہ کو قائم کردے اور یہ حالت جب ہی حاصل ہوگی جبکہ اول مبتدی کی طرح عمل کرو گے بس تم اول ذکر پر توجہ کرو پھر شدہ شدہ مذکور کی طرف توجہ حاصل ہوگی۔

اس سے ایک نکتہ اور سمجھ میں آیا ہوگا کہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا

''اور اپنے رب کا نام یاد کرتے ہو اور سب سے قطع کرکے اس کی طرف متوجہ رہو۔''

تو یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ واذکر ربک کیوں نہیں فرمایا، اسم کیوں بڑھایا، اس کے

جواب میں بعض نے کہا ہے کہ اسم زائد ہے مگر میں کہتا ہوں کہ اسم کو زائد کہنے کی ضرورت نہیں بلکہ اس میں مبتدی کا درجہ بتایا ہے کہ وہ اسم ہی کی طرف توجہ کرے تو کافی ہے۔ پھر اسی سے مسمی تک پہنچ جاوے اور و تبتل الیہ میں منتہی کا کیونکہ ابھی بلا واسطہ ذکر رب پر قدرت نہیں اس لیے اس کو ذکر اسم رب کافی ہے اور منتہی کو اس پر قدرت ہے اس لیے اس کو حضرت حق کی طرف متوجہ ہونا چاہیے مگر یہ تفسیر نہیں نکتہ ہے لیکن اس پر میرا استدلال موقوف بھی نہیں۔ بہرحال احضار قلب کے دوطریقے ہیں ایک بواسطہ توجہ الی الذکر کے اور ایک بواسطہ توجہ الی المذکور کے تو روح نماز کی یہ احضار ہے۔ اگر اس احضار کے بعد وسوسے آویں تو یہ حضور قلب کے منافی نہیں ہے تو جماعت کی نماز میں جب احضار کرلیا گو حضور نہ ہو تو یہ کہنا سراسر غلط ہو گیا کہ جماعت میں حضور قلب نہیں ہوتا تو دیکھئے کتنی بڑی دولت سے شیطان نے محروم کرنا چاہا تھا۔

حدیث شریف میں ہے جماعت کی ایک نماز میں پچیس نماز کا ثواب ملتا ہے اس لیے کسی بات میں اپنی رائے پر عمل نہیں کرنا چاہیے بلکہ شریعت پر چلتے رہو۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں:

در طریقت ہر چہ پیش سالک آید خیر اوست　　　بر صراط مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

(شریعت میں جو حالت بھی سالک کو پیش آئے وہ اس کے لیے بہتر ہے، اے دل صراط مستقیم پر کوئی گمراہ نہیں ہے)

صراط مستقیم سے مراد شریعت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب حالت شریعت کے موافق ہو تو پھر جو حالت بھی بلا اختیار پیش آوے جیسے لفظ آید اس پر دال ہے وہ سب خیر ہی ہے خواہ وساوس ہوں یا اس سے بڑھ کر کچھ ہو اسی طرح دعا میں بھی شیطان بہکاتا ہے کہ ہماری دعا ہی کیا جب حضور قلب نہ ہو۔

تعلق عقائد و عبادت

ایک شخص میرے پاس آئے کہ میں بہت مقروض ہو گیا ہوں میرے لیے ادائے قرض کی دعا کرو، میں نے کہا میں بھی کرتا ہوں تم بھی کرو، کہنے لگے اجی ہماری دعا ہی کیا میں نے کہا کلمہ طیبہ جس سے آدمی مسلمان ہوتا ہے افضل ہے یا دعا، کہنے لگے کلمہ طیبہ میں نے بس یہی کہہ کے اسے بھی چھوڑ دو کہ ہمارا اسلام ہی کیا۔ میں کہتا ہوں جو کچھ ہے اسی کو غنیمت سمجھو۔

بلا بودے اگر ایں ہم نہ بودے
(مصیبت ہوتی اگر یہ بھی نہ ہوتا)

غرض ایسے ہی جہل سے لوگوں کے عقائد خراب ہور ہے ہیں اور جب عقائد خراب ہوئے تو عبادت بھی ناقص ہوگی کیونکہ عبادت کے معنی عبد شدن ہیں اور اس میں عقائد و اعمال سب داخل ہیں۔ جب ایک جزو بھی ناقص ہوا تو مجموعہ ضرور ناقص ہوگا۔ یہ پہلی اور دوسری غلطی تو عقائد واعمال کے متعلق تھی۔

تیسری غلطی یہ ہے کہ بعض نے معاملات کو ضروری نہیں سمجھا چنانچہ اجارات وتجارات میں بیع وشراء میں باستثناء شاذ ونادر کوئی جانتا تک بھی نہیں کہ اس کے متعلق شریعت میں کچھ احکام بھی ہیں۔ ریل میں بے ٹکٹ سفر کرنے کو حرج نہیں سمجھتے اور جو ٹکٹ لیتے ہیں تو قانون سے زائد اسباب لے جانے کو برا نہیں سمجھتے حالانکہ ریل حق العبد ہے۔ جب ہم نے اس کو استعمال کیا ہے تو ہمیں اس کا حق معہودہ کرایہ بھی دینا چاہیے۔ اسی طرح مدارس اور انجمنوں کے چندے بھی حق العبد ہیں اس کی تحصیل میں جبر کی کچھ پروا نہیں کرتے بلکہ قصداً زیادہ دباؤ ڈالتے ہیں تاکہ زیادہ چندہ وصول ہو۔

علماء سے تعلق پیدا کرنے کی ضرورت

اسی طرح کل معاملات میں سخت بے پروائی ہے چنانچہ اس کی کھلی دلیل ہے کہ جس طرح نماز، روزہ میں علماء سے پوچھتے ہیں، معاملات میں کبھی نہیں پوچھتے، رہن نامہ، بیع نامہ کی دستاویز لکھ کر وکیل کو تو دکھائیں گے کہ قانون حکومت کے خلاف تو نہیں مگر کسی عالم کو کبھی نہیں دکھائیں گے کہ قانون شرعی کے خلاف تو نہیں، اسی طرح مقدمہ میں جھوٹ بولنا کہ اس میں علماء سے بالکل نہیں پوچھیں گے کیونکہ یہ عام طور پر معلوم ہے۔ **لعنة اللہ علی الکاذبین** (جھوٹ بولنے والوں پر اللہ کی لعنت) اس سے وہ سمجھتے ہیں کہ پوچھنے پر یہی فتویٰ ملے گا تو پوچھ کر خود کیوں لعنت سنی، اپنے فعل پر لعنت سننے سے۔

عرب کے ایک معلم کا قصہ یاد آیا کہ ایک لڑکا استاد سے قرآن کا سبق لے رہا تھا اور استاد کی طرف منہ کر کے اس آیت کا تکرار کر رہا تھا:

وَاِنَّ عَلَیْکَ اللَّعْنَةَ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ...... وَاِنَّ عَلَیْکَ اللَّعْنَةَ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ
''قیامت تک تجھ پر اللہ کی لعنت ہے''

استاد اس ہیئت خطاب سے جھنجھلا گیا اور کہا "**ان علیک اللعنة وعلی والدیک**" (تجھ پر لعنت اور تیرے ماں باپ پر بھی) لڑکا سمجھا کہ آیت یونہی ہوگی، اس نے یونہی کہنا شروع کر دیا "**ان علیک اللعنة وعلی والدیک**" (تجھ پر لعنت اور تیرے ماں باپ پر بھی)

غرض جھوٹ بولنے کی نسبت علماء سے نہیں پوچھیں گے، میں کہتا ہوں کہ پوچھا تو ہوتا، شاید اجازت ہی مل جاتی اور گو بات تو کہنے کی نہ تھی مگر کیا کروں اس کے کہنے کی بھی ضرورت ہے کہ بعض جگہ جھوٹ بولنا جائز ہے، تم پوچھ کر تو دیکھو معلوم ہوگا کہ کہاں کہاں جھوٹ بولنا جائز ہے، اس کی تفصیل میں اس وقت نہیں بتا سکتا کیونکہ میں اس وقت فقہ کی کتاب تھوڑا ہی لکھ رہا ہوں۔ مگر اس اجمال کے بعد اتنا ضرور کہوں گا کہ علماء سے وحشت مت کرو اور یہ بدگمانی مت کرو کہ وہ ہر جھوٹ کو حرام ہی کہیں گے۔

اسی سے تو لوگ درویشوں کو اچھا سمجھتے ہیں کہ کسی کو روکتے ٹوکتے نہیں، شفقت سے کسی کو بچہ کہہ دیا اور کسی کو باوا بنا دیا۔ مگر بشارت دیتا ہوں کہ آج کل تو نوعمر مولوی بھی اسی طرح کا برتاؤ کرنے لگے ہیں کہ باوجودیکہ وہ آپ کی سب سے بیہودہ حالت سمجھتے ہیں مگر کچھ نہیں کہتے۔ مثلاً میں کسی کی ڈاڑھی مونڈھی ہوئی دیکھتا ہوں مگر کہنا دل شکنی سمجھتا ہوں۔

تو آپ اس زمانہ کے نوعمر تہذیب دیدہ مولویوں کے پاس جائیے اور نوعمر کے یہ معنی نہیں کہ وہ آپ سے بھی زیادہ نوعمر ہوں۔ اس وصف میں تو آپ ہی بڑھے ہوئے ہیں۔

جیسے نوشیرواں سے کسی نے شکایت کی کہ فلاں شخص نے مجھ پر ظلم کیا تو نوشیرواں نے کہا کہ تو کوتاہ قامت ہے یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی شخص کوتاہ قامت پر ظلم کر سکے۔ وہ خود مفتن ہوتا ہے اس نے کہا، اجی جس نے مجھ پر ظلم کیا وہ مجھ سے زیادہ کوتاہ قامت ہے۔ چنانچہ تحقیقات سے ایسا ہی نکلا۔

بلکہ نوعمر کا مطلب یہ ہے کہ بہت پرانے مولویوں کے سامنے جو نوعمر ہوں گے وہ تسامح

کریں گے۔ تو اخلاقاً وہ بھی درویش ہی ہیں۔ وہ آپ کی بہت خاطر کریں گے، تہذیب کے ساتھ پیش آویں گے۔ یہاں تک کہ آپ کے دل میں ان کی محبت پیدا ہوگی تو آپ خود ڈاڑھی رکھ لیں گے کیونکہ ان کے اخلاق دیکھ کر پھر آپ منڈواتے ہوئے خود شرمائیں گے مگر اس کو سن کر ڈر مت جانا بس جی اگر مولویوں سے ملنے میں یہ خاصیت ہے کہ خود بخود ڈاڑھی رکھ لیتا ہے تو ہم ملیں ہی گے نہیں جیسے کسی نے کہا تھا کہ چاند دیکھ کے روزہ فرض ہوجاتا ہے، دوسرے نے کہا میں دیکھوں گا ہی نہیں جو فرض ہو مگر صاحب جب مولوی آپ سے ڈاڑھی کی بابت کچھ نہ کہیں بلکہ آپ بدوں کہے خود ہی رکھ لیں تو اس میں آپ کا کیا حرج ہے جبکہ آپ بلا کلفت ڈاڑھی رکھ لیں، پھر ڈرنے کی کیا بات ہے۔

بہر حال آپ علماء سے ضرور ملئے اور ہر بات کو ضرور پوچھئے بلکہ میں تو علیٰ سبیل الترقی کہتا ہوں کہ اگر عمل نہ بھی کرنا ہو تب بھی پوچھئے کیونکہ اگر مسئلہ بھی نہ معلوم ہوا تو ایک تو ترک علم کا گناہ ہوا اور ایک ترک عمل کا تو اس میں ایک یہی فائدہ ہوگا کہ تحصیل علم کا فرض تو ادا ہوجائے گا۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اگر کبھی توفیق عمل کی ہوگئی تو علم اپنے پاس ہوگا۔

جیسے کسی کو خارش ہو اور وہ نسخہ کا ایک جز گندھک سن لے اور بد بودار سمجھ کے نسخہ ہی نہ سنے۔ یہ اس کی غلطی ہے کم از کم نسخہ تو معلوم کرلے کہ اگر کبھی علاج کو جی چاہے تو اس وقت طبیب کو تو ڈھونڈنا نہ پڑے گا۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ علم کی خاصیت خشیت ہے۔ امام غزالیؒ نے ایک بزرگ کا مقولہ لکھا ہے کہ ہم نے علم اور اغراض سے سیکھا تھا کہ تحصیل علم کے بعد قاضی بنیں گے، مفتی بنیں گے مگر علم نے ہمیں چھوڑا نہیں اور وہ ہمیں اللہ ہی کا بنا کے رہا تو علم کی خاصیت ہے کہ کبھی نہ کبھی خشیت پیدا ہو ہی جاتی ہے تو علماء سے احکام پوچھ لیا کرو اور ہر امر کے متعلق پوچھا کرو۔ مثلاً مقدمہ عدالت میں لے جانا ہو تو بھی علماء سے پوچھ لیں۔ جب آپ ہر بات کو پوچھیں گے اس وقت آپ کا یہ گمان کہ علماء نے صرف لا یجوز کا سبق پڑھا ہے، غلط ثابت ہوگا۔

بہر حال معاملات سے آج کل اتنی بے فکری ہے کہ اکثر لوگ معاملات کو دین میں داخل ہی نہیں سمجھتے۔ اگر کوئی پوچھنے کو کہے بھی تو کہتے ہیں کہ مولویوں کو اس سے کیا بحث ان کا

کام نماز، روزہ کا بتلانا ہے۔ یاد رکھو کہ یہ خیال بالکل ہی غلط ہے۔

معاشرت بطور جزو دین

قرآن وحدیث وفقہ میں سب چیزوں کی تعلیم موجود ہے، معاملات کی بھی معاشرت کی بھی لیکن معاشرت کو معاملات سے بھی زیادہ دین سے الگ سمجھتے ہیں کہ لباس پہنیں گے، دوسری اقوام کا سا باتیں کریں گے تو انہی کی زبان یا انہی کے لب ولہجہ میں حتیٰ کہ کمرہ بھی سجائیں گے تو اسی طرح جس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم معاشرت میں دریوزہ گر ہیں۔ دوسری قوموں کے اور گویا اس کا اقرار ہے اور نہایت گندہ اقرار ہے کہ ہمیں اس کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ نہیں دی۔ حالانکہ ان قوموں نے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تعلیم سے معاشرت کا طریقہ سیکھا ہے مگر آپ کی تو وہ حالت ہے:

یک سبد پرناں ترا بر فرق سر تو ہمی جوئی لب ناں دربدر
تابزا نوئے میان قعر آب ازعطش وزجوع گشتی خراب

(تیرے سر پر روٹیوں کا ٹوکرا رکھا ہے تو ایک روٹی کے ٹکڑے کو دربدر مارا پھرتا ہے تو زانو تک نہریں کھڑا ہے اور پیاس و بھوک سے خراب ہو رہا ہے)

یعنی سر پر ٹوکرا روٹیوں اور پیروں کے نیچے اتنا پانی کہ تو سارے شہر کو سیراب کر دے مگر عادت تو پڑ گئی ہے بھیک مانگنے کی اس لیے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلا رہے ہیں۔

جیسے ایک چلتی پھرتی عورت کی حکایت ہے کہ بھیک مانگتی پھرتی تھی مگر تھی حسین، بادشاہ کو پسند آ گئی، اپنے ساتھ لے گیا مگر تھوڑے دنوں میں دبلی ہوگئی، بادشاہ کو تعجب ہوا کہ اس عیش وعشرت میں دبلا ہونے کے کیا معنی، اس سے بھی پوچھا، کہنے لگی میں آپ کے ساتھ کھانا نہیں کھا سکتی مجھے کھانا الگ دیدیا کیجئے، خیر بادشاہ نے ایسا ہی کیا تو تر وتازہ ہونا شروع ہوئی۔ بادشاہ نے ماماؤں سے کہا کہ یہ کیا کھاتی ہے انہوں نے کہا ہمارے سامنے تو کھاتی نہیں کھانا رکھوا کر ہم کو رخصت کر دیتی ہے اور کمرہ بند کر لیتی ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ روشندان میں سے دیکھو کہ کیا کرتی ہے۔ جب ماما کھانا رکھ کر چلی گئی تو اس نے حسب معمول دروازہ بند کر لیا،

اب روشن دان میں سے جھانک کر دیکھا تو اس نے یہ کیا کہ روٹی تو ایک طاق میں رکھی اور پیالا دوسرے طاق میں اور رکابی تیسرے طاق میں، اب ایک طاق کے پاس گئی اور کہا کہ اللہ کے واسطے ایک ٹکڑا دے دے، بس ایک لقمہ کھالیا، پھر دوسرے طاق کے پاس گئی اور اسی طرح کہا پھر ایک لقمہ کھالیا، بس اسی طرح سارا کھانا کھالیا، بادشاہ کو یہ حال معلوم ہوا تو فوراً اسے نکالا کہ کم بخت اب بھی بھیک کی عادت نہ گئی، واللہ مجھے بہت افسوس ہوا کہ یہی حالت ہماری ہے کہ اپنے یہاں کی دولتیں ناپسند اور دوسروں کے یہاں کی مانگی ہوئی بھیک پسند۔

کوئی کام ہندو کرنے لگیں یہ بھی ان کی دیکھا دیکھی کھڑے ہو جائیں گے۔ عیسائیوں کو کچھ کرتے دیکھیں گے ان کی حرص میں یہ بھی کرنے لگیں گے اور پھر تقلید بھی کریں گے تو کورانہ بے سمجھے۔ پھر اس میں بھی استقلال نہیں کہ چار دن میں بیٹھ رہیں گے حالانکہ دوسری قومیں جو کام کرتی ہیں نباہ کر کرتی ہیں۔

غرض معاشرت بھی جزو دین ہے اس کو بھی اپنے ہی گھر سے سیکھو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بھی ایسی اعلیٰ تعلیم دی ہے کہ دنیا کا کوئی مذہب کوئی رواج ایسا نمونہ پیش نہیں کرسکتا۔

میں بطور مثال ایک چھوٹا سا نمونہ پیش کرتا ہوں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ اگر تین آدمی ہوں، دو آدمیوں کو تیسرے سے جدا ہو کے سرگوشی کی اجازت نہیں، سلف کا دستور یہ تھا کہ ایسے موقع پر جب چوتھا آدمی آجاتا تب ان میں سے دو اٹھ کے سرگوشی کر لیتے تاکہ تیسرے کی دل شکنی نہ ہو، میں کہتا ہوں کسی مذہب میں بھی ایسا قانون ہے۔ بھلا کوئی اس کی نظیر دکھلا تو دے آج کسی تمدن میں بھی ایسے قانون کا پتہ نہیں۔ واقعی جو اصول اسلام نے سکھائے ہیں وہ کسی قوم میں بھی نہیں، میں تو دوسری اقوام کے سامنے اپنے بزرگان دین کو پیش کر کے یہ کہوں گا۔

اولئک آبائی فجئنی بمثلھم اذا جمعتنا یا جریر المجامع

''یہ ہمارے آباؤ اجداد ہے اے جریر تو ان جیسے ہمارے پاس جبکہ ہم مجموعوں کو جمع کریں''

بھلا کوئی لاسکتا ہے ایسے اصول بس ہمیں تو وہی معاشرت چاہیے جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی اور گو وہ ظاہر میں شاندار نہ ہو تو نہ ہو مگر واللہ ہیبت اصلی اس میں ہے بقول مولانا:

ہیبت حق است ایں از خلق نیست　　ہیبتے از صاحب ایں دلق نیست

(یہ ہیبت حق کی ہے خلق کی نہیں کچھ ہیبت صاحب دلق کی نہیں)

یہ شعر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قصہ میں ہے کہ ان کو سفیر روم نے اینٹ پر سر رکھ کر سوتے دیکھا اور اسی حالت میں جب چہرہ مبارک پر نظر پڑی تو مارے رُعب کے کانپ اٹھا۔ اس پر سخت متعجب ہوا اور یہ فیصلہ کیا کہ بے شک یہ شخص حق پر ہے اور یہ حق ہی کی ہیبت ہے۔

ہیبت حق است ایں از خلق نیست　　ہیبت ایں صاحب دلق نیست

(یہ ہیبت حق کی ہے خلق کی نہیں کچھ ہیبت صاحب دلق کی نہیں ہے)

اب بھی دیکھ لیجئے کہ جس شخص کو اللہ سے جتنا تعلق ہوتا ہے قلوب میں اتنی ہی ہیبت زیادہ ہوتی ہے کہ بادشاہ سے بھی نہیں ہوتی اور اس ہیبت کے ساتھ ہی اس کی محبت بھی بے حد ہوتی ہے۔ بہر حال یہ تو ہماری روزمرہ کی معاشرت کا حال ہے پھر شادی بیاہ میں اور غمی کی رسموں میں تو شریعت سے استفتاء کون کرے۔ یہ تو گویا ہماری قومی باتیں ہیں، شریعت کو ان سے کیا غرض (نعوذ باللہ) اسی لیے ان رسموں میں وہ روپیہ اڑاتا ہے کہ خدا کی پناہ۔

ہمارے اطراف میں کیرانہ ایک قصبہ ہے وہاں کا قصہ ہے کہ ایک گوجر بیمار ہوا۔ اس کا بیٹا حکیم کے پاس آیا اور کہنے لگا اجی حکیم جی! جس طرح ہو اب کے تو میرے باپ کو اچھا ہی کر دو کیونکہ چاول بہت مہنگے ہیں، برادری کو کہاں سے کھلاؤں گا، مجھ کو باپ کے مرنے کا غم نہیں ہے صرف برادری کو کھلانے کی فکر ہے، کس قدر معاشرت بگڑی ہے۔

اسی طرح خود ہمارے قصبہ کا واقعہ ہے کہ ایک ساس مر گئی تو بہو بیٹھی رو رہی تھی کہ کفن دفن تو کسی طرح چندہ خیرات سے ہو ہی جائے گا مگر آٹھ آنے کے پان برادری کے لیے کہاں سے لاؤں۔ جب میں نے سنا تو اپنے گھر میں کہا کہ گو ایسے موقع پر رسماً جانا جائز نہیں اور تم کہیں آتی جاتی بھی نہیں ہو مگر خدا کے لیے جس کے گھر میت ہو وہاں ضرور جایا کرو اور جا کے پاندان پر قبضہ کر لیا کرو اور کسی کو پان نہ کھانے دو۔ یہ کہاں کی مصیبت ہے چنانچہ انہوں نے جب سے ایسا کیا، الحمد للہ! ہمارے یہاں سے تو یہ رواج اٹھ گیا۔ کیوں صاحب یہی معنی ہیں دین کے کہ اس طرح پرایا مال کھا جایا کرو، اس وقت بہت وقت ہو گیا اس لیے

میں پانچویں جز یعنی اخلاق کے بیان پر ختم کردوں گا۔

اخلاق کی حقیقت

اول یہ سمجھئے کہ اخلاق کیا چیز ہیں۔ اس کی حقیقت ہے اپنے نفس کی اصلاح کرنا۔ اس کا تو کہیں نام ونشان بھی نہیں رہا بس مرید ہوگئے اور عقیدہ پکا لیا کہ پیر اللہ میاں کے یہاں بخشوائیں گے۔ ادھر پیر روٹیوں سے مطمئن ہوگئے کہ اب سلسلہ میں تو آ ہی گئے پھر کیا غم۔ گویا ایک خاندانی رسم ورواج بن گیا ہے چنانچہ بعض اطراف میں یہ قاعدہ ہوگیا ہے کہ اگر ایک خاندان کا ایک شخص کسی کا مرید ہوگیا تو اب سارے خاندان کو اسی کا مرید ہونا ضروری ہے، پھر ان کی اولاد کو اس پیر کی اولاد کا مرید ہونا ضروری ہے۔ گو اہلیت کا نام ونشان بھی نہ ہو تو بجز گمراہ کرنے کے اس مشیخت کا کیا نتیجہ ہے۔

ایک ایسے ہی گمراہ کن پیر جی کا قصہ یاد آ گیا، مریدوں کے گھر گوجروں کے کسی گاؤں میں پہنچے، کچھ دبلے ہورہے تھے۔ ایک گوجر مرید نے پوچھا پیر جی دبلے کیوں ہورہے ہو۔ انہوں نے کہا کہ کم بختو! تم لوگ نہ نماز پڑھتے ہو نہ روزہ رکھتے ہو تمہارے بدلہ مجھ کو روزہ نماز کرنا پڑتا ہے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ بھی کہ تم سب کے بدلے مجھے کو پل صراط پر چلنا پڑتا ہے، پھر بتلاؤ دبلا ہوں یا نہ ہوں، مرید بڑا خوش ہوا کہ واقعی پیر جی ہماری طرف سے بڑی محنت کرتے ہیں۔ خوش ہوکر کہنے لگا کہ جا فلانا کھیت وہاں کا تم کو دے دیا۔ پیر جی تھے ہوشیار کہا کہ چل کے قبضہ کرادے۔ اب یہ بڑا خوش ہوا کہ اچھا احمق پھنسا، دھانوں کے کھیت میں پانی تو بہت ہوتا ہے اور مینڈ ذرا پتلی ہوتی ہے جس کی عادت نہ ہو وہ اس پر سے نہیں گزر سکتا، پیر جی اس پر سے چلے تو پیر لڑکھڑایا اور کھیت میں جا گرے، مرید نے جو پیر جی کو گرتے دیکھا تو اوپر سے ایک لات ماری کہ تو بڑا جھوٹا ہے جب اتنے چوڑے راستے پر نہیں چل سکا تو پل صراط پر کیا چلے گا جو بال سے بھی زیادہ باریک ہے، جا ہم کھیت نہیں دیتے۔ اب پیر جی کو کچھ تو گرنے کا کھسیان پن اور کچھ لات کی چوٹ اور کچھ کھیت نہ ملنے کا غم بیچارے کا بہت ہی برا حال ہوا۔

رہبر کی علامات

غضب تو یہ ہے کہ ایسے جھوٹوں نے سچوں کو بھی بدنام کر رکھا ہے تو اسی لیے میں کہا کرتا ہوں کہ

بڑا خوش قسمت ہے وہ شخص جسے رہبر محقق مل جائے، وہ رہبر کسی کے بتانے سے نہ بناؤ بلکہ علامات سے خود منتخب کرو اور چند علامتیں ہیں بس انہیں سمجھ لے اس کے بعد انتخاب آسان ہو جائے گا۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھو کہ اسے علم دین ہے یا نہیں، اور یہ ضرور نہیں کہ وہ عربی ہی جانتا ہو چاہے اردو و فارسی ہی جانتا ہو مگر بقدر حاجت دین کے احکام سے واقف ہو مگر یہ اس کا مطلب بھی نہیں کہ صرف راہ نجات ہرنی کے قصہ ہی کا عالم ہو بلکہ عقائد، دیانات، معاملات، معاشرات، اخلاق سب شعبوں کو اچھی طرح جانتا ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ ہمیں کیسے معلوم ہو کہ وہ ان چیزوں کو جانتا ہے یا نہیں۔ سو اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ چند روز اس کے پاس رہ کر دیکھو کہ ہر امر میں اپنی معلومات سے مریدوں کی اصلاح کرتا ہے یا نہیں اور اگر پاس نہ رہ سکو تو وقتاً فوقتاً خط و کتابت سے پوچھتے رہو۔ اگر اسے ضروری مسائل بھی معلوم نہ ہوں تو اس کو تو چھوڑ دو دوسرے کی تلاش کرو۔

دوسری علامت یہ ہے کہ وہ خود بھی شریعت پر عامل ہو۔

تیسری علامت یہ کہ اسے عادت ہو طالبین کو امر و نہی کرنے کی سختی سے یا نرمی سے۔

چوتھی یہ کہ اس کی صحبت میں روز بروز حق تعالیٰ کی محبت بڑھتی ہو اور دنیا کی محبت گھٹتی ہو۔

پانچویں علامت یہ ہے کہ جو بزرگوں سے سنی ہے کہ اس کی طرف عوام و اہل دنیا کا رجحان کم ہو اور اہل علم و اہل فہم و صلحاء کا رجحان زیادہ ہو اور جس کی طرف عوام اور دنیا داروں کا رجحان زیادہ ہو وہ کامل نہیں ہے۔

پس جس میں یہ پانچوں علامتیں مل جاویں اسے غنیمت سمجھنا چاہیے اس کا اتباع مطلق کرنا چاہیے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے حکم کا منتظر رہے بلکہ خود بھی پوچھتا رہے۔

طریق اصلاح

مثلاً یہ دیکھے کہ میرے اندر تکبر ہے اس کا علاج پوچھے کینہ ہے، علاج پوچھے غصہ ہے، غیبت کی عادت ہے، اس کا علاج پوچھے یا مال کی محبت ہے کہ فقیر کو دیتے ہوئے دم رکتا ہے، اس کا علاج پوچھے کیونکہ کوئی باطنی بیماری ایسی نہیں جس کا علاج نہ ہو اس لیے سب کو پوچھنا چاہیے اور جو نہیں پوچھتا وہ گویا اپنے کو بیمار نہیں سمجھتا، یہ علامتیں اس لیے میں نے

بتا دیں کہ بہت سے پیر بھی ایسے ہیں کہ:

از بروں چوں گور کافر پر حلل　　　　واندروں قہر خدائے عزوجل
از بروں طعنہ زدی بر با یزید　　　　وزدرونت ننگ می دارد یزید

(باہر سے کافر کی قبر کی طرح مزین اور اندر خدائے عزوجل کا عذاب ہو رہا ہے، باہر تو حضرت بایزید بسطامیؒ پر طعنہ زنی کرتا ہے اور تیری اندرونی حالت یزید سے بدتر ہے)

اور ان امراض کے علاج سے جیسا مریدوں کو بے فکر نہ ہونا چاہیے شیوخ بھی بے فکر نہ رہیں اس لیے کہ ہم جس طرح بیمار ہیں اسی طرح بعض اوقات شیوخ بھی بیمار ہو جاتے ہیں اور اس میں تعجب ہی کیا ہے کیا حکیم بیمار نہیں ہوتے بلکہ یہ تو ایسے بیمار ہوتے ہیں کہ بعض دفعہ ان کی زندگی بھی خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ اپنی طب کے گھمنڈ پر بد پرہیزی بہت کرتے ہیں اسی طرح شیوخ ہیں کہ ان کی بیماری عوام سے بڑھ کر ہوتی ہے ان کے لیے علاج کی صرف یہ صورت ہے کہ یہ بزرگوں کی کتابیں دیکھیں اور ان سے اپنا علاج کریں اور یہ کتابیں مبتدی کو تو کافی نہیں ہوتی مگر منتہی کو کافی ہو جاتی ہیں کیونکہ وہ فن جانتا ہے اور ایک طریقہ یہ ہے کہ اپنے معاصرین میں سے جسے اہل دیکھے اس سے رجوع کرے۔

ایک علامت شیخ کامل کی یہ بھی ہے کہ یہ دیکھے کہ اس کے پاس بیٹھنے والوں میں اکثر کی حالت روز بروز بہتر ہوتی جاتی ہے یا نہیں اکثر کی حالت بہتر ہو تو وہ شیخ کامل ہے۔ گو سب کی نہ ہو کیونکہ للاکثر حکم الکل اور اگر اکثر کی خراب ہو اور ایک آدھ کی اچھی ہو تو وہ شیخ کامل نہیں۔ اس سے ہرگز رجوع نہ کرے ورنہ یہ بھی ناقص ہی رہے گا کیونکہ پیر میں کمال نہیں، اس میں کہاں سے آ جائے گا۔ جیسے ایک مرید نے کہا تھا:

ہمارے اطراف میں ایک قصبہ ہے رام پور، وہاں کا ایک شخص کسی پیر کا مرید ہو گیا، اس سے کسی نے پوچھا میاں کچھ ملا بھی تو اس نے کہا کہ میاں جب سقاوہ ہی میں کچھ نہ ہو تو بدھنی میں کہاں سے آوے۔ واقعی جب پیر ہی کی حالت درست نہیں ہے تو بے چارے مرید کی کب اصلاح ہوگی۔

غرض جس کے مریدوں میں اکثر کی حالت درست ہو وہ کامل ہے۔ یہ علامت دیکھ کر تب اس

سے اصلاح کا تعلق کرے اوراس کے متعلق ایک اور ضروری تنبیہ ہے وہ یہ کہ اگر اس میں سب علامات ہیں اوراس کی تعلیم وصحبت سے اکثر کی حالت درست بھی ہے مگر خوداس مرید کی حالت درست نہیں ہوتی تواس سے یہ تو نہ سمجھے کہ شیخ کامل نہیں ہے لیکن شیخ سے اپنی حالت کا ذکر کرتا رہے اور جب ایک معتد بہ مدت گزرنے پر بھی حالت درست نہ ہوتو بدگمانی تو جب بھی نہ کرے لیکن اس وقت یہ سمجھے کہ مجھے اس سے مناسبت نہیں پھراور کوئی مناسبت کی جگہ تلاش کرے اور شیخ سے بھی کہہ دے۔

شیخ کا فرض

اگر شیخ محقق ہے تو وہ فوراً دوسرے سے رجوع کرنے کی اجازت دیدے گا اور اگر دُکاندار ہے تو مکدر ہوگا تو اس حالت میں وہ واجب الاتباع بھی نہیں، دُکاندار کی تو یہ حالت ہے کہ چاہے طالب کی کتنی ہی پریشانی و ناکامی بڑھ جائے مگر یوں کبھی نہ کہیں گے کہ میں تمہارے لیے کافی نہیں اور سے رجوع کرو جیسے مدعی طماع طبیب کہ چاہے مریض مرہی جاوے مگر اپنے علاج کے قاصر ہونے کا کبھی اقرار نہ کریں گے۔

جیسے ایک جاہل حکیم کا قصہ ہے اس نے کسی مریض کو بڑا سخت مسہل دے دیا تھا۔ تیمار دار نے خبر دی کہ حکیم جی دست بہت آ رہے ہیں کہا آنے دو مادہ بہت ہے۔ اچھا ہے نکل جاوے جب اور زیادتی ہوئی پھر اطلاع کی گئی پھر یہی جواب ملا۔ غرض بار بار اطلاع ہوتی رہی اور حکیم جی یہی کہتے رہے کہ مادہ سخت ہے نکلنے دو، یہاں تک کہ ضعف کے مارے مریض کا دم نکل گیا اس کی بھی اطلاع ہوئی تو حکیم جی کیا کہتے ہیں اللہ رے مادے جس کے نکلنے سے مر گیا، خدا جانے رہتا تو کیا ہوتا، ارے منحوس مرنے کے بعد اور کیا ہوتا شاید دوزخی بنا دیتا۔

تو حضرت ایسے ہی بعضے طبیب روحانی بھی ہوتے ہیں۔ محض اناڑی جیسے دہلی میں کسی پیر نے ایک مرید کو حبس دم بتایا تھا اب اسے تکلیف ہوئی اس نے اطلاع کی کہا کئے جا مجاہدہ میں تو تکلیف ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اس غریب کا دم نکل گیا تو کہا چلو شہید ہوا میں کہتا ہوں بے شک مگر خبر بھی ہے کہ شہید وہ ہوتا ہے جسے کوئی ظالم قتل کرے تو یہ پیر ظالم ہوا، اسی لیے اس طریق میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، جلدی سے کسی کو پیر نہ بنانا چاہیے۔ مولانا فرماتے ہیں:

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست　　　　بس بہر دستے نباید داد دست

(آدمیوں کی صورت میں بہت سے شیطان بھی ہیں، یعنی دھوکہ باز پیر پس ہر شخص سے بیعت نہ ہونا چاہیے)

اور ایک جگہ علامات کے اسباب میں فرماتے ہیں:

کارمرداں روشنی و گرمی ست　　　کار دوناں حیلہ و بے شرمی ست

(بردان حق کا کام روشنی و گرمی یعنی محبت اور معرفت ہے، دھوکہ باز دوسروں کا کام حیلہ اور بے شرمی ہے)

روشنی سے مراد معرفت اور گرمی سے مراد محبت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس میں معرفت اور محبت کامل ہو اس کو شیخ بناؤ، معرفت کے لوازم میں سے ایک یہ امر بھی ہوگا کہ اگر کسی عارض کے سبب اس سے نفع نہ ہو، مرید کو دوسری جگہ جانے کو فوراً کہہ دے گا ورنہ بے چارے مرید ہی میں دس کھوٹ نکال کر حیلہ بہانہ کر دے گا۔

ایک شخص کامل محقق کا واقعہ بیان کرتا ہوں، ہمارے دادا پیر حضرت میاں جی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کاندھلہ کے ایک عالم بیعت ہوئے جو پہلے مخالف تھے پھر موافق ہو گئے تھے اور مخالفت کے زمانہ میں حضرت میاں جی صاحب کی شان میں گستاخی کیا کرتے تھے۔ میاں جی صاحب نے بیعت تو کرلیا اور طریق کی تعلیم بھی شروع کی مگر چند روز کے بعد خود ہی فرما دیا کہ مولانا اس طریق کی بنا محض صدق وخلوص پر ہے اس لیے میں بے تکلف کہتا ہوں کہ آپ کو مجھ سے نفع نہ ہوگا، جس وقت میں آپ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اسی وقت آپ کے وہ پچھلے کلمات دیوار آہنی بن کر سامنے آجاتے ہیں۔ آپ کسی دوسرے سے رجوع فرمادیں، میں دعا کرتا ہوں۔

آج کل خود تو کیا کسی دوسرے کے پاس بھیجیں گے اگر کوئی خود سے بھی چلا جائے تو اس قدر ناراض ہوتے ہیں کہ گویا مرتد ہو گیا تو شیخ محقق کی یہ شان ہوتی ہے۔

اتباع شیخ کی ضرورت

غرض جب شیخ کا انتخاب کر چکے جس کی یہ علامات ہیں جو مذکور ہوئیں تو اب اس کا کامل اتباع کرے کہ جو وہ کہے وہ کرے اور جو مرض وہ بتائے اس کا علاج کرے اور خود سے بھی اپنے امراض کا اظہار کرتا رہے۔ اس بھروسہ پر نہ رہے کہ شیخ کو خود کشف سے معلوم ہو گیا ہوگا۔ اول تو

یہ ضروری نہیں، دوسرے جب طبیب سے مزید اطمینان کے لیے نبض وقارورہ دکھا دینے کے بعد بھی حال بیان کرتے ہیں تو یہاں بھی ایسا ہی کرو۔ یہ بھی طبیب روحانی ہے تیسرے مانا کہ بغیر کہے پیر کو انکشاف ہی ہوگیا ہو مگر بغیر کہے اسے آپ کی طلب کیسے معلوم ہوگی اور بغیر طلب کے تو حق تعالیٰ بھی متوجہ نہیں ہوتے۔ ''انلزمکموھا وانتم لھا کارھون'' یعنی اگر تم ایک مرتبہ ہماری رحمت سے بھاگتے ہو تو جاؤ ہم ہزار دفعہ مستغنی ہیں اور طالب کے لیے یہ وعدہ ہے:

من تقرب الی شبرا تقربت الیه ذراعا ومن تقرب الی ذراعا تقربت الیه باعا.

''جو شخص میری طرف ایک بالشت آتا ہے میں اس کی طرف ایک گز آتا ہوں اور جو میری طرف ایک گز آتا ہے میں اس کی طرف (دونوں ہاتھ کے برابر) آتا ہوں۔''

برسوں کی مسافت طے کردیتے ہیں۔ اسی کو مولاناؒ فرماتے ہیں:

آب کم جو تشنگی آور بدست　　تا بجوشد آبت از بالا وپست
تشنگاں گر آب جویند از جہاں　　آب ہم جوید بعالم تشنگاں

''پانی کو کم تلاش کرو پیاس پیدا کرو تا کہ تمہارے لئے پانی بلندی اور پستی سے جوش مارے دنیا میں اگر پیاسے پانی تلاش کرتے ہیں تو اسی جہان میں پانی بھی پیاسوں کو ڈھونڈتا ہے''۔

حضرت فریدالدین عطار فرماتے ہیں:

گر تو ہستی طالب حق مرد راہ　　درد خواہ و درد خواہ و درد خواہ

''اگر تو طالب مرد مالک ہے تو درد عشق طلب کر''

پھر مولانا فرماتے ہیں:

ہر کجا پستی ست آب آنجا رود　　ہر کجا مشکل جواب آنجا رود
ہر کجا دردے دوا آنجا رود　　ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

''جہاں پستی ہوتی ہے پانی بھی وہیں جاتا ہے جس جگہ مشکل ہوتی ہے جواب وہیں دیا جاتا ہے جہاں بیماری ہوتی ہے دوا وہیں دی جاتی ہے''۔

اور فرماتے ہیں:

سالہا تو سنگ بودی دلخراش　　آزموں رایک زمانے خاک باش

''برسوں تک تم دلخراش پتھر بنے رہے آزمائش کے لئے ایک زمانہ خاک بن کر دیکھو''
ان سب میں طلب ہی کی ترغیب ہے کہ تم خود بھی تو طلب ظاہر کرو، ایک شخص کے متعلق حاکم چاہتا ہے کہ اسے تحصیلدار کردے۔ مگر چاہتا یہ ہے کہ یہ بھی تو منہ سے کہے۔ وجہ یہ کہ اگر یونہی مل جائے گی تو قدر نہیں کرے گا۔

ہرکہ اوارزاں خرد ارزاں دہد گوہرے طفلے بقرص ناں دہد

''جو شخص سستا خریدتا ہے سستا ہی دیتا ہے بچہ ایک روٹی کے بدلے ایک موتی دیتا ہے''
تو اگر شیخ صاحب کو کشف بھی ہو تب بھی آپ کی طرف سے طلب تو ہو جب طلب ہوگی تب ہی عنایت ہوگی۔ یہی اصلاح اخلاق فقیری ہے طریق حق جس کے لیے لوگوں نے ایک الگ جماعت تجویز کر رکھی ہے اور جس کی تعریف یہ گھڑ رکھی ہے کہ دنیا کے کسی کام سے تعلق نہ ہو حالانکہ اس فقیری کی یہ تعریف ہے۔ ''اتقوا اللہ حق تقاتہٖ'' (یعنی اللہ سے ایسا ڈرو جیسا ڈرنے کا حق ہے حق تقتہ کی تفسیر یہ لکھی ہے کہ یطاع ولا یعصی یطاع کے معنی ہیں۔ اطاعت کیا جاوے یہ طوع سے ماخذ ہے اور طوع کہتے ہیں رغبت اور خوشی کو تو اطاعت خوشی سے کہنا ماننا ہوا، اب سچ کہو کہ کیا کسل کے وقت نماز رغبت سے پڑھی جاتی ہے، بخل کے وقت زکوٰۃ خوشی سے دی جاتی ہے ہرگز نہیں! بس اسی کی کسر ہے ہماری غلامی میں تو معلوم ہوا کہ کوئی ایسا بھی درجہ ہے جس میں اعمال شرعیہ طبیعت ثانیہ بن جاویں کہ بے تکلف خوشی سے ادا ہونے لگیں اور یہ ہے وہ درجہ جو کنز و ہدایہ میں نہ ملے گا بلکہ وہ اس طرح ملے گا۔

قال را بگذار مرد حال شو پیش مرد کاملے پامال شو

''قال کو چھوڑ دحال کو پیدا کرو یہ اس وقت ہوگا جب کسی اہل اللہ کے قدموں میں جا پڑو''

گر تو سنگ خارہ مرمر شوی چوں بصاحب دل رسی گوہر شوی

''اگر تم سخت پتھر یعنی سنگ مرمر بھی ہو کسی اہل دل کے پاس جاؤ گے تو گوہر ہو جاؤ گے''
یہ انہی اہل دل کی صحبت کا اثر ہے کہ پتھر کو گوہر بنا دیتے ہیں اس دولت کی تحصیل کے لیے ان کا اتباع ضروری ہے وہی دل کی اصلاح کرتے ہیں جس کے متعلق ارشاد ہے:

''اذا صلحت صلح الجسد کلہ[1] (الحدیث)''

(جب وہ درست ہو تو تمام بدن درست ہو جاتا ہے) اور جب اصلاح قلب پر تمام تر

---

[1] الصحیح للبخاری ۱: ۲۰

اصلاح موقوف ہے تو اس کا ضروری ہونا بھی ظاہر ہو گیا۔ کیا یہ حدیث اس حکم کے افادہ کے لیے کافی نہیں ہے۔ یقیناً کافی ہے تو اب یہ کہنا کہ اس طریق کی پیروی کرنا سب کے ذمے فرض و واجب نہیں جیسا کہ اس شعبہ کو اکثر لوگوں نے دین میں غیر ضروری قرار دے رکھا ہے بالکل غلط ٹھہرا۔

ترک دنیا کی نفی

لیکن اس میں دنیا کے چھوڑنے اور بیوی بچوں سے منہ موڑنے کی ضرورت نہیں اور اسی سے تو لوگوں کو توحش ہوا ہے اور اسی سے اس کو دین سے علیحدہ سمجھا ہے سو ایسا نہیں بلکہ اسی عیش و راحت کی حالت میں طریق طے ہو سکتا ہے۔

چو فقر اندر لباس شاہی آمد ٭ بہ تدبیر عبید اللٰہی آمد

''جب فقیر لباس شاہی میں آیا تو اللہ کے بندہ کی تدبیر سے آیا''

محققین شاہانہ لباس کے ساتھ بھی تم کو درویش بنا دیں گے اور بعضوں نے جو اچھا لباس چھوڑ دیا وہ ان کا غلبہ حال تھا جیسے بعض لوگوں کی بیوی مر جاتی ہے تو بچوں کی محبت میں دوسری بیوی نہیں کرتے اور جس پر ایسا غلبہ نہیں ہوتا وہ بوڑھے ہو کر بھی نکاح کرتے ہیں۔ گو لوگ ان پر ہنستے بھی ہوں مگر ان کا کیا ضرر ہے آرام تو ملے گا۔

ہنسنے پر ایک بڑے میاں کا قصہ یاد آیا، ایک نوے سال کے بوڑھے نے جوان کنواری بچی سے نکاح کیا تھا، رات کو ماما صاحبہ آئیں کہ لڑکے کو گھر میں بلاتی ہیں، ماشاء اللہ کیسے اچھے لڑکے ہیں جن کی ڈاڑھی سفید گالا ہو چکی ہے کچھ دانت بھی گر چکے ہیں اور ساس جن کے ابھی بال بھی سفید نہیں ہوئے۔ وہ بڑے میاں سے کہتی ہیں بیٹا میں تمہیں بیٹی دیتی ہوں بیٹا کیا کہتے ہیں کہ اجی اماں جان! آپ یہ کیا کہتی ہیں، لونڈی نہیں میں تو بجائے بیٹی کے رکھوں گا۔

غرض جس طرح بعضے نکاح کرتے ہیں بعض نہیں کرتے بس اس طرح بعضے بزرگوں نے دیکھا کہ ہم خالق و مخلوق دونوں کے حقوق کو جمع نہ کر سکیں گے۔ انہوں نے تعلقات خلق کو چھوڑ دیا ورنہ اس طریق میں فی نفسہ یہ مانع نہیں ہے بس ہر شخص کے لیے ضرور ثابت ہوئی کہ اپنے باطن کی درستی کرے اور اس کے لیے کچھ بیعت ہی کی ضرورت نہیں بلکہ اس میں تو بعض دفعہ مضرت ہو جاتی ہے کہ اگر کہیں پھنس گئے تو بس بعد میں بیچ بھر رہے ہیں تو اب تو جو ہو گیا سو ہو گیا اور ایسے بہت کم ہیں جو متنبہ ہو کر اپنے کو اس ورطہ سے نکال لیں بلکہ خود پیر کو بھی متنبہ کر دیں۔

جیسے ایک دیندار مرید نے ایسی جرأت کی مگر لطافت کے ساتھ وہ دھوکہ میں آ کر ایک دنیا دار پیر کے ہاتھ میں پھنس گیا۔ اس نے چاہا کہ پیر کی حالت پیر کے کان میں ڈالے۔ چنانچہ ایک بار پیر صاحب سے کہا آج میں نے ایک خواب دیکھا ہے میری انگلیاں گوہ میں بھری ہوئی ہیں اور آپ کی شہد میں پیر نے کہا کیوں نہ ہوتم دنیا کے کتے ہو خباثت میں بھرے ہو اور ہم بحمد اللہ پاک وصاف شیریں ہیں، کہا حضور ابھی خواب کا ایک جزو باقی ہے وہ یہ کہ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ میں آپ کی انگلیاں چاٹ رہا ہوں اور آپ میری۔ اصل میں اس نے لطافت سے یہ بات پیر کے کان میں ڈالی کہ آپ مجھ سے دنیا حاصل کرر ہے ہیں اور میں آپ سے دین۔

تو بعض وقت اس طرح پھنس جاتے ہیں۔ اس لیے بیعت میں جلدی نہیں چاہیے، پہلے خوب پیر کو اچھی طرح جانچ لے اور جانچنے کی صورت قابل اطمینان یہی ہے کہ چندے پاس رہے بلکہ اس میں بھی اچھی صورت یہ ہے کہ اس کے وطن میں جا کر رہے اور اگر پاس رہنے کی گنجائش نہ ہوتو کم از کم برس دو برس خط و کتابت ہی کرے اور اس میں اپنے امراض لکھے اور ان کا علاج پوچھے۔ جب اچھی طرح اطمینان ہو جائے کہ نفع ہوگا، تب بیعت کا بھی مضائقہ نہیں۔ یہ ہے بیان شعبۂ اخلاق کا اور اسی پر اپنے بیان کو ختم کرتا ہوں اور مختصر الفاظ میں تمام بیان کا خلاصہ عرض کیے دیتا ہوں۔

خلاصۂ بیان

وہ خلاصہ یہ ہے کہ عبادت کے معنی ہیں عبد شدن یعنی غلام ہو جانا اور غلام اسی کو کہتے ہیں جو اپنے آقا کی تمام اوامر و نواہی میں اطاعت کرے اور وہ اوامر و نواہی یہ ہیں کہ اپنے عقائد درست کیجئے، اعمال درست کیجئے، معاملات اور معاشرت درست کیجئے، اخلاق کی اصلاح کیجئے اور یہ موقوف اس پر ہے کہ علم دین کی کتابیں دیکھا کیجئے، خود بھی دیکھئے اور اپنے بچوں کو بھی پڑھایئے اور اپنے دیکھنے میں جہاں سمجھ نہ آوے کسی عالم سے تحقیق کیجئے اور کسی زندہ اہل اللہ سے تعلق رکھئے اور اس سے اپنے امراض کا علاج پوچھتے رہئے اور عمل کرتے رہئے۔ انشاء اللہ اس طور پر بہت جلد کمال دینی حاصل ہو جائے گا اور اس وقت آپ عبد کہلانے کے مستحق ہوں گے۔ بس اب میں ختم کر چکا۔ حق تعالیٰ سے علم عمل اور فہم و توفیق کی دعا کیجئے۔ آمین یارب العالمین۔

اصل العبادۃ

عبادت کے متعلق یہ وعظ کیرانہ کی جامع مسجد میں بروز جمعہ ۲۷ ربیع الاول ۱۳۳۶ھ کو منبر پر بیٹھ کر بیان فرمایا جو ۳ گھنٹوں میں ختم ہوا۔ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمدلله نحمده و نستعينه ونستغفره ونومن به ونتوكل عليه و نعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له ونشهدان لااله الاالله وحده لاشريک له ونشهدان سيدنا ومولانا محمدا عبده ورسوله صلى الله تعالى عليه وعلى اله واصحابه و بارک و سلم.

امابعد فقد قال النبیّ صلّی اللّٰه علیه وسلّم فضل العالم على العابد کفضلی علی ادناکم. (سنن الترمذی ۲۶۸۵)

ترجمہ: ''ارشاد فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسی میری فضیلت تم میں سے کسی ادنیٰ پر۔''

تمہید: ہر چند کہ اس وقت طول سفر سے ایسا تکان ہے کہ بیان کی ہمت نہ ہوتی تھی مگر احباب نے محبت سے درخواست کی میں نے عذر بھی کیا۔ ادھر سے اصرار ہوا تو میں نے یہ خیال کیا کہ جتنی دیر احباب کے جواب وسوال میں لگے گی اتنی دیر بیان ہی کردوں گا۔ اس لیے میں نے درخواست منظور کر لی اور بیان کی ہمت ہوگئی مگر بیان مختصر ہوگا لیکن نہ ایسا مختصر کہ مقصود میں مخل ہو بلکہ مقصود کے لیے انشاء اللہ کافی شافی ہوگا۔ اس وقت جو حدیث میں نے پڑھی ہے اس میں ایک عام غلطی کی اصلاح ہے اول اس کا ترجمہ کرتا ہوں پھر تفصیل عرض کروں گا۔

عالم کی فضیلت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسی میری فضیلت تم سے ادنیٰ آدمی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت اور شان تو یہ ہے:

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

(اللہ کے بعد سب سے عظیم المرتبت شخصیت جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے)

جب آپ تمام انبیاء سے اور سب ملائکہ سے افضل ہیں تو اولیاء کس پوچھ میں ہیں اور اُمت کے ادنیٰ آدمی تو کس شمار میں ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر تو کوئی بھی نہیں ہے نہ علم میں نہ حال میں نہ عمل میں نہ کمال میں نہ عبادت میں نہ درجات قرب میں۔ خود ارشاد فرماتے ہیں:

آدم ومن دونہ تحت لوائی یوم القیامۃ[1]

''کہ آدم علیہ السلام اور ان کے سوا سب آدمی قیامت کے دن
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے تلے ہوں گے۔''

غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات دیکھنے سے یہ بات واضح ہے کہ حضورؐ کے برابر بھی کوئی نہیں، زیادہ تو کیا ہوتا پھر اُمت پر اور اس میں بھی ادنیٰ اُمتی پر تو کس قدر فضیلت ہوگی۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ عالم کی فضیلت عابد پر اس درجہ کی ہے جس درجہ میری فضیلت ہے ایک ادنیٰ اُمتی پر، یہ تو حدیث کا ترجمہ ہوا، اب میں اس غلطی پر متنبہ کرتا ہوں جس میں لوگ مبتلا ہیں اور اسی لیے اس کی اصلاح کی ضرورت ہے۔

ایک عام غلطی

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ انسان سب کے سب عبادت کے لیے پیدا ہوئے ہیں اس لیے عبادت کی تو ضرورت ظاہر ہے اور علم کی ضرورت اس لیے ہے کہ عبادت کا طریقہ بدون اس کے معلوم نہیں ہوسکتا اور ظاہر ہے کہ ہر کام کے لیے طریقہ کی ضرورت ہے۔ مثلاً روٹی کھانا ضروری ہے مگر اس کے لیے طریقہ جاننے کی بھی ضرورت ہے کہ روٹی کیونکر پکائی جاتی ہے، آٹا کیونکر پیسا جاتا ہے، غرض ہر کام میں علم وعمل دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

اب سمجھئے کہ لوگوں کی اس باب میں غلطی کیا ہے، سب سے پہلی غلطی تو یہ ہے کہ لوگوں کو اول تو دین کی طرف توجہ ہی نہیں، اگر ہوتی ہے تو وہ بھی دنیا کی غرض سے ہوتی ہے۔ باستثناء غرباء کے ان بیچاروں کو تو دین کی محبت ہے جو کام کرتے ہیں دین کے واسطے کرتے ہیں مگر یہ جو بڑے طبقہ کے لوگ

---

[1] مسند امام احمد بن حنبل ۱: ۲۸۱

ہیں ان کو جو دینی کام کی رغبت ہے محض تفاخر اور جاہ کے لیے ہوتی ہے چنانچہ آج کل جو انجمنیں قائم ہیں اس کے عہدیدار اپنے نام کے ساتھ سیکرٹری اور سپرنٹنڈنٹ اور گورنر وغیرہ لکھتے ہیں۔ بس یہ جاہ اور عزت ان کو مطلوب ہے ورنہ خود اپنے قلم سے اپنے نام کے ساتھ ان عہدوں کا ذکر نہ کرتے۔

بریلی سے میرے پاس ایک صاحب کا خط آیا اس میں انہوں نے اپنے نام کے ساتھ گورنر یتیم خانہ لکھا تھا پھر تہذیب یہ کہ خط میں استفتاء تھا اور جواب کے لیے ٹکٹ ندارد۔ میں نے یہ رعایت کی کہ جواب لکھ کر بیرنگ روانہ کر دیا ان حضرت نے میری اس رعایت کی یہ قدر کی کہ بیرنگ خط کو واپس کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد میں نے بیرنگ خط بھیجنے سے توبہ کر لی بس جس خط میں ٹکٹ نہ ہو جواب کے لیے اس کو چند روز امانت رکھ کر ردی میں دیتا ہوں۔ پھر جلدی ہی میرا بریلی جانا ہو گیا تو میں نے وہ بیرنگ خط اپنے ساتھ لے لیا کہ اگر ان حضرت سے ملاقات ہوئی تو ان سے ایک آنہ وصول کروں گا۔ چنانچہ وہاں پہنچ کر میں نے ایک مجلس میں بھائی سے اس کا ذکر کیا کہ یہاں یتیم خانہ کے گورنر کون صاحب ہیں؟ انہوں نے ایسی بدتہذیبی کی کہ میرے پاس استفتاء بھیجا اور جواب کے لیے ٹکٹ بھی نہ رکھا، قاعدہ کے موافق تو اس کا مقتضاء یہ تھا کہ میں خط کو ردی میں ڈال دیتا مگر میں نے رعایت کر کے ان کے خط کا جواب بیرنگ بھیج دیا تو انہوں نے میرے ساتھ یہ تہذیب برتی کہ بیرنگ خط واپس کر کے مجھے تاوان ادا کرنے پر مجبور کیا، میں ان حضرت سے اپنا ایک آنہ وصول کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ تاوان ناحق میرے ذمہ پڑا۔ بھائی نے یاد نہیں کیا کہا پھر مجلس برخواست ہونے کے بعد بھائی نے کہا کہ آپ نے غضب کیا یہ صاحب جو آپ کے سامنے بیٹھے تھے یہ گورنر صاحب کے صاحبزادے تھے، میں نے کہا اچھا ہوا گورنر صاحب کو اپنی حرکت کا علم تو ہو جائے گا۔

حب جاہ

بڑے طبقہ کے لوگ اکثر دین کے کام دین کی نیت سے نہیں کرتے بلکہ دنیا کی نیت سے کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک انجمن کے سیکرٹری شراب پیتے تھے مگر اس کے ساتھ بھی وہ اسلامی انجمن کے سیکرٹری تھے کیا ایسے لوگوں سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ وہ دین کے واسطے انجمن کی خدمت کرتے ہیں؟ ہرگز نہیں بلکہ محض جاہ کے واسطے مجھے اس انجمن میں بلایا گیا تھا،

میں نے انکار کر دیا کیونکہ جس انجمن کا سیکرٹری نااہل ہو اس میں شرکت کرنا سیکرٹری کی جاہ بڑھانا ہے اور نااہل کی جاہ بڑھانا اور اس کے عہدہ کو تسلیم کرنا خود ناجائز ہے۔ ہاں کوئی اس واسطے شرکت کرے کہ ایسے نااہلوں کے معزول کرنے میں سعی کرے تو جائز ہے اور ایسے لوگوں کو سیکرٹری وغیرہ صرف اس واسطے بنایا جاتا ہے کہ وہ چندہ خوب وصول کرتے ہیں، غرباء کے اوپر ٹیکس کی طرح چندہ مقرر کرتے ہیں اور اپنے دباؤ اور اثر سے جبراً وصول کرتے ہیں۔ اس کام میں ان کی مدح کی جاتی ہے کہ فلاں صاحب دین کے کاموں میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ سبحان اللہ! یہ بڑا دین کا کام کیا کہ غرباء کے گلے پر چھری رکھ کر چندہ وصول کر لیا، ان سے اچھے تو وہ لوگ ہیں جو کھلم کھلا ڈاکو ہیں کیونکہ وہ لوگوں سے مال چھین کر اپنے بال بچوں کو تو کھلاتے ہیں جن کا نفقہ ان کے ذمہ واجب ہے تو گو ان کا ذریعہ معاش تو حرام ہے مگر مصرف ایسا ہے جس میں خرچ کرنا ان کے ذمہ واجب تھا تو وہ حرام کا ارتکاب کر کے ایک واجب سے تو سبکدوش ہوئے اور یہ سیکرٹری صاحب حرام طریقہ سے چندہ وصول کر کے ایسی جگہ صرف کرتے ہیں جس کی خدمت ان کے ذمہ واجب نہیں اور ڈاکو کی سزا معلوم ہے۔ تو یہ لوگ اس کے واسطے تیار رہیں۔ افسوس آج کل چندہ میں اس کا اصلاً لحاظ نہیں کیا جاتا کہ یہ مال خوشی سے دیا گیا ہے یا جبر سے۔

طیب نفس اور اشراف نفس

حق تعالیٰ شانہ نے تو بیوی کے مال کے بارے میں فرمایا ہے:

فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا

"کہ بیوی اگر اپنے دل کی خوشی سے مرد کو اپنے مہر میں سے کچھ دے دے تو اس کا کھانا جائز ہے۔"

یہاں بھی طیب نفس کی قید ہے حالانکہ میاں بیوی کا تعلق عاشق معشوق کا تعلق ہوتا ہے اور ایسے تعلق میں ناگواری بھی بہت ہی کم ہوتی ہے تو پھر غرباء کا روپیہ بدوں طیب قلب کے کیوں کر جائز ہوگا۔ بیوی کے معاملہ میں ایک مقام پر اس سے بڑھ کر ارشاد ہے:

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَافَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى.

''کہ اگر تم اپنی بیوی کو دخول سے پہلے طلاق دے دی ہو اور مہر مقرر ہو چکا ہو بیوی کے لیے نصف مہر ہے مگر یہ کہ وہ اپنا حق معاف کر دے (تو کچھ نہ رہے گا) اور اے مردو! تم معاف کر دو تو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔''

یعنی مرد کے لیے زیادہ بہتر یہ ہے کہ عورت کی معافی کا منتظر نہ رہے بلکہ خود اپنا حق معاف کر دے تو دیکھئے باوجود یہ کہ عورت اگر خوشی سے مہر معاف کر دے تو اس کا قبول کرنا جائز ہے اور اس کی اجازت دیدی گئی تھی مگر اس مقام پر دوسرا ادب سکھلایا گیا ہے، غیرت کا مقتضا یہی ہے کہ عورت کی معافی کو قبول نہ کرو بلکہ تم اس کے ساتھ احسان کرو جب بیوی کے ساتھ لین دین کرنے اور اس کا عطیہ قبول کرنے کے لیے یہ آداب ہیں تو بھلا چندہ کے لیے آداب نہ ہوں گے؟ ضرور ہیں اور ان کا لحاظ کرنا واجب ہے۔ شریعت مقدسہ نے تو ہدیہ کے لیے بھی آداب مقرر کیے ہیں۔ چنانچہ ایک ادب یہ ہے:

ما اتاک من غیر اشراف نفس فخذہ و ما لا فلا تتبعہ نفسک[1]

''کہ جو چیز ہدیہ وغیرہ بدون انتظار کے آجائے لے لو اور جو انتظار سے آئے اپنے نفس کو اس کے پیچھے مت ڈالو۔''

اس پر ایک واقعہ مجھے یاد آیا بلگرام میں ایک بزرگ عالم متوکل تھے ایک دن ان کے یہاں فاقہ تھا صبح کو جب حسب معمول پڑھانے لگے تو شاگرد نے چہرہ اور آواز سے پہچان لیا کہ شیخ کو فاقہ کا ضعف ہے۔ اس نے دو چار سطریں پڑھ کر کتاب بند کر دی اور یہ کہا کہ میری طبیعت آج اچھی نہیں آج سبق موقوف فرما دیجئے۔ استاد نے سبق کا ناغہ منظور فرما لیا اور شاگرد وہاں سے اٹھ کر اپنے گھر گئے اور تھوڑی دیر میں ایک خوان سر پر رکھے ہوئے آئے جس میں عمدہ عمدہ کھانے تھے، وہ خوان استاد کے سامنے پیش کیا کہ یہ ہدیہ قبول فرمائیے۔ استاد نے کہا کہ یہ ہدیہ ایسے وقت آیا کہ مجھے اس کی ضرورت تھی مگر ایک عذر اس کے قبول سے مانع ہے وہ یہ کہ تم جس وقت اٹھ کر چلے ہو میرے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ تم کھانا لینے گئے ہو اور حدیث میں آیا ہے:

---

[1] جمهرة انساب العرب: ۱۶۷

ما اتاک من غیر اشراف نفس فخذہ و ما لا فلا تتبعہ نفسک[1]

''جو ہدیہ بغیر انتظار کے مل جائے اسے قبول کرو جو انتظار سے آئے اپنے نفس کو اس کے پیچھے مت ڈالو۔''

اور یہ ہدیہ اشراف النفس کے بعد آیا ہے۔ اس لیے اس کا قبول کرنا خلاف سنت ہے وہ شاگرد بھی ان بزرگ کی صحبت کی برکت سے فہیم تھے۔ اس نے شیخ پر اصرار نہیں کیا۔ اگر ہم جیسے ہوتے تو اصرار کرنے لگتے اور عاجزی کے ساتھ منہ بنا بنا کر خوشامد کرتے کہ جس طرح بھی ہو اب تو قبول ہی کر لیجئے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ آج کل کھانا کھانے میں اصرار کیا جاتا ہے کہ اور کھائیے میری خاطر سے تھوڑا سا تو اور کھا لیجئے، اب انکار کیا جائے تو ان کی دل شکنی ہوتی ہے اور کھایا جائے تو اپنی شکم شکنی ہوتی ہے۔ وہ تو اصرار کر کے زیادہ کھلا کر اپنے گھر آرام سے سو رہیں گے اور ہم کو زیادہ کھانے سے رات بھر بے چینی رہے گی، نہ نیند آئے گی نہ طبیعت صاف ہوگی اس لیے میں ایسے اصرار کو قبول نہیں کرتا۔

چنانچہ اس وقت بھی اس سفر میں مجھے ایک واقعہ پیش آیا کہ ایک موقع پر ایک بوڑھے میاں نے دعوت پر اصرار کیا میں نے معقول عذر کر دیا کہ آج فلاں صاحب کے یہاں جانا ہے ان کے یہاں دعوت پہلے منظور ہو چکی ہے، وہ کہنے لگے چونکہ آپ نائب رسولؐ ہیں اس لیے مجھے آپ کو کھلانے کا اشتیاق ہے، میں نے کہا چونکہ میں آپ کے نزدیک نائب رسولؐ ہوں اسی لیے تو میں وعدہ خلافی سے رکتا ہوں کہ آج مجھے فلاں جگہ جانا ہے وہاں اطلاع کر چکا ہوں اس لیے آپ کی دعوت قبول کرنے سے قاصر ہوں۔ کہنے لگے کہ کبھی وعدہ ملتوی بھی تو ہو جاتا ہے میں نے کہا بہت اچھا میں سب سے پہلے آپ کی دعوت قبول کرتا ہوں اور قبول کر کے ملتوی کرتا ہوں کیونکہ وعدہ کبھی ملتوی بھی تو ہو جاتا ہے، اب تو وہ بڑے چپ ہوئے، میں نے اپنے دل میں کہا کہ واقعی یہ بڑے میاں پنشن پانے کے قابل ہیں اس کے بعد انہوں نے نقد ہدیہ پیش کیا کہ دعوت کی بجائے اسی کو قبول فرما لیجئے۔ میں نے کہا چونکہ آپ نے مباحثہ کی صورت اختیار کی ہے جس سے مجھے تکدر ہوا، اس لیے اب تو میں نقد بھی نہ لوں گا نہ آپ کی سواری پر سوار ہوں گا تو

---

[1] جمھرۃ انساب العرب: ۱۶۷

آج کل لوگوں کو اصرار کا بڑا مرض ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ دوسرے کے قاعدے اور ضابطے تو سب لغو ہیں، اصرار ان کی ہر تجویز صحیح ہے، بڑی بدتمیزی کی بات ہے۔

تو وہ شاگرد ایسے بدتہذیب نہ تھے جب استاد کا معقول عذر سنا تو خوان اٹھا کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ میں خلاف سنت کام کرنے پر آپ کو مجبور نہیں کرتا، بہت اچھا میں اس کو واپس لے جاتا ہوں۔ چنانچہ کھانا واپس لے گئے اور اتنی دور چلے گئے کہ شیخ کو یقین ہو گیا کہ واپس لے گئے، اس کے بعد تھوڑی دیر میں پھر حاضر ہوئے اور عرض کیا حضرت اب تو اشراف النفس ختم ہو گیا اب قبول فرمالیجئے، شیخ کو محبت کا جوش ہوا اور کھڑے ہو کر شاگرد کو سینہ سے لگالیا۔

دیکھئے تہذیب اس کا نام ہے کہ شیخ کی بات کو رد بھی نہ کیا اور ہدیہ بھی ان کے اصول کے موافق پیش کر دیا۔ واقعی جب انسان کو محبت ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو آداب محبت خود سکھا دیتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ہے کہ جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ہوئی تو اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پچیس سال کی عمر تھی اور حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عمر چالیس سال تھی، یہ بیوہ تھیں اور بہت مال دار چنانچہ اپنے تمول ہی کی وجہ سے ملکہ عرب مشہور تھیں اور یہاں سے مخالفین اسلام کو شرم کرنا چاہیے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرتے ہیں کہ معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عورتوں ہی کی فکر رہتی تھی۔ اس واقعہ کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ آپ کو عورتوں ہی کی فکر رہتی تھی۔ حضور کو جوان کنواری لڑکی ملنا کیا دشوار تھا، اگر آپ چاہتے تو بوجہ عالی خاندان ہونے کے کہ بنی ہاشم مکہ کے سردار تھے، آپ کو کتنی ہی لڑکیاں مل سکتی تھیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے کبھی اس امر پر توجہ ہی نہیں کی پھر علاوہ عالی خاندان ہونے کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت بھی بہت زیادہ تھی کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ آپ کو تیس مردوں کی قوت عطا ہوئی تھی۔

وفی روایۃ اربعین وقال مجاھد اعطی قوۃ اربعین من رجال الجنۃ

حدیث کو کوئی نہ مانے تو حضرت رکانہ کا واقعہ اس کے سامنے پیش کیا جائے گا کہ وہ

عرب کے مشہور پہلوان تھے جن کی طاقت وقوت ہزار مردوں کے برابر شمار کی جاتی تھی۔ ان کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تبلیغ کی تو انہوں نے کہا کہ کوئی بات دکھلاؤ تو میں ایمان لاؤں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بتلاؤ کیا چاہتے ہو کہنے لگے کہ مجھ سے زیادہ طاقتور عرب میں کوئی نہیں۔ اگر آپ کشتی میں مجھے پچھاڑ دیں تو ایمان لے آؤں گا۔ حضورؐ نے فرمایا بہت اچھا: چنانچہ کشتی ہوئی اور حضورؐ نے رکانہ کو پچھاڑ دیا، وہ بڑے حیران ہوئے اور کہنے لگے یہ اتفاقی بات ہے، دوبارہ پھر کشتی ہو۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر رکانہ کو پچھاڑ دیا تو وہ اسلام لے آئے۔

جب حضورؐ کی قوت کی یہ حالت ہے تو حضورؐ کے لیے نکاح میں اُمت سے زیادہ وسعت دیا جانا عین موافق عقل ہے۔ یہ تو جملہ معترضہ تھا۔

آداب ہدیہ

میں یہ کہہ رہا تھا کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نکاح کے وقت حضرت صدیق اکبرؓ کو یہ خیال ہوا کہ اس موقع پر حضورؐ کی طرف سے بھی مہر وغیرہ میں زیادہ خرچ ہونا چاہیے تا کہ سُبکی نہ ہو مگر آپ کے پاس مال تھا نہیں، اس کی تدبیر یہ کی کہ ایک حیلہ سے آپ کو روپیہ دیا کیونکہ ویسے لینے کی اُمید نہ تھی، وہ حیلہ یہ کیا کہ حضورؐ سے آ کر عرض کیا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کے دادا صاحب نے کچھ رقم میرے دادا کے پاس امانت رکھی تھی، میں نے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ حضورؐ کے سامنے وہ امانت پیش کروں مگر موقع کا منتظر تھا کہ جب آپ کو ضرورت زیادہ ہوگی اس وقت پیش کروں گا چنانچہ اب موقع ہے اس لیے پیش کرتا ہوں۔

یہ حیلہ حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس واسطے کیا کہ تا کہ حضورؐ کو ہدیہ کے قبول کرنے سے گرانی نہ ہو۔ تو یہ آداب ہیں ہدیہ کے کہ اس طرح پیش کیا جائے جس سے دوسرے پر گرانی نہ ہو۔ دیکھئے حضرت صدیقؓ نے کس تدبیر سے حضورؐ کو راحت پہنچائی۔ وہاں تو یہی مقصود تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مجھ سے راحت پہنچے۔ حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نبوت سے پہلے ہی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت تھی۔

غرض ہدیہ میں یہ ضروری ہے کہ کسی پر گرانی نہ ہو، نہ مہدی پر نہ مہدی علیہ پر یہی شرط

ہے صدقہ میں۔ چنانچہ بزرگوں نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص مجمع میں سوال کرنے پر دو روپیہ دے اور تنہائی میں ایک روپیہ دے تو اس میں ایک روپیہ حلال ہے اور ایک حرام ہے۔ یہی باقاعدہ چندہ میں بھی ہے مگر چندہ میں تو قصداً یہ تدبیر کی جاتی ہے کہ مجمع میں تحریک کی جائے تاکہ جو شخص ایک روپیہ دیتا ہے وہ شرما شرمی پانچ تو دے گا۔ یاد رکھو یہ صورت بالکل ناجائز ہے مگر لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔

مقصود بالذات

میں کہتا ہوں کہ یہ بتلاؤ مقصود بالذات کیا ہے، کام مقصود ہے یا دین؟ اگر صرف کام ہی مقصود ہے تو منافقین درک اسفل نار (دوزخ کے گہرے گڑھے) میں کیوں ہوں گے کیونکہ وہ بھی تو جہاد وغیرہ کرتے تھے۔ معلوم ہوا کہ جس کام میں رضائے حق نہ ہو وہ کام نہیں ہیں۔ مسلمان کا مقصود رضائے حق ہے چاہے کام تھوڑا ہو مگر رضائے حق کے موافق ہونا چاہیے۔ مثلاً اگر یتیم خانہ بہت بڑا ہو مگر رضائے حق نہ ہو تو اس کو لے کر کرنا کیا ہے۔

چنانچہ آج کل جو ایک بہت بڑی انجمن ہے میں اس کا نام بیان کرنا نہیں چاہتا۔ اس کا ایک عجیب واقعہ سنا ہے جس سے حیرت ہوگئی وہ یہ کہ لکھنؤ میں ایک کسی نے اپنی بہت بڑی جائیداد ایک متوکل عالم تنگ دست کے سامنے پیش کی کہ اس کو قبول فرما کر اپنے تصرف میں لائیے، انہوں نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد اس نے انجمن والوں کے سامنے پیش کیا کہ میری طرف سے اس کو انجمن کے واسطے وقف کر دو انہوں نے قبول کر لیا۔ لکھنؤ کے عوام نے اس پر عجیب فقرہ کسا کہ میاں وہ بزرگ تو اکیلے تھے، ان کو گناہوں کے بار کا تحمل نہ تھا اور انجمن میں تو بہت سے موٹے موٹے ہیں وہ سب مل کر تھوڑا تھوڑا اٹھا لیں گے۔

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کو صرف انجمن کا چلانا مقصود ہے رضائے حق مقصود نہیں ورنہ حلال وحرام کی ضرور رعایت کرتے اور یہ ساری خرابی حب جاہ کی ہے کہ ان لوگوں کو کام سے جاہ مطلوب ہے۔

چنانچہ ڈیگ میں ایک انجمن کے سیکرٹری مجھ سے ملے اور انجمن سے لوگوں کی بے

توجہی کی شکایت کرنے لگے۔ میں نے کہا کہ دوسروں کو کام میں لگانے کی اور ان کی شکایت کی آپ کو کیا ضرورت ہے۔ آپ پہلے خود کام کرنا شروع کر دیں جتنا بھی آپ سے ہو سکے، دوسروں کو آپ تنگ نہ کریں پھر کام میں خود کشش ہوتی ہے۔ لوگوں کو خود بخود توجہ ہو جاوے گی۔ جب وہ چلے گئے تو لوگوں نے مجھ سے کہا کہ تم نے ان کے مرض کو خوب سمجھا۔ واقعی بات تو یہی ہے کہ یہ خود تو کوئی کام نہیں کرتے اور دوسروں سے چندہ وصول کرنا اور کام لینا چاہتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ سیکرٹری بننے کا شوق ہے اور کام کا نام صفر ہے۔ غرض واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کل جو لوگ دین کی خدمت کرتے ہیں محض جاہ کے لیے کرتے ہیں دین اور رضائے حق مطلوب نہیں۔

خدا پرستی اور قوم پرستی

چنانچہ اسی حالت کے متعلق میرے ایک دوست کا خواب ہے کہ انہوں نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو محاسن اسلام پر تقریر کرتے ہوئے دیکھا مگر خواب ہی میں یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قبل از اسلام محاسن اسلام پر تقریر کر رہے ہیں، میں نے اس کی یہی تعبیر دی کہ اس خواب میں آج کل کے حامیان اسلام کی خدمت اسلام کی حقیقت بتلائی گئی ہے کہ ان کی یہ حمایت اسلام ایسی ہے جیسے حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نبوت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت والفت تھی کہ وہ نصرت محض دوستانہ تھی، رضائے حق کے لیے نہ تھی۔ اسی طرح آج کل جو لوگوں کو اسلامی درد ہے یا حمایت اسلام کا ولولہ ہے وہ محض قوم پرستی اور ہمدردی قوم سے ناشی ہے، طلب رضائے حق سے ناشی نہیں ورنہ اتباع احکام کا اہتمام ضرور ہوتا۔

اب تو یہ حالت ہے کہ انجمنوں میں ہزاروں روپیہ جمع ہے اور بینک میں داخل ہے جس کا سود لے رہے ہیں۔ یہ کیا دین ہے مگر ان کی بلا سے سود ہو یا سود سے بھی بدتر۔ ان کی انجمن کا کام چلنا چاہیے کیونکہ اس کی بدولت یہ سیکرٹری، رفارمر اور لیڈر بنے ہوئے ہیں۔ اسی سے ان کی وقعت ہے اور یہی ان کو مطلوب ہے اس لیے آج کل زیادہ کام قوم پرستی

کرارہی ہے، خدا پرستی نہیں کراتی۔

خدا پرستی تو یہ ہے کہ ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ایک کافر معرکہ جہاد میں میرا ایک ہاتھ کاٹ دے، پھر جب مجھے اس پر قابو ملے اور میں اس کو مارنا چاہوں تو وہ کلمہ اسلام زبان سے پڑھ دے تو میں کیا کروں۔ حضورؐ نے فرمایا: ہاتھ روک لو۔ صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حالت میں تو وہ محض جان بچانے کو کلمہ پڑھتا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: ہاتھ روک لو اگر تم نے اس کو کلمہ پڑھنے کے بعد قتل کیا تو اس کی وہ حالت ہوگی جو کلمہ اسلام کے بعد تمہاری حالت ہوئی تھی اور تمہاری وہ حالت ہوگی جو کلمہ پڑھنے سے پہلے اس کی حالت تھی تم کو کسی کے دل کی کیا خبر ہے۔

یہ ہے خدا پرستی کہ تمام مصالح پر خاک ڈال دی اور حکم کا اتباع کیا۔ چنانچہ حضرات صحابہ کے کارناموں سے معلوم ہوگا کہ انہوں نے ان احکام کی کس قدر پابندی کی۔

حضرت عمرؓ اور پابندی شریعت

ایک واقعہ مجھے اسی قسم کا یاد آ گیا جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں پیش آیا تھا کہ ہرمزان فارسی سے جو شاہان فارس میں سے ایک بادشاہ تھا، مسلمانوں کی صلح ہوگئی تھی مگر اس نے صلح کے بعد عذر کیا پھر مسلمانوں نے اس کے ملک پر حملہ کیا اور صلح کے لیے خوشامد کرنے لگا، پھر عذر کیا، صحابہ نے پھر اس کے ملک پر حملہ کیا تو پھر صلح کی درخواست کرنے لگا، حضرات صحابہ نے اس مرتبہ صلح منظور نہ کی کیونکہ تجربہ ہو چکا تھا تو اس نے درخواست کی کہ اچھا مجھ کو حضرت عمرؓ کے پاس بھیج دیا جائے وہ جو فیصلہ میرے حق میں کردیں گے مجھے منظور ہے۔ چنانچہ اس کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بھیج دیا گیا۔ اس کی صورت دیکھ کر حضرت عمرؓ کو غصہ سے تاب نہ رہی کیونکہ اس نے صلح کر کے مسلمانوں کے بڑے بڑے بہادر اور جلیل القدر صحابہ کو قتل کیا تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے غصہ کے ساتھ اس کو ڈانٹ کر فرمایا کہ تیرے پاس اس عذر کا کیا جواب ہے بولو؟ ہرمزان نے کہا زندوں کی طرح بولوں یا مردوں کی طرح کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہیں بات پورا کرنے سے پہلے ہی آپ مجھ کو قتل کردیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: تکلم لا باس بولو ڈرو نہیں؟ اس نے کہا اچھے مجھے پانی پلوادیجئے کہ پیاس سے بے تاب ہوں۔ حضرت عمرؓ

نے اس کے لیے پانی منگوایا جو ایک بھدے سے پیالے میں لایا گیا۔ ہرمزان نے کہا کہ میں مر بھی جاؤں گا تو ایسے پیالے میں پانی نہ پیوں گا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اس کے حق میں پیاس اور قتل کو جمع نہ کرو، اچھے گلاس میں پانی لے آؤ۔ چنانچہ لایا گیا تو ہرمزان نے گلاس منہ سے لگا کر ہٹا لیا کہ پینے کی ہمت نہیں ہوتی۔ مجھے اندیشہ ہے کہیں گلاس منہ کو لگاتے ہی میرا سر گردن سے جدا کر دیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: **لاتخف حتیٰ تشربه** کہ پانی پینے تک کچھ اندیشہ نہ کرو۔ یہ سنتے ہی ہرمزان نے پانی پھینک دیا اور کہا مجھے پیاس نہیں ہے، مجھے تو صرف امن لینا مقصود تھا، سو وہ مقصود حاصل ہو گیا۔ اب آپ مجھ کو قتل نہیں کر سکتے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا بھلا میں ایسے شخص کو زندہ چھوڑ سکتا ہوں جس نے براء بن مالکؓ اور فلاں فلاں جلیل القدر صحابہ کو قتل کیا ہے۔ ہرمزان نے کہا کہ میں نے کچھ ہی کیا ہو مگر آپ مجھ کو امن دے چکے ہیں اب قتل نہیں کر سکتے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں نے تجھ کو امن نہیں دیا۔ ہرمزان نے کہا، آپ واقعی مجھ کو امن دے چکے ہیں اس پر دوسرے صحابہؓ نے بھی ہرمزان کی تائید کی۔ واقعی آپ اس کو امن دے چکے ہیں کیونکہ آپ نے اس کو تکلم لاباس اور لاتخف حتیٰ تشربہ فرمایا ہے اور یہ الفاظ موجب امان ہیں۔ حضرت عمرؓ نے بھی اپنے کلام میں غور فرمایا تو سمجھ گئے واقعی میری زبان سے الفاظ امان نکل چکے ہیں۔ تو ہرمزان کو رہا کر دیا اور فرمایا: ''خدعتنی ولا انخدع الا لمسلم'' کہ تم نے مجھ کو دھوکہ دیا مگر میں مسلمان کے دھوکہ میں آ سکتا ہوں کافر کے دھوکہ میں نہیں آ سکتا۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر کے بعد ہرمزان مسلمان ہو گیا، حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ تو نے جان بچانے کے لیے تدبیریں کیوں کیں۔ اول ہی میں اسلام لے آتا تو تیری جان بچ جاتی، کہا اس صورت میں آپ کو میرے اسلام کی قدر نہ ہوتی۔ یہ خیال ہوتا کہ جان بچانے کے لیے مسلمان ہوا ہے اس لیے میں نے دوسرے طریقے سے جان بچالی اور آپ کو اپنے قتل سے روک دیا، اس کے بعد مطمئن ہو کر اسلام لایا۔ اب کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں کہ جان بچانے کو اسلام لایا ہے۔

تو اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کس قدر شریعت کے پابند اور وقاف عندالحدود تھے۔ عبدیت اسی کا نام ہے، بندہ کی شان تو یہ ہے کہ احکام کا اتباع کرے مصالح کی پروانہ کرے۔

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار　　　کار ملک ست انکہ تدبیر و تحمل بایدش

(دنیا کو سوختہ کرنے، رند کو مصلحت دیکھنے سے کیا غرض سلطنت کے امور میں تدبیر و

تحمل کی ضرورت ہے)

انجن کو کیا حق ہے کہ راستہ میں ڈرائیور کے ٹھہرانے کے بعد نہ ٹھہرے بلکہ اس کو ڈرائیور کے ٹھہرانے کے بعد فوراً ٹھہر جانا چاہیے، خواہ اس کے نزدیک ٹھہرنے کی جگہ ہو یا نہ ہو۔

سلطان صلاح الدین کا سنہری اصول

سلطان صلاح الدین رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ جب وہ فتوحات سے فراغت کر چکے تو وزراء نے ان سے کہا کہ عیسائی رعایا کے واسطے ایک قانون سخت بنانا چاہیے کیونکہ یہ لوگ بدون سختی کے مفسدہ سے باز نہیں آتے اور قانون اسلام بہت نرم ہے اس سے مفسد لوگ دب نہیں سکتے۔ آپ نے فرمایا کہ قرآن و حدیث کافی ہے کسی نئے قانون کی ضرورت نہیں۔ خدا تعالیٰ کو پہلے سے سب کچھ معلوم تھا کہ مفتوحات اسلامیہ کی رعایا کس کس قسم کی ہوگی۔ انہوں نے اپنے علم سے یہ قانون نازل فرمایا ہے اس لیے ہمارے نزدیک قانون اسلام ہر قسم کی رعایا کے واسطے کافی ہے اور فرض کرلو کہ وہ کافی نہیں تو ہم کو تو رضائے حق مطلوب ہے بقائے سلطنت مطلوب نہیں۔ اگر قانون اسلام رائج کرنے سے سلطنت جاتی رہے گی بلا سے جاتی رہے کیونکہ اس صورت میں اللہ تعالیٰ تو ہم سے راضی رہیں گے اور دوسرا قانون رائج کرنے سے فرض کرلو سلطنت باقی رہے گی مگر خدا تعالیٰ ہم سے ناراض ہو جائیں گے اور ہم نے اس واسطے فتوحات نہیں کیں کہ خدا تعالیٰ کو ناراض کر کے سلطنت کریں ایسی سلطنت تو فرعون کو بھی حاصل تھی۔

مصلحت دیدن آنست کہ یاراں ہمہ کار بگذارند وخم طرہ یارے گیرند

(میں بڑی مصلحت یہ دیکھتا ہوں کہ دوست سب کو چھوڑ کر محبوب حقیقی کی طرف متوجہ ہو جائیں)

حصول علم کی ضرورت

غرض بڑے طبقہ کے اکثر لوگ جو دین کا بڑا کام کرتے ہیں وہ محض دنیا کے واسطے کرتے ہیں، دین کے لیے اور خدا کے لیے کم کرتے ہیں البتہ غرباء کی نیتیں دین کے کام میں درست ہیں کیونکہ ان کی عزت ہی کچھ نہیں وہ دین کا کتنا ہی بڑا کام کریں ان کی کوئی وقعت دنیا والے نہیں کرتے۔ ہاں خدا تعالیٰ ان کی وقعت فرماتے ہیں اور وہی وقعت کرنے والے کافی

ہیں۔ پس غرباء کوتو دین پر کچھ توجہ ہے امراء کونہیں ہے اسی لیے حدیث میں آتا ہے "هم اتباع الرسل" کہ انبیاء علیہم السلام کا اتباع کرنے والے غرباء زیادہ ہیں، اول تو شمار میں بھی غرباء زیادہ ہیں۔ دوسرے دین کی خدمت خدا کے لیے کرنے والے بھی زیادہ غرباء ہی ہیں۔ امراء اول تو دین کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے اور ہوتے بھی ہیں تو دنیا ہی کے لیے۱۲)

یہاں تک تو ان کی شکایت ہے جو کام ہی نہیں کرتے یا طریقے سے نہیں کرتے۔

اب میں ان کی شکایت کرتا ہوں جو کام کرنے والے ہیں کہ ان کو عمل کا تو اہتمام ہے مگر علم کا اہتمام نہیں، یہ لوگ نفلیں پڑھ لیں گے، حج کر لیں گے، روزے رکھ لیں گے، باقی یہ کہیں نہیں دیکھا جاتا کہ دینداری اختیار کرنے کے بعد کسی نے دین کی کوئی کتاب پڑھنا بھی شروع کر دی ہو، مجھے مشائخ کی بھی شکایت ہے اور ان مشائخ کی بھی جو علماء ہیں کہ وہ اپنے مریدوں کو وظائف و اوراد وغیرہ تو بتلاتے ہیں مگر مسائل واحکام کی کوئی کتاب پڑھنے سننے کو نہیں بتلاتے کہ فلاں کتاب دیکھنا یا کسی سے سن لینا ہاں اگر کوئی مولوی اپنی خوشی سے آجائے جیسے ایک نیم ٹرملا کے پیالا میں گوشت کی بوٹیاں اپنی خوشی سے آ گئی تھیں۔

نیم ٹر کا قصہ یہ ہے کہ اس کے گھر میں کسی کا مرغا آ گیا تو اس نے تین دفعہ پکار کر کہا یہ کس کا مرغا؟ مگر کس کا تو زور سے کہتا تھا اور مرغا آہستہ سے جب تین دفعہ ندا ہو چکی، بیوی سے کہا یہ لقطہ ہے حلال ہے اس کو ذبح کر لو، جب پک کر تیار ہو گیا، بیوی سے کہا کہ کھانا لے آؤ مگر شوربا نکالو بوٹی میں شبہ ہے وہ مت لانا۔ وہ شوربا اتارنے بیٹھی اور چمچے سے بوٹیوں کو ہٹا کر شوربا نکالنے لگی نیم ٹر بولے کہ چمچے سے نہ ہٹاؤ بلکہ کنارے سے شوربا نکال لو اس نے کہا اس طرح تو بوٹی بھی آوے گی فرمایا جو اپنی خوشی سے آجاوے اسے آنے دو تم خود مت لاؤ۔

تو اسی طرح کوئی مولوی خود ان کے گھر اپنی خوشی سے آجائے تو اب اس سے مسئلے پوچھتے ہیں کہ فلاں دن نماز میں یہ واقعہ پیش آیا، نماز ہوئی یا نہیں، مولوی صاحب نے جواب دیا کہ نماز نہیں ہوئی اس کا اعادہ کرو۔ پھر بعض تو اعادہ کر لیتے ہیں اور بعض کہہ دیتے ہیں کہ میاں سب ہو گئی اللہ تعالیٰ ہم جاہلوں کی ہر طرح قبول کر لیتے ہیں۔ اس عدم اعادہ کا منشاء ایک تو دین سے بے پروائی ہے یہ تو امر مشترک ہے، ایک منشاء طبعی ہے وہ یہ کہ عمل کرنے کے بعد جو اس میں کچھ خرابی

بتلائی جاتی ہے وہ انسان کو گراں گزرتی ہے۔ عمل سے پہلے جتنی بھی قیود لگادی جائیں وہ زیادہ گراں نہیں مگر جب کام ختم ہو چکے اب یہ کہنا کہ اس میں یہ خرابی ہے وہ خرابی ہے گراں گزرتا ہے۔

کھانے کے آداب

مجھے اس کا تجربہ یوں ہوا کہ ایک دفعہ میں نے ایک بڑے عہدیدار کی دعوت کردی اور یہ کام میں نے اصول طریق کے خلاف کیا۔ حضرت حاجی صاحب فرماتے تھے کہ مجھے ایک بزرگ نے وصیت فرمائی تھی کہ کسی کی دعوت نہ کرنا تو بزرگوں کا یہ اصول ہے مگر چونکہ وہ عہدیدار اکثر میرے پاس ملنے آتے تھے اس لیے میں نے شرم سے ان کی دعوت کردی، جب کھانا تیار ہوکر سامنے لایا گیا اور وہ کھانے بیٹھے تو کہنے لگے کہ میں مرچ بالکل نہیں کھاتا، اس وقت ان کا یہ کہنا مجھے بہت ہی گراں گزرا کہ بندہ خدا پہلے سے نہ کہہ دیا۔

یہ بھی قلت علم کی خرابی ہے کہ لوگوں کو کھانے کے آداب معلوم نہیں کھانے کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ جس کے یہاں مہمان ہو اس کو اپنے معمولات کی پہلے ہی اطلاع کردے، دسترخوان پر بیٹھ کر اپنے معمولات بیان کرنا تہذیب کے خلاف ہے کہ اس سے میزبان کو تکلیف ہوتی ہے۔ چنانچہ اس وقت واقعی مجھے بہت تکلیف ہوئی وہ تو اتفاق سے ہماری ایک عزیزہ اس زمانے میں آنکھیں بنوا کر آئی تھیں اور ڈاکٹر نے ان کو مرچ کھانے سے منع کررکھا تھا، ان کے ہاں سے بے مرچ کا سالن منگایا گیا تب عہدیدار صاحب نے کھانا کھایا۔

اس طرح کھانے کے آداب میں سے یہ ہے کہ میزبان مہمان کے اوپر مسلط ہوکر نہ بیٹھے بلکہ اس کو آزاد چھوڑ دے کہ جس طرح چاہے کھائے بعض لوگ مہمان کے کھانے کو دیکھتے ہیں کہ کس طرح کھا رہا ہے اس سے مہمان کو تکلیف ہوتی ہے۔

چنانچہ ایک صاحب نے میری دعوت کی اور میرے اوپر مسلط ہوکر دسترخوان پر بیٹھ گئے خود تو کھایا نہیں میرے کھانے کو دیکھنے لگے اور ایک ایک کھانا میرے آگے بڑھانے لگے، میں نے ایک بار تو کہہ دیا کہ میں کھالوں گا، آپ تکلیف نہ کریں مگر وہ کب ماننے والے تھے، پھر وہ کہنے لگے کہ آپ میرے باپ کے ملنے والوں میں سے ہیں اس لیے مجھے آپ سے خاص محبت ہے میں تو آپ کو باپ سمجھتا ہوں، میں نے دل میں کہا مگر میں آپ کو باپ سمجھتا ہوں۔

حضرت معاویہؓ کا دستر خوان بہت وسیع تھا، ہمیشہ آپ کے دستر خوان پر بہت بہت آدمی کھانے والے ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک بدوی آپ کے دستر خوان پر تھا جو بڑے بڑے لقمے کھا رہا تھا۔ اتفاق سے حضرت معاویہؓ کی نظر اس پر پڑ گئی تو آپ نے خیر خواہانہ طور سے نصیحت کی کہ لقمہ چھوٹا لو، کہیں گلے میں نہ پھنس جائے، بدوی یہ سنتے ہی کھڑا ہو گیا اور کہا آپ کو کھانا کھلانا نہیں آتا، آپ مہمانوں کے لقمے دیکھتے ہیں پھر ہر چند حضرت معاویہؓ نے خوشامد کی مگر وہ نہ ٹھہرا۔

تو کھانے کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ مہمانوں کے لقمے نہ دیکھے، ہاں خفیہ طور سے کہ مہمان کو نہ معلوم ہو کہ یہ مجھے دیکھ رہا ہے اس بات کی خبر گیری رکھے کہ کس کو کس چیز کی ضرورت ہے۔ اسی طرح آداب طعام میں سے یہ ہے کہ میز بان کے ہاتھ شروع میں پہلے دھلائے جائیں اور کھانا بھی اول میز بان کے سامنے رکھا جائے۔

امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کے مہمان ہوئے تو امام مالک رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے خادم سے فرمایا کہ پہلے میرے ہاتھ دھلاؤ اور میرے سامنے کھانا پہلے رکھو کیونکہ مقصود تو مہمان کو راحت دینا ہے اور مہمان کو راحت اسی میں ہے کہ پہلے میز بان ہاتھ دھوئے اور کھانا شروع کرے، اس سے مہمان بے تکلف ہو جاتا ہے مگر ان باتوں کو عوام تو عوام مشائخ بھی نہیں جانتے اور جو جانتے ہیں وہ ان کی تعلیم نہیں کرتے۔

زاہد شدی و شیخ شدی دانش مند   ایں جملہ شدی ولیکن انساں نشدی

(زاہد اور شیخ بننا تو آسان ہے لیکن مسلمان بننا مشکل ہے)

مشائخ کے فرائض

مشائخ کو چاہیے کہ وظیفہ وغیرہ بتلانے سے پہلے دو کام بتلائیں، ایک اخلاق کی درستی، دوسرے بقدر ضرورت علم کی تحصیل۔ پہلے زمانہ میں اسی پر عمل تھا، مریدوں کی برسوں تک اصلاح اخلاق کرتے تھے اس کے بعد وظیفے تعلیم فرماتے تھے اور جو طالب علم دین سے کورا ہوتا اس کو تحصیل علم کی تاکید فرماتے تھے۔

چنانچہ شیخ عبدالحق رحمتہ اللہ علیہ کے پاس شیخ عبدالقدوس رحمتہ اللہ علیہ حاضر ہوئے تو شیخ نے پوچھا کہ علم دین کہاں تک حاصل کیا ہے، کہا کچھ نہیں۔ فرمایا جاہل ولی نہیں ہو سکتا، جاؤ پہلے

علم دین بقدر ضرورت حاصل کر کے آؤ۔ چنانچہ شیخ عبدالقدوس رحمتہ اللہ علیہ واپس ہو گئے اور کچھ عرصہ کے بعد پھر حاضر ہوئے تو حضرت شیخ عبدالحق رحمتہ اللہ علیہ کا وصال ہو چکا تھا تو آپ نے شیخ کے پوتے سے بیعت کی درخواست کی۔ انہوں نے بھی وہی سوال کیا کہ کیا پڑھا ہے۔ عرض کیا کافیہ تک پڑھا ہے، فرمایا: کافیہ کافی است باقی دردسر (کافیہ کافی ہے باقی دردسر ہے) اور بیعت فرمالیا۔ پھر گو ظاہر میں پوتے سے بیعت ہوئے تھے مگر روحانی فیض آپ کو شیخ عبدالحق ردولوی رحمتہ اللہ علیہ سے بہت زیادہ ہوا تو محققین مشائخ کی یہ عادت تھی کہ ہر شخص کو فوراً بیعت نہ کرتے تھے بلکہ اول اس کو مبادی کی تحصیل کا امر کرتے تھے اور اگر کوئی شخص مبادی کو حاصل کر کے آیا ہو اس کو بھی جلدی بیعت نہ کرتے تھے بلکہ امتحان طلب کے بعد بیعت فرماتے تھے۔

چنانچہ ہمارے حضرت حاجی صاحب اور حافظ ضامن صاحب رحمتہ اللہ علیہ میں باہم یہ قول و قرار ہو چکا تھا کہ دونوں ایک ہی پیر سے بیعت ہوں گے کیونکہ دونوں میں محبت بہت تھی۔ پھر حضرت حاجی صاحب تو ایک خواب کی وجہ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یا اور کسی بزرگ نے خواب میں آپ کا ہاتھ میاں جی صاحب کے ہاتھ میں دے کر فرمایا تھا کہ یہ تمہارے پیر ہیں، مدت تک تو اس سوچ میں رہے کہ یہ بزرگ کون ہیں پھر کسی سے حضرت میاں جی صاحب کے کمالات سن کر لوہاری حاضر ہوئے تو دیکھا تو میاں جی صاحب کی بالکل وہی شکل و صورت تھی جو خواب میں دیکھی تھی۔ حضرت میاں جی صاحب نے پوچھا کچھ کہنا ہے، حاجی صاحب نے عرض کیا، کیا آپ کو خبر نہیں میاں جی صاحب نے فرمایا کہ خواب و خیال کا کیا اعتبار اب تو حاجی صاحب کو اور زیادہ اعتقاد ہو گیا کہ آپ کو بھی خبر ہے کہ میں آپ کے حوالہ کیا گیا ہوں، بس رونا شروع کر دیا۔ حضرت میاں جی صاحب نے تسلی فرمائی اور حاجی صاحب کچھ ایسے مغلوب ہوئے کہ حافظ صاحب سے کہنا بھول گئے۔ حافظ صاحب نے جو دیکھا کہ حاجی صاحب روز روز لوہاری جاتے ہیں۔ ایک دن پوچھا کہ تم روز روز کہاں جایا کرتے ہو، حاجی صاحب نے فرمایا کہ میں نے ایک بزرگ سے بیعت کر لی ہے۔ حافظ صاحب نے فرمایا کہ ہمارا تم سے کیا عہد تھا، فرمایا میں بالکل بھول گیا، کہا اچھا اب ہم کو بھی ساتھ لے چلو۔ فرمایا بہت اچھا، چنانچہ دونوں حضرات پہنچے تو میاں جی صاحب نے حافظ صاحب سے پوچھا کہ کس ارادہ سے تشریف لائے، عرض کیا بیعت ہونے کے ارادہ سے آیا

ہوں، فرمایا میں اس قابل نہیں مجھے اس سے معاف رکھئے، کہا بہت اچھا میں اصرار نہیں کرتا کہ بزرگوں سے اصرار کرنا بے ادبی ہے۔ مگر اس کے بعد حافظ صاحب برابر حاضر ہوتے رہے یہاں تک کہ عرصہ کے بعد میاں جی صاحب نے فرمایا کہ کیا حافظ صاحب اب بھی وہی خیال ہے؟ عرض کیا حضرت میں تو اپنی طرف سے اول ہی دن بیعت ہو چکا ہوں آپ کو اختیار ہے قبول فرمائیں یا نہ فرمائیں، فرمایا بہت اچھا وضو کر کے آ جایئے۔

غرض مشائخ کا یہ طرز تھا کہ ہر شخص کے ساتھ اس کے مناسب برتاؤ کرتے تھے۔ یہ نہیں کہ جو آیا فوراً مرید کر لیا اور مرید کرنے کے بعد سب کو وظیفے بتلا دیئے، چاہے اس کو نماز کے اور پاکی ناپاکی کے مسائل بھی معلوم نہ ہوں بلکہ آج کل تو غضب یہ ہے کہ مریدوں کو علم کی ترغیب تو کیا دیتے الٹی یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ

"العلم هو الحجاب الاکبر" کہ علم بڑا حجاب ہے اور اس کے غلط معنی مشہور کیے ہیں، علم وصول الی اللہ سے مانع ہے خود اس کے معارض بزرگوں کا دوسرا ارشاد ہے:
"ماتخذ اللّٰه ولیاً جاهلا" کہ خدا تعالیٰ نے کسی جاہل کو ولی نہیں بنایا۔

(اور جو اہل اللہ امی تھے وہ جاہل نہ تھے وہ حضرات صحابہؓ کی طرح صحبت کے ذریعے سے ضروری مسائل و احکام معلوم کیے ہوئے تھے) بلکہ حجاب اکبر شاہی اصطلاح ہے۔ شاہی محاورہ میں حجاب اکبر وہ پردہ ہے جو بالکل بادشاہ کے پاس ہوتا ہے کہ اس کے بعد اور حجاب کوئی نہیں ہوتا جس کا لقب دہلی کے قلعہ میں لال پردہ تھا۔ پس مطلب اس کا یہ ہے کہ علم حاصل کرنے سے سب حجابات رفع ہو جاتے ہیں اور غایت قرب نصیب ہو جاتا ہے۔ حجاب اکبر کے یہ معنی ہیں۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے ایک دوسرے معنی بتلائے کہ العلم میں لام عہد ہے مراد علم غیر حق ہے۔ وہ بے شک مانع عن المقصود ہے اور میں نے اس کی یہ تفسیر کی ہے کہ علم سے مراد علم العلم ہے۔ یعنی دعویٰ علم اپنے آپ کو عالم سمجھنا یہ بڑا حجاب ہے کیونکہ تکبر ہے اور تکبر کا حجاب اکبر ہونا ظاہر ہے مگر اس سے نفس علم کا حجاب ہونا لازم نہیں آتا۔

لہٰذا مشائخ پر لازم ہے کہ اپنے مریدوں کو علماء سے نہ روکیں، گو علماء دو قسم کے ہیں ایک علماء صوفیاء دوسرے علماء خشک اور شاید تم علماء خشک سے روکنا ضروری سمجھتے ہو مگر میں کہتا ہوں کہ عالم خشک پھر بھی جاہل صوفی سے افضل ہے، جاہل صوفی کی مثال اگرچہ وہ تر ہے، جمنا کے بھنور

کی مانند ہے کہ لوگوں کے ایمان کو غرق کرتا ہے اور عالم خشک کی مثال جمنا کے ریت کی مانند ہے کہ گو خشک ہے مگر اس میں کوئی غرق نہیں ہوتا اور عالم صوفی ہو تو اس کی تو یہ شان ہے:

برکفے جام شریعت برکف سندان عشق — ہر ہوسناکے نداند جام وسنداں باختن

(ایک ہاتھ میں شریعت کا اور دوسرے ہاتھ میں عشق کا جام، ہر ہوسناکران دونوں کے ساتھ نمٹنا نہیں جانتا)

مجھے مشائخ سے یہ شکایت ہے کہ وہ اپنے مریدوں کو علماء سے روکتے ہیں۔ پہلے زمانہ میں مشائخ کا یہ برتاؤ نہ تھا۔ چنانچہ شیخ عبدالقدوس رحمتہ اللہ علیہ کو حضرت شیخ جلال تھانیسری اول اول نچنیا پیر کہتے تھے۔ کیونکہ شیخ عبدالقدوس صاحب وجد وسماع تھے مگر شیخ عبدالقدوس اپنے خادم کو علماء کے پاس تحصیل علم کے لیے بھیجتے تھے۔ علماء کے طعن وملامت سے ان پر یہ اثر نہیں ہوا کہ علماء سے اپنے خدام کو روک دیتے۔ مگر آج کل درویشوں کو علم سے ایسی نفرت ہے کہ اس سے دور بھاگتے ہیں، نفلیں تو خوب پڑھتے ہیں مگر مسائل کو نہیں سیکھتے نہ مشائخ ان کو سکھلاتے ہیں، ان کی نمازیں بھی درست نہیں ہوتیں اور جب بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ نماز نہیں ہوئی تو اعادہ گراں گزرتا ہے اور بہت کم لوگ ایسے ہیں جو بعد میں مسئلہ معلوم کر کے نماز کا اعادہ کرتے ہوں کیونکہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ عمل کے بعد اس میں خرابی معلوم ہونا طبعاً بہت گراں ہے۔ اب محبت وعشق کا غلبہ ہو تو عمل کی اصلاح کا اہتمام ہوگا ورنہ نہیں۔ پس آسان بات یہ ہے کہ پہلے ہی سے علم حاصل کر لیا جائے۔

فکر دین کے ثمرات

مجھے تو درویشوں میں صرف دو آدمی ایسے ملے ہیں جن کو مسائل شرعیہ کا اہتمام تھا۔ ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ وجد میں اگر غشی کی حالت میں گر پڑوں تو وضو رہے گا یا نہیں۔ میں اس سوال سے بہت خوش ہوا اور میں نے کہا کہ عمر بھر میں آج تم نے یہ سوال کیا ہے اور کسی نے نہیں کیا۔ معلوم ہوتا ہے تم کو دین کی فکر ہے اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں وضو کا اعادہ ضروری ہے، وہ کہنے لگا کہ درویشوں میں کوئی بھی وضو کا اعادہ نہیں کرتا۔ اس صورت میں مرید تو کیا پیر کی بھی نماز درست نہیں ہوتی مگر نماز کا اہتمام اور اس کی

قدر وقعت ہو تو مسائل جاننے کی فکر ہو۔

دوسرے ایک بزرگ شاہجہان پور میں تھے وہ بھی درویشوں میں ایسے ملے جن کو دین کا خیال تھا۔ انہوں نے بھی ایسا مسئلہ دریافت کیا کہ ان سے پہلے کسی نے دریافت نہیں کیا۔ انہوں نے لکھا کہ میرا ایک دشمن تھا، میں نے اس کے لیے بددعا کی تو وہ ہلاک ہو گیا، مجھے اس صورت میں قتل کا گناہ تو نہیں ہوا؟ اگر ہوا ہے تو اس کا کفارہ کیا ہے؟ کسی دوسرے شخص کو یہ واقعہ پیش آتا تو وہ اس کو اپنی کرامت وولایت قرار دیتا مگر ان بزرگ کو دین کی فکر تھی، ان کو گناہ کا اندیشہ ہوا، میں نے لکھا کہ آپ کے سوال سے بہت جی خوش ہوا، مسئلہ کا جواب یہ ہے کہ اگر آپ صاحب تصرف ہیں اور تصرف سے کام لیا ہے تو بے شک آپ قاتل بشبہ عمد ہیں، اب آگے تفصیل ہے کہ اگر وہ شخص شرعاً مباح الدم تھا تو گناہ نہیں ہوا اور نہ گناہ ہے اور شبہ عمد کا کفارہ بھی واجب ہوا، یعنی ایک غلام مومن آزاد کرنا یہ نہ ہو سکے تو دو مہینے پے در پے روزے رکھنا اور اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار کرنا اور اگر آپ صاحب تصرف نہیں یا ہیں مگر تصرف سے کام نہیں لیا صرف دعا پر اکتفا کی ہے تو قتل لازم نہیں آیا۔ اب یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ شخص بددعا کا محل نہ تھا تو بددعا کا گناہ ہوا جس سے توبہ استغفار لازم ہے، کفارہ قتل لازم نہیں اور وہ شخص جو ہلاک ہو گیا ممکن ہے یہ گستاخی کی سزا ہو۔ جیسا حافظ شیرازی فرماتے ہیں:

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات   بادرد کشاں ہر کہ درافتاد برافتاد

(اس دیر مکافات میں ہم نے بہت تجربہ کیا ہے کہ جو شخص اہل اللہ سے الجھا ہلاک ہو گیا)

اہل اللہ کو ستانا اچھا نہیں، اس کا ثمرہ جلد ہی مل جاتا ہے مگر ان بزرگ کا کمال دیکھئے کہ اس کو کرامت سمجھ کر بے فکر نہ ہوئے بلکہ ڈر گئے کہ مجھے بددعائے ناحق کا یا قتل کا یہ گناہ تو نہیں ہوا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ صدور کرامت کے بعد ولی کو بے فکر نہ ہونا چاہیے بلکہ حکم شرعی معلوم کر کے شریعت کا اتباع کرنا چاہیے۔

ہمارے حاجی صاحب کے یہاں ایک دفعہ عین وقت پر بہت سے مہمان آگئے، جتنا آٹا گوندھا گیا تھا وہ کافی نہ تھا، حضرت نے اپنا چادر یا رومال گھر میں بھیج دیا کہ اس کو آٹے پر ڈھک دو اور پکانا شروع کر دو، چنانچہ تھوڑے سے آٹے میں اتنی برکت ہوئی کہ سب

مہمانوں نے کھالیا اور بچ بھی گیا۔ حضرت حافظ محمد ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو حاجی صاحب کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: مبارک ہو کرامت ظاہر ہوئی۔ بس آپ کار ومال سلامت چاہئے پھر دنیا میں قحط کیوں پڑنے لگا اور قحط میں جو حکمتیں ہیں ان کا ظہور کیوں ہونے لگا، یہ سن کر حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا رنگ زرد ہو گیا اور فرمایا: حافظ صاحب میں توبہ کرتا ہوں کہ ایسی جرأت پھر نہ ہوگی۔

یہ تھے سچے لوگ اور آج کل تو حالت یہ ہے کہ کسی کو تصرف کی قوت عطا ہو جاتی ہے تو وہ اس کی اس طرح مشق کرتے ہیں کہ اپنے پاس آنے والے کے دل پر اثر ڈالتے ہیں تاکہ ان کے مدرسہ یا مسجد یا خانقاہ میں روپے دیئے جائیں۔ یاد رکھو ایسا تصرف جس سے دوسرے شخص کی آزادی سلب ہو جاوے حرام ہے اور یہ بھی ایک قسم کی ڈکیتی ہے مگر یہ لوگ اس کو اپنی کرامت سمجھتے اور اس پر فخر کرتے ہیں یہ ساری خرابی جہل کی ہے۔

فضیلت علم

اب تو آپ کو معلوم ہوا کہ علم نہ ہونے سے کتنی خرابیاں ہو رہی ہیں۔ پس بڑی کمی اس وقت یہ ہے کہ لوگ علم کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اگر کسی کو دین کی طرف توجہ کی توفیق بھی ہوتی ہے تو وہ مسجد بنواتا اور مسجد میں رقم لگاتا ہے، مدارس کی امداد نہیں کرتا چنانچہ لوگ مسجد میں تو تیل بہت دیتے ہیں مگر طلبہ کی خدمت نہیں کرتے۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم (سنن الترمذی:۲۶۸۵)

"کہ عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے میری فضیلت ادنیٰ اُمتی پر ہے۔"

اس فضیلت کا منشا یہ نہیں کہ علم کا نفع متعدی ہے اور عبادت کا نفع لازم کیونکہ علم کا نفع بھی متعدی نہیں لازم ہے۔ نفع متعدی اگر ہے تو تعلیم کا ہے بلکہ فضیلت علم کا منشا یہی ہے کہ وہ شرط عمل ہے کیونکہ عبادت بدون علم کے نہیں ہو سکتی اور جو ہوتی ہے وہ عبادت کی محض صورت ہوتی ہے حقیقت نہیں ہوتی۔ ہاں تعلیم کی فضیلت کا منشاء یہی ہے کہ اس کا نفع متعدی ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "**انما بعثت معلما**" (کہ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں) یہاں سے معلم کی فضیلت بھی معلوم ہوئی کہ وہ اس امر میں نائب رسولؐ ہے۔ ایک مرتبہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے تو وہاں دو جماعتیں تھیں، ایک علماء کی جو مسائل شرعیہ کا تذکرہ کررہے تھے دوسری عابدین کی جو ذکراذکار کررہے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم علماء میں بیٹھ گئے اور فرمایا "انما بعثت معلما" (میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں) مگر آج کل قرآن کے معلموں کی تو ایسی بے قدری ہے کہ دو روپیہ ماہوار اور کھانا ان کو ملتا ہے۔ اس سے زیادہ تنخواہ کسی کی ہوئی تو دس بارہ حد ہے۔ اسی طرح مؤذنوں کی اور اماموں کی بڑی بے قدری ہے بلکہ جو لوگ امامت سے پہلے معزز تھے، امام بن جانے کے بعد ان کی بھی بے قدری کی جاتی ہے کیونکہ وہ بھی مسجد کے ملا ہی کہلاتے ہیں۔ سو یاد رکھو کہ معلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب ہے مگر حضورؐ کا پیشہ معلّمی نہ تھا کہ اس پیشہ سے آپؐ نے گزر کیا ہو بلکہ آپؐ کا ذریعہ معاش جہاد اور توکل علی اللہ تھا۔ آج کل جو معلمین کی بے قدری ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اس کو پیشہ بنالیا ہے لیکن اگر مسلمانوں کو علم کی طرف توجہ ہوتی اور شوق ہوتا تو معلموں کو اس کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ شکایت تو اسی کی ہے کہ مسلمانوں کو علم کی طرف بالکل توجہ نہیں۔

اب میں اس حدیث کے متعلق ایک نکتہ بیان کر کے ختم کرتا ہوں وہ یہ کہ اس حدیث میں عالم سے مراد عالم محض نہیں جو عمل سے خالی ہو کیونکہ ایسے عالم کی تو دوسری حدیثوں میں بے حد مذمت وارد ہے بلکہ مراد وہ عالم ہے جو باعمل ہے مگر غلبہ اس پر علم کا ہے ایسے ہی عابد سے مراد عابد محض نہیں جو علم سے بالکل کورا ہو کیونکہ ایسا شخص عبادت کر ہی نہیں سکتا، بغیر علم کے تو عمل دشوار ہے اور اگر وہ عبادت کرے گا تو وہ محض نقل ہوگی، حقیقت عبادت نہ ہوگی بلکہ مراد وہ عابد ہے جو علم وعبادت کا جامع ہے مگر اس پر شان علم غالب نہیں بلکہ شان عمل غالب ہے تو ایسے عابد سے عالم اس لیے افضل ہے کہ علم خود موقوف علیہ عمل کا ہے اگر اس پر یہ شبہ کیا جائے کہ علم کا شرط عمل ہونا فضیلت کے لیے اس لیے کافی نہیں کہ عمل میں دوسری فضیلت موجود ہے وہ یہ کہ عمل مقصود ہے اور علم وسیلہ ہے اور مقصود وسیلہ سے افضل ہوتا ہے۔

علم وعمل کا تعلق

پس علم بلاعمل طریق بلامقصود ہے اور عمل بلاعلم مقصود بلاطریق ہے۔ اس کا جواب یہ

ہے کہ علم ہمیشہ عمل کے لیے نہیں ہوتا بلکہ بعض علوم محض علم ہی کے لیے موضوع ہیں جیسے اعتقادیات اور عمل کوئی بھی بدون علم کے نہیں ہوسکتا۔ پس علم تو ایک درجہ میں عمل سے مفارق و مستغنی ہوسکتا ہے مگر عمل کسی درجہ میں بھی علم سے مستغنی نہیں۔

دوسرے یہ کہ علم کبھی عمل تک بھی پہنچا دیتا ہے اور عمل کبھی علم تک نہیں پہنچاتا۔ اس لیے عابد سے تکمیل علم کی بھی امید نہیں اور عالم سے تکمیل عبادت کی امید ہے۔

تیسرے علم میں حظ نفس کچھ نہیں بھلا حیض ونفاس ورہن وشفعہ کے مسائل میں کیا حظ ہوتا اور عبادت وذکر واشغال میں لطف وحظ بھی بہت ہے اس لیے عالم زیادہ مجاہدہ کرتا ہے عابد اس کے برابر مجاہدہ نہیں کرتا، پس جس شخص کو عبادت کی توفیق ہوچکی ہو۔ اس کو لازم ہے کہ مسائل شرعیہ کی تحصیل بھی شروع کردے کہ بدون اس کے عبادت ناقص ہے۔

تحصیل علم کا طریقہ سب سے افضل تو یہ ہے کہ عربی میں حاصل کیا جائے اگر اس کی ہمت نہ ہو تو اردو رسائل بھی آج کل دینیات میں بکثرت ہیں، ان کو پڑھا جائے بقدر ضرورت تو استاد سے اس کے بعد اپنے مطالعہ سے اور مردوں کو چاہیے کہ جتنا سبق پڑھیں اس کو گھر میں آکر مستورات کو سنائیں تاکہ ان کو بھی علم شریعت حاصل ہوجائے اور جو یہ بھی نہ کرسکیں تو وہ ایک وقت فرصت کا مقرر کرکے کسی عالم سے مسائل کی کتاب سن لیا کریں۔ مگر اس کے واسطے ہر بستی کے آدمیوں کو چندہ کرکے ایک عالم اپنے یہاں بلانا ہوگا اور یہ کچھ دشوار نہیں اور اگر یہ بھی نہ ہوسکے تو کم از کم علماء سے ملتے جلتے ہی رہیں اور فرصت کے دنوں میں چند ماہ روز ان کے پاس رہ لیا کریں اور ضرورت کی باتیں پوچھتے رہا کریں، اس طرح بھی ان کو علم حاصل ہوجائے گا اور انشاء اللہ وہ اس فضیلت سے کچھ حصہ پالیں گے جو اس حدیث کے اندر مذکور ہے جس کو میں نے ابتداء بیان میں پڑھا تھا۔ اگر یہ بھی نہ ہوسکے تو اس بے پروائی کا کچھ علاج نہیں۔ اب دعا کیجئے اللہ تعالیٰ شانہ ہم کو فہم سلیم اور توفیق عمل عطا فرماویں۔

وصلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد و علی آلہ واصحابہ اجمعین. وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین.

اسرار العبادۃ

اسرار عبادت کے متعلق یہ وعظ مدرسہ انوار العلوم نام پلی حیدر آباد دکن میں بروز شنبہ بعد فجر مورخہ ۱۴ محرم ۱۳۴۲ھ کو کرسی پر بیٹھ کر بیان فرمایا جو سوا چار گھنٹے میں ختم ہوا۔ حاضرین کی تعداد تین ہزار تھی۔ احمد عبد الحلیم نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمدلله نحمده و نستعينه ونستغفره ونومن به ونتوكل عليه و نعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له ونشهدان لااله الاالله وحده لاشريك له ونشهدان سيدنا ومولانا محمدا عبده ورسوله صلى الله تعالى عليه وعلى اله واصحابه و بارك و سلم. امابعد فاعوذ بالله من الشيطن الرجيم بسم. الله الرحمن الرحيم. رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَابَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا. (سوره مريم آيت ٦٥)

ترجمہ: ''وہ رب ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور ان سب چیزوں کا جو ان دونوں کے درمیان میں ہیں۔ سوتو اس کی عبادت کیا کر اور اس کی عبادت پر قائم رہ، بھلا تو کسی کو اس کا ہم صفت جانتا ہے۔''

عقائد کا مقام مع اقسام

یہ وہی آیت ہے جو اس سے قبل کے جلسہ وعظ میں تلاوت کی گئی تھی اور اس جلسہ میں یہ بھی اطلاع دی گئی تھی کہ اس کے قبل بھی اسی کی تلاوت ہو چکی ہے۔ گویا آج تیسری بار اس کی تلاوت کی گئی ہے۔

وجہ یہ ہے کہ ان دونوں جلسوں میں اس کے متعلق بیان مکمل نہ ہوا تھا اس واسطے حاجت اعادہ کی ہوئی تا کہ اس مضمون کی کسی قدر تکمیل ہو جاوے اور کسی قدر اس لیے کہا کہ پوری تکمیل کے لیے تو مدت دراز چاہیے۔ حتیٰ کہ تکمیل عرفی کے لیے بھی۔ باقی تکمیل حقیقی کے لیے تو تمام عمر بھی کافی نہیں مگر ''خیر مالا یدرک کله لایترک کله'' (تم اگر کُل

کو نہ پا سکو تو کُل کو بھی بالکل مت چھوڑو) کے قاعدہ پر جتنی تکمیل بھی اس مختصر وقت میں ہو سکتی ہے وہ تو کر دینا چاہیے۔ بس ایسی حالت میں یہ تکمیل گویا بقدر ضرورت ہی ہوگی۔ یعنی جن امور مہمہ کی طرف توجہ نہیں رہی ان کی طرف متوجہ کر دیا جاوے گا کیونکہ اصل ہمارے تمام امراض کی بے توجہی ہی ہے کہ ہم کو تکمیل دین کی طرف توجہ نہیں اور چونکہ بحمد اللہ عقائد تو ان لوگوں کے جو شہروں میں رہتے ہیں یا جو تعلیم یافتہ ہیں اور ان کو صلحاء کی صحبت میسر ہے کافی درجہ میں صحیح ہیں، اس لیے عقیدہ کے متعلق تو کسی جدید تعلیم کی ضرورت نہیں۔ البتہ مستحضر نہیں ہیں مگر ضرورت کے موقع پر ان کا استحضار بھی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی ان سے پوچھے کہ تمہارا پروردگار کون ہے اور تم کس کی عبادت کرتے ہو تو وہی جواب میں کہیں گے جو حاصل ہے اس آیت کا۔ اس سے ثابت ہوا کہ وہ عقائد ذہن میں حاضر تو ہیں مگر دوسری چیزیں ذہن میں اس قدر غالب ہو گئی ہیں کہ وہ حاضر بھی مثل غائب کے ہو گیا۔

شاید کسی کو اس تقریر سے یہ خلجان ہوا ہو کہ اس کا کیا مطلب ہے اور پھر مثل غائب کے ہیں تو میں اس شبہ کے رفع کرنے کے لیے ایک مثال بیان کرتا ہوں۔ مثلاً موٹی بات ہے کہ خط لکھنے بیٹھیے تو کاغذ کا نظر آنا، قلم کا نظر آنا، روشنائی کا نظر آنا ضروری ہے مگر ان سب نظر آنے کے واسطے ضیا کی ضرورت ہے، دن کو بھی اور رات کو بھی۔ دن کو آفتاب کی روشنی کی مدد سے ہر چیز نظر آتی ہے، رات کو لالٹین وغیرہ کی روشنی سے۔ غرض نورانیت کی ضرورت ہر حال میں ہے کہ بغیر اس کی استعانت کے خط نہیں لکھ سکتے اور لکھتے وقت جب کاغذ پر اور حروف پر نظر پڑتی ہے تو اس ضیا پر بھی ضرور پڑتی ہے بلکہ اول روشنی پر ہی نظر پڑتی ہے مگر سچ بتائیے کہ کبھی لکھنے کے وقت کسی کو بھی اس طرف توجہ ہوتی ہے کہ اول ہماری نظر ضیا پر پڑتی ہے عموماً کسی کو بھی اس پر التفات نہیں ہوتا۔ لیکن اگر کوئی لکھتے ہوئے آپ سے پوچھے کہ کیا اس وقت آفتاب نکل رہا ہے تو آپ بے ساختہ کہیں گے کہ ہاں نکل رہا ہے اور اس جواب میں ذرا تامل نہ کریں گے مگر باوجود اس کے بھی دوسری طرف کی توجہ نے اس توجہ الی الضیاء کو مستور ہی نہیں بلکہ معدوم کر دیا ہے۔ اب اس مثال سے آپ آسانی سے سمجھ گئے ہوں گے کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک چیز ذہن میں موجود ہو اور پھر مثل غائب کے ہو۔

بس اسی طرح عقائد کے دو درجے ہیں۔ایک تو مرتبہ تحقیق ورسوخ کا ہے اور ایک مرتبہ استحضار وتوجہ کا ہے جس کو دوسری عبارت میں یوں کہئے کہ ایک مرتبہ علم کا ہے اور دوسرا مرتبہ حال کا ہے۔تو بحمداللہ مرتبہ تحقیق ورسوخ میں تو کمی نہیں ہے البتہ توجہ واستحضار میں کمی ہے حالانکہ اس کی بھی سخت ضرورت ہے اس لیے میں آج توجہ کے متعلق بیان کرتا ہوں اور اس کا محل متعدد امور ہیں جن میں سے بعض کا بیان تو کر چکا ہوں اور بعض باقی ہیں اور بعض باقی کلیات کے درجہ میں بیان کیے جاسکتے ہیں۔جزئیات میں ان سے خود کام لے لیا جائے گا اس لیے ان کلیات کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت ہے۔یہ ہے مبہم تمہید۔

مفسر یہ ہے کہ اس آیت کا حاصل امر بہ عبارت ہے اور یہی روح ہے اس آیت کی اور اس کے قبل اسی کی تمہید ہے اور اس کے بعد اسی کی تاکید ہے۔چنانچہ بقدر ضرورت عرض کرتا ہوں۔

روح عبادت

وہ روح یہ ہے فاعبدہ جس کا ترجمہ یہ ہے عبادت کیجئے۔عبادت کا لفظ ہر مسلمان کے کان میں برابر پڑتا رہتا ہے اور اکثر اطلاق سے معنی بھی اس کے قریب قریب سب کو معلوم ہیں جس سے اس کے معنی ومفہوم کے متعلق تو بیان کرنا کوئی نئی بات نہ ہوگی۔البتہ کمی یہ ہے کہ عبادت کی حقیقت ہمارے ذہن میں نہیں آتی اور اسی لیے اس کے حقوق کی طرف بھی توجہ نہیں۔چنانچہ جب ہم اپنی حالت کا موازانہ کرتے ہیں تو بہت شرم آتی ہے کہ قرآن میں تو عبادت کے متعلق امر کا صیغہ ہے کہ جس کے معنی یہ ہیں کہ عبادت ضروری ہے اور یہاں اس کا پتہ بھی نہیں۔تو اگر حقیقت عبادت کی معلوم ہو تو ادھر توجہ بھی ہو۔اس لیے اس کو بتلاتا ہوں اور بہت سہل عنوان سے بتلاتا ہوں۔

سو عبادت کا وہ سہل عنوان ہے عبد شدن یعنی غلام ہو جانا تو فاعبدہ کے معنی یہ ہوئے کہ غلام بن جاؤ۔اب اس عنوان ہی پر نظر کر کے آپ اپنی حالت کو دیکھ لیجئے کہ آیا ہم نے غلامی اختیار کی ہے یا نہیں اور اختیار کی قید میں نے اس لیے لگائی کہ غلامی کی دو قسمیں ہیں۔ایک تو اضطراری وہ یہ کہ جس نے خریدا وہ مالک ہوگیا اور خرید شدہ غلام ہوگیا جس میں غلام کے اختیار کو اصلاً دخل نہیں۔سو اس قسم کی غلامی تو غلام کا کوئی کمال نہیں، یہ تو ایجاب وقبول

کے بعد بلا اس کے اختیار کے ہو ہی جائے گا۔

جیسے عورت پر طلاق کہ ادائے صیغ طلاق سے فوراً ہو جاوے گی، چاہے عورت چاہے یا نہ چاہے یا کوئی مر جاوے تو متروکہ وارث کی ملک میں ہو جاوے گا۔ خواہ وہ ارادہ کرے یا نہ کرے۔

ایک غلامی اختیاری ہے کہ اپنے قصد سے کسی کا منقاد و مطیع ہو جاوے۔ اسی کا نص میں امر ہے اور یہی کمال مطلوب ہے۔ یہ وجہ اختیار کے قید لگانے کی ہے اور اضطراری غلامی تو تمام مخلوق کو حق تعالیٰ کے ساتھ حاصل ہے جس سے نکلنا محال ہے اور اوپر جو اضطراری غلامی کو وقوع طلاق و ثبوت ملک وارث کے ساتھ تشبیہ دی گئی اس پر کچھ مضمون ضروری طلاق و میراث کے متعلق یاد آ گیا وہ بھی استطراداً عرض کیے دیتا ہوں۔

مسئلہ طلاق و میراث

طلاق کے متعلق میرے پاس ایک استفتاء آیا تھا کہ ایک شخص نے اپنی عورت کو طلاق دی۔ عورت نے کہا میں تو نہیں لیتی۔ سائل نے پوچھا تھا کہ اس صورت میں طلاق ہوئی یا نہیں۔ یہاں سے جواب گیا کہ طلاق ہوگئی۔ عورت کے نہ لینے سے کچھ نہیں ہو سکتا، اس کو تو جھک مار کے لینا پڑے گی اور نہ لے جب بھی پڑ جائے گی۔

گر نہ ستانی بہ ستم مے رسد

(اگر نہیں لیتی تو زبردستی پہنچے گی)

اب اگر کوئی عورت کہے کہ میری لیاقت اور شائستگی تھی کہ میں نے تمہاری خاطر سے طلاق کو قبول کر لیا تو کوئی عقلمند اس کا احسان مانے گا؟ ہرگز نہیں بلکہ ہر شخص اس کی بات پر ہنسے گا کہ سبحان اللہ! یہ بڑا کمال کیا آپ نے۔ بھلا اس کے نہ قبول کرنے سے ہوتا کیا ہے۔ ذرا قبول نہ کر کے تو دیکھ لیجئے۔ مثلاً طلاق و انقضائے عدت کے بعد کے متعلق اگر عدالت میں نالش کرے اپنے نان و نفقہ کی تو عدالت خواہ رسمی ہو خواہ قانونی، خواہ عرفی ہو خواہ شرعی، یہی حکم کرے گی کہ چونکہ طلاق واقع ہوگئی اس لیے نان و نفقہ واجب نہیں رہا۔ جب نہ قبول کرنے کا کچھ اثر نہیں تو قبول میں کچھ کمال بھی نہیں، قبول کرنا اسی چیز کا کمال ہے جو نہ قبول کرنے سے رد ہو سکے۔

اسی طرح ملک اضطراری بھی کوئی کمال نہیں۔ چنانچہ میراث میں بھی یہی ہے کہ ملک اضطراراً ثابت ہو جاتی ہے جو رد سے بھی رد نہیں ہوتی۔ اگر ایک وارث یوں کہتا ہے کہ میں وارث نہیں بنتا جب بھی وہ وارث ہوتا ہے۔

یہاں اس مثال پر ایک تفریع بھی ہے جس کے متعلق بعض اہل علم بھی ایک غلطی میں مبتلا ہیں۔ وہ یہ کہ بعض دفعہ کوئی خاص وارث اپنا حق نہیں لینا چاہتا مثلاً بہن عام طور پر اپنا حق نہیں لیتی اور اس کی بناء ابتداء تو ظلم سے ہوئی ہے مگر اب رسم عام ہوگئی کہ میراث میں سے حصہ لینا عورت کے لیے عیوب میں داخل سمجھا جاتا ہے، اس واسطے وہ حصہ نہیں لیتی بلکہ یہ کہہ دیتی ہے کہ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ میرا حصہ بھائی لے لے تو اس کے اس کہنے سے بھائی اس بہن کے حصہ کا مالک نہیں ہوتا کیونکہ اول تو جب اس رسم ورواج کی بناء ظلم پر ہے تو بہن نے طیب قلب سے اپنا حصہ نہیں چھوڑا اور بدون طیب قلب کے کسی کا مال دوسرے کے لیے حلال نہیں۔ دوسرے اگر فرض کیجئے کہ اس کہنے کی بنا ظلم بھی نہ ہو بلکہ طیب خاطر سے بھی کہہ دے تب بھی بوجہ اس کے اضطرار مالک ہو جانے کے وہ حصہ اس کی ملک ہو گیا اور ملک ہو جانے کے بعد کوئی عقد انتقال ملک کا پایا نہیں گیا۔ اس لیے وہ حصہ اس کی ملک سے خارج نہیں ہوا بلکہ وہ ترکہ میں سے اپنے حصہ کی بدستور مالک ہے۔

اب اس مسئلہ کے چند فروع ہیں۔ ایک یہ کہ اگر اس نے اپنی زندگی میں نہ لیا تو مرنے کے بعد بہن کی اولاد اس کا حصہ پاوے گی اور اگر ماموں سے لینا چاہیں تو شرعاً مطالبہ کر سکتے ہیں۔ اس میں غلطی کی بناء یہ ہوتی ہے کہ بہن کے اس کہنے کو کہ میں اپنا حصہ لینا نہیں چاہتی کافی سمجھتے ہیں حالانکہ یہ کافی نہیں۔ اس پر شاید یہ سوال ہو کہ اچھا پھر کیا کہیں؟ کیا یوں کہہ دے کہ میں اپنے حصہ سے دست بردار ہوتی ہوں، سو یہ بھی کافی نہیں کیونکہ ابراء دیون سے ہوتا ہے اعیان سے نہیں ہوتا۔

یعنی اگر کسی کے ذمہ میرے دس روپے آتے تھے اور میں نے کہا کہ میں نے یہ روپیہ معاف کر دیا تو میرے اس کہنے سے قرض اس کے ذمہ سے ساقط ہو گیا۔ یہ تو ہے برائت عن الدین اور اگر میرا قلمدان رکھا ہے میں نے کہا جاؤ میں نے تمہیں یہ قلمدان معاف کر دیا تو

اس کہنے سے نہ وہ میرے ملک سے خارج ہوا نہ آپ کی ملک میں داخل ہوا۔ وہاں ''وھبت نحلت اعطیت'' (میں نے ہبہ کیا یا بخشش کیا یا عطا کیا) یا اورانہیں کے ہم معنی الفاظ کی ضرورت ہوگی۔

اسی طرح تمام شرائط ہبہ کا پایا جانا ضروری ہوگا۔ اس واسطے بہن کے معاف کر دینے سے وہ حق وراثت معاف نہیں ہوا اور نہ بھائی کی ملک میں داخل ہوا کیونکہ وہ حصہ حصہ عین ہے دین نہیں ہے۔ اگر اس کے واقعی دینے کی نیت ہو تو اس کو الفاظ ہبہ کے ساتھ ہبہ کرنا چاہیے یا بیع کرنا چاہیے اور جو کچھ کرے اس کی شرائط پورے ادا کرنا چاہئیں۔

مثلاً اگر ہبہ کرے تو مسئلہ یہ ہے کہ قبل تقسیم کے ہبہ صحیح نہیں۔ مثلاً ایک جائیداد قابل تقسیم ہے اور اس میں بہن کا حصہ ہے اور بہن نے تقسیم سے پہلے ہبہ کیا تو یہ ہبہ جائز نہیں اور اگر تقسیم کے بعد ہبہ ہوا ہے تو بشرط قبض صحیح ہے غرض ہبہ صرف کاغذی نہیں ہونا چاہیے حسی و حقیقی ہونا چاہیے۔ کاغذ تو محض تکمیل ہبہ کی سند اور حکایت ہے جس سے پہلے محکی عنہ کا وجود ضروری ہے۔

محض کاغذی کارروائی پر ایک حکایت یاد آئی۔ ایک مہاجن تھا، نہایت محاسب مگر عقل سے کورا۔ وہ اپنے کنبہ کو ساتھ لے کر بہلی میں سوار ہو کر کہیں سفر کو نکلا۔ راستہ میں ایک ندی پڑی۔ بہلی بان سے کہا ٹھہر جاؤ میں ذرا حساب لگا لوں کہ پانی کتنا ہے۔ بانس لے کر پانی میں اترا اور جا بجا پانی کو بانس سے ناپ لیا کہ یہاں ایک ہاتھ ہے آگے دو ہاتھ ہے، آگے چوتھائی بانس ہے اس سے آگے آدھا اور پھر ایک بانس ہے۔ سو بعض جگہ ڈوباؤ کی مقدار بھی تھا مگر اس نے اس سرے سے اس سرے تک سب ناپ کر حساب کر کے اوسط نکالا کہ کمر تک ہے تو بہلی کیوں ڈوبنے لگی، بہلی بان سے کہا چل۔ وہ چلا آگے جا کے بہلی لگی ڈولنے تو آپ نے پھر اپنا حساب جانچا کہ کہیں غلطی تو نہیں ہوگئی، حساب بالکل ٹھیک تھا تو آپ کہتے ہیں لیکھا جوں کا توں پھر کنبہ ڈوبا کیوں؟

میں نے اس واسطے یہ قصہ سنایا کہ خود قانون دان بھی اس کاغذی تقسیم کو حقیقی تقسیم سمجھتے ہیں۔ حالانکہ شرعاً جو تقسیم مطلوب ہے وہ کاغذی نہیں کہ سہام قائم کر دے جس کی حد بندی ہونا چاہیے۔ یہ تو ہبہ کے لیے شرط ہے۔

ایک شرط دیانتاً بھی ہے وہ یہ کہ خوش دلی اور طیب خاطر سے ہونا چاہیے۔ اگر خوش دلی نہیں تو ہبہ ملک تو ہو جاوے گی ملک خبیث رہے گی۔

فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْئًا مَّرِيْئًا

"ہاں اگر وہ بیویاں خوش دلی سے چھوڑ دیں تم کو ان مہر کا کوئی جز تو تم خوش دلی سے کھاؤ"

اس کی صریح دلیل ہے۔ یہ آیت زوجین کے بارہ میں ہے اور ظاہر ہے کہ میاں بیوی میں جتنی بے تکلفی ہوتی ہے اتنی بھائی بہن میں نہیں ہوتی مگر دیکھئے کہ میاں بیوی کے بارے میں یہ بھی ارشاد ہے کہ اگر وہ مہر معاف کر دیں طیب خاطر سے تو کھاؤ ورنہ نہیں۔ بس جہاں اتنی بے تکلفی بھی نہیں وہاں کیونکر طیب خاطر کا لحاظ ضروری نہ ہوگا۔ نیز حدیث شریف میں ہے:

لایحل مال امراء مسلم الا بطیب نفس منه[۱]

"کسی شخص کا مال بغیر اس کی دلی رضامندی کے حلال نہیں"

اب ہم دیکھتے ہیں کہ بہن جو دیتی ہے وہ طیب خاطر سے نہیں دیتی بلکہ بدنامی کے خوف سے دیتی ہے اس لیے یہ ہبہ عنداللہ صحیح نہیں ہوا۔ باقی یہ کہ خوش دلی کیونکر معلوم ہو تو اس کی صورت یہ ہے کہ جائیداد تقسیم کر کے بہن کو اس کے حصہ پر قبضہ کرا دو اور دو تین سال تک اسے جائیداد کی آمدنی سے منتفع ہونے دو کہ اسے جائیداد کا حظ تو آ جائے اور معلوم ہو جائے کہ زمینداری کیا چیز ہے اور روپیہ کیا چیز ہے۔ اس کے بعد دیکھئے کتنی بہنیں اپنا حصہ دیتی ہیں۔ اس طیب خاطر پر ایک اور فرع بھی متفرع ہوتی ہے۔

چندہ کی رسم

وہ یہ کہ آج کل چندہ کی عام رسم ہے اور اس کی کچھ پروا نہیں کی جاتی کہ دینے والا جبر و کراہت سے دیتا ہے یا کہ طوع و رغبت سے۔ عام حالت یہ ہے کہ قصداً جبر و کراہت کے ساتھ وصول کیا جاتا ہے اس لیے کسی صاحب اثر و ذی وجاہت کو چندہ وصول کرنے کے لیے کھڑا کیا جاتا ہے خواہ وجاہت دینیہ ہو جیسے علماء و مشائخ اور خواہ دنیویہ جیسے عہدیدار یا امراء اب غور کرنے کی بات ہے۔ یہ چندہ حلال ہوا یا نہیں؟ اس کے لیے خود رسول مقبول

---

[۱] کتاب التمہیدین لابن عبدالبر ۱۰ : ۲۳۱

صلی اللہ علیہ وسلم کا فتویٰ کافی ہے۔

لایحل مال امراء مسلم الابطیب نفس منہ[1]

''یعنی کسی شخص کا مال اس وقت تک حلال نہیں ہوتا جب تک کہ اس کی خوش دلی نہ ہو۔''

اس کے متعلق دو عذر کیے جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ صاحب ہم نے جبر کہاں کیا، کوئی تلوار تھوڑا ہی اس کے گلے پر رکھی تھی کہ ہمیں زبردستی دو، ہم نے تو سب سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ خوشی ہو دو ورنہ مت دو۔ مگر میں کہتا ہوں کہ آپ کا یہ کہنا تو ایسا ہی ہوا جیسا کہ آپ کہیں دعوت میں جہاں صرف آپ کو بلایا گیا تھا اپنے بچوں کو بھی ہمراہ لے جائیں اور وہاں پہنچ کر صاحب خانہ سے کہیں کہ صاحب خوشی ہو تو یہ بھی دسترخوان پر بیٹھیں ورنہ نہیں۔ اب بتلائیں وہ کیا کہے گا۔ زبان سے تو بے شک کہہ دے گا کہ اس پوچھنے کی کیا ضرورت ہے لیکن دل میں وہ کیا کہتا ہوگا اس کو خود سوچ لیجئے۔ اگر کوئی آپ کے یہاں ایسا کرے تو آپ دل میں خود کہیں گے کہ یا اللہ یہ فوج کی فوج کہاں سے آ گئی مگر زبان سے یہی کہیں گے کہ ہاں صاحب ضرور بیٹھیں، تشریف لائیے، سب آپ ہی کا تو ہے۔

اب آپ ہی بتائیے کہ یہ خوشی ہے یا صرف الفاظ ہیں۔ خوشی کے، یقیناً خوشی سے نہیں کہا جاتا مگر زبردستی کوئی سر پر آ پڑے تو غریب کیا کرے۔ کیا تہذیب کو چھوڑ کر صاف کہہ دے کہ یہ نہ بیٹھیں، ایسی ہمت ہر ایک کو نہیں ہوتی، ہاں بعضے صاف بھی کہہ دیتے ہیں جیسے ایک شخص نے نماز کی نیت میں صفائی کی تھی۔

ساڈھورہ میں ایک واعظ آئے تھے۔ وہ لوگوں کو لٹھ مار مار کر نماز پڑھاتے تھے، ایک بوڑھے شخص کو زبردستی مسجد میں نماز کے لیے لائے۔ وہ بے چارہ کھڑا ہوا اور نماز کی نیت کہلوائی تو آپ نے اس طرح نیت کی کہ نیت کرتا ہوں میں چار رکعت عصر کی، منہ میرا طرف کعبہ شریف کے پیچھے اس امام کے، ظلم اس مولوی صاحب کا اللہ اکبر! بے چارہ صاف دل تھا خدا کو دھوکہ نہیں دیا۔ اگرچہ ظلم ہی سے پڑھی مگر پڑھی تو اور پھر صاف کہہ بھی دیا کہ ظلم اس مولوی صاحب کا، اس کو چھپایا نہیں، اس شعر کا عامل تھا۔

---

[1] کتاب التمھیدین لابن عبدالبر ۱۰ : ۲۳۱

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند   حق رابسجودے و نبی رابہ درودے

''تم ان لوگوں میں سے ہرگز مت ہو جو اللہ تعالیٰ کو ایک سجدہ سے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک درود سے دھوکہ دیتے ہیں''

اس بے چارہ نے جیسی پڑھی تھی زبان سے بھی صاف کہہ دیا کہ اس کی نماز ہماری ریا کی نماز سے تو اچھی تھی کہ ہم ظاہر میں خدا کے لیے نماز پڑھتے ہیں اور نیت دوسروں کو دکھانے کی ہے اور پھر اس کو چھپاتے ہیں۔ اسی کی نسبت فرماتے ہیں:

بہ قمار خانہ رفتم ہمہ پاکباز دیدم   چو بصومعہ رسیدم ہمہ یافتم ریائی

''میں قمار خانہ گیا وہاں تمام لوگوں کو اصول کا پابند پایا اور جب میں عبادت خانہ پہنچا وہاں لوگوں کو نظم وضبط کا پابند نہ دیکھا''۔

حقیقت میں اس تقدس ریائی سے تو رندی اچھی لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ رندوں کو تقدس کی ضرورت نہیں بلکہ یہ معنی ہیں کہ اہل تقدس کو ریا سے بچنے کی ضرورت ہے اور رندوں کو تقدس کی ضرورت۔ نہ یہ کہ عابد تو عبادت چھوڑ دے اور رندی پر قائم رہے بلکہ گفتگو صرف یہ ہے کہ ان دونوں میں کون اچھا ہے تو وہی اچھا جس سے لوگوں کو دھوکہ نہ ہو۔

گناہ آمرز زندان قدح خوار   بہ طاعت گیر پیران ریاکار

''خدا شرابی رندوں کے گناہ بخشنے والا' ریاکار عبادت گزاروں کو پکڑنے والا ہے''

تو جب اس غریب نے زبان سے کہہ دیا کہ ظلم اس مولوی صاحب کا اور واقع میں تھا بھی ایسا ہی تو اس نے دھوکہ تو نہیں دیا۔ مگر ایسے صاف گو اب کہاں جو چندہ میں زبان سے کہہ دیں کہ تمہارے ظلم سے دے رہا ہوں بلکہ غالب یہ ہے کہ زبان سے خوشی ظاہر کرتے ہیں اور دل میں کراہت ہوتی ہے۔ تو یہ چندہ بھی حلال نہیں ہوگا۔

صحابہ کی بے تکلفی

اب تو دو عورتوں میں بھی ایک کی جگہ دو کے آنے سے گرانی ہوتی ہے کیونکہ اب پہلے کی سی ارزانی نہیں رہی اور ممکن ہے یہاں پر کسی کو گراں نہ ہوتا ہو کیونکہ حق تعالیٰ نے یہاں لوگوں کو ثروت دی ہے مگر جب ثروت سے زیادہ بار ہونے لگے تو سب ہی کو گرانی ہوگی۔ مثلاً

پچاس آدمیوں کی دعوت تھی اور دوسو آ گئے تو داعی میں ثروت تو ہے کہ بازار سے منگا کر کھلا دیں گے مگر لوگوں کی نظر میں کر کری تو ہو جاوے گی کہ ان کے گھر میں کھانا نہیں تھا تو اس سے بھی بار ہوسکتا ہے اس لیے اپنے بچوں کو ساتھ لے جا کر صاحب خانہ سے پوچھنا کافی نہیں بلکہ لے جانا ہی نہ چاہیے۔ اس مقام پر شاید کوئی اس پوچھنے کی کفایت پر اس حدیث سے استدلال کرنے لگے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی تھی اور ایک شخص راستہ سے آپ کے ساتھ ہو گیا۔ جب آپؐ وہاں پہنچے تو آپ نے صاحب خانہ سے پوچھا کہ بھئی تمہاری خوشی ہو تو یہ شخص آوے ورنہ نہیں، صاحب خانہ نے کہا کہ خوشی ہے کہ آوے۔

میں کہتا ہوں بس آپ نے ایک حدیث پر نظر کی دوسری حدیث پر نظر نہیں کی۔ وہ یہ کہ ایک شخص فارس کا رہنے والا شوربا اچھا پکاتا تھا۔ ایک روز اس کا جی چاہا کہ حضورؐ کو بھی کھلا دے۔ چنانچہ حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے چلئے تھوڑا شوربا نوش فرما لیجئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ عائشہؓ بھی چلیں گی، اس وقت تک حجاب نازل نہ ہوا تھا اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ ہماری کوئی دعوت کرے اور ہم قبول دعوت میں کوئی شرط لگالیں تو اس بناء پر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بھئی ہمارا ایک مہمان بھی ہے اور جیسے ہم کو شرط لگانے کا اختیار ہے اسی طرح داعی کو بھی اختیار ہے خواہ وہ ہماری شرط کو منظور کرے یا نہ کرے اس صورت میں جبر نہیں ہے اس لیے یہ جائز ہے۔

تو آپؐ نے فرمایا عائشہؓ بھی۔ گو اس شخص کا پہلے سے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی دعوت کا ارادہ نہ تھا مگر اب حضورؐ کے فرمانے سے وہ ارادہ کر سکتا تھا۔ مگر اس نے اپنے ارادہ کو چھپایا نہیں۔ صاف کہہ دیا کہ نہیں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی دعوت نہیں۔ اس سے حضورؐ کی تعلیم کا اندازہ کیجئے کہ آپؐ کے یہاں آزادی کی تعلیم اس درجہ بڑھی ہوئی ہے کہ حضورؐ فرماتے ہیں عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی اور وہ کہتا ہے نہیں عائشہؓ نہیں۔ آپؐ نے صحابہ کو اتنا آزاد بنایا تھا کہ وہ جان دینے کو ہر وقت تیار مگر کھانا دینے کو ہر وقت تیار نہیں۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی جاں نثاری کی تو یہ حالت تھی جیسا کہ ایک صحابی فرماتے ہیں:

فان ابی و والدتی و عرضی   لعرض محمد منکم وقاء

(میرا باپ اور میری ماں اور میری آبرو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آبرو کیلئے وقایہ ہیں)

مگر اس کے ساتھ ہی وہ امور اختیاریہ میں بے تکلف بھی اس درجہ تھے کہ آپ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی دعوت کو شرط بناتے ہیں وہ نہیں مانتا۔ آخر آپؐ نے فرمایا: کہ عائشہؓ نہیں تو ہم بھی نہیں۔ اس نے کہا نہ سہی اور چل دیا۔

آج تو کوئی مرید اپنے پیر کے ساتھ ایسا کرے، دیکھئے پھر کیا ہوتا ہے، بجائے مرید کے اس کا لقب مرتد ہو جائے گا مگر اس سے تو اس کی اور ترقی ہوگئی کہ نیچے کے دو نقطے اوپر آ گئے اور پھر دال بھی مشدد ہے کیونکہ دو دال ہیں۔ ایک کا دوسرے میں ادغام ہو گیا۔ مرید کے تو چار ہی حرف تھے اور یہاں پانچ حرف ہو گئے۔ گو حساب ابجد میں پانچ حرف نہیں مانے جائیں گے کیونکہ اس کا قاعدہ اور ہے۔ وہاں ملفوظی کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ مکتوبی کو دیکھا جاتا ہے۔ غرض یہ تو اور احسان ہوا پیر کا کہ مرید کی ترقی کر دی مگر میں مرشد کو مشورہ دیتا ہوں کہ ایسے مرید کو مرتد تو نہ کہو بلکہ ایسا ہی غصہ نکالنا چاہو تو مرید ہی کہہ لو "بفتح المیم" کہ پہلے تو میم کو رفع تھا جو رفعت کی علامت تھی اور اب نصب ہو گیا مشقت کے معنی میں ہے۔

غرض آج کل کوئی ایسا معاملہ کرے تو مرشد صاحب اس کو گستاخی اور بے ادبی پر محمول کریں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کس کا حق ہوگا۔ ہمیں تو اپنے واسطے آپ کو نمونہ بنانا چاہیے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ شخص پھر لوٹا کہ حضور تھوڑا سا شوربا نوش فرما لیجئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اور عائشہؓ بھی، اس نے پھر یہی کہا کہ نہیں عائشہؓ نہیں۔

حقیقت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے غلاموں کو کس قدر بے تکلف بنا دیا تھا۔ میں مرشدوں اور استادوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ اپنے مریدوں اور شاگردوں کو ایسا ہی بے تکلف رکھو مگر نوکروں کو نہیں کیونکہ اگر اسے گستاخ کر لیا تو وہ آقا کو پریشان کرے گا مگر اتنا ذلیل بھی نہیں کرنا چاہیے۔ جیسا آج کل کیا جاتا ہے کہ بارہ پہر باہر رہو، جب گھنٹی بجا دیں تب آؤ۔ یہ صاف کبر ہے اور نہایت بری بات ہے۔ ممکن ہے کہ کسی وقت وہ ہماری جگہ ہو جاوے تو سوچ لیجئے کہ آپ کے ساتھ یہ معاملہ کیا جائے تو آپ کو کس قدر ناگوار ہو۔ شاید تم یہ کہو کہ کہ ایسا ہونا تو بعید ہے۔ اجی اتنا سا انقلاب خدا کو کیا مشکل ہے۔ جب سلطنتیں بدل جاتی ہیں تو ایک غریب کا

امیر ہو جانا اور ایک امیر کا غریب ہو جانا کیا بعید ہے۔ چنانچہ اس قسم کی بہت حکایتیں ہیں۔
ان میں سے ایک حکایت بہت مشہور ہے کہ جو بوستان میں لکھی ہے۔ ایک تونگر کے یہاں ایک فقیر آیا۔ اس نے سوال کیا، اسے نکال دیا، پھر اتفاق سے تونگر پر افلاس آ گیا اور ایسی مصیبت پڑی کہ بیوی تک کو طلاق دینا پڑی اور اب بھیک کی نوبت پہنچ گئی۔ اتفاق سے یہ کسی جگہ پہنچا وہاں جا کر سوال کیا، صاحب خانہ نے اپنی عورت سے کہا کہ سائل کو کچھ دے آؤ، عورت نے جو سائل کو دیکھا تو زار و قطار رونے لگی۔ اس نے رونے کا سبب پوچھا، تو اس نے کہا کہ یہ میرا پہلا شوہر تھا، ایک مرتبہ ہم میاں بی بی بیٹھے تھے کہ ایک سائل آیا، اس کو اس نے بہت سختی سے جھڑک دیا، اسی کے وبال میں یہ گرفتار ہوا، اس نے کہا وہ سائل میں ہی تھا۔
دیکھئے کیسا انقلاب ہوا کہ سائل مسئول ہو گیا اور مسئول سائل اور پھر دولت تو دولت بیوی تک اس کے قبضہ میں پہنچ گئی۔ خدا کی قدرت ہے اور اگر دنیا میں ایسا نہ بھی ہوا تو کیا آخرت میں بھی کچھ نہ ہوگا۔
غرض نوکر کی نہ اتنی تحقیر کرو جو خدا کو بری لگے اور نہ اس سے اتنی بے تکلفی کرو کہ گستاخ ہو جائے۔ بہرحال گستاخ تو نہ کیجئے مگر شفقت کے ساتھ رکھئے۔ غرض اعتدال کی رعایت ضروری ہے۔
میرے ایک دوست ڈپٹی کلکٹر تھے۔ وہ اپنے نوکر کو کھانا تک ساتھ کھلاتے تھے۔ میں نے انہیں اس سے منع کیا، انہوں نے نہ مانا، آخر میں اس کی گستاخی اتنی بڑھ گئی کہ انہیں علیحدہ کرنا پڑا۔ اسی طرح مرید اور شاگرد کو پیر اور استاد تو مثل اولاد کے سمجھے اور مرید اور شاگرد اپنے کو غلام سمجھے۔ بہرحال ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سبق لینا چاہیے۔
وہ شخص پھر تیسری بار آیا کہ چل کے تھوڑا سا شوربا نوش فرما لیجئے۔ آپؐ نے پھر فرمایا کہ عائشہ بھی، اس نے کہا اچھا عائشہ بھی، پھر دونوں حضرات تشریف لے گئے۔
شاید اس پر کسی کو شبہ جبر کا ہو کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے تو اس شخص کے یہاں بلا طیب خاطر کھایا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی رائے بدل گئی۔ پہلے یہ خیال تھا کہ شوربا ہے ایک آدمی بھر کا اور اس کا یہ جی چاہتا تھا کہ حضورؐ سیر ہو کر کھا دیں مگر اس نے جب دیکھا کہ حضورؐ ہی آدھا پیٹ کھانا چاہتے ہیں تو میرا کیا بگڑتا ہے۔ تو اس میں حضرت

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لیے کراہت نہیں رہی۔

پس اس حدیث کو پہلی حدیث کے ساتھ ملا کر دیکھئے کہ حضورؐ نے جو گھر پر جا کر صحابی سے پوچھا کہ اگر اجازت دو تو یہ آئے ورنہ نہیں۔ یہ کس صورت اور کس حالت میں تھا، حضورؐ نے اس وقت پوچھا تھا جب آپؐ نے صحابہ کو اپنے ساتھ اتنا بے تکلف بنادیا تھا کہ اجنبی تو اجنبی وہ تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے باب میں بھی صاف صاف عرض کر سکتے تھے۔ اب بتائیے کہ آپ نے بھی اپنے دوستوں کو اتنا بے تکلف کیا ہے، حضورؐ نے تو اتنا بے تکلف کر رکھا تھا کہ میزبان کو یقین تھا کہ وہ اگر اجازت بھی نہ دے گا تب بھی حضورؐ ویسے ہی بشاش رہیں گے جیسے اجازت کے بعد ہوئے تو حضورؐ تو اتنی رعایت فرماتے تھے کہ کسی کو تنگ دلی نہ ہو۔

جبری چندہ

تو ہم کو کیا حق ہے کہ کسی پر جبر کر کے چندہ لیں چاہے اس کا دل چاہے یا نہ چاہے۔ محققین نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کوئی سائل قرائن سے جانتا ہے کہ اگر کسی سے مجمع میں سوال کرے گا تو وہ ایک روپیہ دے گا اور اگر یہی سائل تنہائی میں سوال کرتا تو وہ آٹھ آنے دیتا، اس صورت میں سائل کو آٹھ آنے سے زیادہ حلال نہیں۔ بات یہ ہے کہ مجمع کا لحاظ ہوتا ہے اور شرم ہوتی ہے اس لیے ایسی حالت میں مجمع میں مانگنا بھی جائز نہیں تو حضرت جبر تلوار دکھانے کو نہیں کہتے۔

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ جسم کو اذیت پہنچا کر لینا حرام ہے۔ اسی طرح قلب کو اذیت پہنچا کر اور بوجھ ڈال کر لینا بھی حرام ہے بلکہ دل تو بدن سے بھی زیادہ نازک ہے۔ اس واسطے چندوں میں اہل وجاہت کو درمیان میں نہ ڈالیں بلکہ خود تحریک کریں اور تحریک بھی عام کرنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ فہرست لے کے اس کے پاس پہنچ گئے۔ اس نے دس روپے لکھے تو اس سے یہ کہا جاتا ہے کہ آپ کی شان تو پچاس روپے کے قابل ہے۔ اس نے شرما شرمی بیس روپے کر دیئے، ایک عذر کا جواب تو یہ تھا جو خوشی ہو دو نہ ہو نہ دو۔ اس تقریر سے اس کی حقیقت معلوم ہوگئی۔

دوسرا عذر یہ کیا جاتا ہے کہ ہم کچھ اپنے واسطے تھوڑا ہی کرتے ہیں، ہم تو اللہ کے واسطے

کرتے ہیں تو اگر جبر بھی ہو تو کیا ہے۔ یہ عجیب عذر ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کے واسطے جبر جائز ہے۔ بتلائیے کہ اللہ تعالیٰ نے کہاں کہا ہے کہ میرے لیے ڈکیتی کرو۔ اگر یہی مسئلہ ہے تو آج تو یوں چندہ وصول کیا، کل چوری بھی کرو گے اور کہہ دو گے کہ اپنے واسطے تھوڑی کی ہے ہم نے تو مسجد کے لیے کی ہے اور عدالت میں بھی جا کر یہی عذر کر دینا۔ دیکھیں عدالت کیسے چھوڑ دے گی۔

اسی طرح عدالت عالیہ کو سمجھئے بلکہ غور کیا جاوے تو اس میں ایک اور باریک بات ہے وہ یہ کہ اگر نفس کے واسطے جبر کرتے تو اتنا برا نہ ہوتا جتنا اللہ کے واسطے کرنا برا ہے کیونکہ قاعدہ ہے کہ جس کام کی غرض نہ حاصل ہو وہ بے کار ہوتا ہے۔

اب سوچو کہ اگر نفس کے واسطے کسی سے وصول کرتے اور غرض یہ ہوتی کہ تم کو دنیا کا نفع ہو تو جبر کی صورت میں یہ مقصود تو حاصل ہو جاتا اور اگر خدا کے واسطے جبر کیا جس میں غرض یہ ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ خوش ہوں تو اس میں تو وہ مقصود بھی حاصل نہیں ہوا بلکہ جبر سے اُلٹا گناہ ہوا تو زیادہ برا ہوا۔

غرض اپنے نفس کے لیے جبر کرتے تو کچھ فائدہ تو حاصل ہوتا کہ روپیہ جیب میں آتا اور خدا کے واسطے ناجائز طریقہ سے روپیہ حاصل کیا تو خدا تعالیٰ بھی ناراض ہوئے اور کیا تھا خوش کرنے کو، اب تو یہ فعل محض لغو اور بیہودہ ہوا۔ تو یہ دوسرا عذر تو بالکل عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہو گیا۔

یہ تو ایسا ہو گیا جیسے ایک شخص نے ایک آدمی کو طمانچہ لگایا۔ وہ ناراض ہوا تو آپ کہتے ہیں معاف کیجئے۔ میں آپ کے اباجان کو سمجھا تھا، سبحان اللہ! یہ عذر بڑا اچھا ہوا۔ تو یہ کہنا کہ ہم دین کے واسطے کام کرتے ہیں اپنے واسطے نہیں کرتے، ایسا ہی عذر گناہ بدتر از گناہ ہوا تو خدا کے واسطے کام کرنے میں تو اور زیادہ احتیاط چاہیے۔ بہر حال ایسے ہی چندہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

لایحل مال امراء مسلم الابطیب نفس منه[1]

''کسی مسلمان مرد کا مال بغیر اس کی دلی رضامندی کے حلال نہیں''

---

[1] كتاب التمهيدين لابن عبدالبر ١٠: ٢٣١

آج کل کے مجتہد

یہاں ایک شبہ نئے مجتہدوں کی طرف سے اور بھی ہوسکتا ہے کہ حضورؐ نے تو مسلم کی قید لگائی ہے تو کافر کا مال جبراً لینے میں کیا حرج ہے کیونکہ آج کل مجتہد کثرت سے ہونے لگے ہیں۔ پہلے تو جب کوئی علوم میں امام ابوحنیفہ کے درجہ میں پہنچتا تھا جب مجتہد ہوتا تھا اور آج کل بس ترجمہ قرآن دیکھ لیا اور مجتہد ہوگئے اور پھر غضب تو یہ ہے کہ کافر بھی ہمارے مذہب میں اجتہاد کرنے لگے۔

چنانچہ میں ایک مقام پر ایک صاحب کے یہاں دعوت کی تقریب سے بلایا ہوا گیا، وہ ملے نہیں، نوکر سے پوچھا کہاں گئے ہیں، کہا کھیلنے گئے ہیں، میں حیران ہوا کہ وہ کیا بچے ہیں جو کھیلنے گئے ہیں، ارے ظالمو! اس کا نام تفریح ہی رکھ دیا ہوتا کیونکہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے الفاظ کی بھی شائستگی سکھلائی ہے۔

چنانچہ جی متلانے کے معنی میں اہل عرب خبثت کہا کرتے تھے جس کا ترجمہ میرا جی میلا ہورہا ہے یا خراب ہورہا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: کہ یہ نہ کہو بلکہ یوں کہو "نفست نفسی" جس کا ترجمہ ہے میرا جی متلاتا ہے کیونکہ خبثت نفسی میں خبث کی اسناد ہے اپنے نفس کی طرف جو سننے سے برا معلوم ہوتا ہے۔ اس واسطے ہم تو اس کھیل کے لفظ پر بھی ضرور مواخذہ کریں گے جس سے آپ بچپن میں داخل ہونا چاہتے ہیں حالانکہ پہنچ چکے ہیں پچپن میں۔

میں ان کے انتظار میں بیٹھ گیا، وہاں ایک انگریز بھی ان سے ملنے آیا تھا، وہ بھی اسی جلسہ میں بیٹھ گیا، اس نے لوگوں سے باتیں کرنا شروع کیں، کہنے لگا کران (قرآن) میں آیا ہے کہ طاعون ایک سے دوسرے کو لگتا ہے۔ میں سوچتا رہا کہ اے اللہ! قرآن کی کونسی آیت میں یہ مضمون ہے، اتنے میں آپ نے خود ہی تفسیر کی دیکھو کران (قرآن) میں آیا ہے کہ جہاں طاعون ہو وہاں مت جاؤ اور وہاں سے بھی مت جاؤ۔ اول تو اس ظالم نے حدیث کو قرآن بنایا، پھر اس میں اپنا اجتہاد ٹھونسا اور دوسرے جزو سے اس طرح استدلال کیا کہ جہاں طاعون ہو وہاں سے دوسری جگہ جانے کو اس لیے منع فرمایا ہے کہ دوسری جگہ جا کے طاعون پھیلاؤ گے۔ سبحان اللہ! اس کو نص کا مدلول بتاتے ہیں، غرض اجتہاد اتنا عام ہوگیا ہے کہ کافر بھی ہمارے دین میں اجتہاد کرنے لگے۔

چنانچہ آج کل گاندھی بھی مسلمانوں کے مذہب میں مجتہد سمجھے گئے ہیں اور یہ ایسے مجتہد مصیب مطلق ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ سے تو اجتہاد میں غلطی بھی ہوتی تھی چنانچہ اسی بناء پر بعض مسائل میں ان سے رجوع ثابت ہے یا خود علمائے احناف نے ان کے بعض فتوؤں کو چھوڑ کر صاحبین کے قول پر عمل کرلیا ہے مگر گاندھی کی زبان سے کوئی غلط بات نکلتی ہی نہیں، بس جو بات اس کے منہ سے نکلی نعوذ باللہ! گویا قرآن وحدیث ہاتھ باندھے اس کی تائید کو کھڑے ہیں کہ مولویوں نے فوراً اس کو شریعت سے ثابت کر دیا۔ خدا خیر کرے۔

اذا کان الغراب دلیل قوم سیھدیھم طریق الھالکینا

اگر ایسے ہی مجتہد ہوئے تو وہ ضرور قوم کو تباہ کریں گے اور کر ہی دیا۔ خلاصہ یہ کہ آج کل اجتہاد کا زور ہے۔ حتیٰ کہ کافر بھی مجتہد ہونے لگے ہیں، خواہ وہ یورپ کا ہو یا ہندوستان کا۔

مسلم وغیر مسلم کا مال کا فرق

تو شاید کوئی ایسا ہی مجتہد یوں کہنے لگے کہ حدیث میں تو مسلم کی قید ہے تو مسلمان کا مال تو بدوں طیب قلب کے حلال نہیں ہوگا لیکن کافر کا تو ضرور حلال ہے اور پھر شاید استدلال سے منتفع ہو کر ریل میں بے ٹکٹ سفر کرتے ہوں کہ وہ مسلمانوں کی نہیں ہے اور غیر مسلم اس کے مالک ہیں، خواہ ان کے پاس ٹھیکہ ہے اور بعض لوگ اسے سرکاری سمجھ کر یہ تاویل کرتے ہیں کہ ہم گورنمنٹ سے اپنا حق وصول کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ بھی بجائے خود قابل بحث ہے کہ غیر جنس سے حق وصول کرنا جائز ہے یا نہیں۔ مگر بہت لوگ اس جگہ مسلم کی قید دیکھ کر یوں سمجھے ہوں گے کہ کافروں کا مال لینے میں مطلقاً کچھ حرج نہیں خواہ اس پر ہمارا حق ہو یا نہ ہو کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو مسلم کا مال جبراً لینے کو منع فرمایا ہے۔

اس کا ایک جواب ظاہر تو یہ ہے کہ یہ قید اتفاقی ہے کہ عادتاً مسلمانوں کو سابقہ مسلمان ہی سے پڑتا ہے ورنہ نصوص عامہ کی وجہ سے اس طرح کسی کا بھی مال حلال نہیں۔ چنانچہ بعض احادیث وعید میں "الرجل یقتطع مال الرجل" آیا ہے۔ رواہ فی الترغیب عن الحاکم وقال صحیح علی شرطہما۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ کافر ذمی اور کافر مسالم حقوق ظاہرہ اور معاملات میں شرعاً مثل مسلمان کے ہے۔ "لھم مالنا و علیھم ما علینا" (ان کے لیے وہ ہے جو ہمارے لیے ہے اور جو ان پر ہے

وہ ہم پر بھی ہے) البتہ کافر محارب کا مال مباح ہے مگر وہاں بھی فریب اور غدر جائز نہیں۔

مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے اس کے متعلق ایک عجیب بات فرمائی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کا مال لینا مسلمان کے مال لینے سے بھی زیادہ برا ہے۔ چنانچہ مولانا نے فرمایا کہ بھئی اگر کسی کا حق ہی رکھنا ہو تو مسلمان کا رکھ لے کافر کا نہ رکھے کیونکہ قیامت میں ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دی جاویں گی تو اگر کسی مسلمان پر ظلم کیا تو نماز روزہ ظالم کا اس کے بھائی ہی کو ملے گا۔ خیر اگر ظاہر میں ظلم کیا تو باطن میں قومی ہمدردی بھی تو کی کہ اپنی نیکیاں اسے دے دیں اور اگر کافر کا حق رکھا تو ایک تو اپنی نیکیاں پرائے گھر، پھر اس صورت میں نہ تمہارا بھلا نہ اس کا بھلا کیونکہ وہ تو پھر بھی جہنم ہی میں گیا۔

اگر کوئی کہے کہ پھر اسے نفع کیا ہوا جب نیکیاں اس کے کارآمد نہ ہوئیں۔ جواب یہ ہے کہ نفع تو ہوگا مگر اتنا کم ہوگا کہ اسے محسوس نہ ہوگا۔ جیسے اگر کسی کے پاس من بھر سونے کا ڈھیر ہے اور اس میں سے کسی نے ایک رتی بھی سونا چرالیا تو واقع میں تو کمی ہوئی مگر محسوس نہ ہوگی لیکن اسے کوئی عادل اور کوئی عاقل اس کی اجازت نہ دے گا کہ اتنا چرالیا کرو۔

مثلاً کسی سلطنت میں دودھ کے اندر پانی ملانے کی اجازت نہ ہو اور کوئی یہ کہہ کر ملا دے کہ ایک من میں ایک لوٹا کیا معلوم ہوگا تو کیا یہ جرم نہیں، یقیناً جرم ہے۔ اگر اطلاع ہوجائے تو ضرور سزا ہوگی مگر اکثر اطلاع نہیں ہوتی کیونکہ اس کا احساس کم ہوتا ہے مگر عدم احساس سے بطلان شے تو لازم نہیں آتا۔ اسی طرح اگر کسی کو اپنے نفع کا احساس نہ ہو مگر سزا میں کچھ تخفیف ہوگئی ہو تو اس سے نفع کا بطلان لازم نہیں آتا۔ اسی طرح کافر کے عذاب میں بھی تخفیف ہوگی۔ گو اس خفت کا احساس نہ ہو۔

اگر کوئی کہے کہ قرآن میں تو ہے "لایخفف عنهم العذاب" کہ ان کے عذاب میں تخفیف نہیں کی جائے گی اور تم کہتے ہو کہ نیکیاں ملنے سے عذاب میں خفت ہوگی۔ یہ تعارض ہوا۔

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ایسی تخفیف نہ ہوگی جس سے راحت محسوس ہو۔ باقی یہ مطلب اس آیت کا نہیں ہے کہ سب کفار کو برابر عذاب ہوگا اور کسی کا عذاب کسی سے کم نہ ہوگا کیونکہ جس طرح معذبین کے اعمال مراتب میں تفاوت ہے کہ بعضے کافر کفر میں اشد اور اخلاق

میں سخت ہیں اور بعضے ایسے نہیں، اسی طرح عذاب کے بھی درجات مختلف ہیں۔ یہ نہیں کہ فرعون اور شداد و نمرود کے برابر اس کافر کو بھی عذاب ہو جو غریب مسکین مظلوم تھا۔ تو جیسے کفر کے مراتب اور کفار کے درجات ہیں۔ اسی فرق مراتب کے اعتبار سے عذاب میں بھی فرق ہوگا کہ ایک کو جتنا عذاب ہوگا دوسرے کو اس کا ضعف ہوگا اور کسی کو ضعفین اور یہ سب قرآن میں آیا ہے۔ البتہ جس کے لیے جتنا عذاب دخول جہنم کے وقت تجویز ہو جائے گا عذاب مجوز میں خفت کی نفی ہے۔

بہرحال مولانا کی تقریر سے معلوم ہوا کہ کافر کا مال لینا مسلمان کے مال لینے سے بھی زیادہ برا ہے۔

اب تیسرا جواب سنئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی عادل اُمت سے یہ احتمال ہی نہ تھا کہ کوئی مسلمان کسی کافر کو نقصان پہنچائے گا۔ اگر کرے گا تو اپنے بھائی ہی کی گلوتراشی کرے گا کیونکہ عام طور پر اس وقت لوگوں کا یہ خیال تھا کہ

خانہ دوستاں بروب و در دشمناں مکوب

(دوستوں کا گھر جھاڑ، دشمنوں کا دروازہ مت کھٹکھٹا)

حضورؐ نے اُمت کو اس سے بھی روک دیا جس سے اب خانہ دوستاں بروب (دوستوں کے گھر مت جھاڑ) کی بھی گنجائش نہ رہی۔ اس کی اس لیے تصریح کردی کہ شاید اس قول کے ظاہر پر عمل کرنے لگے مگر ایسے شخص کو یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اگر وہ دوست بھی اس پر عمل کرے اور جو کچھ آپ اس کے گھر سے لائے ہیں وہ بھی اور جو آپ کے گھر کا ہے وہ بھی سب لے جائے تو کیا آپ کو گوارہ ہوگا۔ اگر گوارہ نہیں تو ایسا ہی دوسرے کو بھی سمجھ لیجئے۔ اور شیخ کے کلام میں روفتن کا وہ درجہ مراد ہے جس کو گوارہ کیا جا سکے جیسے بعضی صورتیں دوستوں میں بے تکلفی کی ہوتی ہیں۔

غرض اس پر کلام بڑھ گیا تھا کہ بدون طیب خاطر کے کسی کا مال حلال نہیں ہوتا۔ اسی طرح بہنوں کا حصہ بھی حلال نہیں کیونکہ عموماً طیب خاطر سے وہ نہیں دیتیں، محض رسم و رواج سے دیتی ہیں۔ اس میں صحت ہبہ کے لیے دیانت کا بھی حکم ہے کہ ان کے قبضہ میں رقم اور جائیداد جانے کے بعد اور اس کی آمدنی وصول کرنے اور خرچ کرنے کے بعد اگر وہ دیں تو ہبہ صحیح ہے ورنہ نہیں اور قضاء کا حکم یہ ہے کہ وہ ہبہ کردے حسب شرائط یا بیع کردے۔ محض معاف کردیئے یا دستبردار

ہونے سے اس کی ملک زائل نہیں ہوتی بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ زبانی بیع کرا لیجئے اور اختیار ہے کہ اگر دس لاکھ کا بھی حصہ ہے اور وہ دس روپے میں بیچ دے تو معاملہ درست ہو جائے گا اور پھر کہہ دے کہ میں نے زرِ ثمن معاف کر دیا کیونکہ بیع میں غیر مشاع ہونا ضروری نہیں۔

یہ سب کلام ملک اضطراری پر چلا تھا اور اصل مضمون یہ تھا کہ ایک درجہ تو ہماری غلامی کا یہ ہے کہ ہم بطور ملک اضطراری خدا کے غلام ہیں۔ سو یہ تو ہماری کوئی خوبی نہیں۔

اختیاری غلامی

خوبی یہ ہے کہ ہم خود چاہیں غلام بننا۔ جیسا آسمان وزمین سے کہا گیا تھا "**فقال لها وللارض ائتیا طوعا او کرها** اور انہوں نے عرض کیا "**قالتا اتینا طائعین**" یعنی حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے زمین وآسمان سے کہا کہ ہماری اطاعت میں داخل ہو جاؤ، خواہ خوشی سے یا ناخوشی سے، انہوں نے کہا ہم خوشی سے اطاعت قبول کرتے ہیں۔

قہری اطاعت تو یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ آج آسمانوں کو توڑنا چاہیں یا زمین کو شق کرنا چاہیں اور وہ نہ چاہیں تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے اور جو حکم ہوگا لامحالہ وہ واقع ہو جائے گا۔ یہ تو اطاعت قہر یہ ہے مگر آسمان وزمین نے کہا کہ ہم خوشی سے حاضر ہوتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ وہ تسبیح وتقدیس واعتقاد الوہیت کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔

اگر کوئی کہے کہ ان میں جان تھوڑا ہی ہے جو انہوں نے یہ باتیں کیں۔ میں کہتا ہوں آپ کو یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ ان میں جان نہیں ہے۔ کیوں نہیں جب قرآن میں ان کے متعلق طوع رغبت ثابت ہے تو اس کے لوازم بھی ضرور ثابت ہیں۔ حاصل یہ کہ معترض کے نزدیک اگر طوع ورغبت روح ہونے پر موقوف ہے تو ان میں بھی روح ہے مگر آپ کی سی روح ہونا ضروری نہیں ہے۔ اگر زیادہ نہیں تو اتنی ضرور ہے کہ ان کو شعور ہے اور وہ قصد کرتے ہیں ذکر واطاعت کا اور صوفیاء نے تو صاف صاف کہا ہے کہ ان میں روح ہے۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں:

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند   بامن و تو مردہ باحق زندہ اند

"خاک، ہوا، پانی، آگ یہ چاروں عنصر حق تعالیٰ کے بندے ہیں ہمارے تمہارے روبرو گو مردہ ہیں مگر حق تعالیٰ کے روبرو زندہ ہیں"

مولانا نے ایک حکایت کے ضمن میں اس کو فرمایا ہے۔ حکایت یہ ہے کہ ایک بادشاہ کافر بت پرست تھا۔ وہ اپنی رعایا کو بت پرستی پر مجبور کرتا تھا اور انکار پر آگ میں ڈال دیتا تھا۔ چنانچہ ایک عورت سے بھی کہا گیا جس کی گود میں ایک شیر خوار بچہ تھا۔ وہ سجدہ بت پر راضی نہ ہوئی تو اس کے بچہ کو چھین کر دہکتی ہوئی آگ کے حوض میں ڈال دیا اور کہا گیا کہ تیرا بھی یہی حشر ہوگا، وہ بیچاری گھبرا گئی۔

خواست تا او سجدہ آرد پیش بت　　　بانگ زد آں طفل کہ انی لم اُمت

''اے ماں اندر چلی آ' میں اس جگہ خوش ہوں اگر چہ ظاہر میں آگ کے اندر ہوں۔ اے ماں اندر چلی آ' برہان حق کا مظاہرہ کرتا کہ تو خاصان حق کے عیش وعشرت کو دیکھ لے''

قریب تھا کہ وہ بادشاہ کے خوف سے بت کے روبرو سجدہ میں گر پڑے مگر لڑکے نے آگ ہی میں سے پکارا کہ گھبرانا نہیں میں زندہ ہوں اور مزید براں یہ کہنا شروع کیا:

اندر آ مادر کہ من اینجا خوشم　　　گرچہ در صورت میان آتشم

اندر آ مادر ببیں برہان حق　　　تا بہ بنی عشرت خاصان حق

اندر آ اسرار ابراہیمؑ بیں　　　کودر آتش یافت ورد یاسمین

اندر آ مادر بحق مادری　　　بیں کہ ایں آذر ندارد آذری

اندر آ مادر کہ اقبال آمد است　　　اندر آ مادر بدہ دولت زدست

''اے ماں اندر چلی آ اور دیکھ کہ یہ آگ نہیں گلزار ابراہیمی ہے۔ اے ماں اندر چلی آ' اور مادری حق کے طفیل میں دیکھ کہ یہ آذر آذری نہیں رکھتا۔ اے ماں اندر آ کہ مقدر کا اقبال جاگ چکا ہے۔ اے ماں اندر آ اور دولت اسلام کو ہاتھ سے نہ دے''۔

اور پھر ترقی کر کے اوروں کو بلانا شروع کیا:

اندر آئید اے ہمہ پروانہ وار　　　اندریں آتش کہ دارد صد بہار

اندر آئید اے مسلمانان ہمہ　　　غیر عذب دین عذابست آں ہمہ

''اے تمام مسلمانو! پروانہ کی طرح اندر چلے آؤ اور آگ کے اندر سینکڑوں بہاریں دیکھو! اے تمام مسلمانو! اندر چلے آؤ دین شیریں کے علاوہ سب عذاب ہے''۔

ماں سنتے ہی فوراً آگ میں کود پڑی اور اس نے بھی وہی کہنا شروع کیا۔ پھر تمام لوگ لگے آگ میں گرنے۔ حتیٰ کہ بادشاہ کو پولیس کے ذریعے سے لوگوں کو آگ میں گرنے سے روکنا پڑا کہ اگر یہی حال رہا تو بادشاہ کے مذہب کا بطلان شائع ہو جائے گا۔ پھر بادشاہ نے دیکھا کہ ان لوگوں کو آگ سے کوئی گزند نہیں پہنچتا تو اس حالت کو دیکھ کر بادشاہ بہت گھبرایا اور غصہ میں فرضی خطاب کے طور پر کہا کہ اری آگ! آج تجھے کیا ہو گیا تو جلاتی کیوں نہیں؟ کہاں گئی تیری وہ تیزی اور گرمی اور کہاں گئی تیری قوت محرقہ؟ کیا تو آگ نہیں رہی؟ حق تعالیٰ نے آگ کو زبان دی اور اس نے جواب دیا کہ:

گفت آتش من ہمانم آتشم　　اندر آتو تا بہ بینی تابشم

یعنی میں تو وہی آگ ہوں، تو ذرا اندر آ تو تجھے معلوم ہو کہ میں آگ ہی ہوں۔

طبع من دیگر نہ گشت و عنصرم　　تیغ حقم ہم بدستوری برم

یعنی میری خاصیت نہیں بدلی لیکن میں خدا کی تلوار ہوں۔ اس کی اجازت سے کاٹ سکتی ہوں، تیری خواہش سے نہیں کاٹ سکتی۔

جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب آگ میں ڈالا گیا تو آگ کو حکم ہوا کہ "کونی برداً وسلاماً" وہ ٹھنڈی ہو گئی۔ اسی طرح جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کرنے کا حکم ہوا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنا کام شروع کر دیا کہ کاٹ رہے ہیں اور چھری خوب تیز ہے مگر چھری کاٹتی نہیں۔ یہاں تک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے غضب ناک ہو کر کہا، اری چھری تجھے کیا ہوا تو کاٹتی نہیں، تو وہ کہتی ہے مجھے آپ کیا فرماتے ہیں، آپ کو حکم ہوا ہے کاٹنے کا اور مجھے حکم ہوا ہے نہ کاٹنے کا، آپ اپنا کام کریں میں اپنا کام کروں گی جو کچھ کہنا ہو حق تعالیٰ سے کہئے وہ اجازت دیں گے تو کاٹ دوں گی۔ غرض کہ حکم الٰہی سے آگ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بے کار رہی اور چھری حضرت اسماعیل علیہ السلام پر بے کار رہی۔

اس مقام پر مفسرین نے ایک علمی لطیفہ لکھا ہے کہ اگر برداً کے ساتھ سلاماً نہ ہوتا تو آگ اس قدر سرد ہو جاتی کہ پھر ٹھنڈک سے تکلیف ہونے لگتی، اس لیے حق تعالیٰ نے صرف برداً نہیں فرمایا بلکہ سلاماً بھی فرمایا۔ تو مولانا نے اس حکایت پر متفرع کر کے فرمایا ہے:

بادو خاک و آب و آتش بندہ اند　　　　بامن و تو مردہ باحق زندہ اند

(ہوا، خاک، پانی، آگ، چاروں عنصر حق تعالیٰ کے بندے ہیں، گو ہمارے تمہارے روبرو مردہ ہیں مگر حق تعالیٰ کے روبرو زندہ ہیں)

یہ تو حکایت تاریخی سے استدلال تھا۔ آگے قصہ منصوصہ سے استدلال فرماتے ہیں:

گر نہ بودے واقف از حق جان باد　　　　فرق چوں کردے میان قوم عاد

تو حضرت یہ سب چیزیں ہیں اور لیجئے ارشاد ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُلَهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ.

''اے مخاطب کیا تجھ کو یہ بات معلوم نہیں کہ اللہ کے سامنے جو آسمانوں میں ہیں، جو زمین میں ہیں اور سورج، چاند، ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور بہت سے آدمی بھی سجدہ کرتے ہیں۔''

یعنی یہ سب سجدہ میں مشغول ہیں۔ وجہ استدلال یہ ہے کہ یہاں حق تعالیٰ نے سب مخلوقات کی فہرست بتلا کر کسی میں کوئی قید نہیں لگائی مگر ہمارے متعلق فرمایا ''وكثير من الناس'' کہ بہت سے آدمی بھی سجدہ کرتے ہیں۔ ہمیں پھسڈی نکلے کہ سوائے ہمارے اور تو سب سجدہ میں ہیں اور جب ہمارا نمبر آیا تو ''كثير من الناس'' کی قید سے فرمایا۔

آگے دوسرے مقابل کی نسبت فرماتے ہیں وكثير حق عليه العذاب اور یہ ظاہر ہے کہ عبادت وسجدہ قسر یہ سے کفار بھی خالی نہیں۔ اگر یہاں عبادت قسر یہ مراد ہوتی تو انسان کے ساتھ کثیر کی قید نہ ہوتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہاں عبادت اختیار یہ مراد ہے۔ پس اور مخلوقات تو سب کے سب خوشی سے عبادت میں مشغول ہیں بجز انسان کے کہ ان میں بہت سے تو خوشی سے عبادت کرتے ہیں اور بہت سے کافر ہیں جو عبادت اختیار یہ سے محروم ہیں اور جب آسمان و زمین، شجر و دواب نجوم وغیرہ خوشی سے عبادت کرتے ہیں تو معلوم ہوا کہ آسمان و زمین وغیرہ میں اتنا ادراک ہے جس سے وہ حق تعالیٰ کو پہچانتے ہیں اور یہ ادراک ان کا قیامت کے قریب سب پر ظاہر ہوگا۔

چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ یہودیوں کو قتل کیا جاوے گا اور وہ چھپتے پھریں گے تو اگر وہ کسی پتھر کے پیچھے چھپیں گے تو پتھر بھی کہہ دے گا کہ اے مسلم! میرے پیچھے یہودی ہے اور پھر قیامت میں تو سب ہی بولیں گے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْ اَنْطَقَ كُلَّ شَیْءٍ.

''یہ لوگ اپنے اعضاء سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی، وہ جواب دیں گے کہ ہم کو اس نے گویائی دی جس نے ہر چیز کو گویائی دی۔''

اور ارشاد ہے: ''یومئذ تحدث اخبارھا'' (یعنی جس دن زمین سب اترے پترے کھول دے گی) اور دہریوں نے جو اس کا انکار کیا ہے میں کہتا ہوں ان کے پاس دلیل کیا ہے امتناع کی کچھ بھی نہیں، پھر الٹا ہم سے پوچھتے ہیں کہ تم اس کا ثبوت لاؤ اور ثبوت بھی دلائل عقلیہ سے نہیں، وہ تو ہم پیش کر چکے کہ اس کا امتناع ثابت نہیں تو امکان ثابت اور جس ممکن کے وقوع کی مخبر صادق خبر دے اس کا وقوع ثابت۔ بس اس ممکن کا وقوع ثابت ہو گیا تو پھر ہم سے ثبوت کیا مانگتے ہیں۔ نظیر لاؤ تا کہ اسے دیکھ کر استبعاد رفع کریں۔

نظیر اور ثبوت کا فرق

آج کل یہ بھی ایک جہل ہے کہ نظیر بتلانے کا ثبوت رکھا ہے۔ حالانکہ ثبوت نام ہے دلیل عقلی یا نقلی کا اور نظیر سے تو دلیل کی توضیح مقصود ہوتی ہے، نظیر سے اثبات مدعا نہیں ہوا کرتا مگر آج کل یہ الٹی منطق ہے کہ نظیر کو دلیل سمجھتے ہیں۔

چنانچہ ایک شخص رام پور میں معراج جسمانی کا انکار کرتے تھے۔ میں نے کہا معراج جسمانی ہی تھی، روحانی نہ تھی۔ تو کہا ثبوت لاؤ یعنی نظیر لاؤ کہ کسی کو بھی۔ میں کہتا ہوں کہ نظیر اثبات مدعا کے لیے نہیں ہوتی بلکہ توضیح دلائل کے لیے ہوتی ہے مگر اس کو وہ سمجھتے ہی نہیں۔ سوال تو کر دیا اور جواب سمجھنے کی صلاحیت نہیں۔ اب ہم پر الزام ہے کہ علماء جواب نہیں دے سکتے۔ میں کہتا ہوں کہ تم جواب سمجھ ہی نہیں سکتے ورنہ جواب سے ہم کب عاجز ہیں۔ اسی واسطے بعض دفعہ ان سے خطاب کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ بقول عارف شیرازی کے:

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(راز کا فاش کرنا مصلحتوں کے خلاف ہے ورنہ مجلس عارفین میں کوئی چیز ایسی نہیں کہ نہ ہو)

غرض وہ بار بار تو یہی کہے جاتے ہیں کہ ثبوت لاؤ یعنی نظیر لاؤ۔ اس کا ایک اور بھی جواب ہے۔ وہ یہ کہ اگر ہر واقعہ کے ثبوت کے لیے نظیر کی ضرورت ہے تو نظیر بھی ایک واقعہ ہے پھر اس کے لیے بھی نظیر کی ضرورت ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو کلیہ ٹوٹ گیا اور اگر ہے تو پھر اس کے لیے بھی اسی طرح نظیر کی ضرورت ہوگی تو پھر اس میں بھی یہی کلام ہے۔ غرض اگر کہیں سلسلہ ختم ہو گیا تو کلیہ ٹوٹ گیا اور اگر ختم نہیں ہوا تو تسلسل لازم آئے گا جو محال ہے اور جو مستلزم محال ہے وہ بھی محال ہے مگر وہ اسے بھی نہیں سمجھتے۔

نئی ایجادوں سے تائید دین

اب ثبوت میں صرف اس کی کسر رہ گئی ہے کہ چھت پھٹ جائے اور میں اچک کر ان کے سامنے اڑ جاؤں کہ لو صاحب معراج ہوگئی۔

ایک صاحب اس پر الجھے ہوئے تھے کہ اگر معراج جسمانی ہوئی تو ہوا کے کرہ کے بعد آگ کا کرہ ہے یا یوں کہیے کہ ہوا نہیں ہے جہاں بغیر سانس لیے کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں نے کہا کہ اس دعویٰ کی کہ بغیر سانس لیے ہوئے زندہ نہیں رہ سکتے دلیل کیا ہے تو قاعدہ سے تو اتنا ہی جواب میرے ذمہ تھا۔ مگر ایک بات دفع استبعاد کے لیے بعد میں سمجھ میں آ گئی کہ سیر کی دو قسمیں ہیں۔ سیر سریعی اور سیر بطیئی یعنی ایک جلدی گزرنا اور ایک ٹھہر ٹھہر کے گزرنا۔ سو جلدی گزرنے میں استبعاد بھی نہیں کیونکہ سرعت کے ساتھ آگ میں سے نکل جائے تو جل نہیں سکتا۔ جیسے ایک شعلہ ہو، اس کے اندر سے جلدی جلدی انگلی کو یا ہاتھ کو نکالو تو رونگٹا بھی نہیں جلے گا۔ بس اگر اسی طرح حضور بھی معراج میں اس سرعت کے ساتھ پہنچا دیئے گئے کہ یہ چیزیں اثر نہ کر سکیں تو استبعاد بھی نہیں رہا۔

اسی طرح ان چیزوں کے بولنے میں امتناع عقلی تو نہیں ہے صرف استبعادی ہے اور اب تو استبعادی بھی نہیں کیونکہ روزانہ نئی ایجادیں نکلتی ہیں جن سے بہت سے مستبعدات کا مشاہدہ ہونے لگا۔ یہ اللہ کی رحمت ہے کہ ایسے لوگوں سے تائید دین کا کام لیا ہے جو کافر ہیں کہ وہ نئی نئی ایجادیں کر دیں جن سے بہت سے شبہات حل ہو گئے۔

چنانچہ لوگوں کو شبہ تھا کہ زمین کیسے بولے گی کیونکہ وہ جمادات میں سے ہے۔ خدا نے اس کی نظیر گراموفون ایجاد کرا دیا کہ یہ نہ انسان ہے نہ حیوان اور نہ نباتات اور پھر بولتا ہے۔ اب اس کو کس قسم میں داخل کرو گے۔ ایک لطیفہ یاد آیا کہ ایک انسپکٹر تھے تعلیمات کے، وہ جہاں جاتے تھے لڑکوں سے پوچھا کرتے تھے کہ موجودات کی کتنی قسمیں ہیں بتلاؤ؟ وہ کہتے کہ تین قسمیں، جمادات، نباتات، حیوانات۔ پھر پوچھتے کہ بتلاؤ میز کس قسم میں ہے۔ اگر لڑکے نے اس کو نباتات کہہ دیا تو کہتے کہ اس میں نمو کہاں ہے اور جمادات سے کہہ دیا تو کہا یہ لکڑی ہے اور لکڑی درخت کی ہے اور درخت نباتات میں سے ہے۔ غرض بچوں کو بہت دق کرتے تھے۔ ایک لڑکا تھا بہت ذہین، اس نے کہا کہ موجودات کی چار قسمیں ہیں، حیوانات، نباتات، جمادات اور متفرقات بس جو چیز ان تین قسموں میں داخل نہ معلوم ہوئی کہہ دیا کہ یہ متفرقات میں سے ہے۔ بس اس کے بعد ان کا سوال ختم ہو گیا کہ وہ تو ان کا بھی استاد نکلا۔

بس اسی طرح میں بھی کہتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے موجودات میں سے کچھ چیزیں ایسی پیدا کی ہیں جن کو تم متفرقات میں داخل کرو گے۔ مثلاً گراموفون کہ اس پر شبہ ہوتا ہے کہ اگر یہ جمادات میں سے ہے تو بولتا کیوں ہے اور اگر حیوانات میں سے ہے تو کبھی مرتا کیوں نہیں۔ حالانکہ یہ جن کی آواز کی حکایت کرتا ہے وہ تو مر کے ختم بھی ہو گئے مگر یہ نہیں ختم ہوتا۔

خیر یہ تو لطیفہ تھا۔ ظاہر ہے کہ جمادات ہی میں سے ہے تو جمادات کے بولنے کا استبعاد بھی ختم ہو گیا۔ البتہ اب تک یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں مخارج کہاں ہیں اور حروف کیسے ادا ہوتے ہیں اور یہ حیرت بھی اسی لیے ہے کہ ہم اس کی حقیقت نہیں جانتے ورنہ موجدوں کو کچھ بھی حیرت نہیں۔ اسی سے سمجھ لیجئے کہ جس نے اس کے مؤجد کو ایجاد کیا وہ کیسا ہوگا۔

چہ باشند آں نگار خود کہ بندد ایں نگارہا

(وہ نگار کیسا ہوگا جس نے یہ نگار پیدا کیے)

اور دراصل تو گراموفون کو بھی مؤجد حقیقی نے ایجاد کیا ہے۔ گو ظاہر میں ایک انسان مؤجد نظر آتا ہے کیونکہ یہ ایجاد نتیجہ ہے فعل دماغ کا اور مؤجد کا کام صرف سوچنا تھا۔ پھر سوچنے کے بعد ایجاد کا ذہن میں آ جانا اس کے اختیار میں نہیں۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ یہ بات

اس کے اختیار میں نہیں کہ ایجاد کی صورت چار دن میں ذہن میں آجائے یا برس روز میں اگر ایجاد کا ذہن میں آنا اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ فوراً ہی کیوں نہ سمجھ لیتا۔ سالہا سال تک ادھیڑ بن میں کیوں لگا رہتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی اور موجد ہے اور یہ محض واسطہ ہے۔

عشق من پید او معشوقم نہاں   یار بیروں فتنہ او درجہاں

''یار تو جہاں سے باہر ہے مگر اس کا تصرف جہاں کے اندر ہے اور وہ خود نظر نہیں آتا''
(کام کوئی کرتا ہے اور نام کسی کا ہے)

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں   کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں

اور یہ ستم گاری معنی مجازی پر محمول ہے مگر اہل ادب اس مجاز سے بچتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ایک مرتبہ ایک مضمون لکھا تھا اور اس میں یہ شعر لکھا تھا۔ تو میرے ایک بزرگ نے اس شعر کو ادب کی بناء پر کاٹ کے اس کے بجائے دوسرا شعر لکھ دیا کہ

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل   نسیم صبح تیری مہربانی

اور میں نے ایک شعر دوسرا لکھا تھا۔ اسے باقی رکھا کہ:

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں   مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

یعنی مشک کے بارے میں چینی ہرن کا نام لگا دیا ہے ورنہ یہ سب آپ ہی کی زلف کی خوشبو ہے۔

درحقیقت صوفیائے کرام نے اسی کو سمجھ کر کہا ہے کہ مخلوقات مظہر صفات الٰہیہ اور محض واسطہ ہیں اور فاعل حقیقی حق تعالیٰ ہی ہیں۔ مقصود تو اتنا ہی تھا، باقی جوش میں بعض سے ایسے الفاظ بھی نکل گئے ہیں کہ کم فہموں کے ایمان کی صفائی ہو گئی ہے جسے وہ ہر شے کو خدا سمجھنے لگے۔ مثلاً

ز دریا موج گونا گوں بر آید   زبیچو نے برنگ چوں بر آید
گہے درکسوت لیلیٰ فروشد   گہے در صورت مجنوں بر آید

''دریا سے رنگ برنگ کی موج اٹھتی ہے بے مثل برنگ مثل ظاہر ہوا کبھی لیلیٰ کے لباس میں اتر آیا کبھی مجنوں کی صورت میں ظاہر ہوا''۔

حقیقت وحدۃ الوجود

یہ تو سب غلبہ حال میں نکلا ہے کہ خدا تعالیٰ کو کبھی لیلیٰ کہہ دیا اور کبھی مجنوں۔ خوب سمجھ لو

اور وحدۃ الوجود اور ہمہ اوست اسی مسئلہ کا نام ہے۔ ان تعبیرات مجازی کی ایسی مثال ہے کہ مثلاً کسی بڑے حاکم کے پاس ایک مظلوم پہنچا اور جا کر کسی کے ظلم کی فریاد کی۔ حاکم کہتا ہے کہ پہلے پولیس میں رپورٹ لکھواؤ۔ پھر ابتدائی عدالت میں باقاعدہ چارہ جوئی کرو، وہاں تمہارے مفید نہ ہوتو درمیانی عدالت میں جاؤ، وہاں بھی نہ ہوتو پھر ہائی کورٹ یا عدالت العالیہ میں رجوع کرو اور پھر جب وہاں بھی نہ ہوتو تب میرے پاس لاؤ۔ ابھی سے خلاف ضابطہ میرے پاس کیسے آ گئے تو وہ کہتا ہے کہ حضور میں نہیں جانتا پولیس وعدالت، میرے تو حضور ہی پولیس ہیں اور حضور ہی عدالت ابتدائی اور حضور ہی عدالت انتہائی۔

اب میں پوچھتا ہوں یہ کلام صحیح ہے یا غلط؟ بالکل صحیح ہے۔ اب ایک کم فہم جاہل نے بھی وہاں دربار میں یہ کلام سنا اور یہ سمجھا کہ اچھا یہ بادشاہ صاحب تو کانسٹیبل بھی ہیں، کوتوال بھی ہیں، تھانے دار بھی ہیں اور اب جو دربار میں گیا تو جا کے بادشاہ سے کہا، کانسٹیبل صاحب! السلام علیکم! اس پر اس کے اتنے جوتے لگیں گے کہ یاد کرے گا کیونکہ یہ کلام بالکل غلط ہے۔ بس یہ فیصلہ ہے وحدۃ الوجود کا۔ یہی حاصل ہے عارفین کے ان اشعار کا مثلاً

ہر چہ بینم درجہاں غیر تو نیست یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو

''مطلب یہ ہے کہ تمام عالم آپ کی صفات کا مظہر ہے ہر چیز کو آپ سے تعلق ہے غیر کا وجود ہی نہیں بلکہ ہر جگہ آپ کا ظہور ہے''

اور مثلاً عارف جامی کا شعر جس میں اس کی بناء بھی بتلا دی۔

بسکہ درجان فگار وچشم بیدارم توئی ہر چہ پیدا می شود از دور پندارم توئی

یعنی چونکہ آپ میری جان ودل میں ہر وقت حاضر ہیں اس لیے مَیں ہر چیز کو یوں سمجھتا ہوں کہ آپ ہی ہیں۔

پندارم سے معلوم ہو گیا کہ اس کا منشاء غلبہ خیال ہے۔ یہ نہیں کہ واقع میں ہر چیز معاذ اللہ خدا ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ آدمی جب کسی کے انتظار میں ہوتا ہے تو جب کوئی سامنے آتا ہے تو یوں ہی سمجھتا ہے کہ وہی آ گیا۔

اس پر لطیفہ یاد آیا کہ جب مولانا یہ شعر پڑھ رہے تھے تو ایک منکر تصوف نے کہا مولانا

اگر خر پیدا شود (اگر گدھا ظاہر ہو) تو آپ نے فی البدیہ جواب دیا پندارم توئی یعنی میں سمجھوں گا کہ تو ہے۔ سبحان اللہ! جواب میں بھی اس کلیہ سے نہیں نکلے اور جواب ایسا دیا کہ مخاطب پر چسپاں ہوگیا۔ کیا ذہانت ہے اس احمق نے مولانا کے ذوق کو بھی برباد کیا۔

غرض یہ ہے کہ وحدۃ الوجود کی حقیقت اور ہمہ اوست کا عنوان ایسا ہے جیسا اس مظلوم کا بادشاہ سے کہنا کہ حضور ہمارے تو پولیس بھی آپ ہی ہیں، مجسٹریٹ بھی آپ ہی اور عدالت العالیہ بھی آپ ہی ہیں۔ تو یہ قول اس کا صحیح ہے یا غلط، اگر مجاز نہ لیا جاوے تو غلط ہے ورنہ صحیح ہے۔ اس قول کے معنی یہ ہیں کہ حقیقی حاکم آپ ہیں اور سب واسطہ اور برائے نام حاکم ہیں اور وہ سب آپ کے مقابلہ میں ضعیف ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ اقوی ہیں اور اقوی کے سامنے اضعف کچھ بھی نہیں۔ یہی مطلب وحدۃ الوجود کا ہے کہ موجود حقیقی حق تعالیٰ ہیں، باقی سب برائے نام موجود ہیں۔ اسے سعدیؒ نے خوب واضح کیا ہے:

یکے قطرہ ازابر نیساں چکید   خجل شد چوں دریائے پنہاں پدید

ایک قطرہ پانی کا ابر سے یہ دعویٰ کرتا چلا انا مدوّر انا منور، انا مطہر کہ میں ایک کرہ کی طرح گول ہوں اور آئینہ کی طرح پاک وصاف ہوں مگر جوں ہی دریا کے قریب پہنچا تو اپنے دعوؤں سے شرمندہ ہوکر بے ساختہ کہتا ہے:

کہ جائیکہ دریاست من کیستم   گراوہست حقا کہ من نیستم

جہاں دریا ہے میں کیا چیز ہوں، اس سے تو مجھ کو یہ نسبت ہے کہ اگر وہ ہست ہے تو نیست ہوں۔

واقع میں تو نیست نہیں مگر اس کے مقابلہ میں گویا نیست ہوں۔ یہ کلام تشبیہی ہے جیسے بہادری کے اظہار میں کمال مبالغہ منظور ہوتا ہے تو کہہ دیتے ہیں زید اسد زید شیر ہے۔ اب کسی احمق نے بھی یہ سنا وہ زید کے پیچھے جا کے بیٹھا۔ ارے یہ کیا، کہا میں دم دیکھتا ہوں کیونکہ تم نے جو کہا تھا زید شیر ہے، احمق کہیں کا ارے یہ تو تشبیہ کے واسطے کہہ دیا تھا۔ سچ مچ وہ شیر تھوڑا ہی ہے۔

تو حضرت اگر عنوانات کا مدلول ایسا ہی اتحاد ہے تو پھر سارے محاورات ہی بے کار ہوجائیں گے۔ اسی محاورہ کے موافق من نیستم یہاں بھی کہا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میری ہستی اتنی کمتر ہے کہ دریا کے سامنے مثل نیستی کے ہے۔ آگے مقصود کی تصریح ہے۔

ہمہ ہرچہ ہستند ازاں کمتر اند   کہ با ہستیش نام ہستی برند

یعنی مخلوقات ہست تو ہیں مگر ایسے ہست ہیں کہ ان کے سامنے ان کو ہست کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ جیسے کوئی بڑا حاکم بادشاہ کے سامنے کھڑا ہو اور بادشاہ پوچھے کہ آپ حاکم ہیں تو وہ شرما کر کہے گا کہ حضور میں حضور کے سامنے کیسے کہوں کہ حاکم ہوں۔ اگر حقیقت کے اعتبار سے کہے کہ میں حاکم نہیں تو ناشکری کی اور اگر کہے کہ ہاں حضور میں حاکم ہوں تو ادب کے خلاف دعویٰ اور گستاخی ہے کہ بادشاہ کے سامنے دعویٰ حکومت کرتا ہے۔ وہاں یہی کہنا چاہیے کہ حضور کے سامنے کیسے کہوں، حقیقت کا انکار بھی نہ کرے اور ادب کو بھی نہ چھوڑے کیونکہ جیسے دعویٰ مذموم ہے اسی طرح انکار حقیقت بھی قبیح ہے اور اگر ایسا ہی حقیقت سے انکار ہے تو بس پھر اگر کوئی یہ کہے کہ تم آدمی ہو تو یوں کہا کرو نہیں ہم تو گدھے ہیں۔ مگر یہ ایسی تواضع ہوگی جیسے میں ایک مرتبہ الٰہ آباد سے کانپور کا سفر کر رہا تھا۔ جس گاڑی میں میں بیٹھا تھا اس میں چند جنٹلمین مل گئے وہ سب مسلمان تھے۔ صرف ایک شخص دوسرے مذہب کا جو مصنف تھا کہیں سے ان میں مل گیا۔ وہ بے فکرے تو تھے ہی آپس میں شعر اشعار کی چھیڑ چھاڑ کرتے جاتے تھے۔ اتفاقاً ان میں کسی نے ایک شعر جو پڑھا تو مصنف کے منہ سے نکل گیا جناب پھر تو فرمائیے، بس کم بختی آ گئی، ایک نے کہا آہا آپ شاعر بھی ہیں، اس نے کہا نہیں صاحب! دوسرے صاحب فرماتے ہیں کہ ضرور شاعر ہیں، یہ آپ کی تواضع ہے ورنہ شعر کا اعادہ نہ کراتے۔ تیسرے نے کہا جناب مسکین آپ کا تخلص ہے تو ایک کہتا ہے آہا تو یہ شعر بھی آپ ہی کا ہے کہ

مسکین خر اگرچہ بے تمیز است   چوں بار ہمیں برد عزیز است

(مسکین گدھا اگرچہ بے تمیز ہے مگر جب بوجھ لے جاتا ہے اس وقت پیارا ہے)

یہ سب تمسخر کر رہے تھے اور مجھ سے بار بار کہتے جاتے تھے کہ معاف فرمائیے آپ کو بہت تکلیف ہوتی ہوگی۔ اگرچہ مجھے جانتے نہ تھے، میں نے اپنے دل میں کہا کہ حضور آپ کی یہی بڑی عنایت ہے کہ مجھ پر مشق نہیں ہو رہی۔

غرض اس کے ساتھ ان لوگوں نے بڑی شرارت کی۔ پھر کھانا لے کے بیٹھے تو اس سے کہا، مصنف صاحب آیئے کچھ گوہ موت آپ بھی کھا لیجئے۔ ان میں سے ایک بولا، گوہ

موت کیسا، تم کھانے کی بے ادبی کرتے ہو، اس نے جواب دیا، یہ تواضع ہے، اپنے کھانے کو کھانا کہنا کبر ہے، اس لیے اپنے کھانے کو تحقیر ہی کے ساتھ ذکر کرنا چاہیے۔

تو کیا آپ اس کو بھی تواضع کہیں گے۔ یہ تو صریحاً ناشکری ہے۔ اگر بادشاہ نے کہا کہ کیا تم حاکم ہو، تو یہاں دو شخصوں کی دو حالتیں ہیں۔ ایک شخص تو اس قدر مرعوب ہے اور اس پر اس قدر اثر ہے سلطان کی عظمت کا کہ فانی فی السلطان ہے اور اگر کہہ دے کہ میں حاکم نہیں تو کچھ حرج نہیں اور ایک ایسا مغلوب نہیں ہے اور پھر وہ کہتا ہے کہ میں حاکم نہیں تو اس کہنے کا یہ اثر ہوگا کہ اس کو حکومت سے الگ کر دے گا کہ یہ بڑا ناشکرا ہے کہ ہم نے تو اسے عنایت کر کے حاکم بنایا اور یہ ہماری عنایت کو مٹاتا ہے۔

اسی طرح وحدۃ الوجود میں سمجھئے کہ اگر اس پر غلبہ ہے موجود مطلق کا اور اس وقت یہ کہتا ہے کہ ہمارا وجود نہیں تو مقبول ہے ورنہ مردود۔ غرض حال مقبول اور قال محض غیر مقبول۔ اسی کو کہا گیا ہے:

مغرور سخن مشو کہ توحید خدائے　　　واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

(مغرور سخن نہ ہو اس لیے کہ توحید خدا تعالیٰ کو واحد دیکھنا ہے نہ واحد کہنا)

تو جن صوفیاء پر غلبہ تھا حال کا انہوں نے سب کی نفی کر دی۔ وہ یوں بھی کہہ سکیں گے کہ گراموفون وغیرہ کو اس مشہور موجد نے ایجاد نہیں کیا بلکہ اس نے ایجاد کیا جس نے پہلے دماغ میں ڈالا۔ پھر اس کے بیان کرنے کے لیے زبان میں حرکت دی پھر اس کے بنانے کے لیے ہاتھ میں حرکت دی جس کے سامنے موجد کی یہ حالت ہے۔

رشتہ در گردنم افگندہ دوست　　　می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

(محبوب حقیقی نے یہ حرکات پیدا کر دیئے ہیں جس طرف چاہتے ہیں متحرک کر دیتے ہیں)

تو جس کی حقیقت پر نظر پہنچ گئی اسے تو یہ کہتے ہوئے شرم ہی آوے گی کہ یہ کام میں نے کیا۔ اگر نفی کر دے تو معذور ہے۔

اب یہاں ایک سخت اشکال ہے کہ اگر حقیقت کے اعتبار سے افعال عبد کے بالکل نفی کر دیں تو عام لوگوں پر مفسدہ کا اندیشہ ہے کہ وہ گناہ کر کے بھی اپنے کو بے خطا سمجھیں گے اور اگر ہر فعل کو اپنی طرف منسوب کرنے کی اجازت دیں تو چونکہ ہر شخص اس درجہ کا ہے نہیں

جس درجہ کے عارفین ہیں تو اس اجازت میں مفسدہ ہے خود بینی کا کہ اتنے بڑے قادر کے سامنے یوں کہیں کہ ہم نے یہ کام کیا جس میں اپنے کاموں پر صریح ناز ہے۔

اس اشکال کا حل جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے حق تعالیٰ نے ایسی ترکیب سے فرمایا ہے جس کے بعد اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ:

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردۂ　　　بازمی گوئی کہ دامن ترمکن ہوشیار باش

(دریا میں تختہ باندھ کر ڈال دیا ہے پھر کہتے ہو کہ خبردار دامن تر نہ ہو)

اور وہ ترکیب یہ ہے کہ ارشاد فرمایا:

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَىْءٍ اِنِّىْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ

جس کا حاصل یہ ہوا کہ یوں کہو کہ کام تو ہم نے کیا مگر خدا کے چاہنے سے کیا۔ اب دونوں شقوں کے مفاسد برطرف ہو گئے۔ سبحان اللہ! کتنا لطیف جمع ہے دونوں شقوں کا کہ نہ تو دعویٰ ہے اور نہ اپنا تبریہ۔ پس اشکال بھی رفع ہو گیا، یہ سب کلام اس پر چلا تھا کہ آسمان وزمین نے بھی اختیاری غلامی اختیار کی تھی۔ اسی مسئلہ میں دوسرے مضامین آ گئے تھے۔

ادراک ارض وسما

اب میں اسی مضمون کی طرف عود کرتا ہوں کہ اوپر یہ شبہ تھا کہ آسمان وزمین میں ادراک بھی ہے اس کا جواب یہ دیا تھا کہ ہاں ادراک ہے۔ چنانچہ "قالتا اتینا طائعین" (انہوں نے کہا ہم خوشی سے اطاعت قبول کرتے ہیں) سے تو استدلال گزر چکا ہے اور لیجئے ارشاد ہے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا

"ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا۔ سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ وہ انسان بہت ظلوم وجہول ہے۔"

اگر ان میں ادراک نہ تھا تو عذر کیسے کیا اور پھر ڈرے کیسے۔ ڈر تو فعل قلب کا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حالت کے مناسب قلب بھی ہے اور زبان بھی ہے، کیونکہ وہ چیز جس سے بولتے ہیں وہ زبان ہے اور وہ چیز جس سے ڈرتے ہیں وہ قلب ہے۔ باقی "وحملها الانسان" (انسان نے اس

کو اٹھالیا) کی کیا وجہ تھی۔ وہ وجہ یہ ہے کہ ان حضرات کو عقل بھی زیادہ تھی اور ان میں مادہ محبت کا بھی زیادہ تھا بلکہ اگر غور سے دیکھا جاوے تو اصل مابہ الامتیاز انسان میں یہ محبت ہی ہے۔

چنانچہ جب میں کانپور میں پڑھاتا تھا تو معقولات بھی پڑھاتا تھا۔ اس وقت میں نے کہا تھا کہ اہل معقول انسان کی حقیقت حیوان ناطق بتلاتے ہیں لیکن میرے نزدیک حیوان عاشق کہنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ فصل ایسا ہونا چاہیے جو دوسری انواع سے ممیز ہو۔ تو نطق تو انسان کے لیے اتنا ممیز نہیں جتنا عشق کیونکہ یہ تو ملائکہ اور جنات میں بھی مشترک ہے اور عشق کا مادہ بجز انسان کے کسی میں نہیں۔ یہ مادہ عشق ہی تو تھا جس سے امانت پیش ہونے کے واسطے جو اس سے خطاب کیا گیا اس خطاب میں ایسا خاص حظ اور کچھ ایسی عجیب لذت ہوئی کہ فوراً لینے کے لیے مستعد ہو گیا کیونکہ اس میں عشق بھی تھا اور عقل بھی۔ عشق سے تو لذت خطاب کا ادراک ہوا اور یہ سوچا کہ ایک بار کے کلام میں جب ایسا حظ ہے تو حمل امانت سے تو بار بار کے کلام کا موقع ملے گا، اس میں کتنا حظ ہوگا۔ بس امانت یعنی احکام شرعیہ کی تکلیف کو قبول کرلیا۔ گو اس کا انجام یہ بھی ہوا کہ "لیعذب اللّٰہ المنافقین الی آخرہ" (تاکہ اللہ تعالیٰ منافقوں کو عذاب دیں) مگر عشق کی وجہ سے اس کی پروانہ کی کہ عذاب بھی بھگتنا پڑے گا، اس کو لے ہی لیا۔ حافظ شیرازیؒ کے کلام میں اسی علت کی طرف اشارہ بھی ہے۔

آسماں بار امانت نتوانست کشید قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

(آسمان بار امانت اٹھا نہ سکا اس کا قرعہ فال مجھ دیوانہ کے نام نکلا)

اس شعر میں یہی واقعہ مذکور ہے اور دیوانہ کے لفظ سے اسی طرف اشارہ ہے کہ امانت لینے کا سبب عشق ہوا۔ یہ مضمون "حملها الانسان" (اسے انسان نے اٹھالیا) کا استطراداً آ گیا۔ اصل مضمون یہ تھا کہ سموات والارض وجبال نے جو امانت لینے سے عذر کیا اور ڈر گئے اس سے ان کا بھی ذی شعور اور ذی روح وغیرہ ہونا معلوم ہوتا ہے۔ پس سوال جو ان کے ادراک کے استبعاد پر ہوا تھا وہ حل ہو گیا اور "اتینا طائعین" سے انکا اختیاری غلامی کو اختیار کرنا ثابت ہو گیا اور ان کے خطاب میں جو طوعاً اور کرہاً واقع ہے اس میں اسی عبدیت

اختیاری وعبدیت اضطراری کی طرف اشارہ ہے جس کو میں نے اوپر بیان کیا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ ایک غلامی تو اضطراری ہے جیسے موت بیماری وغیرہ کہ اس میں اگر اطاعت کی تو کیا کمال کیا۔ اگر نہ کرتے تو کیا کر لیتے، کمال تو اس بندگی میں ہے جو آپ کے اختیار سے ہو اور یہ غلامی اختیاری ہے اور انسان اسی کا مکلف ہے۔ سو صورت کے درجہ میں تو ہم لوگ اس عبادت اختیاریہ کو ضروری سمجھتے ہیں مگر حقیقت کے درجہ میں ہمیں اس کی طرف مطلق توجہ نہیں ہے اس لیے میں اس عبادت یعنی غلامی کی حقیقت بتلاتا ہوں۔ اس کے بعد معلوم ہو سکے گا کہ آیا ہم اس درجہ کی غلامی کر بھی رہے ہیں یا نہیں۔

خالق ومخلوق کے معاملات کا موازنہ

سو اس کی سہل نظیر سمجھنے کے لیے یہ ہے کہ آپ کا کوئی نوکر ہو اور وہ آپ کے ساتھ وہ برتاؤ کرے جو آپ نے خدا کے ساتھ کر رکھا ہے سو اس وقت آپ کی کیا حالت ہوگی۔ بس اسی پر فیصلہ ہے۔ اب بتلائیے کیا آپ کو معلوم نہیں کہ خدا کا حکم ہے **"اقیموا الصلوٰۃ"** نماز پڑھو۔ اگر نوکر سے کہیں کھانا لاؤ اور وہ نہ لائے تو آپ کو کتنا غصہ آوے گا۔ یقیناً اسی دن نوکری سے الگ کر دو گے۔ حق تعالیٰ کو تو اپنے بندوں کی نافرمانی پر اتنا غصہ آتا بھی نہیں جتنا ہم کو نوکروں پر آتا ہے کیونکہ انہیں محبت بھی ہے اس لیے وہ بہت سے گناہوں پر انتقام نہیں لیتے اور کبھی لیتے بھی ہیں تو بہت مہلت دے کر مگر انہیں حق تو ہے فوراً انتقام لینے کا پھر آپ کے نوکر نے آپ کی نافرمانی کی تو بتلائیے اس نے آپ کا کیا حق ضائع کیا کچھ بھی نہیں کیونکہ عقد اجارہ کی حقیقت یہ ہے کہ ایک جانب منافع ہوتا ہے اور ایک جانب روپیہ، نوکر اپنا منافع آپ کے ہاتھ بیچتا ہے، منافع یہ کہ کھانا پکانا، بازار جانا، سودا لانا تو نوکر رکھنے کے معنی یہ ہوئے کہ آپ نے اس کے منافع خریدے۔ اب آپ کے غصہ کی حقیقت یہ ہے کہ اس نے اپنے منافع ہم کو نہیں دیئے، اس کا بدلہ یہ ہے کہ آپ اس منفعت کے برابر اس کو تنخواہ نہ دیجئے۔ مگر نہیں اس پر بس نہیں کرتے، سزا بھی دیتے ہیں ذلت کے ساتھ، نکال بھی دیتے ہیں اور پھر منافع مملوک بھی کیسے ہیں کہ جب چاہے وہ نوکری چھوڑ دے۔ بس آپ کی ملک

ختم اور یہاں تو منافع بھی خدا کے پیدا کیے ہوئے ہیں اور ہاتھ پیر بھی انہیں کے دیئے ہوئے۔ افسوس! ہم انہیں کی چیزوں سے انہیں کی معصیت کرتے ہیں۔

اسی طرح آنکھیں بھی خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں جن کو معصیت کا آلہ بنایا جاتا ہے۔ اسی طرح ان کا نور بھی کیونکہ دماغ میں ایک مجمع النور ہے جو ایک نور کی نہر ہے اور ہر وقت جاری ہے اور اس میں اس قدر نور پیدا ہوتا ہے کہ کبھی ختم نہیں ہوتا اور وہ برابر آنکھوں میں آتا رہتا ہے اور جوں جوں آپ نگاہ کرتے اور دیکھتے ہیں وہ ختم ہوتا جاتا ہے۔ اور دوسرا اس کی جگہ آتا رہتا ہے جیسے پانی کی نہر یا بجلی کی روشنی کہ برابر بجلی آتی رہتی ہے۔ اسی طرح نور بھی کہ اگر کسی دن دماغ سے نہ آوے تو آنکھیں پٹ ہو جاویں۔

اس پر ایک ملحد کو متنبہ کیا گیا تھا۔ قصہ یہ ہے کہ قرآن میں حق تعالیٰ نے فرمایا ہے:

قُلْ اَرَءَ یْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَاءُ كُمْ غَوْرًا فَمَنْ یَّاْتِیْكُمْ بِمَاءٍ مَّعِیْنٍ

''بتلاؤ اگر پانی نیچے اتر جاوے تو کون ہے جو اسے لا سکتا ہے''

ایک ملحد نے جب یہ آیت سنی تو آپ نے قافیہ ملایا۔ اگر چہ پھر آپ ہی کا قافیہ تنگ ہو گیا کہ ''ناتی بھا بالمعول والمعین'' اگر پانی اتر جاوے تو ہم کدال اور مزدور کی مدد سے پھر نکال لیں۔ تو گویا آپ نے یہ جواب دیا اللہ تعالیٰ کو اور وہاں تو عادت یہ ہے کہ ''اگر چہ دیر گیر د سخت گیرد'' (اگر چہ دیر سے پکڑے مگر سخت پکڑے) کیونکہ وہ کوئی بے تاب ہوتے نہیں کہ فوراً بدلہ لے لیں۔

خیر رات ہوئی، اب یہ سویا، خواب میں ایک فرشتہ آیا اور اس نے منہ پر ایک تھپڑ لگایا اور کہا ''ذھبنا بماء عینیک فات بھابالمعول والمعین'' ہم نے تیری دونوں آنکھوں کا پانی زائل کر دیا اسے بھی مزدور لگا کر پیدا کرے۔ صبح اٹھا تو پٹ تھا، مولانا اسی مقام پر فرماتے ہیں اگر توبہ کر لیتا تو اس پر بھی معاف کر دیا جاتا اور آنکھوں کی روشنی بحال ہو جاتی مگر قساوت کب اجازت دیتی ہے۔

چنانچہ اس قبول توبہ کی تائید میں ایک اور قصہ ہے کہ قارون نے جب ایک فاحشہ کو بہکایا کہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ تہمت لگانا، حق تعالیٰ نے اس کو توفیق دی کہ مجمع عام

میں سچ کہہ دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو غصہ آیا اور زمین سے فرمایا کہ یا ارض خذیہ کہ اے زمین! پکڑ اس قارون کو، چنانچہ وہ دھنسنا شروع ہوا، اس نے پکارا اے موسیٰ مجھے چھوڑ دے، آپ نے جوش میں پھر فرمایا یا ارض خذیہ (اے زمین اسے پکڑ) وہ چلاتا تھا اور آپ برابر یا ارض خذیہ (اے زمین اسے پکڑ) فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ بالکل دھنس گیا۔

بعد میں حق تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! آپ اس وقت بہت غصہ میں تھے اس لیے ہم نے بھی نہیں کہا لیکن اگر وہ بجائے آپ کے ہم کو پکارتا تو ہم تو چھوڑ دیتے، کیا انتہا ہے اس رحمت کی کہ:

اگر خشم گیرد بکردار زشت چو باز آمدی ماجرا در نوشت

(اگر برے کام پر غصہ آئے تو جب واپس آئے توبہ کرنے، ماجرا لپیٹے)

اس کے متعلق ایک لطیفہ یاد آیا۔ ایک دفعہ جب میں کانپور ہی میں تھا، تو ایک آقا اور نوکر میں کچھ بے لطفی ہوگئی۔ نوکر میرے پاس آیا کہ میری سفارش کردو، آقا بولے کہ اگر تم کہو تو معاف کردو، میں نے کہا زور نہیں دیتا مگر ایک قصہ سن لیجیے۔ پھر یہ قصہ بیان کردیا اور یہ کہا کہ آپ کے سامنے موسیٰ علیہ السلام کی بھی سنت ہے اور اللہ تعالیٰ کی بھی۔ اب آپ کو اختیار ہے جس پر چاہیں عمل کریں، میں سفارش نہیں کرتا، بھلا خدا کی سنت ہوتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام کی سنت پر کب عمل کر سکتے تھے۔

تو حق تعالیٰ کی ایسی رحمت تھی کہ اگر وہ ملحد اپنی گستاخی سے توبہ کرتا تو ضرور معاف کر دیتے اور اس کی آنکھیں پھر منور کر دیتے۔ غرض آیت میں حق تعالیٰ نے جو یہ دعویٰ کیا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ اسباب عادیہ کو ہم اگر معطل کر دیں تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اسی واسطے عارفین مشاہدہ سے کہتے ہیں:

عقل در اسباب می دارد نظر عشق می گوید مسبب رانگر

(عقل کی نظر اسباب پر ہے، عشق مسبّب کو دیکھتا ہے)

تو یہ جس قدر اسباب ہیں یہ سب انہیں کے عطا کیے ہوئے ہیں مگر نام ہمارا کر دیا جیسے ہم اپنے بچوں کے واسطے بعض چیزیں ان کے خوش کرنے کے لیے نامزد کر دیتے ہیں کہ مثلاً یہ کھٹولی تمہاری ہے اور یہ چوکی اس کی ہے۔ اسی طرح سب چیزیں حق تعالیٰ کی ہیں اور محض

ہمارے خوش کرنے کو ہماری طرف ان کی اسناد مجازی کردی ہیں تو اس صورت میں بڑی شرم کی بات ہے کہ ان ہی چیزوں سے ان ہی کا مقابلہ کریں۔

اس پر اگر کوئی کہے کہ جب سب چیزیں حق تعالیٰ کی ہیں تو ہماری ملک کیسے ہوسکتی ہیں۔ صاحبو! اس ملک کی حقیقت صرف یہ ہے کہ بعض اسباب کے وجود پر یہ قانون مقرر کردیا کہ اس میں فلاں شخص کو تصرف کی اجازت ہے، دوسروں کو بدوں اس کے اذن کے نہیں۔ پس یہ ہے حقیقت اس ملک کی اور اس سے ہمارے اس دعوے میں کوئی قدح نہیں ہوا۔

اگر کوئی کہے کہ اسناد مجازی میں حکمت کیا ہے۔ اگر اتنی نسبت بھی نہ ہوتی تو شاید یہ معصیت پر معصیت نہ کرتا۔ تو میں حکمت بتلاتا ہوں اور اس سے ان لوگوں کی غلطی بھی ظاہر ہوجاوے گی جنہوں نے شریعت پر حقیقت کو ترجیح دی ہے۔

شریعت کی برکات

میں مناقشہ تو کرتا نہیں لیکن یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ حقیقت کو اگر ترجیح ہوتی تو شریعت پر تو بڑا لطف ہوتا کہ ہر شخص حقیقت پر عمل کرکے ایک دوسرے کی چیز لے کر بھاگ جایا کرتا کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی ہے تیری کہاں سے آئی اور اس کا جو انجام ہوتا ظاہر ہے۔ اس لیے حق تعالیٰ نے اتنی نسبت لگادی کہ جو چیز اسباب شرعیہ کے موافق کسی کو مل جائے وہ اسی کی ملک ہے۔ سو اس نسبت کے لگادینے میں تو کہہ فلاں چیز فلاں کی ہے ایک ہی خطرہ ہے کہ بس اپنی ملک کا ناز ہی ہے جس کا علاج بھی آسان ہے اور وہاں حقیقت پر عمل کرنے میں قتل وخون ریزی ہے۔

مثلاً آپ کے پاس ایک گھوڑا ہے اور آپ اسے اپنی ملک سمجھتے ہیں۔ دوسرا آدمی جو آپ سے زبردست ہو وہ کہے آپ کی ملک کدھر سے ہے کہ

فی الحقیقت مالک ہر شے خداست　　　　ایں امانت چند روزہ نزد ماست

(درحقیقت ہر چیز کے مالک خدا تعالیٰ ہیں جو ہمارے پاس چند دن کے لیے امانت ہے)

حقیقت کا فتویٰ تو یہ ہے نہیں کہ گھوڑا آپ کا ہے۔ یہ تو شریعت کا فتویٰ ہے اور تم شریعت کو مانتے نہیں۔ پھر یہ آپ کی زیادتی ہے کہ آپ دو برس سے غیر مملوک چیز پر قبضہ

کیے ہوئے ہیں۔اب لائیے میرا حق ہے آخر میں بھی خدا کا بندہ ہوں۔

اس کے بعد پھر نوبت پہنچی بچوں کی اور بیوی کی۔تو نتیجہ یہ ہوتا کہ عالم ایک رزم گاہ ہوتا۔ ہر وقت قتل وخون ریزی کا بازار گرم رہا کرتا۔اس وقت ہم یہ کہتے حضرت یہ سب آپ کے انکار شریعت کی بدولت ہو رہا ہے۔غرض اس سے تو انکار نہیں کہ عالم میں جو کچھ ہے سب خدا ہی کا مملوک وغلام ہے مگر یہ کہنا کہ یہ فلاں کا ہے اور یہ فلاں کا ہے یہ بھی خدا ہی کا حکم و کلام ہے۔اگر اس کا کوئی اثر نہیں تو کیا خدا کا یہ کہنا بے کار ہے۔یہ راز شریعت کی عینک نے دکھلایا ہے اگر شریعت نہ ہوتی تو عالم میں ایک فساد برپا ہو جاتا۔

مولانا رومیؒ نے مثنوی میں ایک جبری کا قصہ لکھا ہے کہ وہ کسی کے باغ میں گھس گیا اور پھل توڑ کر کھانے لگا، مالک باغ نے منع کیا تو کہا تو کون ہوتا ہے باغ بھی خدا کا، پھل بھی خدا کا اور میں بھی خدا کا، سو تو کون ہے منع کرنے والا۔اس نے کہا اچھا اور اپنے نوکر سے کہا کہ لا تو رسا اور ختکا، پھر رسے سے باندھ کر خوب ہی ڈنڈے لگائے، اب تو لگا چلانے، اس نے کہا ارے چلاتا کیوں ہے میں بھی خدا کا، تو بھی خدا کا، رسا بھی خدا اور ختکا بھی خدا کا، غرض سب خدا کا۔اب سمجھ میں آیا تو کہتا ہے:

گفت توبہ کردم از جبر اے عیار اختیارست اختیاراست اختیار

(میں نے جبر سے توبہ کی اب تو اختیار ہی اختیار ہے)

ہاں بھئی اب تو اختیار ہی اختیار ہے تو حضرت اگر شریعت نہ ہوتی تو سارے عالم میں ایسا ہی ہڑبونگ مچ جاتا۔ یہ تو شریعت ہی کی عنایت ہے کہ اس نے ملک مجازی کو بھی ان احکام میں مثل ملک حقیقی ہی کے قرار دیا ہے ورنہ پھر تو بڑا مزہ ہوتا کہ کوئی کسی کو قتل کر دیتا تو قصاص بھی نہ ہوتا اور وہ کہتا کہ قاتل تو حقیقت اللہ تعالیٰ ہیں پھر میرا کیا دخل۔حضرت سچ یہ ہے کہ شریعت آپ کی آپ سے زیادہ خیر خواہ ہے۔اگر یہ نہ ہوتی تو آپ سب حقیقت بھول جاتے مگر افسوس ہے اس پر بھی شریعت کی قدر نہیں کرتے۔

غرض حق تعالیٰ نے براہ راست بعض اشیاء کو ہمارے نامزد کر دیا ہے مگر اس کے آثار یہ نہ ہونا چاہئیں کہ خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں ان کو اپنی کہنے لگو، ہاں دوسرے کے مقابلے میں

اسے کہنے کی اجازت ہے۔ پس اگر خدا پوچھے کہ یہ انگر کھا کس کا ہے تو کہئے آپ کا اور اگر کوئی آدمی پوچھے کہ کس کا ہے تو کہئے ہمارا کیونکہ اگر آپ اس آدمی سے بھی یہی کہیں گے کہ آپ کا ہے تو وہ اتار لے گا۔ خلاصہ یہ کہ جب سب انہیں کا ہے تو انہیں کے آلات لے کے انہیں کی نافرمانی کرنا بڑے غضب کی بات ہے۔

دیکھئے اگر کوئی نوکر بچہ سا اور کمزور اور بیمار ہمارے پاس آیا ہو اور ہم نے اسے کھلا پلا کے اور علاج کرا کے تندرست اور توانا اور بڑا کیا اور پھر تلوار بندوق بھی دی۔ اب وہ اسی تلوار بندوق سے ہمارا مقابلہ کرنے کو تیار ہو جاوے تو اس سے یہی کہا جاوے گا کہ میاں ہماری تلوار بندوق رکھ دو اور اپنے گھر سے ہتھیار لاؤ مقابلہ کے لیے۔

اسی طرح اگر خدا کی نافرمانی کرنا ہے تو خدا کی چیزیں واپس کر دو اور اپنے گھر سے لاؤ مگر جب لانا چاہو گے اس وقت یہی کہنا پڑے گا۔

نیاورد م از خانہ چیزے نخست　　　　تو دادی ہمہ چیز من چیزے تست

(میں اپنے گھر سے کوئی چیز نہیں لایا، یہ سب آپ کا دیا ہوا ہے، میری کیا حقیقت ہے)

تو جس طرح آپ کو اس نوکر کی نافرمانی ناگوار ہے اسی طرح خدا کو آپ کی نافرمانی ناگوار ہے۔ بڑے غضب کی بات ہے کہ جس کا کھاویں، اسی پر غراویں۔

حق تعالیٰ کے حقوق

اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ غلامی کی جو حقیقت سمجھے گا پھر ممکن نہیں کہ اس کے حقوق ادا نہ کرے اور حقیقت اس کی اوپر معلوم ہو چکی ہے تو اس کے حقوق بھی ادا کرنا لازم ہو گا اور ادائے حقوق کے لیے علم حقوق شرط ہے اس لیے ضرورت ہو گی حقوق معلوم کرنے کی۔ اب ان کو اجمالاً عرض کرتا ہوں۔

تو سمجھنا چاہیے کہ وہ تین حق ہیں ان میں سے ایک تو اطاعت ہے مگر اطاعت کے وہ معنی نہیں جو محض اہل قشر ظاہر پرست سمجھتے ہیں یعنی محض ضابطہ کی اطاعت بلکہ حقیقی اطاعت ہونا چاہیے۔ اسے اس طرح سمجھئے کہ نوکر دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو یورپین مذاق کا ہے کہ کھانا پکا دیا اور چل دیا۔ اگر آقا نے کبھی کہا بھی کہ بھئی ذرا پنکھا جھل دو، کہا صاحب میرے

فرائض میں نہیں ہے اور ایک نوکر ایشیائی مذاق کا ہے کہ کھانا بھی پکا دیا اور کھلا بھی دیا اور پنکھا بھی جھل رہا ہے اور اس سے فارغ ہو کے بیٹھ گیا، آقا کے پاؤں دبانے لگا، آپ کہتے بھی ہیں کہ بس بھائی جاؤ یہ کام تمہارے ذمہ نہیں ہے مگر وہ کہتا ہے نہیں گو ذمہ نہ ہو مگر مجھے تو آپ کی خدمت سے راحت ہوتی ہے۔ آپ خود دیکھ لیجئے کہ آپ زیادہ کس نوکر کی قدر کریں گے۔

اسی طرح خدا کے بندے بھی دو قسم کے ہیں ایک وہ جنہوں نے وقت پر اطاعت کر لی پھر کچھ بھی مطلب نہیں رہا، نہ خدا سے محبت ہے نہ ادب ہے۔ کوئی گناہ صغیرہ ہو گیا تو کہتے ہیں یہ تو صغیرہ ہے اور نماز و روزہ کے بعد چلتے پھرتے نظر آئے، نہ خدا کی یاد ہے نہ اشتیاق ہے۔ یہ ویسی اطاعت ہے جیسے یورپین مذاق کے نوکر آپ کی خدمت کیا کرتے ہیں۔ آپ اس نوکر سے منقبض کیوں ہوتے ہیں جو کھانا پکا کر چل دیتا اور تھوڑی دیر پنکھا بھی نہیں جھلتا، اسی لیے تو اتنے احسانات کے بعد بھی تجھے قلبی تعلق نہیں ہوا کہ ٹکا سا جواب دیدیا۔ تو معلوم ہوا کہ آپ اپنے نوکر سے دو حق کے طالب ہیں۔ ایک خدمت دوسرا تعلق قلبی۔ تو کیا خدا کا حق اتنا بھی آپ پر نہیں جتنا آپ اپنا حق نوکر پر سمجھتے ہیں۔

ایک اور ضابطہ ہی کا نوکر تھا جو کام تو سب کرتا تھا مگر وہی جو بتلا دیا اور وہ بھی بالکل بے فکری سے۔ اس لیے اکثر کام رہ بھی جاتے۔ ایک بار مالک زیادہ ناخوش ہوا کہ تو نے یہ نہیں کیا وہ نہیں کیا، تو اس نے کہا صاحب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کون کون سے کام میرے ذمہ ہیں۔ آپ مجھے سب کاموں کی ایک فہرست لکھ کر دے دیجئے۔ چنانچہ آقا نے فہرست لکھ کر حوالے کر دی۔ اتفاق سے کہیں سفر کا موقع ہوا۔ آقا گھوڑے پر سوار آگے آگے تھا اور نوکر صاحب پیچھے پیچھے چلے جا رہے تھے۔ آقا کے کندھے پر سے دوشالہ کھسک کر زمین پر جا گرا، تھوڑی دیر کے بعد جو دیکھا تو ندارد، نوکر سے پوچھا ارے تو نے نہیں دیکھا، اس نے کہا وہ تو بہت دور پیچھے گر گیا، کہا اٹھایا کیوں نہیں، کہا فہرست میں کہاں لکھا ہے کہ دوشالہ گرے تو اٹھا لینا۔ آقا نے کہا اچھا لا اب لکھ دوں۔ اب یہ سوچا کہ جس چیز کا نام لکھ دوں گا یہ وہی اٹھائے گا اس لیے فہرست میں یہ لکھ دیا کہ اگر کوئی چیز گر جاوے اسے اٹھا لیا کرو۔ اب جو منزل پر پہنچے تو نوکر صاحب نے ایک پوٹ کا پوٹ لا کے سامنے رکھ دیا، پوچھا یہ کیا؟ کہنے

لگا دیکھ لیجئے کھولا تو لید، ارے یہ کیا حرکت ہے کہنے لگا آپ ہی نے تو حکم دیا تھا کہ جو چیز گر جائے اٹھالینا، سومیں نے اس کو بھی اٹھالیا، تو ضابطہ کے نوکر ایسے ہوتے ہیں۔

یہی معاملہ ہمارا خدا کے ساتھ، تو کیا خدا کے ساتھ ہمارا بس ایسا ہی تعلق ہے جیسے ایک ڈپٹی کلکٹر جو بخل میں مشہور تھے کہتے تھے کہ جب خدا نے حقوق مالیہ کی فہرست بتادی ہے تو یہ غلو ہے کہ اس سے زیادہ کا اہتمام کریں۔ اس لیے وہ زکوٰۃ سے ایک پیسہ زیادہ نہ دیتے تھے حالانکہ ایسے ذہین لوگوں کا انتظام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں فرمادیا ہے کہ:

ان فی المال لحقا سوی الزکوۃ ثم تلی لیس البر ان تولوا وجوھکم[1] الایه

''تمہارے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ اور بھی حق ہے''

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت سے استدلال کیا کیونکہ اس میں

اٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتَامٰی وَالْمَسَاکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّائِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ

''اور مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور گردن چھڑانے والوں کو''

اول فرمایا ہے اس کے بعد ''اقام الصلوٰۃ واتی الزکوٰۃ'' یعنی انفاق کا ایک مرتبہ تو یہ فرمایا کہ مال دیا قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوال کرنے والوں کو۔ پھر دوسرا عمل یہ فرمایا کہ زکوٰۃ دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ مال دینے سے اور مراد ہے اور زکوٰۃ دینے سے اور۔ اس کو سمجھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ان فی المال لحقا سوی الزکوٰۃ'' اس لیے ہمیں یہ حقوق سمجھ کر فرائض کے علاوہ اور بھی کچھ کرنا چاہیے۔ چہ جائیکہ جن کاموں کو ضابطہ میں اور فہرست میں لکھ دیا ہو ان کو بھی چھوڑ دیں بلکہ ان کو تو سب سے پہلے کرنا چاہیے۔ چنانچہ حق تعالیٰ سے محبت کرنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنا یہ تو ضابطہ ہی میں ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو یہاں تک فرماتے ہیں:

لایومن احدکم حتی اکون احب الیه من ماله ووالده والناس اجمعین.[2]

''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کے مال،

---

[1] سنن الترمذی: ۶۵۹، ۶۶۰ [2] مسند احمد بن حنبل ۳:۱۷۷

اس کے والد اور سب لوگوں سے زیادہ پیارا کیوں نہ ہو جاؤں۔'' اور فرماتے ہیں:

من کان؟ اللّٰہ و رسولہ احب الیہ سواھما[1].

یعنی جب تک میں ہر ایک کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں، مال سے بھی اور اولاد سے بھی اور تمام لوگوں سے بھی اس وقت تک تم میں کوئی مومن نہ ہوگا اور ایسا ہی درجہ محبت کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی۔ تو نری محبت بھی کافی نہ ہوئی بلکہ سب محبتوں سے بڑھ کر محبت فرض ہوئی۔ اب بتلائیے محبت فرض ہوگئی یا نہیں، یہ دوسرا حق ہے منجملہ تین حقوق کے۔

تیسرا حق ادب اور تعظیم ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے اپنی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کو بھی فرض فرمایا ہے:

لِتُؤمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُعَزِّرُوْہُ وَتُوَقِّرُوْہُ.

''تا کہ تم لوگ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو اس کی تعظیم کرو۔''

مرجع ان ضمائر کا واحد ہے۔ الغرض خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کا یہ بھی ایک حق فرض ہوا یعنی ادب وتعظیم اور اس مضمون سے تمام حدیثیں بھری ہوئی ہیں بلکہ اگر غور کیجئے تو خود اسی آیت میں بھی ان حقوق کا ذکر ہے کیونکہ اطاعت تو اس کا مرادف ہی ہے۔

اب اس کی حقیقت دیکھو کیا ہے۔ سو اطاعت ماخوذ ہے طوع اور طوع کے معنی ہیں خوشی۔ سو اطاعت کے معنی ہوئے خوشی سے کہنا ماننا اور یہ بالکل یقینی ہے کہ خوشی سے کہنا ماننا بدون محبت و عظمت کے عادتاً ممکن نہیں۔ پس اطاعت کی فرضیت کے ضمن میں محبت اور عظمت بھی فرض ہوگئی۔

اب یہاں معنی اطاعت کے متعلق ایک سوال ہے۔ وہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ وضو کو پورا کرنا باوجود ناگواری کے اعمال فاضلہ میں سے ہے۔ تو جب ناگواری کے ساتھ کیا گیا تو اطاعت نہ ہوئی پھر فضیلت کیسی۔ اسی طرح حدیث ہے ''حفت الجنۃ بالمکارہ'' (یعنی جنت گھیر دی گئی ہے ناگوار چیزوں سے) اعمال شاقہ کو مکارہ فرمایا، تو ان میں رغبت نہ ہوئی اور جب رغبت نہ ہوئی تو اطاعت نہ ہوئی اور اطاعت نہ ہوئی تو جنت کی بشارت کیسے ممکن ہے تو اہل قشر اس اشکال کو حل نہ کر سکیں گے۔

---

[1] لم اجدہ فی موسوعۃ اطراف الحدیث ولا مافی معناہ

صوفی اور صافی کا فرق

مگر صوفیاء کرام ان باتوں کو خوب سمجھتے ہیں لیکن کون سے صوفی جو صافی ہیں اور کا ہے سے صافی، رذائل باطنہ سے اور صوفیت یہی ہے کیونکہ تصوف کی تعریف ہے **تعمیر الظاهر و الباطن**، یعنی آباد کرنا، ظاہر کا اعمال سے اور باطن کا احوال سے اور یہ محض دعوے سے نہیں ہوتا۔ اس کا طریقہ تو یہ ہے۔

صوفی نہ شود صافی تا درنکشد جامی بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی

صوفی جب تک بہت سے مجاہدے نہ کرے خام ہی رہتا ہے پختگی مجاہدات کے بعد حاصل ہوتی ہے''۔

سفر سے مراد مریدوں کے گھر کا سفر نہیں کہ کبھی پونا، کبھی بمبئی، کبھی سورت، کبھی ہندوستان پہنچ گئے۔ پختہ، خبر مقدم ہے اور شود افعال ناقصہ میں سے ہے اور خامی اس کا اسم مؤخر ہے یعنی جو خام ہے اس کے پختہ ہونے کے لیے بہت سفر کی ضرورت ہے اور بمبئی اور پونا کے سفر میں تو اس کے برعکس ہوگا کہ پختگی کی جگہ اور خامی ہو جائے گی۔ تو سفر سے مراد سفر سلوک ہے جس میں مختلف درجات و مراتب طے کرنا پڑتے ہیں۔ تب کہیں وہ صوفی صافی بنتا ہے۔ اس کی تعبیر ایک دوسرے عنوان سے حافظ نے فرمائی ہے:

شنیدم رہروے در سرزمینے ہمیں گفت ایں معما با قرینے
کہ اے صوفی شراب آنگہ شود صاف کہ در شیشہ بماندار بعینے

''اپنے ہم نشین سے کوئی سالک یہ معمہ کہہ رہا تھا کہ شراب تو اس وقت صاف ہوگی جب چالیس دن شیشہ میں رہے''

اربعین سے مراد چلہ ہے۔ یہ ادنیٰ مقدار ہے سلوک کی، اس وقت بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو اتنی مدت بھی خالص اس کے لیے صرف کرتے ہوں۔ اب تو تصوف بہت سستا ہو گیا ہے کہ دو پیسے میں آتا ہے۔ ایک پیسہ کی تسبیح لے لی اور اور ایک کا گیرو منگا کر کپڑے رنگ لیے، بس صوفی بن گئے اور صوفی بھی رجسٹری شدہ کہ کسی حال میں ان کے کمال میں شبہ نہیں ہوتا۔ اگر خاموش رہے تو چپ شاہ کہلائے اور اگر اینڈی بینڈی بولے تو اہل اسرار و اہل رموز کہلائے اور

اگر ٹھکانے کی کہہ دی تو اہل حقائق اہل معارف بن گئے۔ غرض ہر حال میں انہیں کی جیت ہے۔
ایک ہندو کا قول ہے کہ مسلمان بڑے اچھے رہے، گھٹ گئے تو فقیر، بڑھ گئے تو امیر، مر گئے تو پیر، تو صوفی سے مراد ایسا صوفی نہیں بلکہ محقق صوفی اور قرآن وحدیث کا متبع۔

ہمارے حضرت اس قدر قرآن وحدیث کے متبع تھے کہ باوجود امام فن ہونے کے اپنے خدام علماء سے فرمایا کرتے تھے کہ میں جو کہوں اگر وہ قرآن وحدیث پر منطبق ہو تو ماننا ورنہ مجھ کو خود مطلع کرنا اور اگر یہ قید نہ ہو تو یوں تو بہت نکتے بیان کیے جاسکتے ہیں۔ کیا وہ سب تصوف ہو جائیں گے۔

جیسے ایک جاہل صوفی نے تفسیر کی تھی "وَالضُّحٰی وَاللَّیْلِ اِذَا سَجٰی" (اے نفس! تیری یہی سجا (سزا) شاید اس کا ماخذ یہ ہو کہ لیل بھی کالی ہوتی ہے اور نفس بھی کالا ہے۔ اس مناسب سے لیل کے معنی نفس کے لیے اور اذا میں ہمزہ زائد آ گیا ہوگا اور ذا کے معنی یہی کیونکہ اسم اشارہ ہے اور سجا معرب سزا کا۔

ایسے ہی ایک بانوا فقیر کی حکایت ہے کہ اس نے کسی سے پوچھا کہ بتلا رزق بڑا یا محمدؐ بڑے۔ اس شخص نے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی بڑے ہیں کہ وہ اشرف المخلوقات ہیں اور رزق مخلوق ہے۔ کہنے لگا، واہ! تو بے پیرا ہے۔ ارے رزق بڑا ہے دیکھ کہ "اشهدانّ محمّدا رسول اللّٰه"، میں ان پہلے آیا محمدؐ پیچھے آئے، ان کہتے ہیں ہندی میں اناج کو۔

خیر یہ تو محض جاہلوں کے قصے ہیں، بعضے وہ نکتے ہیں کہ ظاہر میں علمی ہیں مگر شریعت کے خلاف ہونے سے سرمایہ ضلال ہیں۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

ظالم آں قومے کہ چشماں دوختند — از سخنہا عالمے را سوختند

(بڑے ظالم تھے جنہوں نے آنکھیں بند کر کے ایک عالم کو ویران کر دیا)

کراہت کی قسمیں

ہاں تو صوفیاء محققین نے اس اشکال منافاۃ کراہت واطاعت کو حل کر دیا ہے اور دونوں کی صحیح تفسیر کر دی ہے اور کیا ہی اچھا فیصلہ کیا ہے کہ کراہت دو قسم کی ہے۔ ایک کراہت طبعی ایک کراہت عقلی۔ تو اطاعت کے خلاف مطلق کراہت نہیں ہے بلکہ صرف کراہت عقلی

ہے اور وضو میں جو ناگواری ہے وہ طبعی ہے اور وہ مضر نہیں کیونکہ شریعت کو رغبت وطوع مطلوب ہے جو وسع میں ہو اور وہ عقلی ہے اور کراہت طبیعہ بوجہ غیر مقدور ہونے کے شریعت کو مطلوب ہی نہیں تو اس کا فقدان یعنی کراہت طبعی مضر بھی نہیں۔

اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ مثلاً کسی کے دنبل نکل آیا۔ وہ ڈاکٹر کے پاس گیا کہ آپریشن کردو اور بیہوشی کی دوا سنگھانے سے منع کردیا کہ اس سے دماغ کمزور ہوتا ہے۔ اس نے نشتر دیا، اب یہ بڑے زور سے چلایا، اس نے خوب زور سے دبا دبا کر مواد نکال کر مرہم لگا کے پٹی باندھ دی۔ اب یہ سنبھل کے بیٹھ گیا اور پچاس روپے اسے انعام دیا۔

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر نشتر سے ناگواری نہ تھی تو آہ کیوں کی تھی اور اگر ناگواری تھی تو انعام کیوں دیا۔ اس کا جواب یہی ہے کہ ناگواری تو طبعی تھی اور رغبت عقلی تھی تو اسی طرح حضرات صوفیاء نے بھی اس مسئلہ کو حل کیا ہے کہ کراہت طبیعہ اور رغبت عقلیہ دونوں جمع ہو سکتے ہیں۔

صاحب کمال کی شناخت

چنانچہ جب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم کے انتقال پر روئے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ بھی روتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا یہ رحمت کا اثر ہے جو شخص بندوں پر رحمت نہیں کرتا خدا اس پر رحمت نہیں کرتا۔ البتہ زبان سے کچھ کہنا نہیں چاہیے اور بعضے اولیاء متوسطین کے واقعات اس کے خلاف ہیں کہ ان کو لڑکے کے مرنے کی خبر ملی تو وہ ہنس دیئے۔ اب اگر کسی سے دونوں واقعے بیان کردیئے جائیں اور یہ نہ بتایا جائے کہ کون کس کا واقعہ ہے اور پوچھا جائے کہ دونوں واقعے والوں میں کون افضل ہے تو وہ تو یہی کہے گا کہ جو نہیں رویا وہ افضل ہے حالانکہ بالکل غلط، باقی یہ کہ اس کا کیا سبب کہ حضورؐ پر اس واقعہ کا اثر ہوا اور اس متوسط ولی پر نہیں ہوا۔ سو اسے بھی ایک مثال سے سمجھئے۔

آپریشن دو آدمیوں کا ہوا، ایک کو داروئے بیہوشی سنگھائی گئی اور ایک کو نہیں سنگھائی گئی کیونکہ جس کا دل زیادہ مضبوط ہوتا ہے اور وہ قوی وتوانا ہوتا ہے اسے بیہوشی کی دوا نہیں

سنگھاتے تو اب جس کو داروئے بیہوشی نہیں سنگھائی گئی تھی اس نے آپریشن کے وقت زور سے آہ کی اور جو بیہوش تھا وہ خاموش رہا۔ اسی طرح متوسطین داروئے بیہوشی سونگھے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ دارو مغلوب الحال ہوتا ہے اور انبیاء اور اولیاء کاملین کو نہیں سنگھائی جاتی تو اب جس نے لڑکے کے مرنے کی خبر سنی اور وہ نہیں رویا وہ حال میں اتنا مغلوب ہے کہ اسے حس ہی نہیں الم کی تو اس کا نہ رونا کچھ بھی کمال نہیں۔

جیسے کوئی اندھا کہے کہ میں بڑا متقی ہوں کہ کیسی ہی حسین عورت میرے سامنے سے گزر جائے مگر میں اسے نہیں دیکھتا تو اس کا نہ دیکھنا کیا کمال ہے کمال اس کا ہے جس کی آنکھیں بھی روشن ہیں اور دوربین عینک بھی لگی ہوئی ہے اور اس کے سامنے سے حسین عورت گزرتی ہے اور وہ پروا بھی نہیں کرتا۔ ہاں جس کا اثر بلا اختیار طبعاً اس پر اتنا ہوتا ہے کہ بعض اوقات دل دھڑکنے لگتا ہے اور جو اندھا ہے اس کا دل نہیں دھڑکتا تو اندھا بڑا کامل نہیں ہے کیونکہ اس نے تو دیکھا ہی نہیں، کمال اس کا ہے کہ دل دھڑک رہا ہے اور علاج سکون کا یہی ہے کہ پھر دیکھ لے مگر خدا کے خوف سے نہیں دیکھتا اور کہتا ہے دیکھوں گا تو غیرت خداوندی جوش میں آوے گی اور کہا جاوے گا۔

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی ۔۔۔ در بیان دعوائے خود صادقی

پس چرا برغیر افگندی نظر ۔۔۔ ایں بود دعوائے عشق اے بے ہنر

”کہا اے بے وقوف اگر تو عاشق ہے اور اپنے دعویٰ عشق میں سچا ہے تو پھر غیر کی طرف کیوں نظر ڈالی۔ اے بے ہنر کیا یہی عشق کا دعویٰ ہے“۔

عشق کی حقیقت

یہاں ایک استطرادی سوال و جواب ہے وہ یہ کہ شاید تم کہو کہ دعوئے عشق ہم نے کب کیا ہے۔ وہ کون سا دعویٰ ہے تو سنئے وہ دعویٰ یہ ہے کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر کوئی کہے کہ ہم نے کلمہ تو بے شک پڑھا ہے مگر ہم نے یہ تو نہیں کہا کہ ہم عاشق بھی ہیں۔ خبر بھی ہے کہ یہی کہنا دعویٰ ہے عشق کا کیونکہ اس کلمہ سے تم مؤمن ہوگئے اور مؤمن کے لوازم ہے عشق جس کی دلیل یہ ہے۔ ”وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ“ (اور جو مؤمن ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کے

ساتھ سخت قوی محبت ہے) تو کلمہ کی ایسی مثال ہوئی کہ کسی نے نکاح کیا۔ اب بیوی نے کہا کہ اناج لاؤ تو کھانا پکے۔ اس نے کہا کہ میں یہ جھگڑا کیا جانوں۔ میں نے تو قبلت سے تجھ کو قبول کیا ہے، اس بکھیڑے کا نہ وہاں ذکر تھا اور نہ میں نے قبول کیا تھا، اب لڑائی شروع ہوگئی اور محلہ والے جمع ہوگئے تو یہ فیصلہ کرتے ہیں ''ارے قبلت'' (میں نے قبول کیا) میں سب کچھ آ گیا۔

تو بس حضور اسی طرح لاالہ الا اللہ میں سب کچھ آ گیا۔ جیسا ابھی مذکور ہوا کہ ''وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ'' (اور جو مؤمن ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ سخت قوی محبت ہے) لوازم ایمان سے ہے اور اشد حباً کے معنی یہی عاشق کے ہیں کیونکہ شدت حب ہی تو عشق ہے۔ گو خود عشق کا مادہ قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ مگر ایک جاہل صوفی نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ عشق کا مادہ بھی قرآن میں ہے۔ پوچھا گیا کہاں ہے، کہاں قرآن میں ہے، نہیں ''حم عسق''. یہ مادہ عشق ہی کی تعبیر ہے باقی یہ کہ اس میں تو سین ہے اور عشق میں شین ہے۔ تو آپ کہتے ہیں کہ اصل میں تو شین ہی مراد ہے مگر حضورؐ چونکہ پڑھے ہوئے تھے نہیں اور اس لیے (نعوذ باللہ) آپؐ سے شین ادا نہ ہوسکتا تھا، اس لیے آپ کی رعایت سے سین نازل کیا گیا، کم بخت سے کوئی پوچھے کہ اگر ایسا ہوتا تو سارے قرآن میں کہیں بھی شین نہ ہوتا۔

بہرحال یہ دعویٰ تو لغو اور بیہودہ ہے کہ عشق کا ذکر قرآن میں ہے۔ محدثین تو احادیث میں بھی اس کے ذکر سے منکر ہیں اور حدیث من عشق فعف میں کلام کرتے ہیں لیکن حقیقت عشق قرآن سے ضرور ثابت ہے۔ چنانچہ اشد حباً کی تفسیر سے اوپر ثابت کیا گیا ہے۔ بس تو جب آپ عاشق ہوگئے تو اب آپ سے یہ ضرور پوچھا جائے گا کہ اگر غیر کی طرف التفاف کرو گے۔

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی　　در بیان دعوائے خود صادقی

پس چرا برغیر افگندی نظر　　ایں بود دعوائے عشق اے بے ہنر

''کہا اے بے وقوف اگر تو عاشق ہے اور اپنے دعویٰ عشق میں سچا ہے تو پھر غیر کی طرف کیوں نظر ڈالی۔ اے بے ہنر کیا یہی عشق کا دعویٰ ہے''۔

آپ اس کا کیا جواب دیں گے۔ اگر کسی کی بیوی کسی غیر مرد کو تکنے لگے، تو یہ دل چاہے گا کہ تلوار مار دے، حالانکہ یہاں تو یہ بھی عذر نہیں چل سکتا کیونکہ خدا سے زیادہ کون

حسین ہوگا اگر کوئی کہے کیا معلوم دیکھا تو ہے ہی نہیں، صاحبو! اگر خدا تعالیٰ کو دیکھا نہیں مگر سنا تو ہے اور عشق کا مدار کچھ دیکھنے ہی پر نہیں ہے۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد بسا کیں دولت از گفتار خیزد

''محض دیکھنے ہی سے عشق پیدا نہیں ہوتا بلکہ بسا اوقات یہ دولت دیدار سے پیدا ہوتی ہے''

اس پر بھی اگر کوئی کہے کہ نہیں ہم تو دیکھیں گے تب ہی عاشق ہوں گے، ہمارے اندر سننے کا اثر نہیں ہوتا۔ اچھا بھئی دیکھو مگر کیا دیکھنا آنکھ ہی پر منحصر ہے ہرگز نہیں، اگر کوئی معاملہ پیچیدہ ہوتو لوگ کہتے ہیں کہ اس کام کو خوب دیکھ بھال کر کے کرو۔ آپ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ میں نے خوب دیکھ بھال لیا، میرے نزدیک بالکل مناسب ہے، اب میں آپ سے پوچھتا ہوں آپ نے اس معاملہ کو کیوں کر دیکھ لیا، کیا آنکھ سے دیکھ لیا تو ذرا ہمیں بھی تو آنکھوں سے دکھادو۔ اس وقت آپ یہ کہیں گے کہ ہر شے کا دیکھنا جدا ہے کسی کو آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے اور کسی کو دل سے۔ بس اسی طرح خدا بھی دل سے دکھائی دیتا ہے آنکھ سے نہیں دیکھائی دے سکتا، اگر کوئی کہے اچھا دل ہی سے دکھادو، سو بے شک تم دل سے دیکھ سکتے ہو، مگر دل پر جو پردہ پڑا ہوا ہے پہلے اسے ہٹادو، پھر حق تعالیٰ سامنے ہی تو ہیں۔ ہمارے ماموں صاحب کا شعر ہے:

کر غور ذرا دل میں کچھ جلوہ گری ہوگی یہ شیشہ نہیں خالی دیکھ اس میں پری ہوگی

ان سے چھوٹے ایک ماموں صاحب کا شعر ہے:

شد ہفت پردہ بر چشم ایں ہفت پردہ چشم بے پردہ ورنہ ماہے چوں آفتاب دارم

''اس آنکھ کے سات پردوں پر سات پردہ پڑ گئے ورنہ میں ایک چاند مثل آفتاب کے رکھتا ہوں''

اور اس پردہ کے اٹھانے کا طریقہ کیا ہے۔ اس کو عارف شیرازیؒ فرماتے ہیں:

میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز

''عاشق و معشوق کے درمیان کوئی حائل نہیں تیری خودی خود حجاب ہو رہی ہے حافظ خود ہی کو درمیان سے اٹھادے''

بتلادیا کہ خودی اور انانیت یعنی تکبر یہ حجاب ہے کہ اس کو دور کردو۔ پھر وصال ہی وصال ہے۔ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں:

تعلق حجاب ست و بے حاصلی چوں پیوند ہا بگسلی واصلی

''تعلقات غیر اللہ حجاب اور لا حاصل ہیں جب ان تعلقات کو قطع کرلو گے تو تم واصل ہو گے''

بس موانع کو اٹھا دو، خدا سامنے ہی ہے۔ باقی اس پردہ کے اٹھانے کا طریقہ کیا ہے، سو میں ان طرق کو نہیں چھپاتا جن کو صوفیاء چھپاتے ہیں مجھے علی الاعلان کہنے کی بزرگوں سے اجازت ہے اس لیے میں طرق رفع حجب کو ممبر پر بیٹھ کر کہتا ہوں۔ وہ رفع حجاب کا طریق یہ ہے کہ توجہ الی غیر اللہ کو چھوڑ دو، اگر ابتداء میں آپ کی بھی نظر حق تعالیٰ پر نہ پڑی تو ان کی تو تم پر پڑے گی۔ بقول کسی عاشق کے:

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

(ایک پلک مارنے کی مقدور بھی محبوب حقیقی سے غافل مت ہو، شاید تم پر لطف کی نگاہ کریں اور تم آگاہ نہ ہو)

اصل میں تو شاہ کی جگہ لفظ ماہ تھا مگر میں نے ادب کی وجہ سے شاہ کر دیا۔ پھر آپ کی توجہ اور ان کی نظر سے آپ کے قلب کو خدا تعالیٰ سے ایک خاص تعلق ہوگا۔ بس وہی تعلق دل سے دیکھنا ہے اور یہ کرنے کی بات ہے الفاظ سے سمجھنے کی نہیں ہے۔

دیکھو اگر کوئی کابلی پوچھے کہ آم کیسا ہوتا ہے اور آپ کہیں میٹھا ہوتا ہے وہ کہے گا کیسا میٹھا جیسے گڑ۔ آپ کہیں گے نہیں، وہ کہے گا جیسے انگور، انار، سیب، آپ ہر ایک کو نفی کریں گے، وہ کہے گا پھر تعین کے ساتھ بتلاؤ کیسے میٹھا ہوتا ہے، آپ کہیں گے الفاظ سے اس کا مٹھاس بیان نہیں ہوسکتا چکھ کر دیکھ لو اور اگر آپ ہزار کوشش کریں کہ لفظوں سے اس کو آم کی شیرینی سمجھا دیں تو وہ نہ معلوم آم کو کیا سے کیا سمجھے گا۔

جیسے ایک حافظ جی نے جو آنکھوں کے بھی حافظ تھے (یعنی نابینا) کسی شخص سے جس نے کھیر کی دعوت کی تھی، پوچھا کہ کھیر کیسی ہوتی ہے، اس نے کہا سفید سفید ہوتی ہے۔ انہوں نے پوچھا سفید کس کو کہتے ہیں، کہا جیسے بگلا، کہا بگلا کیسا ہوتا ہے، اس نے ہاتھ کو بگلے کی شکل بنا کر پیش کر دیا تو آپ ٹٹول کر کہتے ہیں یہ ٹیڑھی کھیر کیسے گلے سے اترے گی، یہ جو ٹیڑھی کھیر محاورہ میں مشہور ہے اس کی شان ورود یہی ہے۔ تو حافظ جی نے بوسائط یہی سمجھا کہ بگلا جیسا

ٹیڑھا ہے کھیر کی شکل بھی یہی ہوگی۔

تو دیکھئے اس نے ذوقی چیز کو لفظوں سے سمجھانا چاہا تو نوبت کہاں پہنچی۔ بتانے والے نے غلطی یہ کی کہ امور حسیہ کو الفاظ میں ادا کیا حالانکہ کھیر کی حقیقت سمجھنے کے لیے چکھنے کی ضرورت تھی۔ اسی طرح یہ بھی کرنے کی بات ہے اور کرنے کے کام خاموشی کے ساتھ کام میں لگنے سے سمجھ میں آتے ہیں، زبان چلانے سے سمجھ میں نہیں آتے۔ بقول مولانا:

گرچہ تفسیر زبان روشن گرست　　　لیک عشق بے زباں روشن ترست

یعنی گو عشق کی تفسیر زبان سے بھی ہوتی ہے مگر حقیقت اس تفسیر سے معلوم ہوتی ہے جو زبان بند کر کے حاصل ہوتی ہے۔ غرض رفع حجاب کا طریق ترک التفات الی الغیر ہے۔ پھر اس ترک التفات الی الغیر کا ایک طریق ہے وہ یہ کہ چند روز کسی محقق کی تعلیم کے موافق خلوت میں بیٹھ جاؤ اور جو بتائے وہ کرو، اس کے بعد غیر حق سے بے تعلقی اور خدا سے تعلق پیدا ہوگا، اس وقت مشاہدہ حسب استعداد ہوگا اور اس مشاہدہ سے معلوم ہوگا کہ محبت اور عشق کیا چیز ہے اور اس وقت حقیقت ''والذین امنوا اشد حباًلله'' کی منکشف ہوگی۔

مجاہدہ نفس کا اثر

اگر کوئی کہے کہ ہم نے مجاہدہ کیا تھا اور یہ بات حاصل بھی ہوگئی تھی مگر چند روز کے بعد وہ حالت اصلیہ پھر عود کر آئی۔ تو اس کی بقاء کا طریق بھی معلوم ہونا چاہیے تو اس غلطی پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ مجاہدہ کا یہ اثر نہیں ہے کہ جذبات نفسانیہ فنا ہو جاویں جیسا سائل کو شبہ ہوا اور اسی بناء پر عود کا اشکال کیا بلکہ اس کا اثر صرف یہ ہے کہ وہ جذبات مغلوب ہو جاتے ہیں یعنی قبل مجاہدہ جو ہم تقاضائے نفسانی کی مقاومت کرتے تھے تو دشوار ہوتا تھا اور بعد مجاہدہ کے وہ مقاومت کرنا آسان ہو جاتا ہے اور علت اس آسانی کی وہی مجاہدہ ہے۔ پس جب مجاہدہ میں کمی ہوگی عود ضروری ہے اس لیے بقاء اس کیفیت مغلوبیہ کا اس پر موقوف ہے کہ مجاہدہ برابر جاری رہے اور عود کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس نے مجاہدہ کے بعد کسی دفعہ تقاضائے نفس کی مقاومت چھوڑ دی پھر ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ پھر مقاومت نہیں کی، پھر ایسا ہی ہوا پھر نہیں کی۔ پس چند روز تم اسی طرح کرتا رہا۔ اس سے مجاہدہ کا اثر مضمحل ہو کے زائل ہو گیا ایسا کوئی

مادہ بتاؤ کہ کوئی شخص برابر مقاومت کرتا رہا ہو اور پھر حالت اصلیہ عود کر آئی ہو۔ پس یہ غلطی کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجاہدہ کر کے بے فکر ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ بس اب ہمارے اندر سے رذائل نکل گئے، اس کے بعد جو نفس کا تقاضا ہوا تو اس کو رذیلہ نہیں سمجھا بلکہ کوئی اچھی حالت سمجھی حالانکہ رذائل فنا تو ہوتے نہیں مجاہدہ سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ اس لیے بے فکری سے وہ پھر ابھر آتے ہیں۔ اسی کو فرماتے ہیں:

نفس اژدہاہاست او کے مردہ است　　　از غم بے التی افسردہ است

(نفس اژدہا ہے وہ مرا نہیں ہے بے التی کے غم سے افسردہ ہو گیا ہے)

اور فنائے نفس کا جو مرتبہ مشہور ہے اس کے یہی معنی ہیں کہ وہ مغلوب ہو گیا اور توجہ الی اللہ غالب ہو گئی لیکن اصل باقی ہے اس لیے اور مجاہدہ کے بعد بے فکری سے عود کا ضرور اندیشہ ہے اس طریق میں بے فکری کی کہاں گنجائش یہ تو عمر بھر کا دھندا ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں:

اندریں راہ می تراش و می خراش　　　تادم آخر دمے غافل مباش

تادمے آخر دمے آخر بود　　　کہ عنایت با تو صاحب سر بود

"تم کو چاہئے کہ اس طریق وصول الی اللہ میں ہمیشہ ادھیڑ بن میں لگے رہو اور آخری دم تک ایک لحظہ بھی فارغ مت ہو کیونکہ آخری وقت تک کوئی گھڑی ایسی تو ضرور ہوگی جسمیں عنایت ربانی تمہاری ہمراز اور رفیق بن جائے گی یعنی طلب میں لگے رہو تو ضرور وصول الی اللہ ہو جائے گا"

اگر کسی کو مولانا کے دوسرے شعر سے شبہ ہو کہ مولانا تو کامیابی کے احتمال کو وقت موت تک ممتد فرماتے ہیں اور تم کہتے ہو کہ چالیس روز میں حاصل ہو جاتا ہے بات یہ ہے کہ ایک کفایت کا درجہ ہے اور ایک نہایت کا۔ کفایت کا درجہ تو چالیس روز میں کسی محقق کی صحبت میں بیٹھنے سے حاصل ہو جائے گا جس کی حقیقت یہ ہے کہ طریق کی بصیرت ہو جائے گی، راہ پر لگ جاوے گا، اس کے بعد درجہ نہایت کا ہے جس کو مولانا فرما رہے ہیں جس کے وہ آثار ہیں جن کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ "**نعم العبد صهيب لو لم يخف الله لم يعصه**"، یعنی اگر صہیب کو خدا کا خوف بھی نہ ہو تب بھی نافرمانی نہ کرے۔ یہ درجہ جب ہی حاصل ہوتا ہے جب کہ برابر مجاہدہ نفس میں مشغول رہے جس سے کسی دن

محبت ایسی واضح ہوگی کہ خوف کی بھی ضرورت نہ رہے گی۔ یہ نہایت ہے۔

اس کی ایسی مثال سمجھو کہ عالم بننے کے لیے ایک درجہ تو کفایت اور ضرورت کا ہے کہ نصاب درس ختم کرلیا جائے اور ایک درجہ نہایت کا ہے کہ برسوں پڑھنے پڑھانے اور کتب بینی کرنے سے تجربہ کا درجہ حاصل ہو جائے۔ پس میرے دعوے میں جو حافظ کے کلام میں بھی منصوص ہے اور حضرت مولانا رومیؒ کے ارشاد میں بھی تعارض نہ رہا۔

روح کی قوت

میں اوپر یہ گفتگو کر رہا تھا کہ کراہت طبعی اطاعت کے خلاف نہیں، درمیان میں استطراداً دوسرے مضامین اسی کے متعلق آ گئے تھے۔ اب میں اسی طرف عود کرتا ہوں کہ اصل اطاعت یہی ہے کہ عقلی کراہت نہ ہو، باقی طبعی کراہت نہ رہنا، اطاعت کا جز و یا لازم نہیں اور اسی لیے یہ حالت اکثر متوسطین کو پیش آتی ہے۔ کیونکہ متوسطین تو اپنے حال میں اس قدر مغلوب ہوتے ہیں کہ اس وقت لذت طبعیہ اور کراہت طبعیہ کچھ بھی نہیں رہتی، غلبہ کیفیت سے امور طبعیہ مغلوب ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائے ذکر میں زیادہ مزہ آتا ہے کیونکہ اس وقت کیفیت کا ورود غلبہ سے ہوتا ہے جس سے نفس کی کشاکشی مغلوب ہو جاتی ہے، یک سوئی کامل ہو جاتی ہے اور یہی منشاء ہے لذت کا۔

حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی قدس سرہ سے ان کے ایک خادم نے شکایت کی کہ حضرت ذکر میں اب ویسا مزہ نہیں آتا جیسا شروع میں آتا ہے۔ مولانا نے فرمایا: میاں تم نے سنا نہیں کہ پرانی جورو اماں ہو جاتی ہے۔

دیکھو اگر کوئی کسی پر عاشق ہو گیا ہو، پھر نکاح ہو جائے تو ہفتہ دو ہفتہ کے بعد وہ کیفیت نہیں رہے گی جو ابتداء میں تھی۔ اگر کوئی کہے کہ بس جی پھر تو جنت کا مزہ بھی مغلوب ہو جائے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تو مغلوبیت کی وجہ یہ ہے کہ تم نے اس شے کے تمتع اور حسن کا احاطہ کرلیا ہے یہاں بھی حسن غیر محدود ہوتا تو شوق کبھی ختم نہ ہوتا۔ یہاں وہ حسن بھی محدود ہے اور اپنی قوت بھی محدود ہے اور جنت کا حسن بھی غیر محدود ہے اور قوت بھی غیر محدود ہوگی۔ پھر شوق کیوں ختم ہوگا وہاں تو یہ حال ہوگا۔

يزيدك وجهه حسنا اذا مازدته نظرا

''یعنی جس قدر تیرے چہرہ پر نظر ڈالتا ہوں حسن کا دور زیادہ پاتا ہوں''

اور یہی وجہ ہے کہ ذکر میں لذت نفسانیہ تو کچھ دنوں کے بعد کم ہو جاتی ہے مگر شوق روحانی کم نہیں ہوتا کیونکہ روح کی قوت نفس سے زیادہ ہے اور محبوب حقیقی کے کمالات حسن وغیرہ غیر متناہی ہیں تو شوق روحانی کا وہ حال ہوتا ہے جس کو حضرت شیخ سعدی فرماتے ہیں:

دل آرام در بردل آرام جو لب از تشنگی خشک و برطرف جو

(محبوب بغل میں ہے اور محبوب کو ڈھونڈھ رہے ہیں، نہر کے کنارے پر ہیں اور ہونٹ پیاس سے خشک ہیں)

نگویم کہ بر آب قادر نیند کہ بر ساحل نیل مستسقی اند

(یہ ہم نہیں کہتے کہ پانی پر قادر نہیں بلکہ دریائے نیل کے کنارے پر پیاس کے بیمار کی طرح ہیں)

اور ایک دوسرے عارف فرماتے ہیں:

قلم بشکن سیاہی ریز و کاغذ سوز و دم درکش حسن ایں قصہ عشق است در دفتر نمی گنجد

''قلم توڑ سیاہی بکھیر اور کاغذ جلا اور خاموش رہ حسن یہ عشق کا قصہ ہے جو دفتر میں نہیں سما سکتا''

اور کسی نے کہا ہے:

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار گلچین بہار تو نہ داماں گلہ دارد

''تیرے حسن کے گل بہت ہیں تیرے بہار کے گل جس کو تنگ دامنی کا گلہ ہے''

اور چونکہ جنت میں روح کی قوت یہاں سے بھی زیادہ ہوگی۔ اس لیے وہاں یہ شوق یہاں سے بھی زیادہ ہوگا۔ اس مقام پر بعض غیر محقق صوفیاء کو شبہ ہو گیا ہے کہ عشاق کو جنت میں بھی بے چینی رہے گی۔ مگر واقع میں یہ دعویٰ ہی غلط ہے کہ شوق میں ہمیشہ بے چینی ہوتی ہے۔ بے چینی جب ہوتی ہے کہ محبوب کا حصول شوق کے درجہ تک نہ ہو اور وہاں جیسے شوق غیر متناہی ہوگا ایسے ہی حصول بھی غیر متناہی ہے اور ہر درجہ حصول کا اس وقت کے شوق کے موافق ہوگا پھر اس میں کیا استبعاد ہے کہ شوق موجود ہو اور بے چینی نہ ہو اور راز اس میں یہ ہے کہ جس حالت میں جس قدر قرب محبوب کی استعداد ہوگی شوق بھی اسی درجہ کا ہوگا پھر

استعداد میں بھی ترقی ہوگی اور اسی قدر شوق میں بھی۔

مبتدی و منتہی کی شناخت

بے چینی اس وقت ہوتی ہے جب استعداد سے کم قرب ہو۔ ان کو دھوکہ ہوا ہے قیاس الغائب علی الشاہد سے کہ آخرت کو دنیا پر قیاس کیا۔ بہرحال سالک کو یہ بات پیش آتی ہے کہ ابتداء میں یہ ابن الوقت ہوتا ہے کہ حالات اس پر غالب ہوتے ہیں اور یہ ان میں مغلوب ہوتا ہے اور انتہا میں ابوالوقت ہوتا ہے کہ حالات پر یہ غالب ہوتا ہے۔

جیسے قرآن یاد کرنے میں ابتداء میں قرآن کو رٹنا پڑتا ہے اور جب یاد ہو گیا تو اب کچھ محنت نہیں۔ اب نہ وہ رات دن رٹتا ہے نہ سناتا ہے، اس کی اس حالت کو دیکھ کر کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ یہ حافظ ہے اور رٹنے والے کی حالت کو دیکھ کر سب سمجھ جاتے ہیں کہ یہ حافظ ہے۔

اسی طرح اولیاء کاملین کی حالت انتہا میں کسی کو معلوم نہیں ہوتی کہ یہ کس درجہ کے ہیں۔ بس ایسی حالت معلوم ہوتی ہے جیسے معمولی ناظرہ خواں ہو۔ ہاں مبتدی سلوک کی حالت سب کو معلوم ہوتی ہے کیونکہ وہ تو مثل قرآن حفظ کرنے والے کے ہے کہ رٹ رہا ہے رات دن اور حافظ کا حال کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔ بس رمضان آیا اور سنا دیا، پس جس مقام پر صبر کا امر ہے کاملین کو وہاں طبعی ناگواری ہوتی ہے اور وہ اس مقام میں صبر سے کام لیتے ہیں اور مبتدی کو غلبہ حال سے بے چینی نہیں ہوتی اس لیے وہ ہنستا ہے مگر یہ کمال نہیں، کمال وہی ہے کہ بے چینی بھی ہو اور پھر صبر ہو۔ یہ اولیاء کاملین کا حال ہے اور انبیاء کی حالت ان سے بھی بڑھی ہوئی ہے، وہ سب سے زیادہ ادراک بھی رکھتے ہیں پھر اپنے مقامات پر غالب ہوتے ہیں اور دونوں کا فرق میں ابھی کلورافارم کی مثال میں بتا چکا ہوں کہ ایک کلورافارم سونگھے ہوئے ہے اس کو حس ہی نہیں الم کا اور ایک ذی ہوش ہے اس کو حس ہے الم کا اور باوجود احساس الم کے پھر اُف نہیں کرتا۔ بتلائیے دونوں میں کون کامل ہے تو انبیاء کے مقابلہ میں اولیاء متوسطین ایسے ہی ہیں۔

اسی طرح جس کی حسین عورت پر نظر پڑ گئی اور میلان بھی ہوا مگر غیرت الٰہی کے خوف سے اس طرف التفات نہ کیا اس کی حالت اندھے سے اکمل و بہتر ہے جس کو حسن کا ادراک ہی نہیں ہوا۔

اب ”حفت الجنة بالمکارہ“ (الصحیح لمسلم) (جنت ناگوار چیزوں سے

گھیر دی گئی ہے) کی حقیت خوف منکشف ہوگئی کہ جاڑہ میں صبح کی نماز کے لئے اُٹھے۔ سردی کے مارے وضو ناگوار ہے مگر محبت عقلیہ کی وجہ سے کرتا ہے تو اس میں جو شبہ اطاعت و کراہت کے تنافی کا متوہم ہوتا تھا وہ دفع ہو گیا۔

حب اللہ پیدا کرنے کی تدبیر

غرض ایک تو قانونی اطاعت ہے اور ایک حقیقی جس میں حق تعالیٰ کی محبت کی بھی چاشنی ہو کہ مطلقاً فرض ہے۔ اب رہی یہ بات کہ وہ محبت کیسے حاصل ہو اس کی بھی ایک تدبیر ہے وہ یہ ہے کہ اہل محبت کے پاس رہو اور وہ جو بتلا دیں کرو، اب جب تک جانا میسر نہ ہو اس وقت تک کے لیے ایک وقتی نسخہ بتلائے دیتا ہوں۔ وہ یہ کہ چند باتوں کا التزام کرو۔

ایک یہ کہ کوئی معصیت اور نافرمانی نہ ہو، گو اس میں کلفت ہی کیوں نہ ہو اس میں راز یہ ہے کہ جب ہم نافرمانی نہ کریں گے حق تعالیٰ کی نظر محبت ہم پر ہوگی اور اس سے خود بخود آپ کو حق تعالیٰ کی طرف کشش ہوگی اور کشش اصل میں ادھر ہی سے ہوتی ہے اور علت وصول کی یہی ہے مگر اس سے آپ کی کوشش واجتناب عن المعصیۃ کا بیکار ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ وہ کوشش تب ہی ہوتی ہے جبکہ آپ قصد کریں اور قصد یہی ہے اور گو اس میں چند روز تکلیف ہوگی کہ ہر وقت نفس کی مخالفت کرنا پڑے گی مگر پھر عادت سے سہولت ہو جاوے گی۔

ایک بات یہ کیجئے کہ دوسرے تیسرے دن تھوڑا سا وقت نکال کر خلوت میں بیٹھ کے توجہ کے ساتھ اللہ اللہ کر لیا کیجئے اور اس میں وساوس کے آنے کا اندیشہ نہ کیجئے۔ آپ اللہ اللہ کی طرف نگاہ رکھئے، خواہ لکھا ہوا سامنے رکھئے، چاہے لکھا ہوا فرض کر لیجئے کہ میں اس لکھے ہوئے کو دیکھ رہا ہوں یا ارادہ کے ساتھ ادا کیجئے۔ محض یاد سے نہیں کہ دھیان اور طرف ہو اور لفظ اللہ زبان پر ہو بلکہ دل سے سوچ سوچ کر زبان پر لائیے۔ پھر ادھر توجہ رکھنے کی حالت میں وساوس خود بخود رفع ہو جاویں گے اور اگر آپ یہ چاہیں کہ خطرات میں بھی حق تعالیٰ ہی کی طرف توجہ ہو تو اس کا بھی طریقہ ہمارے حضرت قدس سرہ نے بتایا ہے کہ یہ سوچئے کہ سبحان اللہ کیا قدرت ہے حق تعالیٰ کی قلب میں بھی دریا کی سی موجیں پیدا کر دیں تو پھر وہ سارے خطرات

آئینہ جمال الٰہی بن جاویں گے۔ شیطان نے تو جال پھیلایا تھا حق سے دور کرنے کے لیے مگر اہل اللہ نے اس پر کیسا صیقل کر دیا کہ وہ اپنی سلیٹ کوری لے کر چلا گیا، اگر اب وہ دوبارہ آوے گا بھی تو لیٹ ہو کے آوے گا مگر کہیں اس اطمینان پر آپ نہ لیٹ رہیں۔

ایک جز و یہ ہے کہ وقت مقرر کر کے تھوڑی دیر خدا کی نعمتوں کا اور اپنی کوتاہیوں کا مراقبہ کیجئے۔

ایک جز و یہ ہے کہ کسی کامل بزرگ سے خط و کتاب رکھئے اور اپنے حالات اسے لکھئے اور اگر کچھ حالات نہ ہوں تو یہی لکھ دیجئے کہ کوئی حالت نہیں ہے اگر چہ ایسا ہو نہیں سکتا کہ مفید یا مضر کوئی حالت نہ ہو۔

ایک جز و یہ ہے کہ اولیاء اللہ کی حکایات مجاہدہ و ریاضت و ترک دنیا کی دیکھا کیجئے مگر ان کی دقیق ملفوظات کا مطالعہ نہ کیجئے ورنہ ایمان برباد ہونے کا اندیشہ ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

نکتہا چوں تیغ فولاد است تیز　　　چوں نداری تو سپر واپس گریز

"نکتے مثل تلوار ہندی کے تیز ہیں جب تمہارے پاس ڈھال نہیں ہے تو پیچھے ہٹ جاؤ"

سپر سے مراد علم وفہم ہے۔

پیش ایں الماس بے اسپر میا　　　کز بریدن تیغ رانبود حیا

"اس تلوار کے سامنے بغیر ڈھال کے مت آؤ اس لئے کہ تلوار کاٹنے سے نہیں شرماتی"

خوب ہی فرمایا ہے کہ تلوار نہیں شرماتی کاٹنے سے۔ آگے مولانا ان لوگوں کی خبر لیتے ہیں جو ایسے دقیق مضامین بلا ضرورت نااہلوں کے سامنے بیان کرتے رہتے ہیں۔

ظالم آں قومیکہ چشماں دوختند　　　وز سخنہا عالمے راسو ختند

"بڑے ہی ظالم ہیں جنہوں نے آنکھیں بند کر کے ایسی باتوں سے ایک عالم کو ویران کر دیا"

یعنی سچی باتیں بھی جب عوام کے فہم سے بالاتر ہوں ان کو عوام سے بیان کرنا ممنوع ہے۔ حضرت شیخ اکبر فرماتے ہیں "یحرم النظر فی کتبنا" ہماری کتابیں دیکھنا حرام ہیں نہ اس لیے کہ ان کے مضامین مفید نہیں بلکہ اس لیے کہ عوام میں استفادہ کی قابلیت نہیں جیسے طبیب ضعیف المعدہ سے کہے کہ بھنا ہوا گوشت مت کھایا کرو۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ فی نفسہ مضر ہے بلکہ فی نفسہ تو وہ لذیذ و مفید ہے مگر اس کے معدہ میں اس کے ہضم

کی طاقت نہیں ہے۔اسی طرح مبتدی کو ایسی کتاب کا مطالعہ مناسب نہیں۔

ہاں ایسی کتابیں دیکھئے جیسے روض الریاحین ہے کہ میں نے اس کا ترجمہ اردو میں کرادیا ہے اور وہ چھپ بھی گیا ہے۔اس میں اولیاءاللہ کی پانچ سو حکایتیں تھیں اور پانچ سو میں نے دوسری کتب سے ملادیں۔ اب ہزار ہوگئیں اور اس کا نام رکھا ہے (نزہتہ البساتین)۔ یہ کتاب خود بھی مطالعہ میں رکھئے اور گھر والوں کو بھی سنایا کیجئے۔ البتہ بعض حکایات اس میں بھی غامض ہیں ان کو چھوڑ دیا کیجئے۔

نفس پرستوں کا وسوسہ

اس پر نفس پرستوں کو یہ وسوسہ ضرور ہوگا کہ اس سے تو دنیا کا مزہ ہی جاتا رہے گا۔ میں کہتا ہوں خدا کی قسم اس سے تو دنیا میں پہلے سے زیادہ مزہ آنے لگے گا۔ دیکھئے آم کی لذت کی دو صورتیں ہیں ایک تو خود آم ملا، شیریں اور مزیدار، تو اس میں تو محض آم ہی کا مزہ ہے اور ایک صورت یہ ہے کہ محبوب نے آپ کو مزیدار آم دیا تو اس میں دو لطف ہیں۔ایک عین کا اور اضافت کا یعنی اس کے انتساب الی المحبوب کا کہ کھاتے ہوئے اس کا بھی مزہ لے رہے ہیں کہ یہ ہم کو محبوب نے بھیجا ہے تو بتلائیے کہ اب مزہ زیادہ ہے یا پہلے زیادہ تھا۔

اسی طرح تعلق مع اللہ سے پہلے آپ گھر میں بیٹھے قورمہ کھا رہے تھے تھوڑی دیر کے بعد تعلق مع اللہ کے اثر سے آپ کو یہ معلوم ہوا کہ یہ تو محبوب کا دیا ہوا ہے تو اب جو مزہ آوے گا قورمہ میں پہلے ہرگز نہ تھا۔ پہلے صرف قورمہ ہی تھا اور اب محبوب کا دیا ہوا قورمہ ہے تو بتلائیے لطف بڑھے گا یا کم ہوگا۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ محبان حق کو خود دنیا میں جو لطف حاصل ہے دنیادار اس لطف سے محروم ہیں کیونکہ انہیں اس انتساب کا لطف میسر نہیں اور اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کو خود قورمہ کا بھی لطف حاصل نہیں کیونکہ وہ جس ظرف میں کھا رہے ہیں اس میں مٹی پڑی ہوئی ہے جس سے سارا قورمہ کرکرا ہو رہا ہے وہ ظرف ذہن ہے اور مٹی کدورات وتشویشات وتفکرات دنیا ہیں کہ فلانے نے دعویٰ کردیا ہے یا فلانے کے ذمہ اتنا روپیہ ہے، دیکھئے وصول بھی ہو یا نہ ہو۔ اہل اللہ کے پیالہ میں یہ مٹی نہیں ہے۔

اہل اللہ کی حالت

میرا یہ مطلب نہیں کہ اہل اللہ کو حوادث و تفکرات پیش نہیں آتے پیش نہیں آتے ہیں مگر آپ میں اوران میں حوادث کی حالت میں بھی فرق ہے۔ وہ یہ کہ آپ حوادث کے متعلق تجویز و رائے رکھتے ہیں کہ اس طرح ہونا چاہیے اور وہ اختیار میں نہیں اس سے سخت پریشانی میں مبتلا رہتے ہیں اور اہل اللہ اپنی تجویزیں تمام تر مشیت الٰہی میں فنا کر دیتے ہیں اور ان کا مذہب یہ ہوگیا ہے کہ:

ہر چہ از دوست مے رسد نیکو ست

''جو کچھ دوست کی جانب سے پہنچتا ہے وہ بہتر ہے''

اور یہ مذہب ہے کہ

ناخوش تو خوش بود بر جان من　　　دل فدائے یار دل رنجان من

''محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ طبیعت کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو وہ مجھ کو پسندیدہ ہے میں اپنے یار پر جو میری جان کو رنج دینے والا ہے اپنے دل کو قربان کرتا ہوں''

باقی یہ کہ مذہب ان کا کیسے ہو جاتا ہے۔ سو اس طرح ہو جاتا ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے محبوب کے حکم سے ہوتا ہے۔ یہ عقیدہ ان کا حال بن گیا ہے تو اب ان کی کلفت کی ایسی مثال ہے جیسے محبوب کسی عاشق کو پیچھے سے آ کر اپنی آغوش میں زور سے دبالے تو جب تک اس نے محبوب کو دیکھا نہیں اس وقت تک تو جھنجھلاتا ہے کہ یہ کون مجھے دبانے لگا مگر پھر جو دیکھا کہ محبوب دبا رہا ہے تو اب یہ حالت ہے کہ پہلے سے زیادہ دبائے جانے کی تمنا کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تکلیف ہوتی ہو تو چھوڑ دیں اور تیرا رقیب چاہتا ہے کہ مجھے دبا لو، تو میں اس کو دبالوں، تو اس وقت وہ عاشق کہتا ہے:

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت　　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

''دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو جو آپ کی تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر سلامت رہے کہ آپ اس پر خنجر سے وار کریں''

اسی طرح اہل اللہ کی حالت ہے کہ انہیں تکالیف دنیا تو کیا ناگوار ہوتیں ان کو تو موت بھی ناگوار نہیں کیونکہ وہ سب ایسی ذات کا تصرف ہے جو ان کا دل ربا ہے اس لیے یہ حالت ہے کہ

بچہ بھی بیمار ہے مگر جیسی سوچ ان اہل دنیا کو ہوتی ہے کہ ہائے مر گیا تو کیا ہوگا وہاں کچھ بھی نہیں اور اس تمام تر پریشانی ورنج کی جڑ یہ تجویز ہی ہے اور جب تجویز ہی نہ کرے تو رنج کیسا۔ اس لیے کہتا ہوں کہ آپ کے پیالہ میں سے تو قورمہ کا بھی لطف مفقود ہے۔ سو ایک تو آپ کا قورمہ ہے کہ اس میں مٹی ملی ہوئی ہے اور ایک اہل اللہ کا قورمہ ہے کہ بالکل صاف ہے۔

کوئی کہے اہل اللہ کا قورمہ کیسا؟ کیا اہل اللہ بھی قورمہ کھاتے ہیں کیوں کیا ہوا کیا قورمہ کھانا حرام ہے۔ بعض لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ اہل اللہ کو لذائذ حرام ہیں۔ جیسے ایک شخص نے میری نسبت اعتراضاً کہا تھا کہ کپڑا اچھا پہنتا ہے، اسی طرح لوگوں نے اہل اللہ کی نسبت سوچ رکھا ہے کہ بس یہ سوکھی روٹیاں کھاویں تو اہل اللہ ہیں ورنہ نہیں ہیں، یہ غلط ہے۔ ہاں اہل اللہ کو قورمہ کی فکر نہیں ہوتی، ان کے سامنے جو نعمت بھی آ جاوے وہ قورمہ ہی ہے اور جو قورمہ بھی آ جاوے وہ اس کی نعمت سمجھ کر کھاتے ہیں، لذت نفس کے لیے نہیں کھاتے۔ تو انہیں ایک تو قورمہ کا لطف، دوسرے انتساب الی المحبوب کا اور تیسرے یہ کہ وہ کرکرا نہیں کیونکہ نہ وہاں مقدمہ کی فکر ہے نہ بیٹے کا غم اور اس سب کی وجہ وہی محبت اور محبت واقع میں ایسی ہی چیز ہے۔

از محبت تلخہا شیریں شود

(محبت سے ناگوار باتیں بھی گوارہ ہیں)

حقیقت میں شاہی زندگی اہل اللہ کی ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ.

''یعنی جو شخص کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو بشرطیکہ صاحب ایمان ہو تو ہم اس کو بالطف زندگی دیں گے اور اس کو اچھے کاموں کے عوض میں ان کا اجر دیں گے۔''

یعنی عمل صالح کی جزا محض ادھار ہی نہیں ہے جیسے عام کا خیال ہے بلکہ اس کی ایک جزا دنیا میں بھی ملتی ہے اور وہ حیات طیبہ ہے کہ جس میں کوئی غم و فکر نہیں ہے۔

کسی نے حضرت بہلول دانا سے پوچھا کہ آپ کا مزاج کیسا ہے؟ کہا کیا پوچھتے ہو اس شخص کا مزاج کہ دنیا میں کوئی کام اس کی خواہش کے خلاف نہ ہو۔ اس نے پوچھا یہ کیسے؟

فرمایا دنیا میں جو کام ہوتا ہے یہ تو مسلم ہے کہ وہ خدا کے ارادہ کے خلاف نہیں ہوتا اور میں نے اپنے ارادہ کو ان کے ارادہ میں فنا کر دیا ہے۔ تو جب وہ خدا کے ارادہ کے موافق ہے تو میری بھی خواہش کے مطابق ہوا۔

حضرت سید احمد رفاعی رحمۃ اللہ علیہ جو معاصر ہیں حضرت غوث اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے فرماتے ہیں جب ارواح کو جمع کیا گیا تو ہر ایک سے پوچھا گیا کیا چاہتے ہو تو جو جس کی سمجھ میں آیا وہ اس نے مانگا، جب اس ناچیز کی نوبت آئی اور پوچھا گیا کیا چاہتے ہو، میں نے کہا:

اریدان لا ارید واختار ان لا اختار

''یعنی میں یہی تجویز کرتا ہوں کہ کچھ تجویز نہ کروں اور یہی چاہتا ہوں کہ کچھ نہ چاہوں۔''

فاعطانی مالا عین رات ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر من اھل ھذا العصر

''پس مجھے وہ چیزیں عطا ہوئیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں اور نہ کسی کان نے سنیں اور نہ کسی کے دل میں ان کا وسوسہ ہی آیا، اس زمانہ والوں سے۔''

مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ کا رتبہ حضرت غوث اعظمؒ سے بھی بڑھا ہوا ہو۔ ممکن ہے کہ اکثر اہل عصر مراد ہوں اور ایک حیثیت سے یہ بڑھے ہوئے ہوں اور ایک حیثیت سے وہ۔ اس بارہ میں کوئی نص تو ہے نہیں جو کسی ایک شق کا جزم کیا جاوے اور یہی فیصلہ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں بھی ہے جن کی افضلیت مطلقہ منصوص نہیں ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کہ آپ تو علی الاطلاق سب سے افضل ہیں، باقی انبیاء کے تفاضل میں بھی یہی فیصلہ ہے کہ ایک فضیلت کے اعتبار سے ایک افضل ہوں اور دوسری فضیلت کے اعتبار سے دوسرے۔

تو دیکھئے فنا کا ارادہ کیا چیز ہے کہ اتنی بڑی دولت اس کی بدولت ملی۔ ایک منطقی نے اس پر اعتراض کیا کہ جب عدم ارادہ کیا تو یہ بھی ایک ارادہ ہے تو ارادہ پایا گیا۔ پھر عدم ارادہ کا حکم کیسے صحیح ہوا مگر یہ لوگ خادم الفاظ ہوتے ہیں اور صوفیاء اہل معانی ہیں۔ ابن عطاءؒ نے اس کا خوب جواب دیا ہے کہ وہ مطلق ارادہ کے فنا کا دعویٰ نہیں کرتے بلکہ اس ارادہ کے فنا کو کہتے ہیں جو مزاحم رضائے حق ہو اور عدم ارادہ کا مزاحم ارادہ رضائے حق نہیں تو اس کے ارادہ

کی نفی نہیں کرتے۔ معترض تو منہ دیکھ کر رہ گیا ہوگا۔ یہ معقول لوگ ہمیشہ لفظوں ہی کے گورکھ دھندے میں رہتے ہیں۔ پھر اپنے کو اہل معانی کہتے ہیں۔

ایسا ہی ایک مشہور اور لغو اشکال ہے۔ کلامی هذا کاذب میں کہ ہذا کا مشار الیہ یہی کلام ہو تو یہ کلام صادق ہے یا کاذب۔ اور پھر اس پر بڑی بڑی بحثوں میں وقت ضائع کیا ہے۔ مگر اے اللہ محاورہ میں کسی نے بھی یہ جملہ آج تک استعمال کیا ہے۔ بس ایک صورت اپنی طرف سے گھڑ لی اور اشکال کر دیا، چاہے اس کا وقوع ہو یا نہ ہو، انہیں صوفیاء تو کیا منہ لگاتے عوام بھی نہیں پوچھتے۔

چنانچہ ایک منطقی طالب علم کسی تیل کی دُکان پر گئے تیل خریدنے۔ اس کے بیل کے گلے میں گھنٹی بندھی دیکھ کر پوچھا کہ یہ کیوں باندھی ہے۔ اس نے کہا، اس لیے تاکہ گھنٹی کی آواز سے یہ معلوم ہو جائے کہ بیل چل رہا ہے۔ آپ نے کہا آواز سے تو بیل کا چلنا لازم نہیں آتا، ممکن ہے وہ کھڑے کھڑے گردن ہلایا کرے۔ اس نے کہا جی ہاں یہ تو سچ ہے مگر میرے بیل نے منطق نہیں پڑھی ہے۔ آپ میرے بیل کو بگاڑنے آئے ہیں، مہربانی کر کے تشریف لے جائیے، یہ قدر کی منطقی صاحب کی اس تیلی نے۔

تو غرض فناء ارادہ صوفیاء کا ایک خاص مشرب ہے کہ اس کے بعد ہر حال میں خوش ہیں۔ ہاں الم طبعی رضائے عقلی کے خلاف نہیں تو کیا اچھا نسخہ ہے محبت الٰہیہ جس سے دنیا بھی لذیذ اور دین بھی کامل۔ یہ تو اہل محبت کی جماعت ہے کہ مزے لوٹ رہے ہیں۔

منکرین کی حالت

ایک جماعت منکرین کی ہے کہ ان کو مزہ تو کیا نصیب ہوتا خود وجود محبت ہی کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ محبت الٰہیہ کے کوئی معنی ہی نہیں کیونکہ بے دیکھے محبت ہو نہیں سکتی اور حق تعالیٰ کو کوئی دیکھ نہیں سکتا مگر ان لوگوں نے نہایت بے حسی سے کام لیا ہے۔

دیکھو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ ہم لوگوں نے آنکھوں سے دیکھا اور نہ اپنے کانوں سے آپ کی باتیں سنیں اور پھر آپ کی محبت مسلمانوں کے دل میں کس قدر ہے کہ جان دینے کو تیار ہیں تو محبت رویت ہی پر موقوف نہیں ہے۔ ہاں محبت کی بعض قسمیں ایسی بھی ہیں جو دیکھنے پر موقوف ہیں لیکن عقلی محبت تو کسی طرح بھی اس پر موقوف نہیں۔

مثلاً ہم لوگوں کو حضرت امام ابوحنیفہؒ سے بوجہ ان کے کمالات فقیہہ وعبادت وورع کے خاص محبت ہے۔ اگر کسی طرح سے آپ کو دیکھ لیں اور یہ معلوم ہو جائے کہ آپ حسین نہیں ہیں تو کیا یہ محبت گھٹے گی، ہرگز نہیں کیونکہ ہمیں جو محبت ہے وہ تو آپ کے کمالات سے ہے اور اس کا ادراک بصر پر موقوف نہیں تو پھر خدا تعالیٰ کے ساتھ محبت میں کیا استبعاد رہا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جس کا نام ہے محبت حسن وہ بھی دراصل کمال کی محبت ہے کیونکہ حسن بھی ایک کمال ہے اور اگر کمال سے قطع نظر حسن ہی کو بالذات مؤثر فی المحبت کہا جاوے تب بھی اگر زیادہ غور کیا جائے تو جس حسین کی بھی محبت ہو وہ واقع میں حق تعالیٰ ہی کی ہے۔

اب میں منکرین محبت حق پر احتجاج کرتا ہوں کہ حسن و جمال جس محبوت کی صفت ہے وہ اس کی صفت بالذات ہے یا بالعرض ہے۔ اگر بالذات ہے تو زائل کیوں ہوتی ہے۔ چار دن بخار آیا اور چہرہ زرد پڑ گیا۔ ذرا سی چیچک نکل آئی اور معلوم ہوا کہ مرغ نے گوبر میں ٹھونگیں مار دی ہیں اور اسی لیے صفت کے زوال کے ساتھ خود محبت بھی رخصت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

عشق بامردہ نباشد پائیدار — عشق را باحی و باقیوم دار
عشق ہائے کزپئے رنگے بود — عشق نبود عاقبت ننگے بود
غرق عشقے شوکہ غرق است اندریں — عشق ہائے اولین و آخریں

''مردہ کے ساتھ عشق کو پائیداری نہیں ہے اس لئے اس حی وقیوم کا عشق اختیار کرو جو ہمیشہ باقی ہے جو عشق ومحبت رنگ وروپ پر ہوتا ہے وہ واقع میں عشق نہیں بلکہ محض ننگ ہوتا ہے جس کا انجام حسرت ہے عشق حقیقی میں غرق ہو جاؤ اس میں غرق ہونا اولین وآخرین کا عشق ہے''۔

اور جب یہ مجازی حسن و جمال صفت بالذات نہیں بالعرض ہے تو اس کے لیے بالذات کی ضرورت ہوگی اور تم جس کو بالذات بتاؤ گے اگر وہ فانی وحادث ہے تو یہی کلام اس میں برابر ہوتا رہے گا۔ یہاں تک کہ منتہا ہوگا حق تعالیٰ پر ''اَلَآ اِلَی اللّٰہِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ'' اور چونکہ ہے کمالات مقصودہ سے اس لیے مرجعیت کی صورت اتصاف بالذات ہوگا۔ تو معلوم ہوا کہ حسن و جمال بھی اصل صفت حق تعالیٰ ہی کی ہے۔

حسن ربانی

مگر کہیں اس سے یہ نہ سمجھئے گا کہ یہ صفت خدا تعالیٰ کی اسی ہیئت سے ہے، جس ہیئت سے مخلوق میں ظاہر ہے ہرگز نہیں بلکہ بلا تشبیہ اس کی ایسی ناتمام مثال ہے جیسے آفتاب نکلا اور اس کی کرن کسی آئینہ میں سرخ اور کسی میں سبز معلوم ہونے لگی تو کیا آفتاب کو سرخ اور سبز کہنے لگیں گے ہرگز نہیں۔ آفتاب کی شعاع کا رنگ تو ایک ہی ہے مگر خصوصیت محل کی وجہ سے یہ فرق ہو گیا ہے۔

اسی طرح حق تعالیٰ کا حسن تو واحد ہے اور اس کی کوئی مثال بھی بیان نہیں کی جا سکتی مگر اس کی شعاعیں مختلف محلوں میں مختلف نظر آتی ہیں اور ناتمام اس لیے کہا کہ مشبہ بہ میں تو حقیقت شعاع کی اور اس کے تعلق بآئینہ کی حقیقت معلوم ہے اور مشبہ میں نہ صفت حق کی حقیقت معلوم نہ اس کی وجہ تعلق بالمظاہر۔ مگر جو مقصود ہے تشبیہ سے وہ ظاہر ہے اور وہ مقصود یہ ہے کہ جب عشق حسن پر ہوتا ہے اور وہ اصل میں صفت حق تعالیٰ کی ہے تو وہ درحقیقت حق تعالیٰ ہی کے حسن کا عشق ہے کسی نے اس مضمون کو ناتمام تعبیر کیا ہے۔

حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردۂ ۔۔۔ پس بچشم عاشقاں خود را تماشا کردۂ

پرتوئے حسنت نگنجد در زمین و آسمان ۔۔۔ در حریم سینہ حیرانم کہ چوں جا کردۂ

''اپنے حسن کو حسینوں کے چہرے سے ظاہر کیا ہے عاشقوں کی آنکھ میں اپنے آپ کو تماشا بنایا ہے۔ آپ کے حسن کا پرتو زمین و آسمان میں نہیں سماتا میں حیران ہوں کہ میرے حریم سینہ میں کیونکر جگہ کر لی ہے''۔

اور ایک حسن ہی کیا تمام صفات کے کمال کا یہی حال ہے کہ انسان کا علم فضل عطا جود حسن وغیرہ تمام صفات کمال میں حق تعالیٰ ہی متصف بالذات ہیں۔ پس اگر حسن کی یا اور کسی کمال کی وجہ سے کوئی کسی پر عاشق ہے تو وہ درحقیقت حضرت حق ہی کا عاشق ہے مگر اسے خبر نہیں۔

جیسے دیوار پر آفتاب کی روشنی دیکھ کر کوئی دیوار کا عاشق ہوا تو وہ درحقیقت آفتاب کا عاشق ہوا، دیوار کا عاشق نہیں مگر اسے آفتاب کی خبر نہیں، اب جو آفتاب غروب ہونے لگا اور روشنی چلی تو چلاتا ہے کہ ہائے میرا محبوب چلا اور اگر اس کو حقیقت معلوم ہو جائی تو یہ پریشانی نہ ہوتی کیونکہ غروب کے سبب صرف دیوار کے اوپر سے وہ روشنی غائب ہوئی ہے۔ آفتاب

سے تو غائب نہیں ہوئی، وہاں تو اب بھی موجود ہے۔

اسی طرح علم کو صحیح کر لیا جائے تو پھر کسی محبوب مجازی کے فوت سے غم نہ ہو کیونکہ اس میں تو محبوب حقیقی کا عکس تھا۔ جب محبوب حقیقی باقی ہے تو یہ کمال بھی باقی ہے پھر رنج کا ہے کا۔ پس اگر کسی سے سخاوت کی وجہ سے محبت ہے تو بھی وہی محبوب ہے اور اگر علم کی وجہ سے محبت ہے تو بھی وہی محبوب ہے اور حسن کی وجہ سے محبت ہے تو بھی وہی محبوب ہے۔ اسی واسطے لاالہ الا اللہ کے مدلول کا ایک درجہ عارفین کے نزدیک یہ بھی ہے کہ لامطلوب الا اللہ بلکہ لاموجود الا اللہ مگر شریعت نے اس کے ساتھ حکمت کی رعایت سے اسباب کا بھی لحاظ کیا ہے ورنہ لا موجود الا اللہ کی بناء پر تو بندہ کا کسی پر کچھ احسان ہی نہ ہوتا اور نہ کوئی کسی کا احسان مانتا اور اس سے تمدن برباد ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اسی لیے بقائے تمدن کے لیے یہ بھی ارشاد فرمایا گیا کہ:

من لم یشکر الناس لم یشکر اللّٰہ. (مجمع الزوائد للهیثمی۸: ۱۸۱)

اگر کوئی احسان کرے تو گو محسن حقیقی تو حق تعالیٰ ہی ہیں اس لیے اصل شکر تو ان کا ہونا چاہیے مگر یہ ظاہری محسن درمیان میں واسطہ تو ہے اس لیے اس کا بھی شکر کرنا چاہیے۔ پھر دیکھئے شریعت نے معاملہ بواسطہ میں بھی تعدیل فرمائی ہے کہ یہ بتلا دیا کہ مخلوق واسطہ تو ہے مگر ہے انہی کا بنایا ہوا۔ اس لیے یہاں بھی انتساب الی المحبوب ہی سبب شکر و محبت کا ہونا چاہیے اور اس کو بھی مرآت جمال حق بنانا چاہیے۔ یہ نہیں کہ اسی کا عاشق ہو جائے اور اس کو مستقل سمجھ لیا جائے۔

یہاں ایک دقیقہ ہے جسے صوفیاء نے سمجھا ہے۔ وہ یہ کہ محبوبوں کی عادت ہے کہ کبھی بے حجاب ہو کے جمال دکھاتے ہیں اور کبھی باریک پردہ چہرہ پر ڈال لیتے ہیں کہ خفیف سی جھلک عاشق کو دکھلائی دے۔ اسی عادت کے موافق سمجھو کہ جس وقت دوسرے کے واسطے سے کوئی احسان ہوتا ہے اس وقت بھی حق تعالیٰ ہی کی تجلی ہو رہی ہے مگر چلمن کے پیچھے سے یا نقاب کے اندر سے اور اس میں بھی ایک لطیف حکمت ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ ناسوتی استعداد کے اقتضاء سے ایک ہی طرح کی تجلی عاشق کے جذبات محبت بھڑکانے کو کافی نہیں بلکہ گوناگوں تجلیات سے اس کا شوق زیادہ ہوتا ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں "مشاهدة الابرار بين التجلي والاستتار" (عارفین کا مشاہدہ تجلی اور استتار کے درمیان ہوتا ہے) یہاں مقابلہ کی وجہ سے دوسری تجلی کو استتار کہا کہ اس

کے سامنے وہ استتار ہی معلوم ہوتا ہے ورنہ تجلی وہ بھی ہے گو خفیف ہے۔ تو یوں سمجھئے کہ ایک مرتبہ تو بلا آئینہ کے جمال دکھاتے ہیں اور ایک مرتبہ آئینہ کے اندر سے دکھلاتے ہیں جس میں راز یہ ہے کہ انسان اسی ناسوتی استعداد کی خاصیت سے ایک حالت سے اکتا جاتا ہے اگر یہ استتار یا غیبت بالکل نہ ہوتی تو دوام تجلی کا لطف ہی برباد ہو جاتا ہے۔

از دست ہجر یار شکایت نمی کنم گر نیست غیبتے نہ دہد لذتے حضور

(محبوب کی جدائی کی شکایت نہیں اگر جدائی نہ ہوتی تو لطف میں وصل ولذت نہ ہوتی)

تو حق تعالیٰ نے واسطہ کے ذریعے سے سالک کا مزہ بڑھا دیا اور یہاں اور تفریع کرتا ہوں کہ اب تو سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ جو مزے تصوف کے ہیں وہ شریعت ہی کی بدولت ہیں۔ یہ بات بھی شریعت ہی کی بدولت تو معلوم ہوئی کہ یہ وسائط مرایا جمال حق کے ہیں۔ ان کا بھی حق ادا کرنا چاہیے اور اس واسطہ سے بھی مشاہدہ کی لذت حاصل کرنا چاہیے۔

امالہ کی ضرورت

اب جو لوگ ان وسائط کو درمیان سے اڑانا چاہتے ہیں اور ہر وقت تجلی بلا واسطہ کے طالب ہیں وہ لذت مشاہدہ سے محروم ہیں۔ اسی واسطے جو لوگ کثرت سے سماع سنتے ہیں اور انہیں کچھ مزہ نہیں آتا کیونکہ اب وہ بدوں سماع کے چل نہیں سکتے نہ ان کو نماز میں لطف آتا ہے نہ ذکر میں اور بزرگوں نے جو ایسا کیا ہے اس کے لیے کچھ شرائط مقرر کر دیتے ہیں اور مقصود شرائط کا یہ ہے کہ تقلیل ہو اور تقلیل سے مزہ آوے ورنہ روز کی دال روٹی میں کیا مزہ اور اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ تقلیل کے ساتھ علی الاطلاق اجازت ہے خود اس میں بھی شرائط ہیں جن کی حکمت علاوہ تقلیل کے دوسری مضرتوں سے بچانا بھی ہے جو فاقد شرائط میں مرتب ہو جاتی ہیں۔ مقصود مقام کا یہ ہے کہ کثرت سماع میں اگر بالفرض مضرتیں بھی نہ ہوتیں تب بھی اس لیے واجب الترک تھا کہ یہی مصلحت ہے سماع میں وہ اس میں نہیں پائی جاتی۔

خیر یہ تو تفریع تھی حکمت واسطہ پر، مقصود یہ کہنا ہے کہ ظاہر محسن واسطہ ہے باقی اصل میں سارے کمالات حقیقتاً انہی کے ہیں۔ اس لیے بندہ جس سے جس کمال کی وجہ سے بھی محبت کر رہا ہے حقیقت میں وہ انہی سے محبت ہے۔ پھر محبت حق کے حاصل کرنے کو جو طرق

بتلائے جاتے ہیں ان کی حقیقت یہ ہے کہ محبت تو اس شخص کو خدا تعالیٰ کے ساتھ پہلے سے ہے صرف امالہ کی ضرورت ہے اور اس امالہ کے لیے وہی دستور العمل ہے جو میں نے اوپر بتایا ہے اسے کر لیجئے اور حیات طیبہ لے لیجئے۔

اس میں ایک جزو اہل اللہ سے تعلق رکھنا بھی ہے اس کا ایک حق ضروری بھی بتلاتا ہوں۔ وہ یہ کہ جب اہل اللہ کے یہاں پہنچا جائے تو وظیفہ و مطالعہ کو الگ کیجئے مگر ضروریات دین کو الگ نہ کیجئے اور اب جو وہ دیں اسے لیجئے اور بالکل ان کے یہاں ایسے ہو جائیے۔

قال را بگذار مرد حال شو پیش مردے کاملے پامال شو

''قال کو چھوڑ وحال پیدا کرو یہ اس وقت پیدا ہوگا جب کسی اہل اللہ کے قدموں میں جا کر پڑ جاؤ''

ہاں یہ شرط ہے کہ وہ مرد کامل ہو مرد کاہل نہ ہو اور پھر مرد ہو مردہ نہ ہو کیونکہ مردہ تو خود ہی پامال ہو رہا ہے وہ آپ کو کیا پامال کرے گا۔ اسی واسطے حکیم سنائی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے:

عالمت خفتہ و تو ہم خفتہ خفتہ را خفتہ کے کند بیدار

''پیر تمہارا سویا ہوا ہے اور تم بھی سوئے ہوئے ہو سوئے ہوئے کو بیدار نہیں کر سکتا''

پیر جی بنایا تو وہ بھی خفتہ، اب یہ مرید کیسے بیدار ہوگا، اور شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے جو اس شعر کو رد کیا ہے:

باطل است آنچہ مدعی گوید خفتہ را خفتہ کے کند بیدار

''یہ جو مدعی کہتا ہے سوئے ہوئے کو سویا ہوا کب بیدار کر سکتا ہے باطل ہے''

اس سے غرض شعر کا رد کرنا مقصود نہیں بلکہ ظاہر شعر سے احتمال تھا کہ کسی کے احتمال کرنے کا کہ ہمارے علماء بے عمل ہیں، اس لیے ہم ان کا اتباع نہیں کرتے اس کو رد فرماتے ہیں، چنانچہ شیخ کا شعر سابق اس کا قرینہ ہے۔

مرد باید کہ گیرد اندر گوش ور نبشت است پند بر دیوار

''آدمی کو ایسا ہونا چاہئے کہ نصیحت کی بات اگر دیوار پر بھی لکھی ہو تو اس کو بھی حاصل کرلے''

میری غرض بھی اس کے لانے سے یہ ہے کہ صاحب تاثیر سے تعلق پیدا کرنا چاہیے کہ زیادہ نفع ہو۔

اب اس کی تحقیق باقی رہی کہ اس مرد کامل کی پہچان کیا ہے سو اس سے پہلے جلسہ

میں شیخ کامل کی علامات بتا چکا ہوں۔ اگر وہ علامات نہ ہوں گی تو پھر پیر المات ہی المات ہیں۔ تو تم بھی المات میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ یہاں تک یہ سب بیان معبود کے حقوق اور ان حقوق کی تحصیل و تکمیل کے طریقہ کے متعلق۔

حقوق رسول صلی اللہ علیہ وسلم

اب ایک مضمون جو اس کا تتمہ ہے باقی رہ گیا ہے اور وہ حقوق ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اور گو اب اس کا وقت نہیں رہا مگر دس منٹ میں اس کے متعلق کچھ کہے دیتا ہوں وہ یہ کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نائب کامل اور مظہر اتم ہیں۔ حضرت حق کے اور اس سے زیادہ آپ کا ہم پر کیا احسان ہوگا کہ ہم کو دین ملا آپؐ ہی کی بدولت اور ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ "من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ" اور اس کلیہ کے علاوہ خود مستقل حقوق بھی جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے قرآن میں آئے ہیں اور وہ مثل حقوق الٰہیہ کے تین ہی حقوق ہیں۔

۱۔ اطاعت ۲۔ محبت ۳۔ عظمت

چنانچہ مختصراً و مختلطاً مع بعض فروع کے ان کو عرض کرتا ہوں۔ مثلاً ایک نوع حق محبت کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ کا دل دکھانے کی سخت ممانعت فرمائی ہے۔ ارشاد ہے "وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ الایة وغیرھا من الایات" (تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا نہیں دینی چاہیے) اس پر ایک تفریع کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ احادیث میں وارد ہے کہ آپؐ پر اُمتوں کے اعمال پیش ہوتے ہیں تو ہماری بداعمالیوں سے جبکہ ملائکہ آپؐ کے سامنے پیش کرتے ہوں گے آپ کا کتنا دل دکھتا ہوگا تو اس سے کس قدر احتراز لازم ہوگا۔

عظمت کے متعلق آپ کا یہ حق وارد ہے کہ "لَاتُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ" (اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تم سبقت نہ کیا کرو) اور اسی باب میں فرماتے ہیں "يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَاتَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ" (اے ایمان والو تم اپنی آوازیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے بلند مت کرو۔" آپؐ کے آگے چیخ کر مت بولو۔ اور اسی طرح ارشاد ہے:

وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ.

''یعنی معمولی طور سے آپ کو پکارو مت، کبھی ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال غارت ہوجاویں۔'' آگے فرماتے ہیں:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَاءِ الْحُجُرَاتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ. وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ.

''یعنی جو لوگ حجروں کے پیچھے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارتے ہیں ان میں اکثر بے عقل ہیں۔''

واقعہ یہ ہوا تھا کہ کچھ دیہاتی بے وقوف آئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت زنانہ میں تشریف رکھتے تھے مگر انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ کون سے قطعہ میں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ایک ایک آدمی ایک ایک حجرہ کے مقابل کھڑے ہو کر پکارے کہیں تو سن لیں گے۔ اس پر حق تعالیٰ نے انہیں آیت بالا میں ڈانٹا اور اس کی یہ اصلاح فرمائی کہ ''وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ'' یعنی اگر ذرا دیر اور ٹھہرے رہتے یہاں تک کہ آپؐ خود ہی باہر تشریف لے آتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ یعنی انہیں کیا حق ہے کہ اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پکاریں۔

اس مقام پر میں حضرات سامعین سے تفریعاً وتفریحاً ایک سوال کرتا ہوں کہ جب حجرہ کے باہر سے آپ کو پکارنا جائز نہیں تو ہندوستان سے پکارنا کب جائز ہوگا، میں فتویٰ نہیں دیتا آپ سے پوچھتا ہوں............ یہ تو عظمت کا کچھ مضمون تھا۔

اسی طرح جیسے حق تعالیٰ کی اطاعت فرض ہے ویسی ہی آپ کی بھی فرض ہے اور اسی طرح جیسے حق تعالیٰ کی محبت فرض ہے ویسی ہی آپ کی بھی فرض ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قصہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی شخص اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک سب سے زائد محبوب نہ ہوجاؤں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا۔ مجھے آپؐ کے ساتھ سب سے زائد

محبت ہے بجز اپنے نفس کے۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ جب تک اپنے نفس سے بھی زیادہ مجھ سے محبت نہ کرو گے مومن نہ ہو گے۔ اس کے بعد انہوں نے عرض کیا کہ اب نفس سے بھی زیادہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پاتا ہوں، آپؐ نے فرمایا: کہ بس اب مومن بھی ہو۔

خیر اس حدیث کی ایک شرح بھی ہے جس کا اب وقت نہیں ہے مگر اتنا سنا دیا ہے تا کہ یہ معلوم ہو جاوے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی جان سے بھی زیادہ محبت ہونا چاہیے۔ اگر طبعی نہ ہو تو عقلی تو ہونا چاہیے۔

ہماری حالت

آپؐ کے ان حقوق کی بجا آوری میں بھی عام کوتاہی ہو رہی ہے۔ حتیٰ کہ جو لوگ آپ کے حقوق کو بزعم خود ادا کر رہے ہیں وہ بھی کوتاہی سے بری نہیں اور وہ اس طرح کہ آپؐ کے جو تین حق ہیں مطاوعت، عظمت، محبت جن کا اوپر بیان ہوا ہے ان میں اکثر لوگوں نے تجزیہ کر رکھا ہے۔ سو بعض نے تو صرف مطاوعت کو لے لیا ہے مگر محبت وعظمت کے حقوق کو چھوڑ دیا ہے۔ باقی بعض جگہ یہ بھی ہوا ہے کہ واقع میں تو نہیں چھوڑا ہے لیکن دوسرے لوگوں نے اپنی سوء فہمی سے اسے زبردستی سے موہم گستاخی کا بنا لیا تو اس کا ذکر نہیں اور اس کا تو کوئی علاج ہی نہیں۔ ایسے اعتراض تو لوگوں نے اللہ تعالیٰ پر بھی کیے ہیں کہ ہائے اللہ تعالیٰ قرآن میں مکھی مچھر کا ذکر کرتے ہیں جو حقیر چیزیں ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے اور بعض نے یہ کیا کہ محبت کا دم تو بھرتے ہیں مگر مطاوعت اور عظمت کو بالکل ہی اڑا دیا ہے کہ نہ نماز ہے، نہ روزہ، نہ دین کے اور کام اور گمان یہ ہے کہ نری محبت سے نجات ہو جاوے گی اور یہ شعر یاد کر لیا ہے۔

نماند بعصیاں کسے در گرو　　　　که دارد چنیں سید پیش رو

(گناہوں کی وجہ سے وہ شخص نہیں رہے گا جو آپ جیسا سردار رکھتا ہو)

حالانکہ اس کے ساتھ قرآن کی یہ آیت بھی ملانا چاہیے "كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ" اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر نفس کو اس کے اعمال کے بدلہ میں قید حبس ہو گی۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ مومن اخیر تک محبوس عذاب میں نہیں رہے گا۔ شفاعت سے کسی وقت نجات ہو جائے گی تو کیا جہنم کی تھوڑی سی قید آپ کو گوارہ ہے۔ صاحبو! وہاں کا عذاب تحمل سے باہر ہے۔

اس کے علاوہ خود دعوائے محبت ہی کے متعلق کہتا ہوں کہ کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ کسی سے محبت ہو اور اس کی اطاعت نہ ہو۔ ایک شخص سے محبت کا تو دعویٰ مگر نہ اس سے بات کرتے ہیں نہ اس کی طرف دیکھتے ہیں نہ اس سے مصافحہ کرتے ہیں، کسی نے کہا ارے یہ کیسی محبت ہے تو کہا پاک محبت ہے، تو کیا کوئی کہے گا کہ اسے محبت ہے ہرگز نہیں کیونکہ محبت کے لیے تو لازم ہے اقتراب۔ اور یہ شخص اسباب بعد میں مبتلا ہے بلکہ از خود ان اسباب کو اختیار کر رہا ہے۔ پھر محبت کیسی۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا دعویٰ ہو اور اطاعت نہ کی جاوے تو یہ کیسی محبت ہے!

فرض کرو ایک محبّ سے کسی محبوب نے کہا کہ دو روپیہ کے آم لے آؤ، اس نے کہا نہ صاحب میں تو نہ لاؤں گا کیونکہ اتنی دیر تک آپ کو کیسے دیکھوں گا، ہر شخص یہی کہے گا کہ بس معلوم ہوا کہ یہ محبّ ہی نہیں ورنہ اطاعت کرتا اور فوراً چل دیتا کیونکہ محبّ کا تو یہ مذہب ہوتا ہے۔

ارید وصالہ ویرید ھجری فاترک ماارید لما یرید

''میں محبوب کے وصال کا خواہاں ہوں اور وہ ہجر کے خواہاں ہیں پس میں نے اپنی خواہش کو انکی خواہش کی وجہ سے ترک کر دیا''

اسی کا ترجمہ حضرت حافظ کرتے ہیں:

میل من سوئے وصال و میل او سوئے فراق ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست

''میری خواہش وصال کی ہے محبوب فراق کا خواہشمند ہے میں نے اپنی خواہش کو ترک کر دیا تا کہ محبوب کی خواہش پوری ہو''

یعنی مجھے اپنی مرضی کو محبوب کی مرضی کے آگے فنا کر دینا چاہیے۔ اگر چہ قرب بھی ہو۔ چنانچہ ارشاد ہے: ''وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ'' (اور نماز پڑھتے رہئیے اور قرب حاصل کرتے رہئیے) اور حدیث میں ہے ''اقرب ما یکون العبد حین یسجدنی فی الصلوٰۃ[1]'' یعنی سب سے افضل حالت قرب کی سجدہ ہے اور ہماری یہ حالت ہے کہ ہم نماز سے غافل، تو یہ کیسی محبت ہے کہ محبوب تو آپ کو اپنے سے قریب کرنا چاہیے اور آپ اس سے دور ہونا

---

[1] الصحیح لمسلم کتاب الصلوٰۃ: ۲۱۵، مشکوٰۃ المصابیح: ۸۹۴

چاہتے ہیں۔ اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں:

تعصی الرسول و انت تظہر حبہ　　　ھذا لعمری فی الفعال بدیع
لوکان حبک صادقا لاطعتہ　　　ان المحب لمن یحب مطیع

''تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرتا ہے اور آپ کی محبت کا اظہار کرتا ہے یہ بات تو نادر ہے اگر تیری محبت سچی ہوتی تو آپ کی اطاعت کرتا اس لئے محب جس کو محبوب پسند کرے اسکی اطاعت کرتا ہے''

اور بعض نے محبت اور مطاوعت دونوں کو اُڑا دیا، صرف تعظیم ہی لے لی اور وہ بھی اپنی طرف سے گھڑ کر جو واقع میں تعظیم بھی نہیں اور یہ ان لوگوں نے کیا ہے جنہوں نے آج کل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص طرز کی سوانح عمریاں لکھی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں اور آپ کے خلفاء میں اعلیٰ انتظام سلطنت کا ثابت کیا اور اپنے نزدیک آپ کی بڑی شان ظاہر کی مگر کمی یہ کی ہے کہ سلطان اور ملک دونوں کی حیثیت سے تو آپ کی عظمت بتائی مگر نبی ہونے کی حیثیت سے نہیں بتائی۔ معلوم ہوا کہ وہ آپ کی عظمت محض سلطنت کی وجہ سے کرتے ہیں۔ حالانکہ اصل شان آپ کی نبوت ہی ہے اور سلطنت تو تابع ہے اور پھر اس پر ناز بھی ہے کہ ہم نے ایسی سیرت لکھی اور ویسی لکھی اور کہتے ہیں کہ علماء کو تاریخ لکھنا نہیں آتی۔ واقعی سچ ہے ایسی تاریخ لکھنا تو بے شک ہم کو نہیں آتی، ہمارا تو یہ کام ہے:

ماقصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم　　　از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

''ہم نے دارا اور سکندر کے قصے نہیں پڑھے ہم نے سوائے عشق و محبت کی باتوں کے کچھ نہیں پڑھا''

عجیب و غریب نکتہ

اس میں شک نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بادشاہ بھی ہیں مگر اصل صفت آپ کی نبوت ہے اور سلطنت تو اس کے تابع ہے یعنی وہ بھی محض اس واسطے عطا ہوئی تا کہ اس سے اغراض نبوت کی تکمیل ہو ورنہ آپ کا اصل جوہر تو یہ ہے کہ ''**کنت نبیا و آدم بین الروح والجسد**'' (میں صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت نبی تھا جب حضرت آدم علیہ السلام جسم اور روح کے درمیان تھے) کہ میں اس وقت نبی تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے جسد کا خمیر ہی تیار

ہورہا تھا۔ روح بھی اس میں نہ آئی تھی اور اسی طرح اصل کمال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ہے کہ آپ خاتم النبیین ہیں۔ سو آپ کا اصل کمال یہ ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے بھی نبی ہیں اور سب کے آخر بھی، کسی نے اس اولیت و آخریت میں نکتہ خوب نکالا ہے:

پیش از ہمہ شاہاں غیور آمدۂ　　ہرچند کہ آخر بظہور آمدۂ

اے ختم رسل قرب تو معلوم شد　　دیر آمدہ از راہ دور آمدۂ

(پہلے تمام بادشاہوں سے آپ غیور آپ ہرچند ظہور میں آئے، اے ختم رسل صلی اللہ علیہ وسلم آپ کا قرب تو مجھ کو معلوم ہے، دیر میں آئے دور راستے سے آئے)

واقعی نکتہ ہے عجیب وغریب کہ آپ چونکہ بہت دور سے آرہے ہیں اس لیے آنے میں اتنی دیر لگی۔ دوسرے انبیاء مسافت قریبہ سے آئے ہیں اس لیے جلدی آگئے۔ ان کو علمی دلیل نہ سمجھے۔ نشاط کے لیے لطیفہ کے طور پر بیان کر دیا ہے۔

اس پر حضرات خلفاء کی فضیلت اور ترتیب کے متعلق بعض نکات یاد آگئے۔ حدیث شریف میں آتا ہے "**خیر القرون قرنی**" (**سنن الترمذی: ۲۳۰۲**) لفظ قرنی میں نکتہ یہ کہا گیا ہے کہ اس میں اشارہ ہے زمانہ خلافت نبوت کی طرف کیونکہ خلفاء اربعہ کے نام کے آخری حروف میں بہ ترتیب آگئے ہیں۔ یعنی صدیقؓ کا ق اور عمرؓ کی را اور عثمانؓ کا ن اور علیؓ کی ی اور ایک نکتہ اردو میں بھی کسی نے نظم کیا ہے۔

ابوبکر یکسو علی ایک جانب　　خلافت کو گھیرے ہیں باصد صفائی

الف اور ی کی طرح ان کو جانو　　کہ محصور ہے جن میں ساری خدائی

یہ تشبیہ ہے واقعی تو جگہ میں　　الف اور ی نے یہ ترتیب پائی

وہ اول خلیفہ کے اول میں آیا　　یہ آخری خلیفہ کے آخر میں آئی

بھلا کوئی شعر کہے ایسے تو کہے۔ غرض بادشاہی سے اغراض نبوت کی تکمیل مقصود تھی وہ خود مقصود نہ تھی اور وہ نبوت کی غرض اصلاح خلق ہے اور اصلاح خلق دو صورتوں سے ہو سکتی ہے۔ ایک حکومت سے دوسرے عقیدت سے یعنی ایک تو یہ کہ بادشاہ کی عقیدت ہے کہ لوگ اسے بزرگ اور نیک سمجھ کر بڑا مانتے ہیں اور ایک یہ کہ اگر نہ مانیں گے تو تلوار کے زور سے

منوایا جائے گا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب حق تعالیٰ نے اصلاح خلق کے لیے بھیجا تو دونوں قوتیں آپ میں جمع کردیں کہ جو اہل بصیرت ہیں وہ تو عقیدت سے مانیں گے اور آپ کے کمالات ذاتیہ کو پہچانیں گے اور جو اہل بصیرت نہیں ہیں وہ تلوار کے زور سے مانیں گے کیونکہ تلوار بھی بڑا وعظ ہے۔ ہمارے استاد رحمۃ اللہ علیہ کا شعر ہے:

الوعظ ینفع بالعلم والحکم　　　　والسیف ابلغ وعاظ علی القمم

(نصیحت اگر علم و حکمت کے ساتھ ہو تو نفع پہنچاتی ہے اور تلوار سروں پر بڑی نصیحت گروں میں سب سے بلیغ نصیحت گر ہے)

کہ سب سے بڑی وعظ تو تلوار ہے۔ یہ شعر مولانا محمد یعقوب صاحب کا ہے اور قرآن میں اس کا ماخذ یہ آیت ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا بِالْبَیِّنَاتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ

"ہم نے اپنے پیغمبروں (علیہم السلام) کو کھلے کھلے احکام دے کر بھیجا اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب کو اور انصاف کو نازل کیا تاکہ لوگ اعتدال پر قائم رہیں اور ہم نے لوہے کو پیدا کیا جس میں شدید ہیبت ہے۔"

اسکی تفسیر میں ہمارے مولانا فرمایا کرتے تھے۔ حدید سے مراد ہے نعل ارجوتا (یعنی فیہ باس شدید کی صفت کے اعتبار سے سلاح مراد ہے جس کی تعبیر اہل محاورہ اس عنوان سے کیا کرتے ہیں کیونکہ جو فہیم کم ہوتے ہیں ان کے لیے جوتا کی بھی ضرورت ہے۔

سیرت کی صورت

بہر حال آپؐ میں نبوت کی بھی شان ہے اور سلطنت کی بھی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سیرت نبویہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات سلطنت بیان نہ کیے جائیں۔ آپ سلطنت کی شان ضرور بیان کیجئے مگر کتاب کے دو باب کیجئے۔ ایک میں سلطنت کی شان بیان کیجئے اور ایک میں نبوت کی۔ جب نبوت کا ذکر ہی نہیں تو اب تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ جو دعویٰ ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت پہچانی یہ بالکل غلط ہے۔ آپ نے عظمت پہچانی تو مگر ادھوری اور نامکمل۔

اسی طرح ایک صاحب نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سوانح عمری لکھی کہ اس کے دیکھنے سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سوانح عمری ہے بلکہ اگر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام اس میں چھپالیا جاوے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ نوشیرواں کی یا کسی بڑے مدبر و منتظم بادشاہ کی سوانح عمری ہے کیونکہ اس میں اس کا پتہ ہی نہیں کہ آپ کا تقویٰ کس درجہ کا تھا۔ دین سے آپ کو کس درجہ الفت تھی، آپ کا زہد، آپ کی ریاضت اور خلق اور شدت علی الکفار اور کرامات وغیرہ کس شان کی تھیں۔ غرض کسی چیز کا پتہ نہیں بس صرف انتظام تمدن کو لیے پھرتے ہیں۔ حالانکہ اتنے بڑے بڑے کمالات کے ہوتے ہوئے صرف سیاست مدن کی تعریف کرنا ایسا ہے:

شاہ را گوید کسے جولاہا نیست　　　　ایں نہ مدح است اومگر آگاہ نیست

یعنی جیسے بادشاہ کی تعریف میں یہ کہنا کہ یہ بہت بڑے آدمی ہیں کیونکہ جولاہے نہیں ہیں تو اس درجہ کی ہیں یہ سوانح عمریاں۔

خلاصہ یہ کہ مطاوعت، عظمت و محبت یہ تینوں حقوق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ادا کرنا چاہیے اور آپ سے اول حق تعالیٰ کے یہی حقوق مگر محققین سے اور ان کی کتابوں سے معلوم ہوگا کہ مطاوعت، عظمت و محبت کی حقیقت کیا ہے تو اپنی طرف سے ان کی تفسیر نہ گھڑنا وہی بتائیں گے اور جنہیں آپ نے عظمت و محبت وغیرہ سمجھ رکھا ہے ان کی حالت آپ کو بھی معلوم ہو چکی ہے کہ واقع میں وہ مطاوعت و عظمت و محبت نہیں ہیں۔ بہر حال آپ کے ظاہری و باطنی دونوں قسم کے حقوق کو جمع کرو اور اس جمع کے طریق کو کسی ایسے محقق سے حاصل کرو جس کی جامعیت کی خود یہ شان ہو۔

برکفے جام شریعت برکفے سندان عشق　　　　ہر ہوسناکے نداند جام وسنداں باختن

(ادھر شریعت کا خیال، ادھر عشق کا خیال اور عشق کے مقتضیٰ پر عمل کرنا ہر ہوسناک کا کام نہیں ہے)

اور یہ طریق جمع کا حاصل کرنا یا تو محققین کی صحبت سے حاصل ہوتا ہے اگر زماناً و مکاناً قریب ہوں یا ان کی حکایات و ملفوظات کے مطالعہ سے اگر زماناً بعد ہو یا ان سے خط و کتابت سے اگر مکاناً بعد ہو۔

شانِ نبوت کے مظاہر

اب ایک بات اور رہ گئی اور اس کے بعد ختم کردوں گا۔ وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو شانیں ہیں۔ ایک شانِ سلطنت، دوسری شانِ نبوت اور دونوں کے حقوق ہیں۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو پردہ میں ہیں مگر آپ کی دونوں شانوں کے مظاہر موجود ہیں۔ چنانچہ شانِ نبوت کے مظاہر حضرات صوفیاء کرام و علماء ہیں اور شانِ سلطنت کے مظاہر مسلمان عادل بادشاہ ہیں۔ اس واسطے مظاہر ہونے کی حیثیت سے ان دونوں جماعتوں کے حقوق ادا کرنا بھی تتمہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق کا۔ پس ہم کو ان کے حقوق بھی ادا کرنا چاہیے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غیبت ظاہری کے بعد انہیں غنیمت سمجھنا چاہیے۔ بقول مولانا:

چونکہ شد خورشید مارا کرد داغ　　چارہ نبود در مقاش جز چراغ

یعنی خورشید تو چھپ گیا ہے تو اب بجز چراغ کے اور کیا چارہ ہے۔ پس علماء کا حق یہ ہے کہ ان سے دین کے احکام کو پوچھا جائے اور یہ حق علماء کا مسلمان بادشاہوں پر بھی فرض ہے کہ ان کو بھی اپنے احکام جاری کرنے سے قبل علماء سے استفتاء کرنا چاہیے اور مسلمان بادشاہوں کا حق یہ ہے کہ امور انتظامیہ میں ان کی اطاعت کی جاوے حتیٰ کہ علماء کے ذمہ ہے ان امور میں ان کی بقاء کی اور ان کی نصرت کی دعا کریں اور یہ بھی دعا کریں کہ حق تعالیٰ ان دونوں کو اپنے اپنے مناصب ادا کرنے کی توفیق دے۔ یعنی یہ دعا کریں کہ حق تعالیٰ علماء سے دین کی خدمت لے اور سلاطین کو اُمت پر رحیم و شفیق بنادے اور اپنے لیے یہ دعا کریں کہ حق تعالیٰ انہیں دونوں جماعتوں کی برکات سے منتفع کرے۔ آمین (تمام جماعت کے ساتھ عامہ مسلمین و علماء و سلاطین خصوص مقامی بادشاہ کے لیے فلاح دنیا و دین کے لیے دعا کی گئی اور جلسہ ختم ہوا)

مسئلہ ندا من البعید

اس مقام پر حضرات سامعین سے تفریعاً و تفریحاً ایک سوال کرتا ہوں کہ جب حجرہ کے باہر پاس سے آپ کو پکارنا جائز نہیں تو ہندوستان سے پکارنا کب جائز ہوگا۔ میں فتویٰ نہیں دیتا آپؐ سے پوچھتا ہوں۔

اقول: اس مضمون کے متعلق وعظ کے بعد ایک صاحب خوش فہم نے بلدہ ہی مجھ سے ایک سوال تقریراً اور ایک ذی علم نے بعد واپسی وطن میرے ایک رفیق سفر سے ایک خیال کا اظہار تحریراً کیا۔ دونوں کو مع جواب افادہ ناظرین کے لیے نقل کرتا ہوں۔ سوال تقریری: جس کے الفاظ بعد زمان کے سبب یاد نہیں معنی یہ تھے کہ یہ استدلال کس درجہ کا ہے؟

جواب: اس وقت غالباً اتنا عرض کیا تھا کہ عام لوگوں کی سہولت فہم کے لیے اس وقت ایک لطیفہ کے عنوان سے کہہ دیا گیا تھا۔ بعد میں اس کی تکمیل کر دی جاوے گی۔ چنانچہ اس وقت اس وعدہ کو پورا کرتا ہوں۔

تحقیق اس مضمون کی یہ ہے کہ نداء مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرَاتِ سے نہی کی علت صرف یہی ہے کہ یہ ندا کمال ادب کے خلاف ہے اور ظاہر ہے کہ اس نداء کا کمال ادب کے خلاف ہونا ایسا جلی تھا کہ اعراب کی عقول بدون تنبیہ یا تامل کے اس کا ادراک کر سکتے اور نہ کسی نص سے اس پر دلالت کی گئی تھی۔ باوجود اس کے اس کو مذموم اور اس کے فاعل کو ملوم قرار دیا گیا اور نداء من البعید جس اعتقاد اور قصد سے اکثر عوام میں شائع ہے۔ وہ یہ کہ آپ کو لزوماً اطلاع بھی ہو جاتی ہے اور آپ اس کی اجابت اور منادی کی اعانت بھی فرماتے ہیں۔ اس سے نہی صریح وارد ہے تو یہ منہی عنہ ہونے میں اس سے اشد و اثقل ہوا۔ پھر جب اخف کو جائز نہیں رکھا گیا تو اشد و اثقل کیسے جائز ہو جاوے گا۔ سو حاصل اس مضمون کا استدلال بدلالۃ النص ہے جیسے حرمت تافیف سے حرمت ضرب و شتم پر استدلال کیا جاتا ہے۔ پس معنون مضمون لمی و برہانی ہے گو عنوان بصورت لطیفہ ہونے کے سبب خطابی ہے۔

خیال تحریری: یہ ایک خط ہے جو بعینہ درج کیا جاتا ہے۔

مولوی صاحب السلام علیکم! فدوی نے بلدہ میں جناب سے نیاز حاصل کیا ہے اور حضرت اقدس کے جملہ مواعظ کی مجلسوں میں شرکت حاصل کر کے مستفید ہوا اور اب اس وقت اپنے وطن میں آ چکا ہوں۔ بلدہ میں آپ کی روانگی کے بعد مجھ سے ایک مولوی صاحب کی ملاقات ہوئی۔

غالباً وہ مولوی صاحب بغداد کی طرف کے باشندہ ہیں مگر عرصہ سے بلدہ میں مقیم ہیں اور حضرت اقدس سے ایک وقت ملاقات کی تھی اور دونوں وعظ میں بھی شریک تھے، اچھے عالم ہیں محقق و موحد معلوم ہوتے ہیں۔ مولانا کے ثناء خواں ہیں مگر انوار العلوم نام پلی میں جو وعظ ہوا اس کے آخری حصہ میں مولانا نے فرمایا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہندوستان سے پکارنا بے ادبی ہے یا نہیں؟ اس پر غور کریں، میں فتویٰ تو نہیں دیتا، اس پر وہ مولوی صاحب میرے سے یہ تذکرہ فرمارہے تھے کہ اس تمام پر کچھ تشریح ہوجاتی تو بہتر تھا۔ کیونکہ بعض صورتیں پکارنے کی جائز بھی ہیں چنانچہ فرط محبت سے اگر پکارا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں اس لیے اس خاکسار نے جو جرأت کر کے اس کیفیت کی اطلاع حضرت اقدس کو دی ہے (یہ مجھ کو یاد نہیں ۱۲۔ اشرف علی) اور احتیاطاً آپ سے بھی عرض کیا جاتا ہے کہ واقعی مولوی صاحب موصوف کی رائے اگر درست نہیں ہے تو خصوص بلدہ حیدرآباد کا لحاظ کرتے ہوئے منجانب کاتب وعظ یا خود حضرت اقدس کی جانب وعظ کے حاشیہ میں اس کی تشریح ہو تو مناسب و بہتر ہوگا۔

مخفی مباد کہ میں نے ایک اہل بدعت کی کتاب میں جملہ قسم ندا کے جواز کا فتویٰ دیکھا۔ مگر میں صرف مولوی صاحب مذکور کی رائے کے موافق چند جائز صورتیں درج ذیل کرتا ہوں۔ اس لیے اگر یہ صورتیں جائز ہیں یا نہیں اس کا علم مجھ کو بھی ہو جائے۔

۱۔ ندا بطریق تعبد ہے مثلاً کوئی شخص سورہ "یَاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ" پڑھتا ہے تو صرف بطریق تعبد تلاوت قرآن کرتا ہے "یاالتحیات" میں بھی بطریق عبادت "**السلام علیک ایھا النبی**" جس میں عالم غیب نہیں سمجھا جاتا۔

۲۔ کبھی متکلم علم بدیع وفصاحت کے قاعدہ سے شخص غائب کو فرضی طور پر دل میں حاضر تصور کر کے مخاطب کرتا ہے جیسا کہ قصیدہ بردہ وغیرہ میں ہے۔

۳۔ کبھی فرط غم وفرط محبت میں اپنے عزیز یا محبوب سے ندا کی جاتی ہے۔

پہلی صورت ندا کی تو ظاہر ہے کہ اس کے جواز میں تو کوئی شبہ ہی نہیں۔ اب رہی دوسری و

تیسری صورت اگر فرضی طور پر اس طرح ندا کی جائے اور مخاطب کو دراصل حاضر و ناظر یا عالم الغیب نہ سمجھے تو اس میں کیا حرج ہے۔ آیا یہ صورت جائز ہے یا نہیں۔ براہ کرم مولانا کا اس میں کیا ارشاد ہے دریافت فرما کر مطلع فرمادیں یا آپ خود اپنی رائے سے مطلع فرمائیے تو نہایت مہربانی ہوگی۔ بصورت جواز اگر مصلحت معلوم ہو تو وعظ مذکور کے حاشیہ میں تشریح ہو جائے۔

جواب: یہ تفصیل صحیح ہے اور اس سے مجھ کو اتفاق ہے لیکن اس میں اتنے اضافہ کی اور ضرورت ہے کہ اگر صورت ثانیہ اور ثالثہ میں خواص کے فعل سے عوام کے فساد عقیدہ کا اندیشہ ہو تو خواص پر واجب ہے کہ عوام پر اپنے فعل کا اظہار نہ کریں۔ فقہاء حنفیہ نے اس مسئلہ کی تصریح فرمائی ہے اور اسی مصلحت سے وعظ میں اس تفصیل کا اظہار مناسب نہ تھا کہ عوام کے لیے حیلہ نہ ہو جائے۔ دوسرے یہ مضمون محض استطراداً بیان میں آ گیا تھا استقلالاً نہ تھا اس لیے بھی تفصیل کی طرف ذہن کو توجہ نہیں ہوئی۔ خیر اب اتفاق سے تفصیل ہوگئی۔

واللہ یقول الحق وھو یھدی السّبیل. انتھت الحاشیہ کتبھا اشرف علی فی اوائل شعبان ۱۳۴۴ ھجری بعد سنتین و نصف من زمان الوعظ

دواء الغفلت

عبادت میں غفلت کے متعلق یہ وعظ چوپال حکمت اللہ خان خورجہ ضلع بلندشہر میں شب پنج شبہ ۱۸ رجب المرجب ۱۳۴۱ھ کو تخت پر کھڑے ہوکر بیان کیا۔ یہ وعظ منشی محمد یوسف (مرحوم) کی درخواست پر فرمایا جس میں تقریباً ۴۰۰ کا مجمع تھا۔ وعظ تین گھنٹے میں ختم ہوا۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ نحمدہ و نستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھدان لاالہ الااللہ وحدہ لاشریک لہ ونشھدان سیدنا ومولانا محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالی علیہ وعلی الہ واصحابہ و بارک و سلم۔

امابعد فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم بسم. اللہ الرحمن الرحیم.

یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غَافِلُوْنَ.

ترجمہ: ''یہ لوگ صرف دنیوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں اور یہ لوگ آخرت سے بے خبر ہیں۔''

مکان آخرت

یہ ایک آیت ہے سورہ روم کی جس میں حق تعالیٰ نے ایک جماعت کی شکایت مذمت کے ساتھ فرمائی ہے۔ ترجمہ اس کا یہ ہے کہ جانتے ہیں وہ لوگ جن کے حق میں آیت ہے ظاہر حیٰوۃ دنیا کو یہ ترجمہ میں نے اس لیے کیا کہ یہاں من بیانیہ ہے جو ظاہر کا بیان ہے کہ وہ لوگ محض ظاہر کو جانتے ہیں اور وہ ظاہر کیا ہے؟ حیات دنیا اور وہ لوگ آخرت سے غافل ہیں جو کہ ظاہر کے مقابلہ میں آنے کی وجہ سے باطن سے موصوف ہونے کے قابل ہے اور حقیقت میں وہ باطن ہی ہے کیونکہ بطون کے معنی خفاء ہیں اور آخرت اس وقت مخفی اور مغیب ہے کیونکہ آنکھوں سے نظر نہیں آتی۔

یہ شبہ نہ کیا جائے کہ آخرت تو ابھی آئی ہی نہیں، وہ تو دنیا کے بعد آئے گی تو اس وقت تو وہ وصف معدوم کی مستحق ہے نہ کہ مخفی اور مغیب سے موصوف ہونے کی کیونکہ آخرت کے دو جزو ہیں۔ ایک زمان آخرت، ایک مکان آخرت تو اس وقت معدوم زمان آخرت ہے

مکان آخرت معدوم نہیں کیونکہ اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ جنت و نار مخلوق ہو چکی ہیں اور وہ اس وقت موجود ہیں اور جنت و نار ہی مکان آخرت ہے جس سے غفلت کی یہاں شکایت ہے۔ پس آخرت مکاناً معدوم نہیں بلکہ مخفی و مغیب ہے۔ گو زماناً معدوم ہے مگر چونکہ اس زمانہ کا آنا دلائل شرعیہ سے متیقن و محقق ہے اس لیے وہ بھی حکماً موجود ہے اور مغیب و مخفی ہی سے موصوف کیے جانے کا مستحق ہے نہ کہ معدوم کہلائے جانے کا۔

گناہوں کی اقسام

ترجمہ آیت سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہاں کس جماعت کی شکایت ہے۔ یہاں ایسی جماعت کی شکایت ہے جو دنیا ہی میں منہمک ہے۔ ان کا ادراک دنیا ہی کی باتوں میں منحصر ہے۔ اس سے آگے ان کی نظر ہی نہیں بڑھتی۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس امر کی شکایت ہے کہ دنیا کی طرف سے ایسی توجہ ہو کہ آخرت سے غفلت ہو جائے یہ ہے محل شکایت اور یہ ہے حاصل آیت۔

میرے اس خلاصہ پر یہ اشکال نہ کیا جائے کہ آیت کے عنوان سے تو غافلین کی شکایت معلوم ہوتی ہے نہ کہ غفلت کی اور دنیا میں منہمک ہونے والوں کی مذمت ہے نہ انہماک فی الدنیا کی تم نے غفلت عن الاخرۃ اور انہماک فی الدنیا کو محل شکایت کیوں کر قرار دیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو کسی جماعت کی ذات سے عداوت و شکایت نہیں ہوا کرتی بلکہ وہ جس کی بھی شکایت و مذمت فرماتے ہیں ان کے افعال کی وجہ سے فرماتے ہیں۔ پس محل شکایت غافلین و منہمکین کی ذات نہیں ہو سکتی بلکہ ان کے افعال ہی محل شکایت ہیں۔ یعنی غفلت وانہماک۔ دوسرے بلاغت کا بھی تو قاعدہ ہے کہ جب کسی وصف کے ساتھ محکوم علیہ کو موصوف کر کے حکم بیان کیا جائے تو حکم کا ترتب وصف پر ہوتا ہے اور اس وصف کو حکم میں دخل ہوتا ہے جیسے اکرم زید العالم میں وصف علم پر امر اکرام کو مرتب کیا گیا ہے۔ اس قاعدہ کے موافق بھی یہاں بالذات فعل ہی کی شکایت ہونا چاہیے نہ کہ فاعل کی۔ اس تقریر کو یاد رکھیے آئندہ کام آوے گی۔

اس مضمون کے اختیار کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے کو بھی اس شکایت سے خالی نہیں پاتے بلکہ ایک درجہ میں یہ مرض ہمارے اندر بھی موجود ہے اور یہ مرض ہلکا نہیں ہے بلکہ ام الامراض ہے۔ تمام گناہوں کی جڑ یہی ہے اس لیے بیان کے لیے اس کو ترجیح دی گئی اور میں نے جو قید

لگائی کہ ایک درجہ میں ہم میں بھی یہ مرض ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ امراض کے درجات ہیں۔ امراض جسمانی میں بھی جیسے بخار ایک مرض ہے اس کے درجات مختلف ہیں۔ کوئی شدید ہے کوئی اشد ہے جیسے دق کا بخار اور کوئی معمولی ہے۔ اسی طرح امراض نفسانی میں بھی درجات ہیں، غفلت کے بھی مختلف درجات ہیں ایک غفلت شدید اور قوی ہے اور ایک اشد و اقوی ہے جو درجہ شدید و قوی ہے وہ اقوی و اشد کے مقابلہ میں تو گو ضعیف ہے مگر فی نفسہ ضعیف نہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے گرم پانی دو طرح کا ہو۔ ایک تو وہ جو بدن پر ڈالنے کے قابل نہیں بہت تیز ہے مگر آبلہ بھی نہیں ڈالتا اور دوسرا وہ ہے جو پڑتے ہی بدن پر آبلہ ڈال دیتا ہے تو جو تیز پانی بدن پر آبلہ نہ ڈالے وہ آبلہ ڈالنے والے کے مقابلہ میں گو ضعیف ہے مگر اس معنی کر ہلکا بھی نہیں کہ بے تکلیف منہ پر ڈالا جائے۔ اب اگر کوئی اس کو دوسرے درجہ کے مقابلہ میں ہلکا سمجھ کر کسی کے ہاتھ منہ پر ڈال دے تو وہ دوسرا شخص چلائے گا اور جھلا کر کہے گا کہ تم اندھے ہو تم کو نظر نہیں آتا کہ پانی کتنا تیز ہے۔ اس کے جواب میں اگر وہ یہ کہے کہ حضور میں تو دوسرے پانی سے ہلکا لایا تھا تو آپ کیا کہیں گے کہ اس کے اعتبار سے یہ ہلکا سہی مگر فی نفسہ تو ہلکا نہیں شدید اور قوی ہے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

آسماں نسبت بعرش آمد فرود   لیک بس عالی ست پیش خاک تود

یعنی آسمان عرش ہی کے مقابلہ میں چھوٹا اور پست ہے ورنہ واقع میں زمین سے تو بہت بڑا اور بلند ہے۔

یہیں سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ گناہوں کی جو دو قسمیں ہیں صغیرہ و کبیرہ یہ فرق اضافی ہے کہ کبیرہ کے مقابلہ میں بعض صغیرہ ہیں ورنہ حقیقت میں صغیرہ کوئی نہیں کیونکہ گناہ کی حقیقت ہے خدا کی نافرمانی۔ پھر یہ فعل چھوٹا اور ہلکا کیوں کر ہو سکتا ہے۔ کیسا افسوس ہوتا ہے جب بعض لوگ کسی امر کی بابت استفتاء کرتے ہیں اور ان سے کہا جاتا ہے کہ یہ گناہ ہے۔ تو اس کے بعد وہ یہ سوال کرتے ہیں کہ صغیرہ ہے یا کبیرہ ہے۔ گویا اگر صغیرہ ہونا معلوم ہو گیا تو اس سے نہ بچیں گے حالانکہ وہ محض کبیرہ کے مقابلہ میں صغیرہ ہے۔ باقی قصر دین کے سوختہ کرنے کے لیے کافی ہے۔

صاحبو! اگر کسی سے یہ کہا جائے کہ تیرے چھپر میں چنگاری لگ گئی ہے کیا وہاں بھی یہ

تحقیق کی جاتی ہے کہ چھوٹی چنگاری ہے یا بڑی، ہرگز نہیں بلکہ فوراً پریشان ہو جاتے اور اس کے بجھانے کی فکر کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ہم لوگ گناہ کو مضر نہیں سمجھتے اور چنگاری کو مضر سمجھتے ہیں۔ اگر ہم گناہ کو مضر سمجھتے تو اس کی ادنیٰ درجہ سے بھی نفرت کرتے اور اس کے ارتکاب سے پریشان ہو جایا کرتے کیونکہ مضر کا کوئی درجہ بھی انسان کو گوارا نہیں ہوتا۔

غفلت اعتقادی

مگر یہ بے فکری بتلاتی ہے کہ ہم اس کو مضر ہی نہیں سمجھتے۔ گو اعتقاداً مضر سمجھتے ہیں مگر عملاً تو یہی حال ہے اور صوفیاء تو اس اعتقاد کو جس کے مقتضاء پر عمل نہ ہو یقین ہی نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک اعتقاد یقینی وہی ہے جس کے موافق عمل بھی ہو اور یہ حکم محض اصطلاحی نہیں کہ صوفیاء نے دوسروں سے الگ ایک اصطلاح گھڑ لی ہے بلکہ صوفیاء نے اس حکم کو نصوص سے سمجھا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ نجات فی الجملہ کے لیے گویا اعتقاد بلا عمل بھی کافی ہو جائے مگر نجات کاملہ کے لیے کافی نہیں۔ اسی کو نصوص سے اس طرح سمجھا ہے کہ حق تعالیٰ یہود کے بارے میں فرماتے ہیں:

وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَالَهُ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ.

"یعنی وہ جانتے ہیں کہ جو شخص اس کو یعنی سحر کو اختیار کرے اس کے لیے آخرت میں کچھ حصہ نہیں، کاش وہ جانتے۔"

یہاں لقد علموا کے بعد جس میں اثبات ہے علم کا لو کانو ایعلمون کے ساتھ اختتام آیۃ فرمایا جس میں نفی ہے علم کی۔ اس کی یہی وجہ ہے کہ ان کا عمل علم کے خلاف تھا۔ اس لیے حق تعالیٰ نے ان کے علم کو جہل شمار کیا تو صوفیاء نے نصوص کو اور احکام کو دیکھ کر یہ اصطلاح مقرر کی ہے۔ غرض یقین مطلوب اور یقین کامل بدون عمل کے حاصل نہیں ہوتا اور نہ اس کے ثمرات مطلوبہ حاصل ہو سکتے ہیں۔ یقین و اعتقاد کا ثمرہ مطلوبہ نجات مطلقہ بدون تعذیب ہے اور یہ اعتقاد بلا عمل سے حاصل نہیں ہوتا یعنی غالب الوقوع یہی ہے کہ بدون عمل نجات کامل نہیں ہوتی، گو کسی فرد میں تخلف ہو جائے۔ نیز محاورات بھی اسی اصطلاح کے موافق ہیں یعنی اس اعتقاد کو جس کے موافق عمل نہ ہو اعتقاد شمار نہیں کیا جاتا۔

مثلاً ایک شخص اپنے باپ کے ساتھ گستاخی کرتا ہے تو کہتے ہیں ارے کم بخت! یہ تیرا

باپ ہے حالانکہ یہ علم اس کو پہلے سے حاصل ہے کہ میرا باپ ہے مگر چونکہ اس کا عمل اس علم کے خلاف تھا اس لیے علم کو بمنزلہ عدم علم کے سمجھ کر کہا جاتا ہے کہ یہ تیرا باپ ہے۔ نیز حدیث ہے:

من ترک الصلوٰۃ متعمدا فقد کفر۔[1]

''جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی اس نے کفر کیا۔''

اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ نماز کا عمداً ترک کرنا یہ بتلاتا ہے کہ اس شخص کو اس کی فرضیت کا اعتقاد نہیں یعنی کامل اعتقاد نہیں بلکہ اعتقاد میں نقص ہے۔ اس نقص کی وجہ سے اس پر کفر کا اطلاق کیا گیا جو مقابل ہے ایمان کا۔ جب ایمان اعتقاد کامل کا نام ہوگا تو اس کا ارتفاع کفر سے مسمّٰی ہوگا۔ نیز ایک حدیث میں ہے:

لایزنی الزانی حین یزنی وھو مومن۔[2]

''زنا کرنے والا زنا نہیں کرتا مگر اس حال میں کہ وہ مومن کامل نہیں ہوتا۔''

یہ سب نصوص صوفیاء کی اصطلاح کے مویدات ہیں تو صوفیاء کے نزدیک تو گویا اعتقاداً بھی ہم گناہ کو مضر نہیں سمجھتے کیونکہ عمل اس کے خلاف ہے اور جس اعتقاد کے خلاف عمل ہو وہ ان کے یہاں اعتقاد ہی نہیں البتہ فقہاء کے نزدیک یعنی ان کی اصطلاح کے موافق ہمارا ان کو مضر سمجھنا یہ اعتقاد ہے مگر عملاً وحالاً ان کے نزدیک بھی مضر ہونے کا اعتقاد نہیں ہے جبھی تو صغیرہ پر جرأت ہے تو غفلت کا ایک درجہ تو یہ ہوا جس کو درجہ ضعیفہ کہا جاتا ہے مگر وہ اقویٰ کے مقابلہ میں ضعیف ہے ورنہ فی نفسہ یہ بھی قوی ہے۔

دوسرا درجہ غفلت کا کفر جحود یا عناد ہے۔ یہ اقویٰ واقبح ہے۔ ہر چند کہ اس درجہ سے بحمد اللہ خدا تعالیٰ نے ہم کو محفوظ رکھا ہے مگر دوسرا درجہ معصیت کا جس میں ایسی غفلت ہو کہ مطلوب کا استحضار نہ ہو اس میں ہم بھی مبتلا ہیں اور اس سے خالی نہیں ہیں۔ اب جس درجہ کی غفلت ہوگی اسی درجہ کی مذمت ہوگی۔ گو درجہ کفر کی مذمت ہم میں نہ ہو مگر مطلق مذمت و شکایت سے تو ہم بھی صاف اور بری نہیں ہیں اس لیے میں نے اپنی تقریر میں ایک درجہ کی قید لگائی تھی اور یہاں سے ایک شبہ جاتا رہا۔ وہ یہ کہ آیت کفار کے حق میں ہے جیسا کہ سباق وسیاق سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس سے پہلے ہے:

---

[1] کنز العمال: ۱۸۸۶۷،۵۰۰۸ [2] الصحیح للبخاری ۳: ۱۷۸

اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ لَایُخۡلِفُ اللّٰهُ وَعۡدَهٗ

''اللہ تعالیٰ کا وعدہ اور اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتے۔''

فرماتے ہیں کہ یہ (جو اوپر مذکور ہوا جو ایک پیشین گوئی ہے) خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے اور خدا تعالیٰ اپنے وعدہ کو خلاف نہیں کرتے اور اس کا مقتضا یہ ہے کہ اس کا کوئی انکار نہ کرنا مگر ایسے بھی بہت لوگ ہیں جو اس کا انکار کرتے ہیں۔ چنانچہ آگے بطور استدراک کے فرماتے ہیں:

وَلٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ.

''لیکن زیادہ تر لوگ اس بات کو نہیں جانتے''

یہاں پر گو لایعلمون کا مفعول یہ مذکور نہیں مگر مقام کا مقتضاء یہ ہے کہ مفعول وہی ہو جو پہلے مذکور ہے۔ یعنی

لَایَعۡلَمُوۡنَ اِنَّ اللّٰهَ لَایُخۡلِفُ وَعۡدَهٗ

''لوگ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ کے خلاف نہیں کرتے۔''

اور یہ حالت کفر کی ہے اس لیے یہ آیت کفار سے مخصوص ہوئی۔ آگے فرماتے ہیں۔

يَعۡلَمُوۡنَ ظَاهِرًا مِّنَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا. ''یہ لوگ جانتے ہیں ظاہر حیات دنیا کو''

اس کا مرجع بھی وہی ہے جو پہلے لایعلمون میں مذکور ہے ورنہ اس آیت کو ماقبل سے ربط نہ ہوگا اور ضمائر میں بھی انتشار ہوگا۔ اس کے بعد:

وَهُمۡ عَنِ الۡاٰخِرَةِ هُمۡ غٰفِلُوۡنَ ''وہ لوگ آخرت سے بے خبر ہیں۔''

فرمایا تو وہ بھی کفار ہی کے حق میں ہوگا۔ تو اس بناء پر اس میں غفلت اعتقادی ہی مراد ہوگی نہ کہ غفلت عملی اور غفلت اعتقادی یہ ہے کہ آخرت و قیامت کا انکار کیا جائے اور ظاہر ہے کہ یہ شان کفار ہی کی ہے۔ یہ تو سباق تھا، آگے فرماتے ہیں:

اَوَلَمۡ يَتَفَكَّرُوۡا فِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَيۡنَهُمَاۤ اِلَّا بِالۡحَـقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى وَاِنَّ كَثِيۡرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآءِ رَبِّهِمۡ لَـكٰفِرُوۡنَ.

''کیا انہوں نے اپنے دلوں میں یہ غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو اور ان چیزوں کو جو ان کے درمیان میں ہیں کسی حکمت ہی سے اور ایک میعاد معین تک کے لیے پیدا کیا ہے اور بہت سے لوگ اپنے رب کے ملنے کے منکر ہیں۔''

یہ سیاق ہے۔ تو سیاق وسباق دونوں کا مقتضاء یہ ہے کہ یہ آیت کفار کے بارے میں ہو تو پھر جب یہ کفار کے بارے میں ہے تو ہم اس سے بے فکر رہیں ہم کو اس کا مخاطب کیوں بنایا جاتا ہے اور اس کی تائید عبداللہ بن عمرؓ کے قول سے ہوتی ہے کہ انہوں نے خوارج کی شکایت فرمائی کہ جو آیات کفار کے باب میں تھیں ان کو ان لوگوں نے مسلمانوں پر عام کر دیا۔ اس سے اور بے فکری ہوگئی۔ یہ شبہ کی تقریر تھی، بس میری تقریر میں جو ایک درجہ کی قید ہے اس سے یہ شبہ جاتا رہا۔ یعنی غفلت کاملہ بے شک کفار کے ساتھ خاص ہے۔

مواخذہ اعمال

لیکن ایک درجہ کی غفلت تو مسلمانوں میں بھی ہے اور اس طرح سے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اور حضرات صحابہ وآئمہ مجتہدین نے بعض آیات کو جو کفار کے بارے میں ہیں، عام لیا ہے۔ چنانچہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی:

لَيْسَ بَاَمَانِيِّكُمْ وَلَا اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءً يُّجْزَ بِهٖ

''نہ تمہاری تمناؤں سے کام چلتا ہے اور نہ اہل کتاب کی تمناؤں سے جو شخص کوئی برا کام کرے گا وہ اس کے عوض میں سزا پائے گا۔

تو اس کو سن کر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھبرا گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر ہر عمل پر مواخذہ ہوگا ہم تو سب ہلاک ہو جائیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ چھوٹے چھوٹے گناہوں کا کفارہ تو رات دن کے مصائب بھی ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ آیت بظاہر عام نہیں بلکہ اہل کتاب کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ اس کا شان نزول اہل کتاب اور مسلمانوں کا اختلاف ہے۔ مسلمان اپنے کو جنتی کہتے ہیں اور اہل کتاب اپنے کو، اس کا فیصلہ ان آیتوں میں کیا گیا ہے جن میں سے یہ آیت تو کفار کے باب میں ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ آگے فرماتے ہیں:

وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا

''اور اس شخص کو خدا کے سوا نہ کوئی یار ملے گا اور نہ مددگار۔''

یعنی وہ خدا کو چھوڑ کر کسی کو اپنا ولی اور مددگار نہیں پائے گا۔ یہ مسلمانوں کے باب میں

نہیں ہوسکتی کیونکہ انہوں نے خدا تعالیٰ کو کہاں چھوڑا ہے اور یقیناً حق تعالیٰ مسلمانوں کے ولی وناصر ہیں۔ ہاں اگلی آیت مسلمانوں کے بارے میں ہے:

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْراً. وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا وَاتَّخَذَاللّٰهُ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلاً

''اور جو شخص کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ مومن ہو، سوایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اوران پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا اور ایسے شخص سے زیادہ اچھا کس کا دین ہوگا جو کہ اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو اور وہ ملت ابراہیم علیہ السلام کا اتباع کرے اور اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو اپنا خالص دوست بنایا تھا۔''

یہ بے شک مسلمانوں کے متعلق ہے اور پہلی آیت کا مقابل ہے۔ رہا عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول کا جواب تو بات یہ ہے کہ خوارج نے مسلمانوں کو کفار میں داخل کرنے کے لیے ان آیات کو ان پر منطبق کیا تھا کیونکہ ان کے نزدیک ارتکاب کبیرہ کفر ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول میں اس تعمیم کی مذمت ہے اور ایک صورت تعمیم کی یہ ہے کہ یوں کہا جائے گا کہ مسلمان گو اس آیت کے مورد نہیں ہیں مگر اشتراک علت کی وجہ سے کسی درجہ میں ان کو اس میں داخل کر کے خطاب کیا جاتا ہے تو صحابی کے قول میں اس کی نفی نہیں ہے بلکہ بعض صحابہ سے اس طرح کی تعمیم ثابت ہے۔ چنانچہ ایک صحابی نے آیت:

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ.

''جس روز کہ بعض چہرے سفید ہوں گے اور بعض چہرے سیاہ۔''

میں **تسود وجوہ** کو خوارج کے باب میں فرمایا: حالانکہ وقت نزول آیت کے خوارج کا وجود بھی نہ تھا۔ نیز وہ اہل قبلہ میں سے ہیں ان کو کافر نہیں کہا جاتا اور **یوم تسود وجوہ** کفار کے باب میں ہے مگر فی الجملہ کسی درجہ میں اشتراک علت کی وجہ سے خوارج کو بھی اس کا مصداق کہہ دیا گیا۔ نیز امام شافعیؒ نے قرآن سے حجت اجماع مستنبط کرنے کے لیے نہ معلوم کتنی دفعہ قرآن ختم کیا۔ پھر یہ آیت نکالی:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَاتَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰی وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَاتَوَلّٰی وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَاءَ تْ مَصِيْرًا۔

''جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرے گا بعد اس کے کہ اس کو امر حق ظاہر ہو چکا تھا اور مسلمانوں کا راستہ چھوڑ کر دوسرے راستہ ہولیا تو ہم اس کو جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دیں گے۔''

حالانکہ یہ آیت کفار کے باب میں ہے کیونکہ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مسلم کی شان نہیں ہوسکتی مگر امام شافعیؒ نے اس سے حجیت اجماع کا عام حکم مستنبط کیا ہے جو اہل اسلام کو بھی عام ہے۔

غرض معلوم ہوا کہ بعض دفعہ ایک آیت کا مصداق و مسوق لہ الکلام اور کچھ ہوتا ہے اور دوسرے کو تشبیہاً اس میں داخل کیا جاتا ہے۔ یہ بندش میں نے شبہات کے دفع کرنے کے لیے کی ہے کیونکہ آج کل اردو میں کتابیں بہت ہوگئی ہیں۔ شاید کوئی تراجم قرآن یا اردو تفاسیر میں اس آیت کو کفار کے ساتھ خاص دیکھ کر شبہ کرتا تو میں نے اس کا جواب دیدیا ہے اور اس اشکال کے جوابات کی لم میری تقریر سابق سے معلوم ہوگئی ہوں گی جس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ حق تعالیٰ کو کسی ذات سے نفرت و بغض نہیں بلکہ اعمال سے ہے۔

غفلت عن الاخرت

نیز یہ کہ بلاغت کا قاعدہ ہے کہ جب حکم کو کسی وصف پر مرتب کیا جاتا ہے تو وصف کو حکم میں دخل ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ آیت گو کفار کے حق میں نازل ہوئی ہے مگر حکم کو مرتب کیا گیا ہے دو باتوں پر ایک یہ کہ وہ محض دنیا ہی کو جانتے ہیں یعنی اس میں منہمک ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ آخرت سے غافل ہیں۔ معلوم ہوا کہ شکایت اور مذمت میں ان اوصاف کو دخل ہے۔ پھر ہر چند کہ کفار کا انہماک فی الدنیا اور غفلت عن الاخرۃ درجہ اقویٰ میں ہے لیکن اگر کسی مسلمان میں یہ اوصاف کسی درجہ میں ہوں تو اسی درجہ کے موافق شکایت اس کی بھی ہوگی اور وہ بھی فی الجملہ مذمت کا مستحق ہوگا اور ظاہر ہے کہ ہم لوگ اس مرض میں مبتلا ہیں تو اس کی اصلاح کی ضرورت ہوئی مگر ہم لوگوں کو اس مرض سے بہت غفلت ہے۔ یہاں تک کہ اس کو مرض ہی نہیں سمجھا جاتا۔ چنانچہ بعض مصلحان قوم جو اپنے زعم میں مصلح قوم ہیں یہ حالت ہے کہ وہ شرابی کو شراب چھوڑاتے ہیں اور مسلمانوں کو نماز کی بھی ترغیب دیتے ہیں، غیبت جھوٹ سے بھی

روکتے ہیں مگراس ام الامراض کا جوکہ غفلت عن الآخرت ہے کوئی معالجہ نہیں کرتا اور نہ کوئی یہ پوچھتا ہے کہ اس کا علاج کیا ہے حالانکہ حوادث کا اور خصوصی موت کا کوئی ضابطہ نہیں کہ بچپن میں نہ آئے جوانی میں آئے یا جوانی میں نہ آئے بڑھاپے میں آئے۔ شاید ہمیں نفس نفس واپسیں شود شاید (یہی آخری سانس ہو زندگی کا) پھر آخرت سے اتنی غفلت کس بھروسہ پر ہے۔

فقہاءؒ نے لکھا ہے کہ اپنے واسطے پہلے سے قبر کھود کر رکھنا مکروہ ہے کیونکہ کیا خبر ہماری موت کہاں آئے گی۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ.

''اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کس زمین پر مرے گا۔''

تو قبر کا کسی جگہ کھودنا گویا درپردہ یہ دعویٰ کرنا ہے کہ میری موت اسی بستی میں آئے گی اور اس میں ایک گونا معارضہ ہے نص کا۔ اس لیے مکروہ ہے غرض موت کے آنے کا کسی کو علم نہیں ہوسکتا کب اور کس جگہ اور کس حال میں آئے گی۔ پھر موت کے بعد کے واقعات سرسری نہیں ہیں، کیا مسلمانوں کے کانوں میں یہ بات نہیں پڑی کہ قبر میں کیا حال ہوگا، کیا کسی کے پاس کوئی دستاویز ہے کہ وہ قبر میں جواب ٹھیک ہی دے گا۔ حدیث میں ہے:

القبر روضة من رياض الجنة او حفرة من حفرة النار[1]

''کہ قبر یا تو جنت کا ایک باغ یا جہنم کا ایک گڑھا''

یعنی اگر امتحان میں پاس ہوگئے تو راحت کی جگہ ہے اور فیل ہوگئے تو سخت مصیبت کا سامنا ہے۔

فان كنت لا تدرى فتلك مصيبة   وان كنت تدرى فالمصيبة اعظم

(پس اگر تو نہیں جانتا تو یہ تیرے لیے مصیبت ہے اور اگر تو جانتا ہے تو یہ بڑی مصیبت ہے)

اگر کسی کو آخرت کا اعتقاد نہ ہوتو اس کی زیادہ شکایت نہ تھی مگر ایمان و اعتقاد کے بعد اس غفلت پر حیرت ہے۔ افسوس ہمارے قلوب کیسے سخت ہوگئے ہیں۔ ہرچند کہ علماء نے یہ کہا ہے کہ قبر کے بارے میں جو نصوص وارد ہیں وہ مومن کامل اور کافر کے متعلق ہیں اور مسلم عاصی کے متعلق کوئی نص صریح نہیں کہ اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا مگر پھر بھی محققین نے فیصلہ کیا ہے

---

[1] مجمع الزوائد للهيثمى ۳: ۴۶

اور ٹھیک کیا ہے کہ اس کے ساتھ معاملہ بین بین ہوگا۔ یہ شخص کافر کے مقابلہ میں راحت کے اندر ہوگا اور مومن کامل کی نسبت سے عذاب میں ہوگا، جہنم کے عذاب میں بھی مسلم عاصی کے لیے یہی حکم ہے۔ تو وہی فیصلہ یہاں ہونا چاہیے۔ پس مسلم عاصی کو قبر میں عذاب ہوگا۔ گو کافر سے کم ہی ہو، پھر قبر سے نڈر کیوں کر ہو گئے، دنیا میں تو ہماری یہ حالت ہے کہ ہلکی سے گرمی کو برداشت نہیں کر سکتے تو کیا جہنم کی گرمی کو برداشت کر لو گے، جو قبر میں پہنچے گی۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اچھا صاحب ہم نے مانا کہ قبر میں عذاب ہوگا تو کیا کریں قسمت میں جو ہے ہو جاوے گا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بات دنیا کے معاملات میں کیوں نہیں اختیار کی جاتی کہ بس ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاؤ۔ اوروں سے کہہ دو کہ جو قسمت میں ہوگا ہو جائے گا۔ آخر اس فرق کی کیا وجہ ہے کہ دنیا کی تکالیف دفع کرنے کے لیے تو تدابیر کی جاتی ہیں، دھوپ سے بچنے کو چھتری لگاتے ہیں، لو سے بچنے کو خس کو ٹٹیاں لگاتے ہیں اور سایہ تو ہر شخص ڈھونڈتا ہے مگر آخرت کے لیے کوئی تدبیر نہیں کی جاتی۔ اس کے متعلق عموماً یہ اعتقاد ہو گیا ہے کہ آخرت کا معاملہ ہمارے اختیار سے بالکل باہر ہے۔

داخلہ جنت کا اختیار

صاحبو! یہ اعتقاد بالکل غلط ہے اور صراحۃً نصوص کے خلاف ہے۔ گو اس مخالفت نصوص پر جہل کی وجہ سے میں ان لوگوں پر کفر کا فتویٰ تو نہیں لگاتا مگر اس کو جہل شدید ضرور کہا جائے گا۔ قرآن میں نصوص بھری ہوئی ہیں جن سے نجات آخرت کا داخل اختیار ہونا صاف صاف معلوم ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

سَابِقُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ.

''تم اپنے پروردگار کی طرف دوڑو اور نیز ایسی جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین کی وسعت کے برابر ہے۔''

اس میں مسابقت الی الجنت کا امر ہے۔ اگر جنت میں جانا ہمارے اختیار میں نہیں ہے تو حکم سابقوا کیوں ہے؟ معلوم ہوا کہ ہمارے اختیار میں ہے کیونکہ حق تعالیٰ اختیاری امور ہی کا مکلّف فرمایا کرتے ہیں۔ غیر اختیاری امور کا مکلّف نہیں فرماتے۔ نص موجود ہے:

لَایُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا

''اللہ تعالیٰ کسی کو مکلّف شرعی نہیں بناتا مگر اس کی طاقت کے مطابق۔''

شاید اس پر یہ شبہ ہو کہ جنت و دوزخ ہم کو نظر نہیں آتیں کہ اس میں کود کر پہنچ جائیں یا کود کر باہر نکل جائیں یا دور بھاگ جائیں۔ پھر اس کی طرف سبقت کس طرح کی جائے یا دوزخ سے کیوں کر بچا جائے؟

تو سمجھ لیجئے کہ کسی فعل کے اختیاری ہونے کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ بلاواسطہ اختیاری ہو جیسے کھانا کھانا اختیاری ہے، پانی پینا اختیاری ہے، دوسرے یہ کہ بواسطہ اختیاری ہو۔ یعنی اس کے اسباب اختیار میں ہوں۔ جیسا کہ خورجہ سے دہلی پہنچ جانا اور کلکتہ یا بمبئی پہنچ جانا، اسی معنی میں اختیاری ہے کیونکہ یہاں سے بمبئی کود کر کون پہنچ سکتا ہے لیکن پھر بھی اس کو اختیاری کہا جاتا ہے جس کے یہی معنی ہیں کہ اس کے اسباب اختیاری ہیں۔ یعنی مسافت قطع کرنا اور غور کر کے دیکھا جائے تو زیادہ افعال اختیاریہ اسی دوسری قسم کے ہیں۔ مثلاً نکاح کر کے بچے جنوانا، زراعت سے غلہ حاصل کرنا، تجارات سے نفع حاصل کرنا اختیاری ہے تو کیا یہ ایسا اختیاری ہے کہ آپ بلاواسطہ جب چاہیں حاصل کر لیں، ہرگز نہیں! بلکہ اس معنی کر اختیاری ہے کہ اسباب اختیار میں ہیں، اسباب کو اختیار کرو، امید ہے کہ مسبب حاصل ہو جائے گا۔ پس جنت میں جانا بھی اسی معنی کر اختیاری ہے کہ اس کے اسباب آپ کے اختیار میں ہیں۔

قرآن و حدیث کو دیکھو معلوم ہوگا کہ حق تعالیٰ نے دوزخ سے بچنے اور جنت میں جانے کے لیے اسباب و تدابیر بتلائی ہیں۔ ان کو اختیار کرو۔ پس خدا تعالیٰ تم کو خود جنت میں پہنچا دیں گے اور دوزخ سے بچا دیں گے۔ چنانچہ اسی جگہ ارشاد فرمایا:

وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْٓ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ.

''اور اس آگ سے بچو جو کافروں کے واسطے تیار کی گئی ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ کفر موجب دخول نار ہے اور

سَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ

کے بعد ارشاد ہے اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ.

اس سے معلوم ہوا کہ تقویٰ موجب دخول جنت ہے۔

تفصیل تقویٰ

پھر تقوی کی تفصیل قرآن میں جا بجا مذکور ہے۔ چنانچہ اسی جگہ ارشاد ہے:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِى السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ.

''جولوگ کہ خرچ کرتے ہیں، فراغت میں اور تنگی میں اور غصے کے ضبط کرنے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے اور اللہ تعالیٰ ایسے نیکوں کو محبوب رکھتا ہے۔''

اس میں انفاق و کظم غیظ وعفو واحسان کا بیان ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّائِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصَّابِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ.

''کچھ سارا کمال اس میں نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کر لو یا مغرب کو، لیکن کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور آسمانی کتابوں پر اور پیغمبروں پر اور مال دیتا ہو اللہ تعالیٰ کی محبت میں رشتہ داروں کو اور یتیموں اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور گردن چھڑانے میں اور نماز کی پابندی رکھتا ہو اور زکوۃ بھی ادا کرتا ہو اور جو لوگ اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں جب کہ عہد کریں اور وہ لوگ مستقل رہنے والے ہوں تنگ دستی اور بیماری میں اور جنگ میں، تو یہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں۔''

اس میں تمام ابواب تقویٰ کو اجمالاً بیان کر دیا گیا ہے جس میں اول محض صورت بے معنی کو کافی سمجھنے کی ممانعت ہے۔ (دل عليه قوله لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ) جیسا کہ منافقین و یہود نے تحویل قبلہ کی گفتگو کا شغل بنا لیا تھا اس کے بعد ایمان باللہ و ایمان

بالمعاد اور ایمان بالملائکہ اور ایمان بالکتب سماویہ اور ایمان بالانبیاء کا امر ہے۔ یہ تو اعتقادیات کے متعلق ہے۔ پھر جب مال کو انفاق سے زائل کرنے کا امر ہے (یا محبت الٰہیہ میں مال خرچ کرنے کی ترغیب) یہ اصلاح قلب کے متعلق ہے۔ پھر اقامت صلوٰۃ کا امر ہے۔ یہ طاعت بدنیہ ہے پھر ایتاء الزکوٰۃ کا یہ اطاعت مالیہ ہے اور اوپر جو ایتاء مال کا ذکر ہوا ہے وہ انفاق تطوع ہے جس کی حدیث ترمذی میں تصریح ہے۔

ان فی المال لحقا سوی الزکوٰۃ، ثم تلا الایۃ[1]

''زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال میں محتاجوں کا حق ہے۔''

(اور **علی حبه** اس کا قرینہ بھی ہے کیونکہ اگر اس کا مرجع مال ہے تو حب مال کے ازالہ کے لیے فقط ایتاء زکوٰۃ کافی نہیں کچھ زائد انفاق کرنا چاہیے اور اگر اللہ تعالیٰ مرجع ہیں تو حب الٰہی کا مقتضا بھی یہی ہے کہ فرض کے علاوہ کچھ مال محض محبت کی وجہ سے خرچ کیا جائے)

اس کے بعد ایفائے عہد کا امر ہے جو معاشرت کے متعلق ہے۔ پھر صبر کا امر ہے جو سلوک کے متعلق ہے۔ غرض اس میں تمام شعب تقویٰ کو اجمالاً جمع کر دیا گیا ہے۔ اسی لیے ''**اولئک هم المتقون**'' پر اس کو ختم فرمایا ہے تو اب بتلائیے کہ خدا تعالیٰ نے یہ تدابیر بتلائی ہیں یا نہیں اور یہ تدابیر اختیاری ہیں یا نہیں، تو اب جنت میں جانا اختیاری ہوا یا نہیں۔

حقیقت توکل

رہا یہ کہ تدابیر تو حق تعالیٰ نے بتلائی ہیں مگر ان پر عمل کرنا اور ان کو بجالانا تو مشیت پر موقوف ہے بدوں مشیت کے کچھ نہیں ہو سکتا تو بیشک یہ ہمارا عقیدہ ہے مگر اس میں جنت و دوزخ ہی کی کیا تخصیص ہے۔ دنیا کے بھی سب کام مشیت ہی پر موقوف ہیں۔ کھیتی کرنا اور ملازمت کرنا بھی تو مشیت پر موقوف ہے پھر ان کے لیے کیوں سعی کی جاتی ہے۔ وہاں تو یہ کہا جاتا ہے کہ

رزق ہرچند بے گماں برسد لیک شرط است جستن از درہا

(رزق بے شک ملے گا لیکن اس کو اسباب سے تلاش کرنا شرط ہے)

اور مرنا بھی تو مشیت پر موقوف ہے پھر سانپ بچھو وغیرہ سے کیوں حفاظت کی جاتی

---

[1] سنن الترمذی ۶۵۹، ۶۶۰

ہے۔ اس کے متعلق یوں کہتے ہیں:

گرچہ کس بے اجل نخواہد مرد　　تو مرد در دہان اژدرہا

(اگرچہ موت وقت مقررہ سے پہلے نہیں آتی پھر بھی اژدھا کے منہ میں جانے سے گریز کرو)

یہ کیا کہ سارا توکل امور آخرت ہی میں صرف کیا جاتا ہے۔ اگر بڑا توکل کا دعویٰ ہے تو پہلے دنیوی امور میں بھی تو کیا ہوتا۔ میں توکل کو منع نہیں کرتا بلکہ آپ کی غلطی ظاہر کرتا ہوں کہ جس کو آپ نے توکل سمجھا ہے وہ توکل نہیں ہے توکل کے یہ معنی نہیں کہ اسباب وتدابیر کو قطعاً ترک کر دیا جائے بلکہ طریقہ حقہ یہ ہے کہ تدبیر وتقدیر دونوں کو ملایا جائے یعنی کام کر کے توکل کیا جائے۔

گر توکل می کنی در کار کن　　کسب کن پس تکیہ بر جبار کن

(اگر توکل کرو تم کام کے اندر کرو پھر اسباب کے اندر اثر رکھنے میں اور اس کے مسبب ہونے پر اللہ پر اعتماد کرو)

دنیا میں بھی ہم یہی کہتے ہیں کہ کھیتی کر کے ثمرہ کے متعلق خدا تعالیٰ پر نظر رکھو۔

خلاصہ یہ ہے کہ عمل میں تو اسباب کو اختیار کرو اور ثمرہ میں توکل کرو۔ چنانچہ دنیوی معاملات میں سب کا یہی طرز ہے مگر نا معلوم یہ تجربہ کیسا ہے کہ امور اخرویہ میں عمل اور ثمرہ دونوں میں توکل سے کام لیتے ہیں حالانکہ وہاں بھی یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے تھا جو معاملات دنیویہ میں اختیار کر رکھا ہے ورنہ دونوں میں فرق بتلانا چاہیے بلکہ اگر غور کیا جائے تو دنیا وآخرت کا فرق اس کو مقتضی ہے کہ مقاصد دنیویہ میں تو ترک تدبیر وتعطیل اسباب کی گنجائش ہے اور مقاصد اخرویہ میں ترک تدبیر وتعطیل اسباب کے مطلق گنجائش نہیں کیونکہ توکل بمعنی ترک اسباب کی حقیقت ہے ترک اسباب مظنونہ غیر مامور بہا یعنی جن اسباب پر مسبب کا ترتب عادۃً یقینی وقطعی نہ ہو اور شرعاً واجب بھی نہ ہو ان کو ترک کر دیا جائے، باقی جن اسباب پر عادتاً مسببات کا ترتب قطعی ہے اس کا ترک جائز نہیں۔

مثلاً عادتاً کھانا کھانے پر شبع کا ترتب یقینی ہے اور پانی پینے پر سیرابی کا ترتب قطعی ہے اس کا ترک جائز نہیں اور نہ اس کو توکل کہا جائے گا کہ بھوک کی حالت میں آپ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں کہ اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا تو پیٹ خود بخود بھر جائے گا۔ اگر یہ شخص بھوکوں مر گیا تو

عاصی ہوگا اور اسباب مظنونہ کا ترک بھی اس شخص کو جائز ہے جو خود بھی قوی الہمت ہو اور اس کے اہل وعیال بھی یا اس کے اہل وعیال ہی نہ ہوں اور ضعیف الہمت کو یا جس کے عیال ضعیف ہوں اس کو ان کا ترک بھی جائز نہیں۔ اسی طرح اسباب ماموربہا کا ترک توکل نہیں۔

جب توکل کی حقیقت معلوم ہوگئی تو اب سوچئے کہ ثمرات آخرت کے لیے جو اسباب شریعت نے بیان کیے ہیں وہ کیسے ہیں۔ آیا مامور بہ ہیں یا نہیں۔ سو ظاہر ہے کہ مامور بہ ہیں اور نیز آیا ان پر مسبب کا ترتب شرعاً ضروری ہے یا مظنون ہے تو نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ اسباب آخرت پر ترتب مسبب لازم ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وَمَنْ يَّعْمَلُ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰئِکَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلاَ يُظْلَمُوْنَ نَقِيْراً.

''اور جو شخص نیک عمل کرے گا بشرطیکہ وہ مومن ہو پس وہ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرہ برابر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

اور ارشاد ہے:

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ...... وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ

''جو شخص دنیا میں ذرہ برابر بھی نیکی کرے گا وہ وہاں اس کو دیکھ لے گا اور جو شخص ذرا برابر بدی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔''

اور بہت سی صریح نصوص ہیں جن میں اعمال آخرت کے متعلق صریح وعدہ ہے کہ جزا ضرور مرتب ہوگی اور دنیا کے متعلق نہ وعدہ ہے نہ اکثر اسباب میں ترتب ضروری ہے گو ہر چیز کے لیے اسباب موجود ہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

مَاجَعَلَ اللّٰہُ دَاءً اِلاَّ جَعَلَ لَہٗ دَوَاءً

''اللہ تعالیٰ نے جو بیماری بھی پیدا کی ہے اس کی دوا بھی پیدا کی ہے۔''

اسی واسطے تدبیر مشروع ہے مگر ان پر ثمرہ مرتب ہونے کا حق تعالیٰ کی طرف سے وعدہ نہیں ہے اسی لیے کبھی تخلف بھی ہو جاتا ہے کہ کھیتی کرتے ہیں اور پیداوار نہیں ہوتی، دواء کرتے ہیں اور شفاء نہیں ہوتی اور نہ اس پر عادۃ ترتب اثر ضروری ہے اور نہ یہ شرط ہے کہ

بدون دوا کی صحت نہ ہو سکے یا جب دوا کی جائے تو صحت ضرور ہو جائے۔ بخلاف اعمال آخرت کے کہ ان کو اپنے ثمرات کے ساتھ علیت وشریعت دونوں کا علاقہ ہے۔ گو یہ علیت و شریعت عقلی نہ ہو شرعی ہو تو لزوم ترتیب میں اعمال آخرت کی سب کی وہ حالت ہے جو دنیا میں بعض اسباب قطعیہ یقینیہ کی حالت ہے جن پر عادۃً ترتب اثر ضروری ہے جیسے اکل پر شبع کا اور شرب پر ری کا مرتب ہونا بلکہ وعدہ وعدم وعدہ کے تفاوت سے اعمال آخرت ان اسباب سے بھی الصق ہیں۔ پس جیسے ان اسباب کو دنیا میں ترک کرنا جائز نہیں۔ یہی حکم جملہ اسباب آخرت کا ہے کہ ان میں سے کسی کا بھی ترک جائز نہیں کیونکہ وہ سب اسباب قطعیہ یقینیہ ہیں جن پر ترتب اثر کا نص میں وعدہ بھی ہے۔ پھر حیرت ہے کہ جن اسباب پر ترتب اثر کا وعدہ بھی نہیں وہاں تو چھوٹی سے چھوٹی تدبیر سے بھی دریغ نہیں اور جہاں ترتب ثمرہ کا وعدہ ہے کہ تخلف کا احتمال ہی نہیں وہاں توکل اختیار کر لیا ہے۔ پس دنیا و آخرت کے فرق پر نظر کی جائے تو اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے کہ دنیا کے تو بعض اسباب میں توکل جائز ہو اور آخرت کے کسی سبب میں بھی توکل جائز نہ ہو یہ تو اسباب کا حکم تھا۔

رہے مسببات اور ثمرات تو ان میں مطلقاً توکل واجب ہے خواہ ثمرہ دنیا ہو یا ثمرہ آخرت یعنی ثمرات کو اسباب کا نتیجہ نہ سمجھے خدا تعالیٰ کی عطا سمجھے خوب سمجھ لو۔ بہر حال اسباب آخرت میں چونکہ تخلف نہیں ہے اس لیے ان کا ترک جائز نہیں۔ گو بعض لوگ بدون عذاب کے بھی نجات پا جائیں گے مگر یہ محض فضل ہے جو قاعدہ سے باہر ہے اور حقیقت میں اس میں بھی تخلف نہیں کیونکہ وہاں وعید مقید ہے بس خلف وعید ہی نہ ہوا۔

پھر یہ کہ آپ کے پاس کیا ایسے لوگوں کی کوئی فہرست ہے جو بدون عذاب کے خلاف قاعدہ ظاہری بخشے جائیں گے تو اس کا کیوں کر اطمینان کر لیا گیا کہ آپ اسی فہرست میں داخل ہیں اور ان لوگوں میں داخل نہیں جن سے قاعدہ اور ضابطہ کا معاملہ کیا جائے گا۔

خرق عادت وعادت غالبہ

دوسری بات یہ ہے کہ گو بعض عصاۃ کی مغفرت بدون تعذیب کے بھی ہو گی مگر یہ محض احتمال ہے کہ جس طرح دنیا میں گاہے بگاہے اظہار قدرت کاملہ کے لیے بدون اسباب عادیہ

کے مسبب کا وجود ہو جاتا ہے جیسے آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کا بدون ماں باپ کے پیدا ہونا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بدون باپ کے ہونا۔ مگر ایسا شاذ و نادر ہے۔ عادت غالبہ یہی ہے کہ بدون اسباب عادیہ کے مسبب کا ترتب نہیں ہوتا۔ ایسا ہی احتمال ہے کہ شاید آخرت میں بھی ہو کہ زیادہ تر فیصلہ نجات کا اسباب واعمال پر ہو اور بعض کو قدرت خداوندی واختیار کامل ظاہر کرنے کے بدون اسباب کے نجات ہو جائے۔ البتہ ایک سبب کا وجود پھر بھی ضروری ہے یعنی ایمان کا۔ گو حق تعالیٰ اس پر بھی قادر ہیں کہ بدون ایمان بھی بخش دیں اور اگر نص قطعی

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَاءُ

"بیشک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہیں بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے اور اس کے سوا اور جتنے گناہ ہیں جس کے لیے منظور ہوگا وہ گناہ بخش دیں گے۔"

نہ ہوتی تو ہم اس کے بھی قائل ہو جاتے کہ شاید بدون ایمان کے بھی مغفرت ہو جائے مگر نص قطعی کے بعد اس کے قائل نہیں ہو سکتے۔ پس یہ سبب تو ضروری ہے کہ ایمان حاصل ہو۔ دیگر اعمال کے بارے میں ہمارا یہی عقیدہ ہے کہ وہ اسباب اکثریہ ہیں، وہاں تخلف ممکن ہے اور صرف ممکن ہی نہیں بلکہ اس کا وقوع بھی ہوگا کہ باوجود معاصی کے بعض لوگ بدون عذاب کے بخش دیئے جائیں گے مگر اول تو یہ خبر نہیں کہ ایسا کثرت سے ہوگا، شاید کم ہو۔ پھر اس کے بھروسہ پر عمل سے کیونکر بیٹھ سکتے ہیں اس کی تو وہی مثال ہوگی کہ کوئی شخص بدون نکاح کے اولاد کا متمنی ہو اور نظیر میں آدم علیہ السلام وحوا علیہا السلام کا واقعہ پیدائش بیان کرے یا کوئی عورت بدون خاوند کے اولاد کی خواہشمند ہو اور مثال میں مریم علیہا السلام کی نظیر بیان کرے سب لوگ ان کو احمق کہیں گے۔ آخر کیوں؟ اسی واسطے کہ واقعات شاذ و نادر بطور خرق عادت کے ہوئے تھے اور عادت غالبہ اس کے خلاف ہے۔ اسی طرح مغفرت بدون تعذیب کی خبر سن کر اعمال سے بے فکر ہو جانا بھی حماقت ہے اور اگر مان لیا جائے کہ اس کا وقوع بھی کثرت سے ہوگا تو آپ کے پاس ایسے لوگوں کی فہرست تو نہیں ہے۔ پھر کیا اطمینان ہے کہ آپ انہی میں سے ہیں یا دوسروں میں سے اور یہ تخلف ظاہری اسباب سے عصاۃ کے لیے تو ہوگا کہ باوجود معاصی کے نجات ہو جائے گی، متقین کے لیے نہ ہوگا کہ باوجود طاعات کے نجات نہ

ہو۔اوراگراعمال کی مسبیت کے متعلق کسی کواس حدیث سے شبہ ہو۔

ان الرجل ليعمل بعمل اهل الجنة حتٰى لا يبقى بينه وبينها الا قدر ذراع فيسبق عليه القدر فيكون من اهل النار او كما قال[1]

''بے شک کوئی آدمی اہل جنت کے عمل کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان صرف ہاتھ کا فاصلہ باقی رہ جاتا ہے تو پھر تقدیر غالب آجاتی ہے اور وہ شخص دوزخی بن جاتا ہے۔''

کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض دفعہ کوئی شخص باوجود اعمال صالحہ کے پھر بھی محض تقدیر کے غلبہ سے دوزخی ہوجاتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جبراً وقہراً کسی کو دوزخی نہیں بنایا جاتا اور نہ حدیث کا یہ مطلب ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ کوئی آدمی ابتداء میں اعمال صالحہ اختیار کرتا ہے حتیٰ کہ جنت کے قریب ہوجاتا ہے اور انتہاء میں اپنے قصد وارادہ واختیار سے اعمال سیئہ پر کمر باندھ لیتا ہے اور جہنمی ہوجاتا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ بدون قصد واختیار کے اضطرار اس سے اعمال سیئہ صادر ہونے لگتے ہیں کیونکہ عمل اضطرار سے کوئی شخص معذب نہیں ہوسکتا۔ مضطر کو شریعت نے معذور کہا ہے اور اس سے مواخذہ نہیں کیا جاتا۔ پس **فيسبق عليه الكتاب** کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ بے اختیار جبراً معصیت کرنے لگتا ہے۔ کیونکہ یہ معصیت ہی نہیں اکراہ واضطرار میں معصیت تو معصیت اجراء کلمہ کفر پر بھی مواخذہ نہیں ہوتا۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں اور قسم سے زیادہ اطمینان دلانے کا میرے پاس اور کیا ذریعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عذاب کے لیے بہانہ نہیں ڈھونڈتے، ہاں رکھنے کے لیے البتہ بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔ خدا کی قسم جو کوئی جہنم میں جائے گا اپنی کرتوتوں سے جائے گا بلا وجہ کسی کو عذاب نہ دیا جائے گا بلکہ بندہ پر حجت کر کے جہنم میں بھیجا جائے گا اور وہاں انسان کو خوب معلوم ہوجائے گا کہ اعمال شر اور معصیت میں وہ مجبور نہ تھا گو یہاں کیسی ہی باتیں بنائے اور یہاں بھی دوسروں ہی کے سامنے باتیں بنائی جاتی ہیں اور اپنے دل میں ہر شخص جانتا ہے کہ وہ گناہ ارادہ سے کرتا ہے یا بے ارادہ اور مضطر ہوکر کرتا ہے یا مختار ہوکر۔ یقیناً معصیت کے وقت اس کے ضمیر میں

---

[1] الصحیح للبخاری ۸: ۱۵۲

دونوں پہلو آتے ہیں اور تھوڑی دیر تک وہ ضرور متردد ہوتا ہے کہ یہ کام کروں یا نہ کروں، پھر اپنے اختیار سے ایک شق کو لے لیتا ہے۔

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ وَلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ

''بلکہ انسان خود اپنی حالت پر مطلع ہوگا۔ گو اپنے حیلے پیش لاوے۔''

اسی طرح اعمال کی مسببیت کے متعلق اس حدیث سے بھی شبہ نہ کیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

لایدخل الجنة احد بعمله[1] ''کہ اپنے عمل سے جنت میں کوئی نہ جائے گا۔''

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا: **ولاانت یا رسول الله** اور کیا آپ بھی نہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فرمایا: **ولا انا الا ان یتغمدنی الله برحمة** ''ہاں میں بھی نہیں مگر یہ کہ حق تعالیٰ اپنی رحمت سے ڈھانپ لیں۔''

عمل اور فضل

اس سے شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ حدیث تو ساری تقریر کو رد کر رہی ہے اور اس میں تو مسببیت عمل کی صراحتہ نفی ہے کہ عمل کو دخول جنت میں کوئی دخل نہیں بلکہ اس کا مدار محض فضل ورحمت پر ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ حدیث کا مطلب نہیں سمجھے۔ میں تفسیر حدیث سے پہلے ایک مثال بیان کرتا ہوں۔ مثلاً کسی شخص کو ایک گھنٹہ کا کام دیا جائے کہ وہ ایک گھنٹہ تک پیر دبایا کرے اور اس کے عوض میں اس کو ایک ہزار روپے ماہوار دیئے جائیں اور آقا یوں کہے کہ اس کے عمل میں تو کچھ قوت اور قابلیت ایسی نہیں کہ اس کو ہزار روپے ماہوار دئے جائیں۔ یہ تو محض ہماری عنایت ہے تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ ایک گھنٹہ کی خدمت بیکار ہے اور کیا اس راز کو سن کر اس شخص کو ایک گھنٹہ کی خدمت ترک کر دینا چاہیے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو احمق ہوگا کیونکہ گو ہزار روپے ماہوار اس عمل کا معاوضہ نہیں بلکہ محض عنایت ہے مگر وہ عنایت اسی ایک گھنٹہ کی بدولت ہو رہی ہے۔ اگر یہ اس خدمت کو ترک کر دے گا تو نہ معاوضہ ملے گا نہ عنایت ہوگی۔ دونوں سے کورا ہو جائے گا۔

---

[1] تاریخ بغداد للخطیب البغدادی ۷: ۷۵

خَسِرَ الدُّنیَا وَالْاٰخِرَۃِ ذٰلِکَ ھُوَالْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ.

''دنیا میں بھی ٹوٹا اور آخرت میں بھی، یہ تو کھلے ہوئے نقصان ہیں۔''

اب حدیث کا مطلب سمجھئے۔ آپ کا مطلب بھی یہی ہے کہ جنت میں جو مومن کو اتنی بڑی سلطنت ملے گی جس کی شان یہ ہوگی: اِذَا رَاَیْتَ نَعِیْمًا وَمُلْکًا کَبِیْرًا. ''اگر تم اس کو دیکھو تو تم کو بڑی نعمت اور بڑی سلطنت دکھائی دے۔''

اور جس کی حالت یہ ہے: **اعدت لعبادی الصالحین مالا عین رات ولا اذن سمعت ولا خطر علٰی قلب بشر**[1].

''میں نے اس کو اپنے نیک بندوں کے واسطے تیار کیا ہے جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کان نے سنا اور نہ کسی کے دل پر اس کا حال گزرا۔''

اس سلطنت کے حصول کے لیے یہ عمل کیا چیز ہے جو ہم کر رہے ہیں۔ اتنی بڑی جزا یہ محض عنایت ہے لیکن یہ عنایت ہوگی اسی عمل کی بدولت گو وہ ناچیز ہے اور اس جزاء کے سامنے کچھ بھی نہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ عمل بیکار ہے۔

آسان عنوان اس کے سمجھنے کا یہ ہے کہ اس حدیث میں دخول جنت کا سبب رحمت کو بتلایا گیا ہے۔ اب نصوص میں غور کرلو کہ مورد رحمت کون ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ ''کہ رحمت حق نیکوکاروں سے قریب ہے۔''

اس سے صاف معلوم ہوگیا کہ جس رحمت سے دخول جنت ہوگا وہ رحمت اسی عمل قلیل وعمل ناقص وعمل حقیر پر مرتب ہوگی جو جنت کے مقابلہ میں کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔ اگر عمل بیکار چیز ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اعمال پر حدود کیوں جاری کیں اور نصوص میں اعمال سیئہ پر وعید کیوں ہے اور اعمال صالحہ پر وعدہ کیوں ہے۔ تو کیا یہ نصوص محض لغو ہیں، نعوذ باللہ ہرگز نہیں۔ اب آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ لوگ آج کل کتنی بڑی غلطی میں مبتلا ہیں۔ بار بار لوگوں کی زبان پر یہ بات آتی ہے۔

اب تو آرام سے گزرتی ہے — عاقبت کی خبر خدا جانے

---

[1] مسند الامام احمد ۲: ۴۳۸

شاعر نے حصر کر دیا ہے کہ عاقبت کی خبر خدا تعالیٰ ہی کو ہے، ہم کو کچھ خبر نہیں ہو سکتی۔ یہ حصر غلط ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بلاواسطہ خبر تو حق تعالیٰ کو ہے لیکن حق تعالیٰ کے بتانے سے ہم کو بھی خبر ہے۔ پس ہم جواب میں یوں کہتے ہیں کہ عاقبت کی اصل خبر خدا کو ہے اور خدا تعالیٰ کے بتلا دینے سے، ہم کو بھی خبر ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے حکیم ایک دوا کی نسبت یہ کہے کہ یہ زہر ہے اور آپ یوں کہیں کہ بھائی حکیم ہی جانے زہر کون کون ہے مگر یہ کہہ کر آپ سنکھیا کھا نہیں لیتے بلکہ یہی کہتے ہیں کہ بھائی جب حکیم نے بتلا دیا کہ یہ زہر ہے تو ہم کو بھی خبر ہو گئی۔ اب اس کا کھانا حماقت ہے۔

اسی طرح آخرت کے معاملہ میں کیوں نہیں کہا جاتا کہ جن چیزوں کو حق تعالیٰ نے آخرت کے لیے مفید فرمایا ہے ان کو اختیار کرو اور جن کو مضر بتلایا ہے ان کو چھوڑ دو۔ آخرت کے متعلق مفید و مضر کا علم تو حق تعالیٰ کے بتلانے سے ہم کو بھی ہے پھر اس سے مطلق بے خبری کا دعویٰ کیوں کیا جاتا ہے۔

غرض مجھے اس وقت اس امر کی شکایت ہے کہ جس طرح ہم کو دنیا کے اسباب و مسببات میں ربط کا اعتقاد ہے اسی طرح آخرت کے اعمال وثمرات میں ربط کا اعتقاد نہیں۔ بس جو لوگ کچھ کرتے بھی ہیں ایک بے ربط حکم سمجھ کر کرتے ہیں، یہ نہیں سمجھتے کہ اس نماز پر دخول جنت مرتب ہوگا۔ اس خیال عدم ارتباط نے ہمارے اعمال کا ناس کر دیا ہے۔ بعض تو اعمال کی فکر ہی نہیں کرتے اور بعض اعمال بجالاتے بھی ہیں تو ان میں تکمیل و تعدیل کا اہتمام نہیں کرتے کیونکہ اگر وہ دواء کی طرح ان اعمال کو سبب نجات سمجھتے تو جیسے دوا میں تدبیر کامل کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ کوئی دوا رہ نہ جائے اور کوئی دوا وزن سے کم نہ ہو اسی طرح یہاں بھی اہتمام ہوتا کہ عمل کے سب ارکان و آداب بجالائے جاتے اور ہر چیز کو خوبی کے ساتھ ادا کیا جاتا۔

صاحبو! اگر ہم سواری لیا کرتے ہیں تو ایسی لیتے ہیں جس سے منزل پر پہنچ جائیں۔ پھر یہاں نماز ایسی کیوں نہیں ادا کرتے جو جنت میں پہنچا دے۔ اگر کوئی بازار میں جاتا ہے تو ایسا سکہ لے جاتا ہے جو بازار میں چل سکے، گھسی ہوئی اور خراب دونی چونی کوئی نہیں لے جاتا کیونکہ جانتا ہے کہ اس سے سودا نہ ملے گا پھر نماز کو ایسا سکہ کیوں نہیں بناتے جو بازار

آخرت میں چل جائے۔ یہاں اس کے کھرے اور عمدہ بنانے کی تدبیر کیوں نہیں کی جاتی۔ بس یہی تو فرق ہے کہ دنیا کے بازار میں تو آپ دونی چونی کو سکہ اور سودے کی قیمت سمجھتے ہیں اور نماز، روزہ کو بازار آخرت کا سکہ اور جنت کی قیمت نہیں سمجھتے۔ یہی غلطی ہے اور اسی پر میں اس وقت تنبیہ کرنا چاہتا ہوں اور اسی سے غفلت کی شکایت ہے۔

غلبہ خوف کے اثرات

صاحبو! کیا یہ واقعات بھلانے کے قابل ہیں کہ ہم کو پل صراط پر چڑھنا ہے، حشر کے میدان میں کھڑا ہونا ہے جو نہایت سخت دن ہوگا۔ افسوس ہم کو پھانسی پر چڑھنا تو ہے اور اترنے کی خبر نہیں۔

چوں چنیں کاریست اندر رہ ترا　　　خواب چوں می آید اے ابلہ ترا

ہم کیسے غافل ہیں، نامعلوم ہم کو نیند کیسے آتی ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں نیند بھی آنا چاہیے بلکہ مطلب یہ ہے کہ غفلت کی نیند نہ آنا چاہیے ورنہ اگر نیند بالکل نہ آوے تو علاوہ دنیوی کاموں کے ہمارے دین کے کام بھی خراب ہو جائیں۔ تو یہ خدا تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ کیفیت و حال کا اتنا غلبہ ہمارے اوپر نہیں کیا جو نیند ہی اڑ جائے ورنہ واقعی جو حالات ہمارے سامنے ہیں وہ ایسے ہی سخت ہیں کہ اگر ہر وقت پیش نظر رہیں تو نیند بھی اڑ جائے اور کھانا پینا بھی چھوٹ جائے لیکن حق تعالیٰ نے حضور و غیبت کا فرق قائم کر رکھا ہے جس سے دنیا کے اور دین کے سارے کام چل رہے ہیں ورنہ سب کارخانہ معطل ہو جاتے، اگر اتنی غفلت بھی حق تعالیٰ کو گوارا نہیں جیسی اب ہے۔

حدیث میں ہے کہ حضرت حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو راستے میں ملے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مزاج پوچھا، کہا نافق حنظلة کہ حنظلہ (یعنی میں) تو منافق ہو گیا، پوچھا یہ کیسے؟ کہا اس واسطے کہ جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا جنت و دوزخ ہمارے سامنے ہے۔ پھر جب وہاں سے اٹھ کر اپنے بال بچوں میں آتے ہیں اور دنیا کے مشاغل میں لگتے ہیں تو وہ حالت حضور نہیں رہتی (اور یہی نفاق ہے) حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اگر یہ نفاق ہے تو اس میں تو ہم بھی مبتلا ہیں۔ چلو اس کے

متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض معروض کریں۔ چنانچہ حاضر خدمت ہوئے اور شبہ عرض کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے حنظلہ! اگر تم ہر وقت ویسے ہی رہو جیسے میرے سامنے رہتے ہو تو ملائکہ تم سے مصافحہ کیا کرتے اور تم جنگلوں کو چڑھ جاتے۔

ولكن يا حنظلة ساعة فساعة[1]

''لیکن اے حنظلہ ایک وقت ایسا ہے اور ایک وقت ویسا ہے۔''

یہ تو حدیث ہے۔ بعد میں علماء نے اس کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ مثلاً خوف کا ایک درجہ ہے تو یہ ہے کہ محض خوف کا غلبہ ہو تو غلبہ خوف سے تعطل ہو جاتا ہے اور تعطل سے ترقی نہیں ہوتی اور مقصود بھی حاصل نہیں ہوتا جیسے بعض بچے امتحان کے وقت غلبہ خوف سے سب پڑھا پڑھایا یاد کیا ہوا بھول جاتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایک درجہ غلبہ خوف کا یہ ہے جس سے سارے مصالح فوت ہو جائیں، محض خوف ہی خوف باقی رہ جائے۔ یہ درجہ مطلوب نہیں اور ایک درجہ غلبہ خوف کا وہ ہے جس کے ساتھ دوسرے مصالح بھی باقی رہیں مگر وہ تابع ہوں اور خوف سب پر غالب رہے۔ یہ درجہ مطلوب اور محمود ہے۔

اسی طرح غلبہ شوق کا ایک درجہ یہ ہے کہ کسی کو محبوب سے ایسا عشق ہو جائے کہ سب مصالح فوت ہو جائیں نہ کھانے کا رہے نہ پینے کا نہ نماز کا نہ روزہ کا۔ بس ہر وقت ایک ہی دھن میں رہے یہ درجہ تو مطلوب نہیں اور ایک درجہ یہ ہے کہ محبت و شوق کے ساتھ دوسرے مصالح بھی محفوظ رہیں، کھاتا پیتا بھی رہے، کاروبار میں بھی لگا رہے مگر ہر حالت میں محبوب کی یاد رہتی ہے یہ غلبہ مطلوب ہے۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مطلب یہ ہے کہ غلبہ خوف اور محبت دونوں میں مقصود وہ درجہ ہے جس کے ساتھ دوسرے مصالح بھی فوت نہ ہوں اور یہ جبھی ہو سکتا ہے جب کہ ہر حال میں یکساں غلبہ نہ ہو بلکہ ایک وقت میں تو محض خوف اور محبت ہی کا غلبہ ہو اور کسی کام کی طرف التفات نہ ہو اور ایک وقت میں دوسرے کاموں کی طرف بھی التفات ہو مگر دل میں خوف اور محبت کی وجہ سے آرہ بھی چل رہا ہو جیسے طاعون کے زمانہ میں موت کا غلبہ ہر وقت رہتا ہے مگر ایسا نہیں ہوتا کہ کھانا پینا بھی چھوٹ جاوے، نیند نہ آوے یا

---

[1] الصحيح لمسلم كتاب التوبة: ۲ ۱۳،۱۰

دنیا کے کاروبار بند ہوجائیں، نہیں بلکہ کھاتے بھی ہیں پیتے بھی، سوتے بھی ہیں مگر بے فکری نہیں ہوتی۔ بس یہی حالت مطلوب ہے اور عارفین کو بھی غلبہ حاصل ہوتا ہے اور یہی مطلوب ہے۔ اسی حالت کے حاصل کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اکثر و اذکر ھاذم اللذات[1] ''یعنی موت کی یاد کثرت سے کرو۔''

یعنی اس کو غالب رکھو، ویسا ہی غلبہ جیسا طاعون کے زمانہ میں ہوتا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:

صل صلوٰۃ مودع ''یعنی نماز ایسی پڑھ جیسے دنیا کو رخصت کرنے والا نماز پڑھا کرتا ہے۔''

یعنی اگر کسی کو یہ معلوم ہوجائے کشف سے یا کسی صاحب کشف بزرگ کے ارشاد سے کہ ہماری زندگی صرف اتنی باقی رہ گئی ہے کہ اس میں ایک ہی نماز پڑھ سکتے ہیں تو بتلایئے اس وقت کیسی نماز پڑھی جائے گی۔ یقیناً ایسی پڑھی جائے گی کہ عمر بھر ایسی نماز نہ پڑھی ہوگی۔ ہر ہر لفظ کو صاف صاف الگ الگ ادا کیا جائے گا کہ ایسا نہ ہو الفاظ لپٹ جائیں۔ **سبحان ربی العظیم** بھی تین دفعہ گن کر کہیں گے اور ہر رکعت کو بھی اچھی طرح یاد رکھیں۔ یہ نہیں کہ دو رکعت پڑھ کر شبہ ہو رہا ہے کہ دوسری ہے یا چوتھی۔ غرض ہر رکن کو اعتدال اور تکمیل سے ادا کیا جائے گا۔ اول تو انشاء اللہ ہر شخص قاری ہوجائے گا اور قاری بھی نہ ہوا تو الفاظ تو صاف صاف ادا ہوں گے اور ہر رکن میں یہ خیال غالب رہے گا کہ بس اب خدا تعالیٰ سے ملنا ہے، یہ نماز ایسی تو ہو جو ان کے سامنے پیش ہو سکے، وساوس وخطرات بھی کافور ہوجائیں گے۔

نماز اور وساوس

میں یہ نہیں کہتا کہ خیالات بالکل نہ آویں گے۔ اگر آویں گے تو ایسے آویں گے جیسے بہتے دریا میں تنکے اور بلبلے ہوتے ہیں کہ ادھر آیا ادھر گیا، ادھر اٹھا ادھر بجھا، وہ جمنے نہ پاویں گے اور یہی مطلوب ہے۔ خیالات کا انقطاع کلی مطلوب نہیں، وساوس وخطرات بلا قصد تو مرتے دم تک بھی آویں تو خوف کی چیز نہیں کیونکہ حدیث میں ہے:

ان اللہ تجاوز عن اُمتی ماحدثت بہ انفسھا[2]

''اللہ تعالیٰ میری اُمت سے ان خیالات کے گناہ کو درگزر فرماتے ہیں جو ان کے دل

---

[1] سنن الترمذی: ۲۳۰۷ [2] مشکوۃ المصابیح: ۶۳

پر خود وارد ہوں بلا مقصد کے۔''

مگر یہ وہی خیالات ہیں جو خود آ ویں باقی خیالات کا لانا اور قصداً جمع کرنا یہ

اِنْ تُبْدُوْا مَافِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰهُ

''اگر تم ظاہر کرو اپنے دل کی باتیں یا ان کو چھپاؤ اللہ تعالیٰ ان کا محاسبہ کریں گے تم سے۔''

میں داخل ہے۔ اس پر مواخذہ ہوگا۔ مثلاً غنا کا سننا ایک تو بے اختیار ہے کہ خواہ مخواہ کان میں آواز آ رہی ہے مگر یہ قصداً اس طرف توجہ نہیں کرتا۔ یہ تو معاف ہے اور ایک ان کی طرف التفات کرنا، کان لگانا، اس سے مزے لینا یہ حرام ہے بلکہ فقہاء نے لکھا ہے کہ **''التلذذبھا کفر''** یہ بہت سخت کلمہ ہے جو زجراً استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح کسی عورت یا امرد کی طرف بلا ارادہ کے خیال پہنچ جائے۔ یہ معاف ہے اور ایک یہ کہ اس کی صورت کو سوچ سوچ کر یاد کرے یا اس سے تلذذ کرے یہ گناہ ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ کس درجہ کا گناہ ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے کیونکہ صغیرہ کبیرہ کا وہ فرق جو صغیرہ پر جری کر دے میں نے پہلے ہی رفع کر دیا کیونکہ دین کے تباہ کرنے کو دونوں کافی ہیں۔ اسی طرح نماز میں قصداً خیال لانا برا ہے اور بلا قصد کے وساوس کا آنا مضر نہیں۔

اب تو ہماری نماز میں قصداً خیال لائے جاتے ہیں۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک خیال آیا تو بے اختیار مگر اس کو دیر تک باقی رکھتے ہیں۔ ابقاء وساوس بھی امر اختیاری ہے اس پر بھی ملامت کی جاوے گی۔ آج کل ہماری نماز سارے حسابات کا محل ہے، دنیا بھر کے حسابات اسی میں ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حساب کے لیے یک سوئی کی ضرورت ہے۔ اب نماز میں سارے حساب اس لیے ہوتے ہیں کہ ہم کو اس کی تو مشق ہوگئی ہے اس لیے نماز کے ارکان و اذکار ادا کرنے کے لیے توجہ کی ضرورت نہیں رہی تو وہ خود بخود ادا ہوتے رہتے ہیں جیسے گھڑی کوک بھرنے کے بعد خود بخود چلتی رہتی ہے تو اس میں ایک سوئی پوری ہوتی ہے اس لیے سارے وساوس اسی میں آتے ہیں۔

نماز کی مشق پر ایک حکایت یاد آئی۔ ایک کچہری میں معمول تھا کہ ظہر کی نماز کے وقت نماز کے لیے کچھ دیر کو اجازت دیدی جاتی تھی تو سارے مسلمان اس وقت کچہری

سے چلے جاتے تھے۔ نمازی بھی اور بے نمازی بھی۔ نمازی تو نماز کے لیے اور بے نمازی شرما شرمی تاکہ حکام ان کو بے نمازی نہ کہیں۔ تو ایک صاحب جو بے نمازی تھے وہ کچہری سے تو سب کے ساتھ چلے جاتے اور سب سے پہلے واپس آ جاتے اور دوسرے دیر میں آتے۔ ایک دن حاکم نے پوچھا اس کی کیا وجہ ہے کہ فلاں شخص دیر میں آتے ہیں اور تم جلدی آتے ہو کیا تم نماز نہیں پڑھتے۔ تو آپ کہتے ہیں کہ نہیں حضور یہ بات نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ میں تو پرانا نمازی ہوں میرے آباء واجداد کئی پشت سے نمازی ہیں تو مجھے نماز کی مشق ہے اور فلاں صاحب نئے نمازی ہیں ان کو نماز کی مشق نہیں اس لیے سوچ سوچ کر اٹک اٹک کر پڑھتے ہیں۔ غرض نماز میں وساوس اسی لیے آتے ہیں کہ ہم اس کو مشق کے طور پر بے توجہی سے ادا کرتے ہیں ورنہ نماز تو ایسی چیز ہے جس میں سب سے زیادہ توجہ ہونا چاہیے تھی تو پھر اس میں حساب کتاب نہ ہوسکتا۔

لان النفس لاتتوجه فی ان واحد الی شیئین

''کہ نفس ایک آن میں دو طرف متوجہ نہیں ہوسکتا۔''

اگر ہم کو نماز کے ارکان واذکار کی طرف توجہ ہو اور ہر لفظ کو ارادہ وقصد سے ادا کریں تو پھر دوسری طرف ہرگز توجہ نہ ہوسکے اور وساوس کا ہجوم نہ ہو۔ باقی سہواً اگر دوسرے اسباب سے ہو وہ اور بات ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں اس کا طریقہ بتلایا ہے جس سے ہر رکن توجہ سے ادا ہو یعنی **صل صلوٰۃ مودع** ۔ اگر ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ نماز ہماری اخیر نماز ہے اور یہ ایسی بات ہے جس کا احتمال ہر وقت ہے کیونکہ اس کی کسی کو خبر نہیں کہ ہماری کتنی عمر باقی ہے۔ انسان کے اندر خود ہلاکت کا سامان ہر وقت تیار ہے۔ چنانچہ کھانے پینے میں پھندا لگ جاوے تو کیا حال ہو۔ بعض دفعہ تھوک نگلنے سے پھندا لگ جاتا ہے۔ صفراء سودا کے اختلاف کو الگ رہنے دو۔ جب اس حدیث میں کچھ شبہ نہیں کہ ہر وقت موت کا احتمال ہے۔ بعض اوقات ایسے ہوئے ہیں کہ بدون کسی سبب ظاہری کے دفعۃً موت آ گئی۔ اطباء بعد میں اس کے اسباب گھڑتے رہتے ہیں۔ مگر سچ یہ ہے کہ عمر کے ختم ہونے کی کسی کو خبر نہیں، شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود۔

پس ایسی موت کا بڑا سبب ہے کہ دن پورے ہو چکے تھے۔ اس بات کو پیش نظر رکھنے کا اس حدیث میں امر ہے "صل صلوٰۃ مودع" بس یہ سوچ کر نماز پڑھو۔ ان شاء اللہ نماز میں قصداً تو وسوسہ بھی نہ آئے گا اور جو آئے گا بھی تو بہت جلد فنا ہو جائے گا۔

اختصار فی الاعمال

پھر چونکہ نماز میں کھڑے ہوتے ہوئے دفعتہً یہ حالت حاصل نہیں ہو سکتی اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری حدیث میں "اکثر و اذکر ھاذم للذات" فرما کر ایسی بات بتلا دی جس سے نماز میں موت کا مراقبہ سہل ہو جائے کیونکہ اس حدیث سے مقصود یہ ہے کہ زیادہ اوقات میں آخرت کو یاد رکھا کرو۔ جب زیادہ اوقات اس کو یاد رکھا جائے گا تو نماز میں بھی اس کا استحضار سہل ہو جائے گا۔ سبحان اللہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر بھی کس قدر دقیق ہے کہ ہر بات میں ہر پہلو کی رعایت ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم صرف اتنا ہی فرماتے ہیں "صل صلوٰۃ مودع" تو اس پر یہ اشکال ہو سکتا تھا کہ دن بھر تو ہم دنیا کے مشاغل میں مشغول رہیں پھر نماز کے قلیل وقت میں آخرت کو کیونکر متحضر رکھیں۔ یقیناً اس وقت وہی باتیں خیال میں آئیں گی جن کی طرف نماز سے پہلے متوجہ تھے مگر "اکثر واذکر ھاذم اللذات" (سنن الترمذی: ۲۳۰۷) کو اس کے ساتھ ملا کر کوئی اشکال نہیں رہا۔ پھر اس میں بھی یہ نہیں فرمایا کہ ہر وقت موت کو پیش نظر رکھو بلکہ لفظ اکثروا فرمایا کہ زیادہ اوقات میں اس کو یاد رکھا کرو۔ اس پر تعطل کا شبہ بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ کچھ اوقات میں عدم ذکر کی بھی اجازت ہے اور یہ بات یاد رکھنے کی ہے اس حدیث میں ھاذم للذات کی تفسیر موت سے آئی ہے۔ اس سے صرف موت ہی مراد نہیں کیونکہ وہ ذرا سی بات ہے کہ موت آئے گی اس سے لذات شکستہ نہیں ہو سکتیں بلکہ مراد ذکر موت و مابعد الموت ہے کیونکہ

القرآن تفسیر السنۃ والسنۃ تفسیر القرآن "قرآن حدیث کی تفسیر کرتا ہے اور حدیث قرآن کی تفسیر کرتی ہے۔" "فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهٖ "جو کوئی آرزو رکھتا ہے اپنے رب سے ملنے کی۔" اور وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ" اور جو کوئی اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کے وقت ڈرتا ہے اس کے لیے جنت میں دو باغ ہوں گے۔"

اور وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ''اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرتا ہے اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکتا ہے۔''

ان سب نصوص سے معلوم ہوا کہ حشر اور میدان قیامت کا یاد رکھنا اور حق تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کا استحضار بھی مطلوب ہے۔ سو اس استحضار کے اکثار کا حکم فرمایا، مداومت لغویہ کا حکم نہیں دیا کہ وہ بعض اوقات مفوت مصالح ہو جاتا ہے۔ غرض غفلت ضعیفہ مضر نہیں مگر ہماری غفلت تو حد سے بڑھ کر درجہ مذمومیت تک پہنچ گئی ہے اور یہی مانع ہو رہی ہے۔ اصلاح اعمال سے اور آیت میں اسی کی شکایت ہے۔ اگر یہ غفلت دور ہو جاوے تو ان شاء اللہ سارے اعمال درست ہو جائیں چونکہ یہ نسخہ نہایت مفید ہے اس لیے جی چاہا کہ آپ کے کانوں میں بھی یہ مضمون پڑ جائے۔

پس اصلاح اعمال کی صورت یہ ہے کہ ہر کام میں آخرت کو یاد رکھو اور یاد رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ اعمال دو طرح کے ہیں ایک مفید آخرت ایک مضر آخرت۔ تو جو کام آخرت میں مفید ہیں ان کو اختیار کرو اور جو مضر ہیں ان کو ترک کرو۔ اور ظاہراً یہاں ایک تیسری قسم بھی اعمال کی ہے جو نہ آخرت کو نافع ہے نہ مضر۔ اس کا حکم یہ ہے کہ وہ اگر دنیا کو بھی مفید نہیں تو عبث ہے وہ قابل ترک ہے کیونکہ حدیث میں ہے:

من حسن الاسلام المرء ترکه مالا یعنیه. (الکامل لابن عدی ۳:۹۰۷)

''انسان کے لیے اسلام میں بہتر چیز یہ ہے کہ وہ لایعنی سے حتی الامکان احتراز کرے۔''

اگر دنیا کو مفید ہے تو مباح غیر عبث ہے اور اگر دنیا کو مضر ہے تو وہ مباح تو ہے مگر ناپسندیدگی کے ساتھ جیسے طلاق کیونکہ شریعت نے ہمارے دنیوی مصالح کی بھی رعایت کی ہے اور خواہ مخواہ اپنی دنیا کو برباد کرنے سے منع کیا ہے۔ اسی وجہ سے طلاق گو مباح ہے مگر ابغض المباحات عند اللہ کیونکہ اس سے دنیوی مصالح برباد ہوتے ہیں جبکہ بلاوجہ شرعی کے طلاق دی جائے اور میں نے جو عبث کی نسبت کہا ہے کہ وہ نہ نافع ہے نہ مضر۔ یہ محض ظاہر ہی کے اعتبار سے ہے ورنہ حقیقت میں اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ افعال عبث بھی انجام کار مضر ہی میں داخل ہیں۔ گو اس وقت مضر آخرت نہیں معلوم ہوتے۔ آدمی اپنے افعال

عبث کو دیکھ لے تو اس کا سلسلہ معصیت سے ضرور ملا ہوا پائے گا۔

مثلاً کسی سے آپ نے یہ سوال کیا کہ سفر میں کب جاؤ گے۔ اگر وہ اس سوال کا منشا صحیح سمجھ گیا تو خیر اور اس صورت میں سوال عبث ہی نہ ہوگا اور اگر وہ اس کا منشا صحیح نہ سمجھا تو اس کے دل پر اس سوال سے ضرور گرانی ہوگی کہ یہ کیوں پوچھتا ہے۔ اس کو بتلانا میری کسی مصلحت کے خلاف تو نہ ہوجائے گا اور مسلمان کے دل پر بار ڈالنا معصیت ہے۔ یہ تو بالفعل اخروی ضرر ہوا اور فی الحال یہ ہوگا کہ جب کسی کا دل کسی سے مکدر ہوجاتا ہے تو بات بات سے تکدر بڑھتا ہے۔ آخر کار ایک دن دونوں میں خاصی عداوت ہوجاتی ہے جس سے صدہا معاصی پیدا ہوجاتے ہیں۔ یہ اس سوال عبث کا انجام ہے۔ اس طرح ہر کام میں غور کر لیجئے تو فعل عبث سے انتہاء کوئی معصیت ضرور ملی ہوئی ہے۔

اس کے علاوہ عبث کے لیے ایک ضرر تو لازم ہی ہے۔ وہ یہ کہ کثرت عبث سے قلب کا نور بجھ جاتا ہے جس سے قساوت پیدا ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے:

كثرة الضحک تميت القلب[1]۔ ''زیادہ ہنسا دل کو مار دیتا ہے۔''

اور حدیث میں ہے:

ابعد الناس عند الله القلب القاسی[2]

''لوگوں میں حق تعالیٰ سے زیادہ دور قلب قاسی ہے''

اور گو حدیث میں صرف کثرت ضحک کا یہ اثر بیان ہوا ہے کہ اس سے دل مرجاتا ہے لیکن تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ ہر فعل عبث میں یہی خاصیت ہے اور جبھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری حدیث میں لایعنی کو مطلقاً قابل ترک فرمایا ہے۔ ''من حسن اسلام المرء ترکه مالم یعنیه'' غرض فعل عبث کو اگر کثرت سے کیا جائے تو نور قلب زائل ہوجائے گا اور یہ لفظ اگر محض تحقیق علمی کے طور پر ہے ورنہ عبث کے لیے عادۃً کثرت لازم ہے اور نور قلب بڑی قیمتی چیز ہے اس کو ضائع نہ کرنا چاہیے کیونکہ نور قلب ہی طاعت کا ذریعہ ہے۔ اس سے قلب میں طاعت کا داعیہ اور ایک تقاضا پیدا ہوتا ہے اور اس داعیہ کی سخت

---

[1] اتحاف السادة المتقين ۵:۱۴۷ [2] اتحاف السادة المتقين ۶:۱۴۷

ضرورت ہے، محض ارادہ سے کام نہیں چل سکتا۔ اگر ارادہ صدورِ فعل کے لیے کافی ہوا کرتا تو ارادہ تو کبھی بے نمازی کے دل میں بھی پیدا ہو جاتا ہے، جس میں کبھی کامیابی ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی جو نیا نمازی ہے ذرا اس سے پوچھو کہ وہ کس مصیبت میں نماز پڑھتا ہے۔ آپ کو جو نماز میں گرانی نہیں ہوتی اور بے تکلف پانچ وقت کی نماز ادا کر لیتے ہیں یہ اسی داعیہ کی برکت ہے۔

دیوبند میں ایک معقولی طالب علم آئے تھے جو نماز کے پابند نہ تھے مگر دیوبند کے مدرسہ میں آکر نماز پڑھنا پڑی کیونکہ طلبہ ہر نماز کے وقت ان سے کہتے کہ چلو نماز کا وقت ہے تو ان حضرت پر پانچ وقت کی نماز اس قدر گراں ہوئی کہ یوں کہنے لگے کہ حدیث میں تو آتا ہے کہ اول اول پچاس وقت کی نماز فرض ہوئی تھی پھر تخفیف کر کے پانچ وقت کی کر دی گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ دیوبند کے مدرسہ میں وہی پچاس وقت کی باقی ہے کہ جہاں ایک نماز پڑھ کر آئے تھوڑی دیر میں پھر تقاضا ہے کہ چلو نماز کو۔ دوسری پڑھ کر آئے تو پھر تقاضا ہے کہ چلو نماز کو، یہاں تو رات دن نماز ہی نماز ہے۔

تو اس اللہ کے بندے کو پانچ وقت کی نماز پچاس وقت کی معلوم ہوتی تھی کیونکہ ابھی اس کے قلب میں داعیہ پیدا نہ ہوا تھا اور جس کے دل میں داعیہ پیدا ہو چکا ہو اس کو پھولوں سے ہلکی ہے بلکہ بدون نماز کے اس کو چین ہی نہیں ملتا جو لوگ پکے نمازی ہیں ذرا وہ اپنے دل کی حالت دیکھ لیں کہ نماز کا وقت آنے کے بعد دل میں کیسی کھر چن لگتی ہے کہ جب تک نماز سے فراغت نہ پالیں کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ اسی کا نام داعیہ ہے، انسان یہ سمجھتا ہے کہ میں ارادہ سے کام کرتا ہوں یہ بالکل غلط ہے، ارادہ کیا چیز ہے جو طاعات کے لیے دواما کافی ہو سکے بلکہ یہ وہ داعیہ ہے جو تم کو نچائے نچائے پھرتا ہے۔ حضرت عراقی اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

صنمارہ قلندر سزدار بمن نمائی   کہ دراز و دور دیدم رہ ورسم پارسائی

(مجھ کو تو طریق عشق میں چلائے نیز زہد خشک تو بہت دور دراز کا راستہ ہے)

رسم پارسائی سے مراد زہد خشک ہے، جس میں محض ارادہ ہمت سے کام ہوتا ہے اور رہ قلندر سے مراد طریق عشق ہے جس میں داعیہ سے کام ہوتا ہے تو فرماتے ہیں کہ مجھے تو طریق عشق عطا فرمایا جائے کیونکہ زہد تو بہت دشوار ہے، طویل ہے کہ ہر دن اور ہر وقت

ارادہ اور ہمت سے کام لینا پڑتا ہے۔ بخلاف طریق عشق کے کہ اس میں تقاضا اور داعیہ سے خود بخود سب کام ہوتے رہتے ہیں۔ بس عبث سے یہی داعیہ و نور قلب بجھ جاتا ہے اور جب نور قلب بجھ گیا تو اب طاعات میں گرانی ہوگی، اگر جلدی تدارک نہ کیا گیا تو یہ گرانی بڑھے گی، سستی پیدا ہوگی۔ حتیٰ کہ طاعات قضا ہونے لگیں گی۔ پھر بھی فکر نہ ہوا تو تعطل تک نوبت پہنچے گی۔ اب اس حدیث کا راز منکشف ہوگا کہ قلب قاسی سب سے زیادہ حق تعالیٰ سے دور ہے۔ حقیقت میں قسوت قلب جو نورانیت قلب کا مقابل ہے بہت بڑا سدراہ ہے۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبث کو قابل ترک فرمایا ہے ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو رحمتہ للعالمین ہیں۔ آپ بلاوجہ حظوظ نفس سے منع نہیں فرما سکتے۔ آپ نے تو نفس کی بہت رعایت فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

ان لنفسک علیک حقا وان لجسدک علیک حقا وان لعینک علیک حقا وان لاھلک علیک حقا (مسند الامام احمد ۶: ۲۶۸)

''تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے۔ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے۔ تمہاری آنکھوں کا تم پر حق ہے۔ تمہارے اہل و عیال کا تم پر حق ہے۔''

اگر عبث میں کوئی ایسا ضرر نہ ہوتا جو ضرر عظیم کی طرف مفضی ہونے والا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے ہرگز منع نہ فرماتے۔ اس تحقیق سے ثابت ہوا کہ عبث بھی مضر آخرت ہی ہوا۔ باقی جو مباح عبث نہ ہو بلکہ نافع دنیا ہو وہ بھی ظاہراً تیسری قسم ہے ورنہ حقیقت میں بواسطہ یہ بھی نافع آخرت ہے بشرطیکہ امور آخرت میں اس سے کام لیا جائے۔

مثلاً حلوا کھانا فی نفسہ مباح ہے اور بظاہر یہ نافع آخرت نہیں مگر بواسطہ یہ بھی نافع آخرت ہے کیونکہ اس سے طبیعت کو فرحت و قوت ہوتی ہے۔ اس فرحت و قوت سے دین کا کام لو اور اگر کوئی شخص حلوہ اسی نیت سے کھائے کہ اس کو کھا کر ہم خدا کی یاد زیادہ کریں گے یا اس سے ہم کو مشاہدہ صفت منعم ہوگا تو اس کے حق میں حلوا کھانا صرف مباح ہی نہ ہوگا بلکہ مستحب ہو جائے گا اور تمام مباحات کا یہی حال ہے کہ اگر ان میں آخرت کی نیت کر لی جائے تو وہ مستحبات میں بلاواسطہ داخل ہو جاتے ہیں ورنہ بواسطہ افضاء الی العمل النافع تو نافع آخرت ہو ہی جاوے گا۔

اسی طرح جو قسم مضر دنیا ہو وہ بھی بواسطہ مضر آخرت ہو جاتی ہے۔ گو ظاہر میں مضر آخرت نہیں اسی لیے مباح میں داخل ہے کیونکہ تجربہ ہے کہ دنیا کو نقصان پہنچنے سے قلب مشوش ہوتا ہے اور تشویش قلب سے دین کے کام بھی برباد ہوتے ہیں۔ طاعات کا بڑا مدار جمعیت قلب پر ہے اور یہ بہت بڑی نعمت ہے جس کی آج لوگوں کو قدر نہیں۔

پس ثابت ہو گیا کہ حقیقت میں اعمال کی دو ہی قسمیں ہیں۔ نافع آخرت اور مضر آخرت۔ ان دونوں سے خالی کوئی فعل نہیں اور جس کو لا نافع ولا ضار سمجھا گیا تھا غور کرنے کے بعد وہ بھی انہی دو میں سے کسی ایک میں ضرور داخل ہے۔ پس اب مراقبۂ آخرت کی تدبیر یہ ہوئی کہ جو کام کرو پہلے یہ سوچ لو کہ یہ کام فی الحال یا فی المآل مفید آخرت ہے یا مضر آخرت۔ اگر مضر آخرت ہے تو اس کے پاس نہ پھٹکو۔ اگر حرام ہے تب تو بچنا لازمی ہے ہی اور اگر عبث ہے تب بھی ہمت کر کے اس کو ترک کر دو اور اگر مفید آخرت ہے تو وہ نجات کی تدبیر ہے اس کو ضرور کرو۔ پھر یہ سوچو کہ جیسا گانا بجانا ویسا ہی دنیا۔ جیسا تم کام کرو گے ویسا ہی اجر ملے گا۔ جتنا گڑ ڈالو گے اتنا ہی میٹھا ہو گا۔ اس لیے جہاں تک ہو سکے طاعات کو اچھی طرح بجا لاؤ۔

پھر یہ بھی تو سوچو کہ تم عمل کرتے ہو نجات کامل کے لیے تو عمل بھی کامل ہونا چاہیے کیونکہ عمل کامل پر نجات کامل مرتب ہو گی اور عمل ناقص پر نجات ناقص اور یقیناً نجات ناقصہ کو کوئی مسلمان اپنے لیے پسند نہ کرے گا بلکہ ہر شخص اس بات کا طالب ہے کہ بدون عذاب کے نجات ہو جائے تو اس کے واسطے عمل بھی کامل ہونا چاہیے۔

دیکھو اگر تم سفر میں جاتے ہو تو کھانا اور چھتری اور بیگ ایسا ساتھ لیتے ہو جو عمدہ اور کارآمد ہو۔ اگر اتفاق سے خادم نے پھٹا ہوا بیگ ساتھ کر دیا تو تم اس کو واپس کرتے اور کارآمد بیگ ساتھ لیتے ہو۔ اسی طرح چاقو، استرا، پنسل، قلم سب سامان سفر میں اچھا ہی ساتھ لیا جاتا ہے۔ نوٹ روپے بھی غیر مشتبہ کھرے کھرے لیے جاتے ہیں تاکہ سفر میں دقت نہ ہو تو دنیا کے چھوٹے چھوٹے سفروں میں جب ہمارے اہتمام کا یہ حال ہے تو سفر آخرت میں جو بڑا لمبا اور دشوار گزار سفر ہے گھٹیا خراب سامان کیوں ساتھ لیا جاتا ہے۔ اس میں تو سب سے زیادہ عمدہ سامان ساتھ لینا چاہیے اور اس کی یہی صورت ہے کہ کارآمد اعمال

ساتھ لیے جائیں اور ہر عمل کو خوبی سے ادا کیا جائے۔ یہ کیا ستم ہے کہ دنیا کے سفر کے لیے تو سارا سامان کامل لیا جاتا ہے اور سفر آخرت کے لیے سب سامان ناقص ہے۔ پس تم یہ سمجھ کر نماز پڑھا کرو کہ یہ ہماری جائیداد ہے جو آخرت میں کام دے گی اور یہ ہمارا سکہ ہے جس سے جنت خریدیں گے۔ یہ سمجھ کر اس کو اچھی طرح ادا کرو کہ کہیں سے کھوٹا یا گھسا ہوا نہ رہے مبادا منہ پر مار دیا جائے اور تم وہاں کھڑے منہ تکتے رہ جاؤ۔ خصوصاً غرباء کو اس کا بہت زیادہ اہتمام کرنا چاہیے کیونکہ ان کے پاس دنیا میں نہ جائیداد ہے نہ روپیہ، تو کیا آخرت کی جائیداد بھی ان کے پاس نہ ہو اور جنت کا سکہ بھی ان کی جیب میں نہ ہو۔ اگر یہ اس سے بھی محروم رہے تو بڑی حسرت کی جگہ ہے کہ دنیا و آخرت دونوں سے محروم رہے۔ خصوصاً علماء اور طلبہ کو اس کا زیادہ اہتمام کرنا چاہیے کیونکہ یہ اہل دنیا کے مقابلہ میں طالب دین کہلاتے ہیں تو ان کو چاہیے کہ دنیا میں اگر امراء کو نیچا نہیں دکھا سکے تو آخرت میں تو ان کو نیچا دکھا دیں۔ امام غزالیؒ نے اس مضمون کو اشعار میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

اری الملوک بادنی الدین قد قنعوا وما اراھم رضوا فی العیش بالدرن؟

میں بادشاہوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ دین کے ادنیٰ درجے پر قناعت کیے ہوئے ہیں مگر عیش و آرام میں ادنیٰ درجہ پر راضی ہوتے ہوئے میں ان کو نہیں دیکھتا۔

اب آگے غرباء کو خطاب فرماتے ہیں:

فاستغن بالدین عن دنیا الملوک کما استغنیٰ الملوک بدنیا ھم عن الدین

کہ تم دین کامل کر کے بادشاہوں کی دنیا سے ویسے ہی مستغنی ہو جاؤ جیسے وہ دنیا کو کامل کر کے دین سے مستغنی ہو گئے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام غزالیؒ کے زمانہ میں یہ حالت صرف ملوک و سلاطین کی تھی کہ وہ دین کے ادنیٰ درجہ پر قانع تھے، غرباء کی یہ حالت نہ تھی مگر آج کل غرباء کی بھی یہی حالت ہے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ بھائی تم نے دین کو کیوں ناقص کیا۔ امراء کو تو اپنے مال و دولت اور عیش و آرام پر گھمنڈ ہے۔ گو ان کو بھی دین کے ناقص کرنے کا حق نہیں کیونکہ وہ امارت ہے ہی کتنے دن کی، آج مر گئے کل دوسرا دن۔ سب امارت ختم ہو جائے گی اور

آخرت میں ان سے کہا جائے گا۔

لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی کَمَا خَلَقْنَا کُمْ اَوَّلَ مَرَّۃٍ وَّتَرَکْتُمْ مَاخَوَّلْنٰکُمْ وَرَاءَ ظُھُوْرِکُمْ.

''کیا آج تم ہمارے پاس ویسے ہی تنہا (خالی ہاتھ) آگئے جیسا کہ تم کو اول ہم نے پیدا کیا تھا اور جتنی نعمتیں تم کو دی گئی تھیں سب کو پس پشت چھوڑ آئے۔''

تو غفلت عن الاخرت کا امراء کو بھی حق نہیں مگر خیر ان کو تو مال و دولت کی وجہ سے غفلت ہے لیکن غرباء کو کیا ہو گیا کہ یہ امراء سے بھی زیادہ مستائے ہوئے ہیں اور غرباء تو ہمیشہ بہانہ ہی کرتے رہتے ہیں کہ صاحب ہم کمائیں یا نماز پڑھیں۔ بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ نماز ہے کتنی دیر کی اور اس سے کمانے میں کیونکر خلل پڑسکتا ہے۔ دوسرے شریعت نے گو نقص اعمال کی اجازت نہیں دی مگر اختصار فی الاعمال کی اجازت دی ہے۔

اختصار اور ہے اور نقص دوسری چیز ہے۔ نقص یہ ہے کہ ارکان کو خراب کر کے ادا کیا جائے، خشوع کو فوت کیا جائے اور اختصار یہ ہے کہ ارکان میں زیادہ دیر نہ لگائی جائے، لمبی سورتوں کی جگہ چھوٹی سورتیں پڑھ لو، سات دفعہ **سبحان ربی العظیم** کی جگہ تین دفعہ کہہ لو اور نوافل کو ترک کر کے محض فرائض و سنن موکدہ پر اکتفا کر لو۔ اس میں غرباء کو کیا عذر ہے اور ہجوم اشغال کی وجہ سے تو اختصار کی اجازت ہے ہی لیکن صوفیاء میں ایک جماعت کا مذاق یہی ہے کہ وہ اعمال ظاہر میں اختصار ہی کو پسند کرتے ہیں یعنی تکثیر نوافل وغیرہ نہیں کرتے۔

تکمیل اعمال کی ضرورت

پہلے مجھے بہت شبہ رہا کہ ان لوگوں کی ترقی کیسے ہوتی ہوگی کیونکہ ترقی تو اعمال سے ہوتی ہے اور اعمال ان کے پاس کم ہیں۔ پھر الحمدللہ سمجھ میں آ گیا کہ ترقی تو اعمال سے ہوتی ہے مگر اعمال دو قسم کے ہیں۔ ایک اعمال قالبیہ یعنی اعمال ظاہرہ۔ دوسرے اعمال قلبیہ تو اس جماعت قلیل الاعمال کے ظاہری اعمال کم ہوتے ہیں مگر اعمال قلبیہ ان کے بہت زیادہ ہیں اور اعمال قلبیہ یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ معاملہ درست رکھا جائے۔ قلب کی نگہداشت رکھی جائے کہ غیر حق کی طرف متوجہ نہ ہونے پائے بلکہ اکثر اوقات قلب کو ذکر میں مشغول رکھا جائے۔ نیز

قلب میں کسی مسلمان کی طرف سے غل وحقد نہ ہوسب کے ساتھ خیر خواہی ہو۔ نیز حقوق وقت پر ادا کیے جائیں کہ کوئی وقت ذکر سے خالی نہ جائے۔ نیز خوشی اور غمی کے حقوق ادا کیے جائیں، نعمت پر شکر ادا ہوتا رہے، حزن وغم میں دل خدا تعالیٰ سے راضی رہے اور اس کے سوا اور بہت اعمال قلبیہ ہیں جن میں یہ جماعت ہر وقت مشغول رہتی ہے۔ اصلاح میں ان کو قلندر کہتے ہیں مگر آج کل کے قلندر نہیں کیونکہ اس زمانہ میں تو قلندر اسے کہتے ہیں جو چار ابرو کا صفایا کرے گو اس کے ساتھ دل کا بھی صفایا ہو گیا ہو۔ نیز بندر نچانے والوں کو بھی قلندر کہتے ہیں۔ خیر اصطلاح کا تو مضائقہ نہیں مگر احکام میں ان اصلاحوں کو دخل دینے کا کیا حق ہے کہ جو احکام صوفیاء نے قلندر کے لیے بیان کیے ہیں آپ کو اپنی اصطلاح کے قلندروں پر جاری کرنے لگیں۔

اگر کوئی باپ کو بیٹا کہنے لگے اور یہی اصطلاح مقرر کر لے تو باپ کے حقوق تو پھر بھی رہیں گے جیسے ایک حافظ صاحب کا نام برخوردار تھا تو کیا اس نام کی وجہ سے ان کے بیٹے کو یہ جائز ہوگا کہ ان کے ساتھ برخوردار ہی کا سا معاملہ کرے ہرگز نہیں۔

اسی طرح صوفیاء کرام کی ایک جماعت کا لقب ملامتی بھی ہے لوگوں نے اس کے معنی بھی بدل دیئے ہیں کہ جو خلاف شرع کام کرے اس کو ملامتی کہتے ہیں۔ حالانکہ فرقہ ملامتیہ صوفیاء کے نزدیک وہ ہیں جو اعمال کے اخفاء کا اہتمام کرتے ہیں اور ان فرق صوفیاء کی اصل احادیث سے ملتی ہے۔

چنانچہ قلندر کی اصل اس حدیث میں ہے کہ ایک صحابی کا گزر ایک مجمع پر ہوا، مجمع میں سے ایک صحابی نے ان کو دیکھ کر کہا "انی لابغض ھذا" میں اس سے نفرت کرتا ہوں۔ کسی نے ان کو خبر کر دی۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر شکایت کی۔

آپؐ نے ان سے پوچھا کہ تم ان سے بغض کیوں رکھتے ہو، کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ضابطہ سے زیادہ نہ ایک نماز پڑھتے ہیں نہ روزہ رکھتے ہیں نہ خیرات کرتے ہیں تو یہ کیسا مسلمان ہے جو ضابطہ سے زیادہ کچھ بھی نہیں کرتا۔ پہلے صحابی نے کہا یا رسول اللہ! ان سے پوچھئے کہ میں جو کام کرتا ہوں کیا اس میں کچھ نقص رہ جاتا ہے یا میں اسے کامل طور پر ادا کرتا ہوں۔ دوسرے صحابی نے کہا کہ نقص تو کچھ نہیں رہتا، رسول اللہ صلی اللہ علی ہو سلم نے

فرمایا پھر تو ان سے بغض نہ کرو ان سے محبت کرو، یہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتے ہیں اوکما قال۔ یہ حدیث مسند احمد میں ہے۔

ملامتی کی اصل ابوطلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قصہ میں ہے کہ مہمان کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھے، کھانا تھوڑا تھا، چراغ گل کر دیا، مہمان سمجھا کہ یہ بھی کھا رہے ہیں مگر انہوں نے سب مہمان کو کھلا دیا۔

غرض اختصار کا مضائقہ نہیں ہاں نقص مضر ہے۔ مثلاً ایک شخص تو چار کپڑے پہنے ہوئے ہے اور ایک صرف کرتا پاجامہ پہنے ہوئے ہے تو اس کا مضائقہ نہیں ہاں یہ شرط ہے کہ کرتا پاجامہ پھٹا ہوا نہ ہو۔ اس کے بعد دونوں کافی ہیں اس کو ناقص نہ کہیں گے۔ اس مثال سے اختصار و نقص کا فرق سمجھ میں آ گیا ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ تکثیر اعمال ضروری نہیں تکمیل اعمال ضروری ہے اور اس وقت جو ہم کو تکمیل اعمال کی فکر نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ ان اعمال کو دخول جنت میں مؤثر نہیں سمجھتے اس لیے ان کو خراب سراب ادا کرتے ہیں۔

صاحبو! اس خیال کو دل سے نکال دیجئے اور اعمال کو دخول جنت و نجات من النار میں مؤثر سمجھئے۔ گو یہ احتمال ہے جیسا کہ روٹی کھاتے ہوئے یہ احتمال ہو کہ شاید ٹکڑا پیٹ میں نہ پہنچے گلے ہی میں اٹک کر رہ جائے اور پھندا لگ جاوے تو کیا اس احتمال سے کبھی کھانا چھوڑ دیا ہے ہرگز نہیں۔ پھر ان ضعیف احتمالات سے اعمال آخرت کیوں ترک کیے جاتے ہیں۔ پھر اعمال نافعہ دنیا میں تو کبھی ضرر کا بھی احتمال ہوتا ہے اور اعمال نافعہ آخرت میں یہ احتمال تو ہرگز نہیں کہ وہ مضر ہوں گے اور یہ اجر نہ ملنے کا احتمال بھی خود آپ کا لایا ہوا ہے۔

اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

(اے صبح کی ہوا یہ بھی تمہاری لائی ہوئی ہے)

ورنہ حق تعالیٰ کی طرف سے تو یہ ارشاد ہے:

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ.

''کہ جولوگ اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں ان کی ایسی مثال ہے جیسے کسی نے ایک دانہ بویا جس سے سات بالیاں پیدا ہوئیں ہر بالی میں سودانے ہیں (تو ایک سے سات سو ہو گئے) اور اللہ تعالیٰ (بعض کے لیے) اس سے بھی زیادہ بڑھاتے ہیں اور وہ بڑے وسعت والے ہیں، ان کے یہاں کچھ کمی نہیں اور بڑے جاننے والے ہیں (ان سے کسی کا عمل مخفی نہیں)۔''

یہ تو بذل مال کا حکم ہے اور بذل نفس تو مال سے بھی زیادہ ہے۔ اس میں یہ فضیلت بدرجہ اولیٰ ہوگی۔

ابوالامراض

غرض حق تعالیٰ کی تو یہ شان ہے کہ وہ آپ کے اعمال کو بڑھانے کا وعدہ فرماتے ہیں اور آپ ایسے بدگمان ہیں کہ معاذ اللہ خدا پر عمل کے گھٹانے کی بدگمانی ہے۔

بگزر ازظن خطا اے بدگماں ان بعض الظن اثم راںخواں
بدگمانی کردن و حرص آوری کفر باشد نزدخوان مہتری

(اے بدگمان بدگمانی کی حد سے بچ اور (بیشک بعض گمان گناہ ہیں) کو پڑھ، بدگمانی کرنا اور حرص کرنا ایسے محسن کے سامنے سخت بے ادبی ہے یعنی مرشد سے بدگمانی محرومی ہے۔)

اے ہے خدا تعالیٰ سے یہ بدگمانی کہ وہ تمہارے اجر کو مٹادیں گے ہرگز نہیں! بلکہ وہ تو اور زیادہ بڑھائیں گے۔ پس ان خیالات کو دل سے نکالو۔ یہی تو وجہ ہے اعمال سے غفلت کی کہ تم ان اعمال کو دخول جنت میں دخیل نہیں سمجھتے لیکن ایسا دخیل بھی نہ سمجھنا کہ ان کو علت تامہ ہی سمجھا لو۔ یہی معنی ہیں اس حدیث کے کہ کوئی شخص اپنے عمل کے سبب جنت میں نہ جاوے گا۔ سب اللہ تعالیٰ کی رحمت سے جاویں گے۔ یعنی عمل دخول جنت کے لیے علت تامہ نہیں لیکن علت تامہ نہ ہونے سے مطلق علیت کی نفی نہیں ہوتی۔ ہمارے اعمال اگرچہ علت تامہ نہیں لیکن علامت ناقصہ دخول جنت ضرور ہیں۔ گو علت تامہ جزو اخیر ہوتا ہے اور وہ رحمت ہے لیکن اجزائے اولیہ کو بھی تو معلول میں کسی قدر دخل ضرور ہوتا ہے اب سمجھو کہ علت تامہ تو نجات کی رحمت ہے مگر عادۃً رحمت ہوتی اس شخص پر ہے جو یہ اعمال شرعیہ بجالائے۔ چنانچہ نص موجود ہے:

اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ.

''بے شک اللہ کی رحمت نیکی کو سنوار کر کرنے والوں کے قریب ہے۔''

پس اب سب اشکالات رفع ہو گئے اور ثابت ہو گیا کہ اعمال صالحہ یقیناً کارآمد ہیں اور ان کو دخول جنت میں بڑا دخل ہے۔ یہ ہے ذرا سا نکتہ جس سے مسلمانوں کو غفلت ہو رہی ہے۔ اسی واسطے ان کے اعمال تباہ و برباد ہیں۔ اب تو لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ کیا خبر ہے اس نماز روزہ کا کیا ہو جاوے کام آئے یا نہ آئے۔ میں پوچھتا ہوں آخر کہاں اڑ جائے گا۔ کیا خدا تعالیٰ کے علم سے نکل جائے گا، ہرگز نہیں، وہ تو فرماتے ہیں:

اِنَّھَا اِنْ تَکُ مِثْقَالَ حَبَّۃٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَکُنْ فِیْ صَخْرَۃٍ اَوْ فِی السَّمٰوٰتِ اَوْفِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِھَااللّٰہُ

''کہ کوئی چیز رائی برابر بھی جہاں کہیں ہوگی خواہ آسمانوں میں یا زمین میں اللہ تعالیٰ اس کو وہیں لے آئیں گے۔''

اگر آپ کا یہ عقیدہ ہو جائے کہ یہ اعمال یقیناً کارآمد ہو جائیں تو پھر ان سے ہرگز غفلت نہ ہوگی اور اسی طرح اعمال معصیت میں اس کا یقین ہو جائے کہ وہ یقیناً مضر ہیں تو ان سے ضرور بچو گے۔ پس اب میں نے غفلت کا راز بھی بتلا دیا کہ آپ کو اعمال کے نافع و مضر ہونے کا استحضار نہیں اور اس کا علاج بھی بتا دیا کہ اعمال کے نافع وضار ہونے کا اعتقاد دل میں جما لو۔

اب معلوم ہوا ہوگا کہ غفلت کتنا سخت مرض ہے جوام الامراض بلکہ ابوالامراض کے لقب کا مستحق ہے۔ اسی کی شکایت فرماتے ہیں حق تعالیٰ اس آیت میں جو میں نے اول تلاوت کی تھی:

یَعْلَمُوْنَ ظَاھِرًا مِّنَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَھُمْ عَنِ الْاٰخِرَۃِ ھُمْ غَافِلُوْنَ.

''یہ لوگ صرف دنیوی زندگی کے ظاہر کو جانتے اور آخرت سے بے خبر ہیں۔''

اور غفلت کا علاج استحضار ہے کیونکہ علاج الشئی بالضد مسئلہ مسلمہ ہے اور استحضار کا ماخذ میں نے حدیث سے بتلا دیا۔ ''اکثر و اذکر ھاذم للذات'' (لذات کو مٹانے والی موت کو کثرت سے یاد رکھو) یعنی آخرت کو یاد کیا کرو اور خاص عمل کے وقت اس کے استحضار کی تدبیر بھی بتلا دی۔ صل صلوٰۃ مودع کہ ہر عمل کو یہ سمجھ کر ادا کرو کہ شاید یہ ہمارا آخری ہی عمل ہو۔ بس اب ہر پہلو سے علاج مکمل ہو گیا۔

خلاصہ یہ کہ اعمال پر جزا وسزا کے مرتب ہونے کا استحضار رکھو۔ اگر ہر وقت نہ ہو سکے تو کم از کم عمل کے وقت ہی یہ بات سوچ لیا کرو کہ یہ عمل مفید آخرت ہے یا مضر۔ پھر یہ بھی سوچ لو کہ شاید اس کے بعد پھر کسی عمل کی نوبت نہ آئے اور یہ عمل آخری ہو۔ اب اگر وہ مفید آخرت ہے تو اس خیال کے بعد اچھی طرح ادا ہوگا اور اگر مضر ہے تو اس خیال کے آنے سے اس کا ارادہ باقی نہ رہے گا اور اگر کسی کو آخرت بعید معلوم ہوتی ہو تو وہ یہ خیال کرے کہ آخرت موت سے شروع ہو جاتی ہے اس سے استبعاد رفع ہو جائے گا۔

میں نے اس وقت ساری باتیں آسان آسان بیان کی ہیں۔ میں آپ کو ایسی بات بتلانا نہیں چاہتا جس میں دشواری یا بکھیڑا ہو۔ اب عمل کرنا آپ کا کام ہے۔ میں اپنا کام ختم کر چکا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ ہم کو توفیق خیر اور فہم سلیم عطا فرما دیں۔

"فرمایا کہ نمازی کے دل میں نور ہے اس کا اثر چہرہ پر ظاہر ہوتا ہے اور بے نمازی کے دل میں ظلمت ہے اس کا اثر چہرہ کی بدرونقی سے ظاہر ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آگ ضرور اندر لگی ہے۔"

(کمالاتِ اشرفیہ)

الخضوع

ترغیب وترہیب کے متعلق یہ وعظ مولوی رضی الحسن کے مکان واقع کاندھلہ ضلع مظفر نگر پر ۲۳ ربیع الثانی ۱۳۳۴ھ کو بوقت صبح بیٹھ کر بیان فرمایا۔ ۱۵۰ رجال ونساء فہیم کا مجمع تھا۔ ۲ گھنٹے بیان میں صرف ہوئے۔ محمد عبداللہ گنگوہی نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمدلله نحمده و نستعينه ونستغفره ونومن به ونتوكل عليه و نعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له ونشهدان لااله الاالله وحده لاشريک له ونشهدان سيدنا ومولانا محمدا عبده ورسوله صلى الله تعالى عليه وعلى اله واصحابه و بارک و سلم.

امابعد فاعوذ بالله من الشيطن الرجيم بسم. الله الرحمن الرحيم.

يَامَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّکِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرَّاكِعِيْنَ. (ال عمران:۴۳)

ترجمہ: ''اے مریم (علیہا السلام) اطاعت کرتی رہو اپنے پروردگار کی اور سجدہ کیا کرو اور رکوع کیا کرو، ان لوگوں کے ساتھ جو رکوع کرنے والے ہیں۔''

مقام حضرت مریم علیہا السلام

اس آیت میں ہر چند کہ خطاب خاص حضرت مریم علیہا السلام کو ہے لیکن مضمون عام ہے، میں نے اس آیت کو دو وجہ سے اختیار کیا ہے۔

اول تو یہ کہ اس وقت زیادہ مقصود عورتوں کو سنانا ہے اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ ان کی ہی جنس سے ایک فرد خاص کو جو حکم ہوا ہے اس کو بیان کیا جاوے۔

دوسرے حضرت مریم علیہا السلام کی تخصیص کرنے میں ایک نکتہ ہے وہ یہ ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کے فضائل سب کو معلوم ہیں کہ یہ بی بی بڑی فضیلت والی ہیں۔ حتیٰ کہ فرشتوں نے ان سے کلام کیا ہے۔ یہ اتنی بڑی فضیلت ہے کہ بعض علماء کے قول پر غیر نبی سے فرشتے نہیں بولتے اسی واسطے بعض علماء ان کی نبوت کے قائل ہوئے ہیں مگر جمہور کے

نزدیک نبوت ثابت نہیں، محققین نے تصریح کی ہے کہ کلام ملائکہ مخصوص نہیں بالانبیاء بلکہ غیر انبیاء سے بھی فرشتے باتیں کر سکتے ہیں۔ فرق اس قدر ہے کہ انبیاء مامور بالتبلیغ ہوتے ہیں اور غیر انبیاء نہیں ہوتے۔ چنانچہ یہاں جو مریم علیہا السلام کو خطاب ہوا ہے وہ تبلیغ نہیں ہے ان کی اصلاح ہے پس محقق یہ ہے کہ نبوت ثابت نہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ کلام ملائکہ ان کی بڑی مقبولیت کی دلیل ہے۔ اس لیے کہ یہ کلام بطور زجر نہیں ہے پس اس سے مستنبط ہوا کہ مریم علیہا السلام اگر نبی نہیں ہیں تو ولی ہونے میں تو کسی قسم کا شبہ و شک ہی نہیں اور دوسری آیت میں ان کی ولایت کی تصریح بھی چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے: ''وامہ صدیقہ اور صدیقیت کمال ولایت'' ہے بہرحال استنباطاً بھی اور تصریحاً بھی حضرت مریم علیہا السلام کا صاحب فضائل ہونا معلوم ہوا۔

پس میں نے اس لیے اس آیت کو اختیار کیا ہے کہ یہ معلوم ہو جاوے کہ باوجود اس کے مریم علیہا السلام اتنی بڑی مقبولہ ہیں لیکن احکام سے وہ بھی مستثنیٰ نہیں تو اور کسی کا تو کیا منہ ہے کہ اپنے آپ کو آزاد سمجھے جیسے کہ بعض عوام کا گمان ہے کہ اصلاح کی ضرورت اس شخص کو ہے جو گناہ میں مبتلا ہے جو مقدس لوگ ہیں ان کو کیا ضرورت ہے۔ اصلاح کی پس یہ غلطی بھی اس آیت سے رفع ہوتی ہے کہ جب مریم جیسی صدیقہ بھی احکام سے اور اپنی اصلاح سے معاف نہیں کی گئی ہیں تو اور کون ہے جو بے فکر ہو جاوے اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کی اصلاح نہیں ہوئی تھی اور وہ سنوری ہوئی نہیں تھیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس قدر سنور چکی تھیں اس کی حفاظت کا حکم ہے اور آئندہ کو ترقی کا امر ہے اس لیے کہ مراتب اصلاح اور درستی کے غیر متناہی ہیں جو مرتبہ حاصل ہو چکا ہے اس سے آگے دوسرا مرتبہ ہے۔

ضرورت صلاح وفلاح

جس طرح دنیوی فضائل کے اندر جو لوگ ترقی کرتے چلے جاتے ہیں اور جس قدر مراتب حاصل کرتے ہیں ان پر بس نہیں کرتے اور وہ اہل ہمت کہلاتے ہیں اسی طرح دینی فضائل اور اصلاح کے مراتب غیر متناہی ہیں۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

اے برادر بے نہایت درگہیست ہر چہ بروے میرسی بروے مائیست

(اے بھائی بے انتہا درگاہ ہے جس درجہ پر پہنچو اس پر مت ٹھہرو، آگے ترقی کرو)
جو مقام اور مرتبہ میسر ہو وہاں ٹھہرو مت بڑھتے چلے جاؤ اور جس طرح ترقی کا حکم ہے اس سے زیادہ ضروری صلاح حاصل شدہ کی حفاظت مامور بہ ہے صلاح کا بالکل حاصل نہ کرنا تو حرمان ہے اور اس کی حفاظت نہ کرنا خسران کا سبب ہو جاتا ہے۔ آج کل لوگوں کو اس کا بالکل اہتمام نہیں ہے اول تو صلاح کی تحصیل ہی کی فکر نہیں اور جو کچھ کسی کو واقع میں یا اس کے زعم میں حاصل ہو بھی جاتا وہ اس کی حفاظت سے بے فکر ہو جاتا ہے۔ یوں سمجھتے ہیں کہ جو کچھ حاصل کیا ہے اب یہ کہاں جاتا ہے حالانکہ یہ سخت غلطی ہے کیونکہ جیسے تحصیل کی ضرورت ہے حاصل شدہ کی حفاظت اس سے زیادہ ضروری ہے۔

دیکھو مال اگر حاصل کیا جاتا ہے تو اس کی حفاظت کی کس قدر ضرورت ہوتی ہے۔ اگر مال جمع کر کے بے فکری ہو جاوے اور حفاظت کا بالکل اہتمام نہ کیا جاوے تو چور لے جاویں گے۔ یہ تو دنیوی فضیلت کی مثال تھی۔ دینی فضیلت کا بھی یہی حال ہے۔

دیکھو اگر قرآن مجید حفظ کیا ہے تو اس کے یاد رکھنے کے لیے کس قدر اہتمام کی ضرورت ہے۔ حفاظ سے پوچھو کہ وہ ایک مرتبہ یاد کر کے بے فکر نہیں ہو جاتے اور جو بے فکر ہو جاتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں اور حفاظ کو جانے دو کسی کو اگر دو چار سورتیں یاد ہو جائیں اگر ہمیشہ ان کو نہ پڑھتا رہے یاد نہیں رہتیں۔

غرض دنیوی دولت ہو یا دینی فضیلت ہو بغیر اس کی حفاظت کے وہ محفوظ نہیں رہتی۔ یہ مقدمہ سب تسلیم کرتے ہیں لیکن بعض فضائل دینیہ کے اندر ہم لوگوں کا طرز عمل اس کے خلاف دیکھتے ہیں۔ وہاں اس مقدمہ پر لوگوں کا عمل نہیں اور وہ بعض فضائل درستی وصلاح نفس ہے چنانچہ ذکر و شغل سے اگر کچھ کسی کو حاصل ہو جاتا ہے تو بالکل بے فکر ہو جاتے ہیں مشائخ تک اس میں مبتلا ہیں، ایک حد تک پہنچ کر سمجھ لیتے ہیں کہ ہم کو کمال حاصل ہو گیا۔ اب ہمارا کام صرف دوسروں کی تربیت ہے اور خود اپنے سے بے فکر ہو جاتے ہیں اور وجہ اس بے فکری اور کم توجہی کی یہ ہوتی ہے کہ یہ سمجھ جاتے ہیں کہ ہم کو جو کچھ حاصل کرنا تھا کر چکے۔

اہل کمال کے علوم

ایک وجہ اور ہوتی ہے وہ یہ کہ اہل کمال کے علوم ہمیشہ بڑھتے چلے جاتے ہیں اور وہ

علوم نہایت عجیب وغریب ہوتے ہیں اور یہ علوم پچھلے مراقبات اور ریاضات کے ثمرات اور برکات ہوتے ہیں جیسے حمام میں پانی گرم کیا جاتا ہے تو اس میں گو آگ نہ رہے لیکن پانی برابر گرم رہتا ہے سو وہ اثر اسی کا ہے کہ محنت کر کے پہلے اس میں آگ جلا چکے ہیں۔ اسی طرح یہ علوم پچھلی محنت کا اثر ہوتا ہے پھر اس مدت کے اندر الہامات وواردات بھی ہوتے ہیں۔ بس وہ اس پر مغرور ہو جاتے ہیں اور ان علوم اور الہامات کو کمال مقصود سمجھ کر اگلے کمالات کے حاصل کرنے اور سابق حاصل ہوئے کی حفاظت سے بے فکر ہو جاتے ہیں۔

یاد رکھو کہ علوم کی مثال ہتھیاروں جیسی ہے اگر ان سے کام نہ لیا جائے یعنی عمل نہ کیا جائے تو بیکار ہیں اسی طرح اس علم پر ناز کرنا لا حاصل ہے اگر کسی نے نماز کے اندر حضور قلب کے طریقے یاد کر لئے اور دوسروں کو بتا کر وہ خوش ہوتا ہے اور خود اس کی نماز خطرات اور وساوس کا مجموعہ ہے تو اس علم سے کیا نفع ہے جیسے کوئی حلوا پکانے کی ترکیب یاد کر لے اور دوسروں کو بتا کر خوش ہو یا اس پر خوش ہے کہ ہم چاہیں حلوا پکا سکتے ہیں اور خود کبھی پکا کر نہیں کھاتا تو اس کو کیا حاصل ہے۔

یاد رکھو علم اور شے ہے اور قدرت اور شے اور دوسروں کو تعلیم دینا دوسری شے ہے اور اس پر عمل کرنا اور چیز ہے دوسروں کو طریقہ بتا کر اس کو کافی سمجھنا ایسا ہے جیسے دوسروں کو کھلا کر اپنے پیٹ بھرنے کی امید کرنا۔

پس یہ علوم کمال نہیں ہیں گو بعض علوم کمال بھی ہیں لیکن یہاں گفتگو ان علوم میں ہے جو اشغال کے ثمرات وبرکات ہیں۔ سو یہ علوم کمالات مقصودہ میں سے نہیں گو محمود ہیں اور پھر اگر کمال بھی ہوں تو وہ اسی وقت تک باقی رہیں گے جب تک کہ ان کے اشغال کا اثر ہے اگر چندے ان اشغال سے غفلت رہی تو وہ بھی رخصت ہو جاویں گے۔ چنانچہ بہت لوگ ایسے دیکھے گئے ہیں جو دولت مند ہونے کے بعد بالکل مفلس اور کورے رہ گئے اس لیے کہ انہوں نے شغل چھوڑ دیا اور مشائخ نے فرمایا "من لاورد له لاوارد له" غرض ترقی نہ ہونا تو حرمان ہے اور جو حاصل ہو چکا ہے اس کا ضائع ہونا خسران ہے اور اس میں خواص تک مبتلا ہیں عوام کی تو کیا شکایت ہے۔

عوام وخواص کی غلطی

ان کی کیفیت تو یہ ہے کہ بعض تو ان میں وہ ہیں جن کو دین سے کچھ مناسبت ہی نہیں

اس کا کسی درجہ میں اہتمام ہی نہیں اور جن کو دین سے کچھ مناسبت ہے مثلاً کچھ قرآن پڑھنے کی ان کو توفیق ہوگئی یا تہجد کی پابندی نصیب ہوگئی بس وہ سمجھ گئے کہ ہم تو بزرگ اور مقدس ہو گئے خصوصاً عورتیں کہ ان کو بہت جلدی اپنے تقدس کا گمان ہو جاتا ہے۔ اگر قرآن پڑھ لیا تو سمجھ گئیں کہ بس ہمارے برابر کوئی نہیں۔ اب تلاوت بھی چھوڑ دی اور جو کسی نے نصیحت کی تو کہہ دیا کہ ہم نے بہت لڑکیوں اور لڑکوں کو قرآن پڑھایا ہے ہمارے لیے وہی کافی ہے اور اگر ترجمہ بھی پڑھ لیا پھر تو کچھ کسر ہی نہیں رہی پوری مولون (مولوی کا مؤنث) ہی ہو گئیں۔

یاد رکھو قرآن مجید کا صرف ترجمہ پڑھنے سے قرآن مجید سمجھ میں نہیں آتا پوری طرح سمجھ میں جب آتا ہے کہ اول عربی پڑھو اس کے بعد کسی عالم سے سبقاً سبقاً پڑھو۔ اگر ترجمہ پڑھنے سے پڑھانے کا شوق ہو تو کسی عالم سے پڑھو۔ اگر کوئی عالم ایسا میسر نہ ہو تو نفس ترجمہ پڑھ لیا کرو اور پڑھا دیا کرو اور جہاں بالکل کھلا ہوا مطلب ہے اس کو سمجھا دو باقی اپنی طرف سے ایک حرف نہ بتلاؤ۔ ترجمہ سے مطلب متعین کرنا سخت غلطی ہے بس جیسے قرآن مجید کے الفاظ پڑھتے ہو اسی طرح ترجمہ کے بھی الفاظ پڑھ لیا کرو کہ اس میں بھی نفع ہے۔ باقی مطلب اپنی طرف سے کچھ نہ بناؤ نہ سمجھو۔ ہاں جہاں بالکل کھلی ہوئی بات ہے جیسے وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ایسے موقع پر بیان کر دینا کچھ حرج نہیں اور جہاں ذرا بھی شبہ ہو یہ سمجھو کہ ہم نہیں سمجھے اپنے من سمجھوتی نہ سمجھو۔ ہاں اگر کسی عالم کی زبان سے اس کی تقریر سن لو اور خوب سمجھ لو کہ بالکل شبہ نہ رہے اس کے بعد بیان کرو۔ یہ قرآن کے ترجمہ کے آداب ہیں جو قابل لحاظ ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو عورتیں قرآن پڑھی ہوئی ہیں وہ اپنے کو بیوی جی سمجھتی ہیں اور ان پڑھ عورتوں کو خاطر میں نہیں لاتیں اور جس نے قرآن کا ترجمہ بھی پڑھ لیا وہ اپنے کو عالم اور مولون سمجھتی ہیں۔ یاد رکھو اے عورتو! کہ کسی کمال کا حاصل ہو جانا کافی نہیں۔ تاوقتیکہ اندر سے خود پسندی نہ نکلے اور اس بلا میں بہت سے مرد بھی مبتلا ہیں، عورتوں کی تو کیا شکایت ہے اور بعضی اس سے بھی ترقی کرتی ہیں کہ وہ اپنے کو بزرگ سمجھنے لگتی ہیں اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اپنے کمالات کو کافی سمجھ کر آگے ترقی نہیں کرتیں اور اپنے کو بزرگ سمجھنے والا اپنے عیوب کو نہیں دیکھتا اس کو ہمیشہ اوروں ہی کے عیوب نظر آتے ہیں، عورتیں چونکہ ناقص العقل ہیں اس لیے

ان کو اس بلا میں زیادہ ابتلا ہوتا ہے۔ اگر ان کو قرآن مجید حفظ ہے تو غیر حافظ کو حقیر سمجھتی ہیں اور اگر حزب اعظم بھی پڑھتی ہیں تو بہت ہی بزرگ ہوگئیں اور اگر کچھ اللہ اللہ بھی کرلیا تو پھر تو ان کا کوئی مثل ہی نہیں اور اگر کسی کو اللہ اللہ بتلاتی بھی ہیں تو گویا نبوت مل گئی اس کے بعد ان میں ایک ناز پیدا ہوتا ہے کہ ہم اللہ کے مقبول ہیں بس اب کیا رہا غیبت ان کو حلال ہوگئی عیب جوئی ان کا شغل ہوگیا۔ مردہ مسلمانوں کا گوشت ان کو جائز ہوگیا ان کی وہ مثال ہوجاتی ہے جیسے یہود نے کہا تھا "نَحنُ اَبنَآءُ اللّٰهِ وَاَحِبَّاءُ هٗ" کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔

جیسے بیٹے کی برائی بری نہیں معلوم ہوتی اسی طرح ہم کو کچھ مضر نہیں۔ کبھی اپنے نفس کے اندر برائی کا اعتقاد نہیں ہوتا۔ اگر کوئی دوسرا شخص کوئی حرکت کرے جیسے اس کو لتاڑتے ہیں اسی طرح اپنے نفس کے ساتھ پیش نہیں آتے۔ دیکھئے ہم لوگ رات دن دوسروں کو وعظ کرتے ہیں لیکن کبھی اس کی توفیق نہیں ہوتی کہ ایک ماہ میں ایک ہی بار گھنٹہ بھر کے لیے اپنے نفس سے محاسبہ کرلیا کریں ایسی حالت ہے کہ گویا ہم میں کوئی عیب ہی نہیں اور اگر کوئی دوسرا ہم کو ٹوک دیتا ہے تو نفس کے اندر اس قدر ہیجان ہوگا کہ بعضے تو اس سے لڑنے مرنے کو تیار ہوجاتے ہیں اور اگر تہذیب کی وجہ سے کچھ نہ کہا دل میں تو ضرور ہی ناگوار ہوگا اور یہ کہیں گے کہ بھلا ہم میں کہیں عیب ہوسکتا ہے اور اگر عیب سمجھ میں آ بھی گیا تو اقرار ہرگز نہ کریں گے بلکہ یہ کہیں گے اس کی یہ مجال کہ ہمارے عیب نکالے۔ اس کا یہ منصب کہ ہم پر اعتراض کرے ہم بڑے آدمی ہیں یہ چھوٹا آدمی ہے ہم شریف ہیں یہ رذیل ہے۔

تعلق باللہ کا اثر

کالپی کا قصہ ہے کہ ایک مسجد میں ایک سب انسپکٹر نماز پڑھ رہے تھے، نماز میں تعدیل ارکان نہ کرتے تھے، جلدی جلدی پڑھ رہے تھے، وہاں ایک گندھی بھی باہر کا آیا ہوا تھا۔ جب وہ تھانیدار صاحب نماز پڑھ چکے تو اس گندھی نے کہا کہ داروغہ جی آپ کی نماز نہیں ہوئی، آپ نماز پھر پڑھ لیجئے، داروغہ جی نے کہا کہ پاجی مردود تیرا منہ اور تو ہم کو نصیحت کرے بڑا نمازی بن کر آیا ہے۔ اس گندھی نے کہا، خیر پاجی مردود ہی سہی مگر خدا کے واسطے آپ نماز پڑھ لیجئے، اس کو اور زیادہ غصہ آیا اور اس گندھی بچارے کو خوب مارا لیکن اس نے

بھی پیچھا نہیں چھوڑا۔ پٹ کر کہا کہ مجھے اپنے پٹنے کا غم نہیں مجھے آپ کی نماز کی بہت فکر ہے میرا دل بہت دکھتا ہے کہ آپ کی نماز مقبول نہ ہو، میرا جسم تو اچھا ہو جائے گا مگر آپ کی نماز کا کوئی بدل نہیں۔ اس لیے آپ نماز پڑھ لیں، ان داروغہ جی پر ایسا اثر ہوا کہ ان کو نماز پڑھنا ہی پڑی، اس گندھی کی تمام قصبہ کالپی میں شہرت ہوگئی جس طرف کو جاتا تھا لوگ کہتے تھے یہ ہے وہ شخص جس نے داروغہ کو نماز پڑھوائی تھی، سب اس کی قدر کرتے تھے۔ برکت کے واسطے اپنے یہاں لے جاتے تھے اور اس کا عطر خریدتے تھے تمام کالپی کا پیر بن گیا اور تجارت بھی خوب چمکی۔ خدائے تعالیٰ نے دکھلا دیا کہ جو شخص ہمارے ساتھ تعلق رکھتا ہے خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اس کی عزت ہوتی ہے۔

پس اگر کوئی تم کو نصیحت کرے خواہ وہ درجہ میں تم سے چھوٹا ہی ہو تب بھی ناگوار نہیں ہونا چاہیے اب تو یہ حالت ہے کہ ذرا نماز وظیفہ کوئی پڑھنے لگے اور چار آدمی اس کو شاہ صاحب یا صوفی صاحب کہنے لگے تو ان کو کوئی نصیحت کر کے تو دیکھے آپے سے باہر ہو جاویں گے کہ ہم کامل مکمل ہیں بلکہ مکمبل یعنی کمبل پوش ہیں۔ ہم کو یہ نصیحت کرتا ہے گویا شاہ صاحب اس درجہ میں ہیں کہ حرام بھی ان کے لیے حلال ہے ان کو تاویل کی بھی ضرورت نہیں اور اگر کوئی مولوی صاحب ہیں تو وہ تاویل کر کے اس فعل کو جائز کر لیں گے۔

میں تو خود اپنا قصہ بیان کرتا ہوں کہ لڑکپن میں والد صاحب کے پاس میرٹھ میں رہتا تھا وہاں نوچندی ہوئی میں وہاں گیا جس رئیس کے ہاں والد صاحب رہتے تھے ان کے صاحبزادے ہنسنے لگے اور مجھ سے پوچھا کہ کیوں صاحب نوچندی میں جانا کیسا ہے۔ میں نے کہا کہ میں تماشا دیکھنے نہیں گیا تھا بلکہ اس لیے گیا تھا کہ دیکھوں وہاں کیا کیا منکرات ہیں تاکہ وہاں جانے سے اوروں کو دلائل کے ساتھ منع کر سکوں، غرض تاویل کر لی۔

پس جب ہمارے اندر یہ آفت ہے تو جو ہمارے فیض یافتہ ہیں ان میں کیوں نہ ہوگی، کبھی اپنے جرم کا اقرار نہیں کرتے اور عورتیں زیادہ اس بلا میں مبتلا ہیں کہ الف کا نام بے بھی نہیں جانتیں لیکن اگر کوئی خطا ہو جاوے گی تو ہرگز اپنی غلطی کا اقرار نہ کریں گی اور جب تمام عورتوں کی یہ حالت ہے جو ان میں بزرگ ہیں وہ تو زیادہ اس زیور فضائل کی مستحق ہیں اول

تو ان کو اپنی برائی نظر ہی نہیں آتی اور اگر معلوم بھی ہو تو اس کا اقرار صریحی کیا معنی کنایتاً بھی کبھی زبان سے نہ نکلے گا جب یہ حالت ہو تو پھر اصلاح کی نوبت کہاں آوے گی۔ اس لیے اول ضرورت اس کی ہے کہ اپنی منقصت پر تنبیہ ہو۔

اہل اللہ کا طریق

حضرات اولیاء اللہ کی یہ حالت تھی کہ اپنے نفس سے محاسبہ کرتے تھے اور حدیث میں بھی ارشاد آیا ہے "حاسبوا انفسکم قبل ان تحاسبوا[۱]" (اپنے نفس کا خود محاسبہ کرلو اس سے پہلے کہ تمہارا حساب لیا جائے) دیکھو اگر کوئی پٹواری اپنے کاغذات کو حاکم کے معائنہ سے پہلے درست کرلے تو معائنہ کے وقت اس کو ندامت نہ ہوگی اور معائنہ سے پہلے پہلے ہر وقت اس کو فکر بھی رہے گی کہ دیکھئے کیا پیش آتا ہے۔

ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے سے کہا کہ صاحبزادے دن بھر جو کام کیا کرو شام کو ہم کو اس کا حساب دیا کرو۔ اس کو بڑی دقت ہوئی، اول تو ہر کام کو سوچ بچار کر کرتا پھر اس کو یاد رکھتا پھر ابا جان کے سامنے ہر کام کی وجہ اور اس کی ضرورت اور توجیہ بیان کرتا، کئی روز اسی پریشانی میں گزرے ایک روز اس نے کہا کہ ابا اس سے کیا فائدہ ہے جو کچھ آپ کو نصیحت کرنا ہو ویسے ہی کر دیا کرو انہوں نے فرمایا کہ بیٹا اس میں یہ حکمت ہے کہ تم کو یہ معلوم ہو جاوے کہ جب میں ایک بڈھے باپ کے سامنے حساب نہیں دے سکتا تو حق تعالیٰ جو عالم الغیب والشہادۃ اور قادر مطلق ہے اس کے سامنے کیسے حساب دوں گا۔

تو نمی دانی حساب صبح و شام　　　پس حساب عمر چوں گوئی تمام
زیں عملہائے نہ بر نہج صواب　　　نیست جز شرمندگی روز حساب

(تو صبح اور شام کا حساب نہیں جانتا پس زندگی کا حساب کیسے لگاؤ گے، یہ عمل درست نہیں ہے اس سے روز حساب میں سوائے شرمندگی کے اور کچھ نہ ملے گا)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا گیا کہ اپنی زبان کو نکال کر مار رہے ہیں اور یہ فرما رہے ہیں کہ اس نے مجھ کو ہلاکت کے مواقع میں اتارا ہے اور یہ وہ ابوبکر رضی

[۱] کشف الخفاء للعجلونی ۱: ۸۰۴، بلفظ حاسبوھم

اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جن کی نسبت دنیا ہی میں یہ بشارت ہے **ابوبکر فی الجنہ** ہم کی یہ حالت ہے کہ اگر خواب ہی میں جنت کی بشارت ہو جاوے تو ابھی سب چھوڑ بیٹھیں لیکن ان کو صرف جنت ہی میں جانا مقصود نہ تھا بلکہ اپنے مالک کو راضی کرنا بھی منظور تھا۔

دیکھو! اگر کوئی آقا اپنے غلام کی دعوت کر دے تو وہ غلام اگر وفادار ہے تو اس کو کھانا کھانے سے زیادہ اس کا اہتمام ہوگا کہ آقا خوش ہو اور اگر ذرا بھی اس کو اس کا احتمال ہو کہ آقا مجھ سے ناراض ہے تو وہ سارا کھانا اس کے واسطے زہر ہو جاوے گا۔

اگر کوئی کہے کہ اللہ تعالیٰ جنت میں اسی کو بھیجیں گے کہ جس سے راضی ہوں گے پھر کیا وجہ ہے کہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس قدر فکر تھا۔

جواب یہ ہے کہ بے شک ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ جانتے تھے لیکن بہ سبب خوف الٰہی کے ان کو یہ احتمال ہوتا تھا کہ خدا جانے اس وقت بھی وہ رضا حاصل ہے یا نہیں۔ ابوبکرؓ ایسا دل کہاں سے لاتے کہ اس وقت کی رضا پر کفایت کر کے بے فکر ہو جاتے۔ ہمارا دل تو پتھر ہو گیا ہم کو تو فکر نہیں، اب جو اس حدیث پر شبہ تھا وہ رفع ہو گیا۔

دیکھو! اگر کسی کو کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو اگر محبوب کی ذرا بھی ناک چڑھتی ہے تو محبّ کی جان نکل جاتی ہے اور اس کی پوری سعی یہ ہوتی ہے کہ محبوب مجھ سے ایک منٹ کو بھی ناراض نہ ہو، جب محبوب مجازی کے محبین کی یہ کیفیت ہے تو محبوب حقیقی کی محبین کی تو جو حالت ہو کم ہے لیکن ہم کو تو محبوب حقیقی کے بدون قرار آ گیا ہے اس لیے کہ یہ امر ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ ہماری وہ حالت ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں:

اے کہ صبرت نیس از فرزند وزن — صبر چوں داری زرب ذوالمنن
اے کہ صبرت نیست از دنیائے دوں — صبر چوں داری زنعم الماھدون

(اے اللہ کے بندے جب تو اہل وعیال سے صبر نہیں کر سکتا تو اللہ رب العزت سے کس طرح صبر کر سکتا ہے اور جب تو کمینی دنیا سے صبر نہیں کر سکتا تو اللہ تعالیٰ سے کیونکر صبر کر سکتا ہے)

غرض بزرگوں نے اپنے نفس کا اس طرح علاج کیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کسی نے بزمانہ خلافت دیکھا کہ کمر پر مشک لدی ہوئی

ہے اور لوگوں کے یہاں پانی بھرتے پھر رہے ہیں کسی نے پوچھا کہ حضرت آپ یہ کیا کرر ہے ہیں، فرمایا کہ کسی بادشاہ کا سفیر آیا تھا اس نے کہا کہ آپ کے عدل کی بہت شہرت ہو رہی ہے میرا نفس سن کر خوش ہوا میں اس کو ذلیل کر کے اس کی اصلاح کر رہا ہوں۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کرتا پہنا پھر فوراً مقراض منگا کر آستین اس کی کاٹ دی کسی نے پوچھا کہ حضرت یہ کیا کیا، فرمایا کہ کرتہ پہن کر میں اپنی نظر میں اچھا معلوم ہوا، میں نے اس کو بدشکل کر دیا کہ برا لگنے لگوں.......... بزرگوں نے اس طرح مجاہدے کیے ہیں اور نفس کو دبایا ہے کہ مولانا فرماتے ہیں:

زاں بلا ہا کانبیا برداشتند　　　سر بہ چرخ ہفتمیں افراشتند

(ان بلاؤں کی وجہ سے جو انبیاء علیہم السلام نے برداشت کیں ان کے درجات و مراتب تمام مخلوق سے بلند ہو گئے)

یعنی ان بلیات اور مصائب کو جو انبیاء اور اسی طرح اولیاء اللہ نے جھیلا ہے اس سبب سے اللہ تعالیٰ نے ان کا مرتبہ بڑھایا۔

ہماری حالت

ہمارا شب و روز یہ شغل ہے کہ ہم اپنے کو عمل کی وجہ سے یا علم کی وجہ سے یا مال کی وجہ سے اچھا سمجھتے ہیں اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ زبان سے بھی اپنے کو اچھا کہتے ہیں، بے حد تکبر ہے اپنے کو اتنا بڑا سمجھتے ہیں کہ اس کا بھی تو خیال نہیں کہ سننے والے سن کر کیا کہیں گے، گویا سامع کو یہ حق ہی نہیں کہ اس میں کچھ وسوسہ کرے، اس لیے کہ اپنی بڑائی میں ان کو کچھ شک ہوتا تو اس کا ضرور احتمال ہوتا کہ اپنے دل میں یہ کیا کہے گا۔ پھر زبان سے کہنے والے دو قسم کے ہیں بعضے تو صاف صاف واقعات اپنی بڑائی کے بیان کرتے ہیں اور بعضے کنایۃً اور اشارۃً اپنے کمالات ظاہر فرماتے ہیں۔

ایک بزرگ کسی کے یہاں مہمان ہوئے، ان میزبان بزرگ نے اپنے خادم سے کہا کہ پانی اس صراحی میں رکھو جو ہم دوسرے حج میں لائے تھے۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ آپ نے ایک لفظ سے دونوں حج غارت کر دیئے، اگر مجھے یہ معلوم بھی ہو گیا کہ آپ نے دو حج کیے ہیں تو آپ کو کیا نفع ہوا۔

یہ حکایت میں نے بطور مثال بیان کی ہے یہ غرض نہیں کہ اظہار اس میں منحصر ہے اس قسم کی سینکڑوں ترکیبیں ہیں کہ ہم رات دن ان کو اپنے کمالات کے ظاہر کرنے کے لیے کام میں لاتے ہیں۔

مثلاً رات کو ہم تہجد کے لیے اٹھے اول تو زور زور سے جوتوں سے کھڑ کا کیا تا کہ سب کو خبر ہو جاوے کہ مولوی صاحب تہجد کے لیے اٹھے ہیں۔ اگر اس سے بھی کام نہ چلا تو پانی زور زور سے گرایا۔ اگر اس سے بھی مقصود حاصل نہ ہوا تو پکار پکار کر قرآن پڑھا اگر اس سے بھی کامیابی نہ ہوئی تو صبح کو جب معتقدین کا مجمع ہوا تو اب فکر ہے کہ کسی طرح اپنے رات کے عمل کو ظاہر کریں، سوچتے سوچتے ایک بات تراشی کہنے لگے کہ رات کچھ شور سا ہو رہا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ کہیں چور تھے، اس وقت تقریباً دو بجے ہوں گے اب سب نے جان لیا کہ حضرت رات تہجد کے لیے اٹھے تھے اور جو زیادہ معتقد تھے ان کا گمان تو یہ ہوا کہ حضرت رات بھر جاگتے ہیں کسی وقت سوتے بھی نہیں۔

کسی امیر سے اپنی ملاقات ہونے کا اور اپنے استغناء کا قصہ بیان کریں گے۔ یہ شائبہ کبر کا ہے یہ ترکیبیں وہ ہیں جن میں ہم خود مبتلا ہیں لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ ان کی برائی کا احساس ہوتا ہے اور ان کو طاعت نہیں سمجھتے لیکن ابتلا ضرور ہے "وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ"۔

غرض ایسی نظیریں رات دن ہم پر گزرتی ہیں اور اس قسم کی ترکیبوں سے اپنے کمالات ہم لوگ ظاہر کیا کرتے ہیں اور جن کو حس نہیں ہے وہ تو ان ترکیبوں کو کمال سمجھتے ہیں اور اس سے زیادہ یہ کہ اپنے کشف و کرامت کے مدعی بھی ہیں۔ مثلاً کوئی مر گیا تو کہیں گے کہ دیکھا ہمارے ساتھ گستاخی کی تھی اس لیے ہلاک ہو گیا حالانکہ انبیاء کو لوگ ستاتے تھے، بے ادبی کرتے تھے، بعض اوقات تو ان کے ساتھ یہ معاملہ ہوا ہی نہیں یہ ایسے مقبول ہوئے کہ ان کے ساتھ گستاخی کرنے سے ہلاک ہو گیا یہ اشد درجہ کا تکبر ہے خدا کے نزدیک اپنے آپ کو بڑا معزز سمجھتے ہیں خدا کی قسم ہے کہ اللہ والوں کی یہ شان ہے کہ اگر کوئی بلا آئی تو ان کو یہ گمان ہوا کہ یہ بلا ہماری وجہ سے آئی ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں ایک مرتبہ بارش نہ ہوئی، لوگ آئے، ذوالنون سے عرض کیا کہ حضرت دعا فرمائیے بارش نہیں ہوئی، حضرت ذوالنون نے فرمایا کہ بارش

گناہوں کی وجہ سے بند ہوتی ہے اور میں سب سے زیادہ گنہگار ہوں مجھ کو اس شہر سے نکال دو۔

یہ حالت اولیاء کاملین کی تھی کہ کسی آفت کے آنے کو اپنے گناہوں کی وجہ سے جانتے تھے کہاں ہم اور کہاں وہ حضرات اور ذوالنون تو اولیاء اللہ ہی میں سے تھے۔ خود جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو رحمۃ للعالمین ہیں۔ بدر کے واقعہ میں دیکھو کیا فرمایا:

قصہ یہ ہوا تھا کہ غزوہ بدر کے اندر قیدی آئے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مشورہ لیا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو ان کے چھوڑ دینے کا مشورہ دیا اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سب کے قتل کی رائے دی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے پر عمل فرمایا: اس پر عتاب نازل ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم رونے لگے اور فرمایا کہ اگر آج عذاب الٰہی آتا تو صرف عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بچتے۔

اللہ اکبر! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کہ جن کی ذات رحمۃ للعالمین ہے وہ خوف الٰہی سے رودیں اور یہ فرمادیں کہ میری غلطی کی وجہ سے عذاب آ گیا تھا اور ہم کسی شمار وقطار میں نہیں یہ سمجھیں کہ فلاں شخص پر ہماری گستاخی کی وجہ سے آفت آئی ہے کتنا بڑا مہمل قصہ ہے۔

ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

(اس راہ کے فرق کو دیکھو کہ کہاں سے کہاں تک ہے)

تکبر کے اسباب

یہ ساری خرابی ہمارے ظرف کی ہے نظر کی کمی ہے کیونکہ تکبر ہمیشہ جہل کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور بعض چیزوں کا تو خاص خاصہ ہے کہ ان سے تکبر پیدا ہوتا ہے۔ طبابت اور قرأت وتجوید اور علم معقول ان سے اکثر کم ظرف آدمی کو تکبر پیدا ہوتا ہے اور اس کی وجہ علم کی کمی ہے۔ طبیب اپنے کو بڑا جب ہی سمجھے گا جب اس کی حقیقت سے ناواقف ہوگا۔ اسی طرح علم معقول سے اسی کو کبر ہوگا جس کو اس کے مبلغ اصل کی خبر نہ ہو، اسی طرح فن قرأت سے بھی اسی کو ناز ہوگا جو اس کی ماہیت سے آگاہ نہ ہوا اور جو ان فنون کے حقائق تک پہنچ گیا وہ ہرگز ان پر مغرور نہ ہوگا۔

ایک مرتبہ مولانا اسماعیل صاحب نے وعظ فرمایا: ایک شخص نے کہا کہ سبحان اللہ!

آپ کا کیسا علم ہے مولانا نے فرمایا کہ میرا کیا علم ہے، میں تو ایک ادنیٰ سا طالب علم ہوں۔ اس شخص نے کہا کہ یہ تو آپ کی تواضع ہے فرمایا کہ نہیں یہ تو بڑا تکبر ہے اس واسطے کہ اس بات کا کہنے والا اس کا مدعی ہے کہ میں بڑا صاحب بصیرت ہوں، میری نظر اتنی دور تک پہنچی ہوئی ہے کہ اس کے مقابلہ میں یہ میرا علم کوئی چیز نہیں ایک تو یہ لوگ تھے کہ اپنی تواضع کو بھی تکبر جانتے تھے ایک ہم ہیں کہ تکبر کو بھی تکبر نہیں سمجھتے۔

یہ ساری خرابیاں اپنے کو اچھا سمجھنے کی ہیں۔ حق تعالیٰ کا ارشاد **"لاتزکوا انفسکم"** (اپنے آپ کو مقدس نہ سمجھو) اور اس نہی کی وجہ ظاہر ہے چنانچہ جو لوگ اپنے کو نیک اور پاک سمجھتے ہیں وہ ذرا اپنے دل کو ٹٹول کر دیکھیں کہ ہزاروں وسوسے موجود ہیں اور ایسے ایسے خطرات ہیں کہ اگر ہمارے معتقدین کو ان کی اطلاع ہو جاوے تو ابھی لاحول پڑھ کر بھاگ جاویں اور کبھی پاس بھی نہ آویں اور ہم خود بھی سمجھتے ہیں کہ ہمارے اندر ہزاروں بلائیں موجود ہیں کہ غضب، شہوت، کینہ اور ایسے خطرات کہ جن پر گناہ لکھا جاتا ہے۔ یوں کہیے کہ خدا تعالیٰ نے حفاظت فرما رکھی ہے اگر اسباب معاصی کے ہمارے ہاتھ میں ہوں تو ہم گناہ کرنے میں کبھی دریغ نہ کریں ہم کو اپنے باطن کی خوب خبر ہے لیکن اس پر بھی اپنے اس لیے معتقد ہیں کہ دوسرے ہمارے معتقد ہیں۔

ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص کے پاس ایک شریر گھوڑا تھا، اس نے ایک دوست سے کہا کہ اس کو بکوا دو اس نے بازار میں جا کر اس کی جھوٹی تعریفیں شروع کیں کہ یہ گھوڑا اچھا ہے ایسا رہوار ہے، مالک صاحب بھی وہاں موجود تھے آپ اس سے چپکے سے کہتے ہیں کہ جب یہ گھوڑا ایسا ہے تو میں اس کو کیوں بیچوں، اس نے کہا کہ ظالم تیرا پانچ برس کا تجربہ میری تھوڑی دیر کی جھوٹی باتوں سے جاتا رہا۔

تو صاحبو! یہی حال ہمارا ہے کہ ہم برسوں سے اس نفس سرکش کا تجربہ کر رہے ہیں اور اس کی سرکشی کا ہم کو علم ہے مگر وہ سارا علم و تجربہ معتقدین کی ذرا سی بات سے جاتا رہتا ہے اور سمجھتے ہیں کہ کوئی بات تو ہمارے اندر ہے جو یہ لوگ معتقد ہیں۔

بالکل ایسی ہی مثال ہے جیسے ایک بی بی نتھ اتار کر منہ دھو رہی تھی۔ ایک نائن آ گئی اور

بی بی کو اس حالت میں دیکھ کر دوڑی ہوئی نائی کے پاس گئی کہ بیٹھا کیا ہے، فلاں شخص کی بیوی رانڈ ہوگئی ہے اس کے میاں کو خبر دے میاں پردیس میں نوکر تھے وہ فوراً گیا اور جا کر کہا کہ میاں صاحب تمہاری بیوی بیوہ ہوگئی ہے وہ رونے لگے، نوکر چاکر دوست آشنا آئے، پوچھا کہ آپ کیوں روتے ہیں کہا کہ میری بیوی بیوہ ہوگئی ہے، سب ہنسنے لگے کہ آپ تو زندہ صحیح و سالم بیٹھے ہیں پھر بیوی کے رانڈ ہونے کے کیا معنی۔ کہا کہ ہاں یہ تو میں بھی جانتا ہوں لیکن گھر سے بڑا معتبر نائی آیا ہے ہماری بالکل ایسی ہی مثال ہے کہ ہم اپنے نفس کی شرارتوں سے خوب واقف ہیں لیکن چونکہ ہمارے معتقد اور مرید بڑے معتبر ہیں اس لیے ان کے کہنے سے ہم کو ہمارے علم یقینی پر شبہ پڑ گیا۔

طرفہ یہ ہے کہ وہ لوگ خود مرید و معتقد بھی ہمارے ہی مکروں کی وجہ سے ہوئے ہیں، ہماری ریائی نماز اور ریاء کے لیے علمی تحقیقات بیان کرنے سے وہ ہمارے معتقد بنے ہیں۔ پھر ان ہی کے کہنے سے ہم کو یقین آ گیا اور یہ یاد نہ رہا کہ یہ ان کا کہنا بھی تو اسی اعتقاد کا ثمرہ ہے کہ جس کو مکر کرکے ہم نے ان کے دل میں بٹھایا ہے، کس قدر جہالت در جہالت ہے۔

اس پر ایک حکایت یاد آئی۔ اشعب طماع ایک بزرگ تھے۔ طمع ان پر بہت غالب تھی جن پر طمع اور بخل کا غلبہ ہوتا ہے لوگ ان کو خوب بناتے ہیں۔ اسی طرح لوگ ان کے ساتھ بھی ہنسی کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جا رہے تھے لڑکے ان کو چھیڑنے لگے، لڑکوں کے منتشر کرنے کے واسطے کہا کہ میرے ساتھ کیا آ رہے ہو، دیکھو فلاں جگہ مٹھائی تقسیم ہو رہی ہے، لڑکے اس طرف دوڑنے لگے آپ بھی پیچھے پیچھے ہو لئے کہ شاید واقع میں تقسیم ہو رہی ہو حالانکہ ان کو خود ہی اس طرف بھیجا تھا۔

اسی طرح ہم نے اپنے مریدین کے دل میں ہاتھ میں بڑی لمبی تسبیح لے کر اور سر جھکا جھکا کر خود ہی تو اعتقاد پیدا کیا ہے اب وہ اس اعتقاد کی وجہ سے جھوٹی سچی باتیں بنانے لگا تو خود ہی دھوکہ میں آ گئے اور اپنے نفس کی سب شرارت بھول گئے۔ خیال تو فرمائیے کہ کتنا بڑا جہل ہے تو یہ ساری خرابی کس چیز سے ہوئی، اپنے آپ کو اچھا سمجھنے سے اس لیے میں نے وہ آیت لی ہے جو حضرت مریم جیسی ولیہ کے بارے میں آئی ہے کہ وہ اتنی بڑی ولیہ ہیں کہ جن کی ولایت کی خدا نے گواہی

دی ہے جب ان کو بھی خطاب ہے کہ اپنی اصلاح کریں تو بتلاؤ اور کون ہے جو اس سے مستثنیٰ ہو۔

پس معلوم ہوا کہ اہل فضائل بھی اپنی اصلاح کے فکر سے سبکدوش نہیں ہیں اس لیے کہ حضرت مریم علیہا السلام سے زیادہ کون بی بی صاحب فضیلت ہوگی۔ اتنی بڑی فضیلت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مردوں میں سے بہت کامل ہوئے ہیں اور عورتوں میں سے مریم کامل گزری ہیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کامل فرمادیا تو اب وہ ناقص العقل اور ناقص الدین بھی نہیں رہیں اس لیے کہ تصریحاً فرمادیا کہ وہ کامل ہیں اس سے بھی بعضوں کو شبہ ہوا ہے کہ وہ نبیہ ہیں مگر یہ استدلال کافی نہیں۔ بہرحال جس کے کمال کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم گواہی دیں جب ان کو بھی اپنے دین کی حفاظت کی ضرورت ہے تو جو کامل نہیں اور سراپا نقص ہیں ان کو تو بہت ہی کچھ فکر کی ضرورت ہے اور اے عورتوں! اگر تم خود اپنی نگرانی اور حفاظت نہ کرو گی تو اور کون کرے گا کسی کو کیا غرض پڑی ہے کہ وہ ہر وقت تم پر مسلط رہیں تم کو خود اپنی نگرانی کرنا چاہیے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب خاص

یاد رکھو دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ ہیں جو پہلے سے صاحب فضائل ہیں مثلاً قرآن یاد ہے اور احکام شرعیہ سے بھی واقف ہیں، اعمال صالحہ کی بھی توفیق اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے ان کو تو یہ چاہیے کہ اپنے فضائل موجودہ کی حفاظت کریں اور آئندہ فضائل کو بڑھادیں اور اپنے کو کامل نہ سمجھیں، اپنے کو کامل سمجھنا بڑے نقصان کی بات ہے۔ اگر کبھی اپنے کمال کا وسوسہ آوے تو اپنے عیوب بھی ساتھ ساتھ سوچ لیا کریں اور اگر عیب یاد نہ آویں تو یہی خیال کرے کہ اپنے عیب کی خبر نہ ہونا اور اپنے کو کامل سمجھنا یہ بھی ایک عیب اور نقص ہے اور اگر کوئی کمال بھی نظر آوے تو اس پر آدمی کیا فخر کرے اس لیے کہ وہ کمال اس کا نہیں ہے حق تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔ جب چاہے چھین لے۔

دیکھو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تو کوئی باکمال نہیں ہے لیکن حق تعالیٰ آپ کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں ایک مقام پر تو علوم کی نسبت ارشاد ہے، فرماتے ہیں:

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْ اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ ثُمَّ لَاتَجِدُلَکَ بِهٖ عَلَیْنَا وَکِیْلاً اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّکَ اِنَّ فَضْلَهٗ کَانَ عَلَیْکَ کَبِیْرًا۔

''یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! واللہ اگر ہم چاہیں تو جو کچھ آپ کی طرف ہم نے وحی کی ہے یہ سب سلب کرلیں پھر آپؐ اپنے لیے ہمارے مقابلہ میں کوئی کام بنانے والا نہ پاویں مگر اپنے رب کی رحمت بے شک فضل اس کا آپؐ پر بڑا ہے۔''

قیاس کیجئے کہ اس آیت کو سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ سن کر کانپ اٹھے ہوں گے۔ اسی واسطے فرمایا: ''اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا'' یعنی آپ اطمینان رکھئے ہم ایسا کریں گے نہیں، اس لیے کہ ہمارا فضل آپؐ پر بہت بڑا ہے۔ یہ مضمون ہم نے اپنی قدرت ظاہر کرنے کے لیے ارشاد فرمایا تاکہ کسی قسم کا ناز نہ ہو اور اس علم کو اپنی ملک نہ سمجھو۔ دوسرے مقام پر اعمال کی نسبت ارشاد ہے:

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِىْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ

''یعنی بے شک قریب تھا کہ یہ کفار آپ کو بچلا دیں، اس شے سے جو ہم نے آپ کی طرف وحی فرمائی ہے۔ یعنی ایسا کام کرا دیتے جس سے آپؐ بچل جاتے۔''

اور اس سے آگے ارشاد ہے:

وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا ۞ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ۞

''یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ہم نے آپؐ کو قائم رکھا تو آپؐ ان کفار کی طرف کسی قدر جھکنے کے قریب ہو جاتے اور اگر ایسا ہوتا تو ہم آپ کی زندگی کا دوچند عذاب اور موت یعنی آخرت کا دوچند عذاب چکھاتے ہیں، پھر آپؐ اپنے لیے ہم پر کوئی مددگار نہ پاتے۔''

حضرات یہ ان کی نسبت ہے جو معصوم اور افضل المعصومین ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے ہی حق پر جمانے سے آپ قائم رہے ورنہ آپ جھک جاتے اللہ اکبر! اب کیا کسی کا منہ رہا ہے جو کسی کمال کا دعویٰ کرے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ ہر شخص کے ساتھ ایک شیطان رہتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! آپؐ کے ساتھ بھی ہے؟ فرمایا کہ میرے ساتھ بھی ہے ''ولکن اللہ اعانني فاسلم'' لیکن اللہ نے میری مدد فرمائی ہے

پس وہ مسلمان ہوایا میں اس سے سلامت رہتا ہوں۔

اے اللہ! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم وعمل سے زیادہ کس کا علم وعمل ہوگا کہ جس پر دعوے کرے۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْکَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّائِفَةٌ مِنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْکَ

''یعنی اگر اللہ کا فضل آپؐ پر نہ ہوتا اور اس کی رحمت تو ان میں سے تو ایک جماعت نے قصد کرلیا تھا کہ آپ کو بے راہ کردیں۔''

جب آپؐ کی شان میں ایسے ایسے ارشادات ہیں تو بتلائیے ہم کیا چیز ہیں اور ہمارا علم و عمل کیا چیز ہے۔

ہماری طاعات وسیئات

اے صاحب! اگر نمازی ہونے پر آپ کو ناز اور غرہ ہے تو یہ دیکھو اور غور کرو کہ نماز کا جو ہم کو حکم ہے آیا ہم اسی طرح کی نماز ادا کرتے ہیں اگر غور کرو گے تو خاک بھی نہ پاؤ گے، ہماری نماز کیا ہے نماز کی نقل ہے جیسے مٹی کے خربوزے اور آم کی نقل بنا کر بادشاہ کی بارگاہ میں لے جاویں، بادشاہ کا کرم ہے کہ نقل پر اصل کے برابر انعام دے دیں بلکہ اگر سچ پوچھو تو نقل بھی نہیں ہے کیونکہ نقل مشابہ تو اصل کے ہوتی ہے۔ یہاں مشابہت بھی نہیں اس پر بھی اگر ہمارا نام نمازی ہو جاوے تو محض رحمت اور عطا ہے جزاء نہیں ہے اور ''اُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنَاتٍ'' کا مصداق ہے ہمارے حضرت حاجی صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں کہ ہماری طاعات بھی سیئات میں داخل ہیں۔ چنانچہ فقہاء نے ایسی نمازوں کو مکروہ فرمایا ہے اس لیے ہماری یہ طاعات بھی سیئات ہیں۔ کیا عجب ہے کہ جوحق تعالیٰ ان کو بدل کر حسنات میں داخل فرمادیں، غرض عبادات کے اوپر ناز کرنے کا کیا حق ہے۔

تلاوت قرآن پر شاید کسی کو فخر وناز ہو تو اس کو بھی غور کیجئے کہ کیا ہم آداب تلاوت کا لحاظ رکھتے ہیں۔ تلاوت کے آداب خشیت خشوع وخضوع ہیں ہمارے اندر ان کا پتہ بھی نہیں ہے اور باطنی آداب تو علیحدہ رہے۔ ہم الفاظ بھی تو صحیح ادا نہیں کرتے۔ فن تجوید کے اعتبار سے جس طرح قرآن پڑھنا چاہیے ہم کہاں پڑھتے ہیں، غرض ہماری املاء غلط، انشاء

غلط، خود غلط در غلط سراپا غلط ہیں۔

روزہ ہی کو لیجئے، روزہ میں غیبتیں شکایتیں دنیا بھر کے قصے ہوتے ہیں، غرض نماز روزہ تلاوت کوئی قابل قبول نہیں ہے۔ پس کونسی عبادت ہے جو ناز کے قابل ہو اور خیر ہم لوگ تو قصداً کوتاہی کرتے ہیں اپنی وسع وطاقت کی قدر بھی اصلاح نہیں کرتے باقی جو حضرات اپنی طرف سے پورا حق ادا کرتے ہیں اور اپنی وسعت بھر اعمال وعبادات کی اصلاح کرتے ہیں ان کی طاعت میں بھی تو نقص رہ جاتا ہے۔

ہمارے حضرت قدس سرہ کے خلفاء میں ایک مولوی صاحب ہیں صاحب کشف ان کی حکایت ایک شخص نے بیان کی کہ انہوں نے یہ ارادہ کیا کہ ایک مرتبہ تو ایسی نماز پڑھیں کہ جس کی نسبت حدیث شریف میں آیا ہے:

لایحدث فیهما نفسه مقبلا علیهما بقلبه[1]

''یعنی ایسی دو رکعتیں پڑھیں کہ اس میں اپنے نفس سے بالکل بات نہ کرے اور اپنے قلب سے اس پر متوجہ رہے۔''

ان کو خیال ہوا کہ عمر بھر میں ایک نماز تو ایسی پڑھ لیں جس کی یہ شان ہو۔ چنانچہ انہوں نے بڑا اہتمام کیا اور خطرات کے روکنے کے لیے آنکھیں بند کر کے نماز پڑھی، بعد نماز کے اس نماز کی حقیقت مثالیہ کی طرف متوجہ ہوئے کہ دیکھوں میری نماز کیسی ہوئی دیکھا کہ نہایت حسین وجمیل ہر طرح کامل ہے لیکن غور سے جو دیکھا تو آنکھیں نہیں ہیں، بہت حیرت ہوئی کہ یہ کیا بات ہے، میں نے اس نماز کی تکمیل میں کوئی دقیقہ نہیں رکھا تھا۔ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کی خدمت میں گئے اور حضرت سے اجمالاً سارا قصہ عرض کیا، حضرت نے فوراً فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے آنکھیں بند کر کے نماز پڑھی ہوگی، انہوں نے عرض کیا کہ حضرت واقعی خطرات کے روکنے کے لیے میں نے ایسا کیا تھا اور فقہاء نے اس غرض کے لیے آنکھیں بند کرنا جائز بھی لکھا ہے، فرمایا کہ جائز ہے لیکن سنت کے خلاف ہے اگر آنکھیں کھول کر سنت کے موافق پڑھتے تو یہ اچھا تھا گو خطرات آتے غرض کامل

---

[1] المصنف لابن ابی شیبہ ۲: ۳۸۶

عبادت کس سے ادا ہو سکتی ہے۔

ازدست و زباں کہ برآید کز عہدہ شکرش بدر آید

(ہاں اور زبان سب طاعت وفا میں مصروف ہوں پھر بھی اس کا شکر ادا نہیں کر سکتے)

حدیث میں آیا ہے کہ بقدر وسعت عمل کرو اور تم احصار اور احاطہ ہرگز نہ کر سکو گے، پس کمال دین پوری طرح حاصل کرنا بندہ کے امکان سے باہر ہے پھر بایں ہمہ عجز و نقص ناز کا کیا منہ ہے پس ہمارے لیے تو یہی کمال ہے کہ اپنے کو ناقص در ناقص اور عاجز در عاجز سمجھیں، ہمارا وجود ہی سرتاپا گناہ ہے۔ "**وجودک رتب لایقاس به رتب**" (تیرا وجود ہی سراپا گناہ ہے اسے گناہ کے علاوہ کچھ اور قیاس نہیں کیا جا سکتا)

اور نقص بھی ایک قسم کا نہیں بلکہ جس پہلو پر نظر کی جائے نقصان ہے کچھ نقص اضطراری کچھ اختیاری ہیں۔

آج کل کی عورتوں کی حالت

پھر عورتوں کے اندر خاص کر کے ان نقصانات کے علاوہ ایک نقصان عقل اور دین کا بھی ہے پس ان کو تو کسی طرح بھی اپنے کو کامل سمجھنے کا حق ہی نہیں ہے اور عورتوں میں گو یہ نقص ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ان کو خوش بھی ہونا چاہیے کہ ان پر محنت بھی کم ہے سارا بوجھ مردوں کے اوپر ہے ان کو کچھ بھی کام نہیں ہے۔ ایک لڑکی کہنے لگی کہ ہائے ری قسمت، ہماری عقل بھی کم، دین بھی کم، میں نے کہا کہ یہ نہ کہو بلکہ یہ کہو واہ عمل تھوڑا اور اجر زیادہ ہے اور بھی سب بار ہر طرح سے خاوند پر ہے۔ چنانچہ بچارا تمام دن محنت و مشقت کرتا ہے پھر دینی کام بھی مردوں کے ذمہ زیادہ ہیں، بالنفس بھی کہ جمعہ ہے، جماعت ہے اور متعلق بالغیر بھی کہ دین کی اشاعت ہے، تبلیغ ہے اور اس مقام پر مردوں کی مشقت فی المعیشت پر نظر کرے۔

ایک سبق عورتوں کے مناسب اور یاد آیا وہ یہ کہ عورتوں کو چاہیے کہ خاوند کی اطاعت کیا کریں اس کا دل نہ دکھایا کریں، آج کل عورتیں اس کا ذرا خیال نہیں کرتیں، وہ باہر سے تو تمام دن محنت اور مشقت اٹھا کر گھر میں آرام کے واسطے آتا ہے یہاں ایک محنت بیگم اس غریب کے ستانے کو موجود ہیں، کوئی بات نصیحت کی کہی تو ایک طعن انہوں نے بیچارے پر

کھینچ مارا اور اگر کچھ تیز ہوا تو فرماتی ہیں کہ میں کسی کی لونڈی باندی تو ہوں نہیں جو مجھ کو ایسا ایسا کہتے ہو، خدا کے لیے خاوند کا دل نہ دکھایا کرو، اس سے کوئی گراں فرمائش نہ کیا کرو، اس کی کسی بات کو رد نہ کیا کرو، مگر آج کل عورتوں کی یہ حالت ہے کہ یوں چاہتی ہیں کہ خاوند ہمارا غلام رہے، بس رات دن ہماری ہی عبادت کیا کرے، خدا تعالیٰ کا ارشاد تو یہ ہے:
''وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّالِیَعْبُدُوْنِ'' (میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے) لیکن عورتوں کا مشرب یہ ہے ''**ماخلق الازواج الالیطیعون**'' (شوہروں کو صرف ان کی اطاعت کے لیے پیدا کیا گیا ہے) فرمائش اگر کوئی کیا کرو تو وقت دیکھا کرو، آدمی کا دل ہر وقت یکساں نہیں رہتا جب دیکھو کہ اس وقت خاوند خوش ہے اس وقت ادب سے درخواست پیش کر دیا کرو۔

اگر خاوند بے نماز ہو اس کو بھی حقیر نہ سمجھو، عورتوں میں ایک مرض یہ بھی ہے کہ اگر وہ خود نماز روزہ کی پابند ہوتی ہیں اور خاوند ان کو ایسا مل گیا جو آزاد ہے تو اس کو وہ بہت حقیر سمجھتی ہیں اور اگر خاوند انگریزی پڑھا ہوا ہے پھر تو وہ اس کو کافر اور اپنے آپ کو آسیہ سے کم نہیں جانتیں، ہم نے مانا کہ وہ گنہگار ہے لیکن علماء سے مسئلہ تو پوچھو، دیکھو وہ کیا کہتے ہیں۔ یاد رکھو کہ خاوند خواہ اپنی ذات سے کیسا ہی ہو لیکن تم پر ان کی اطاعت ہی واجب ہے اس لیے کہ وہ تمہارا مالک اور حاکم ہے اور حاکم اگر فاسق بھی ہو تو رعایا پر اس کی اطاعت فرض ہے اگر یزید جیسا بھی کوئی حاکم ہو اور اس کی خلافت قاعدہ شرعیہ سے ثابت ہو جاوے تو اطاعت اس کی بھی ضروری ہے۔ پس تمہارا خاوند یزید سے تو زیادہ نہیں۔ جب یزید کی اطاعت واجب ہے تو خاوند کی کیوں نہ ہوگی۔ اس لیے کہ خاوند کا حاکم ہونا قرآن سے ثابت، حدیث سے ثابت، خاوند ہونے میں اس کے شبہ نہیں نکاح کے گواہ موجود ہیں۔ زوج ہونا اس کا معلوم ہے پھر کیا وجہ ہے کہ تم اس کی اطاعت میں کوتاہی کرو۔ غرض زوجیت اطاعت کا سبب ہے وہ یزید سہی مگر تمہارا تو وہ بایزید ہے تم کو نافرمانی کا کیا حق ہے۔

ہاں اگر وہ نماز روزہ سے منع کرے تو اس میں اس کی اطاعت نہ کرے لیکن نماز روزہ سے بھی مراد فرض ہے، نفل نماز روزہ سے اس کی اطاعت مقدم ہے بلکہ فرائض کی نسبت بھی اگر وہ

کہے کہ ذرا ٹھہر کر پڑھ لیجیو اور وقت میں گنجائش ہے تو مؤخر کر دینا چاہیے، ہاں اگر وقت مکروہ ہونے لگے تو اس وقت اس کا کہنا نہ مانے، البتہ اگر وہ صریح کفر کا ارتکاب کرے اس وقت تک کسی محقق عالم سے فتویٰ لے کر اس سے جدا ہو جاؤ۔ باقی فسق تک جب کہ وہ تم کو فسق کا حکم نہ کرے اس کی اطاعت کرو، یہاں تک کہ اگر وہ یہ کہے کہ وظیفہ چھوڑ کر میری خدمت کرو تو وظیفہ چھوڑ دو مگر تم تو سمجھتی ہوگی کہ اس سے بزرگی میں فرق آ جاوے گا۔ اے عورتو! تم کو بزرگ بھی بننا نہ آیا، بزرگی تو شریعت کے اتباع کا نام ہے، رائے کے اتباع کو بزرگی نہیں کہتے جب تم کو خاوند کی اطاعت کا شریعت سے حکم ہے تو بس بزرگی اسی میں ہے کہ ان کی اطاعت کرو۔

الحاصل تمہارے ذمہ کوئی کام نہیں اور مردوں کے ذمہ بہت کام ہیں، سفر کرو، تجارت کرو، معاش حاصل کرو، تمام دنیا کے بکھیڑے مردوں کے ذمہ ہیں، تمام اہل وعیال کا خرچ ان کے ذمہ ہے، تمہارے ذمہ کچھ بھی نہیں ہے اور اسی لیے تمہارا حصہ بھی آدھا ہی مقرر کیا ہے بلکہ یہ بھی تمہارے پاس زائد ہی ہے اس لیے کہ تمہارے ذمہ کسی کا خرچ نہیں۔ حتیٰ کہ اپنا بھی نہیں وہ بھی مرد ہی کے ذمہ ہے تمہارے لیے تو بہت آسانی ہے پس عورت ہونا تمہارا مبارک ہو گیا کیا کرو گی درجوں کو لے کر بس نجات ہو جاوے یہی غنیمت ہے۔

میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے کبھی درجوں کی ہوس نہیں ہوئی کہ مجھے جنت میں بڑا درجہ ملے، میں اس بات سے بالکل خوش اور راضی ہوں کہ عذاب سے نجات ہو جاوے، چاہے جنت میں جوتیوں ہی کی جگہ مل جاوے اگر سزا نہ ہو تو بھی بہت ہے، باقی اگر تم درجوں کے کام کرو گی تو درجے بھی مل جاویں گے لیکن یہ ضروری نہیں کہ تم انبیاء سے بھی بڑھ جاؤ، بہرحال تم کو کام بہت کم بتلایا گیا ہے اس لیے تم خوش رہو اور مردوں پر رشک نہ کرو اور نہ مرد بننے کی تمنا کرو۔

حضرت اُم سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے تمنا کی تھی اور فرمایا تھا ”یالیتنا کنا رجالا“ یعنی کاش ہم تو مرد ہوتے کہ مردوں کے متعلق جو فضائل ہیں وہ ہم کو بھی حاصل ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے نہی فرمائی اور یہ آیت نازل فرمائی:

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ

”اور اس بات کی تمنا نہ کرو جس میں اللہ تعالیٰ تم میں سے تعلق کو بعض پر فضیلت عطا فرماتا ہے۔“

خلاصہ اس آیت کا یہ ہے کہ جو فطری اور عادۃً غیر مکتسب یعنی غیر ممکن الاکتساب فضائل ہیں ان کی تمنامت کرو جو چیزیں اکتساب سے تعلق رکھتی ہیں وہ حاصل کرو۔ پس یہ تمنا کرنا کہ ہم مرد ہوتے ہیں خدا پر اعتراض کرنا ہے کہ ہم کو عورت کیوں بنایا جس کو جیسا بنا دیا وہ وہی بہتر ہے۔

دیکھو صحابی ہونا کتنا بڑا رتبہ ہے لیکن میں اپنی نسبت کہتا ہوں کہ مجھ کو کبھی صحابی بننے کی تمنا نہیں ہوتی اس لیے کہ ہم جیسے ہیں معلوم ہے فطرت تو بدلتی نہیں اگر اس وقت ہوتے تو جب بھی ایسے ہی ہوتے تو خدا جانے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق ہم سے ادا ہوتے یا نہ ہوتے، اگر نہ ہوتے تو مردود ہو جاتے، اس سے تو اس وقت ہی غنیمت ہیں کہ سب عیوب ہمارے مستور ہیں بلکہ خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ ہم لوگ اس زمانہ میں نہیں ہوئے یہ صحابہ ہی کا کام تھا کہ حقوق نبوت انہوں نے اچھی طرح ادا کیے۔

پس عورتوں کو بھی یہی سمجھنا چاہیے اور شکر کرنا چاہیے کہ ہم عورت ہوئے، مرد ہوتے تو مردوں کے متعلق جو حقوق ہیں شاید وہ تم سے ادا نہ ہوتے پس مالک حقیقی نے جس کے واسطے جو پسند کیا ہے وہی پسند ہے۔

بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خندان است　　　بہ عندلیب چہ فرمودۂ کہ نالاں است

(پھول کے کان میں کیا کہہ دیا کہ خندان ہے اور بلبل سے کیا فرمادیا کہ نالاں ہے)

جس کو جو دے دیا ہے اس پر اس کو خوش ہونا چاہیے ہاں عمل کے اندر کوشش کرنا چاہیے اور اس کے ثمرات کی بھی تمنا نہ کرے اس لیے کہ وہ بھی غیر اختیاری ہیں اللہ تعالیٰ خود علیم و حکیم ہیں وہ خود جزا دیں گے۔

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن　　　کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

تواضع کی تاکید

ایک حدیث قدسی کا مضمون ہے کہ ہمارے بعض بندے ایسے ہیں کہ ہم نے ان کو غریب پیدا کیا ہے۔ اگر ان کو ہم امیر کر دیتے تو امارت میں لگ کر وہ ہم کو بھول جاتے اور بعض بندے ایسے ہیں کہ ہم نے ان کو امیر بنایا ہے اگر ہم ان کو غریب کر دیں تو فقر و فاقہ کی

مصیبت کے سبب وہ ہم کو بھول جاویں اور بعضے بندے ایسے ہیں کہ ہم نے ان کو تندرست رکھا ہے اگر ہم ان کو بیمار کردیں تو وہ ہم کو بھول جاویں اور بعضے ایسے ہیں کہ ان کو بیمار رکھتے ہیں اگر وہ تندرست ہوجاویں تو وہ غافل ہوجاویں۔

اس سے آگے فرماتے ہیں "وذلک لانی اعلم بعبادی" یعنی اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے بندوں کے حال سے میں ہی واقف ہوں کہ کس حالت سے ان کو رکھنا مناسب ہے۔ مثل مشہور ہے کہ اپنے بچھڑے کے دانت آدمی خود ہی خوب جانتا ہے۔

پس ہر حالت میں خدائے تعالیٰ کا شکر کرو اور ہر حال میں اس کی حکمت اور رحمت سمجھو اور اس کے ساتھ اپنے نقصان امکان و بشریت کو بھی پیش نظر رکھو، ناز نہ کرو، یہ نہ سمجھو کہ ہم بزرگ ہیں ہم کو تکبر بھی جائز ہے غیبت بھی جائز ہے اگر تم نیک اور بزرگ ہو تو تم کو تو اور بھی زیادہ گناہوں سے بچنا چاہیے۔

دیکھو! اگر سفید کپڑے میں دھبہ لگ جاتا ہے تو وہ کتنا بدنما ہوجاتا ہے اور اگر کپڑا پہلے ہی سے میلا کچیلا ہے تو میل لگنے سے اس کا میل بڑھے گا تو ضرور لیکن ظاہر نہ ہوگا اس لیے کہ وہ پہلے ہی سے میلا ہے۔ الحمدللہ اس قصبہ میں مستورات کی حالت بہت اچھی ہے، میرا دل بہت خوش ہوا، اس لیے میں نے روزہ نماز کے متعلق کچھ بیان نہیں کیا اس لیے کہ بفضلہٖ تعالیٰ پہلے سے ہی پابندی ہے میرا جی چاہا کہ ایسی بات کے متعلق بیان کروں کہ جو ان میں ہوتا کہ اس مرض کی بھی اصلاح ہوکر کوئی کمی نہ رہے۔ سو وہ مرض یہ ہے کہ جو اکثر بیبیوں میں خصوص جو بہت نیک ہوں بوجہ کمی علم اور قلت بصیرت کے ہوتا ہے اور وہ اپنے کو بڑا سمجھنے کا مرض ہے۔ اس لیے یہ آیت اختیار کی گئی۔

اب تم یہ سمجھو کہ حضرت مریم علیہا السلام آخر تم سے تو بزرگی میں زیادہ ہی تھیں، باوجود اتنے کمالات پھر ان کو یہ حکم ہے کہ اے مریم تواضع کرو اپنے رب کے سامنے اور سجدہ کرو۔ مطلب یہ ہے کہ قلب کو بھی مشغول رکھو اور جوارح کو بھی کہ نماز پڑھو چونکہ تمام ارکان صلوٰۃ میں اعظم مقصود سجدہ ہے اس لیے اس کی تخصیص فرمائی اور "وَارْكَعِىْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ" میں یا تو رکوع اصطلاحی مراد ہے اور یا لغوی معنی ہیں اور میں اخیر احتمال پر تفسیر کو مبنی کرنا چاہتا ہوں۔ پس مطلب یہ ہے کہ

جھکو یعنی عاجزی کرو اس کے بڑھانے سے اشارہ اس طرف ہے کہ سب کچھ کرو مگر اپنے کو بڑا نہ سمجھو۔ اپنے کو پست کرو خدا کے سامنے، کمزور سمجھو اور مَعَ الرَّاكِعِيْنَ کے بڑھانے میں یہ نکتہ ہے کہ تواضع کے حاصل ہونے کا طریقہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اس کی تحصیل کا کیا طریقہ ہے حاصل طریق کا یہ ہے کہ تواضع کرنے والوں کے ساتھ رہو یعنی نیک صحبت اختیار کرو، صحبت نیک اخلاق کی درستی کا نہایت عمدہ ذریعہ ہے بغیر صحبت کے اخلاق کی درستی نہیں ہوتی اور چونکہ مستورات کو اس کا موقع بہت کم ملتا ہے اسی واسطے ان کے اخلاق عموماً درست نہیں ہوتے۔ پس ان کو صحبت نیک کی بہت ہی ضرورت ہے، مردوں کے لیے تو اس کا سہل طریقہ یہ ہے کہ بزرگوں کی خدمت میں جا کر رہیں سو یہ عورتوں سے ہو نہیں سکتا ہے اور مناسب بھی نہیں اس لیے کہ اول تو ان کے اپنے گھر کے مشاغل اس قدر ہیں کہ اتنی فرصت ان کو نہیں مل سکتی، دوسرے ان کی وضع کے بھی خلاف ہے۔ البتہ عورتوں میں اگر کوئی عورت بزرگ اور خدا رسیدہ ہوں تو ان کی خدمت میں رہیں لیکن عورتوں میں ایسی بہت کم ہیں تاہم اگر ایسا موقع میسر ہو تو ان کے پاس بیٹھو لیکن یہ بھی نہ ہو سکے تو پھر ان کے لیے بہترین طریقہ یہ ہے کہ بزرگوں کے تذکرے اور حکایتیں دیکھا کریں بطور نمونہ کے چند حکایتیں بھی اہل تواضع کی بیان کرتا ہوں۔

تواضع کی مثالیں

ایک بزرگ تھے ان کی ایک شخص نے دعوت کی۔ جب وہ کھانا کھانے کے لیے بلانے آیا تو اس کے ہمراہ تشریف لے گئے جب گھر پہنچے تو اس شخص نے کہا کہ آپ کیسے تشریف لائے۔ فرمایا کہ بھائی تم نے دعوت کی تھی کہنے لگا آپ بھی عجیب آدمی ہیں لوگوں کے سر پڑتے ہیں جاؤ کیسی دعوت ہوتی ہے۔ وہ بزرگ چلے آئے، وہ شخص پھر آیا اور کہا کہ آپ بھی عجیب شخص ہیں اس قدر نخرہ باز میاں کی دعوت کی تھی چلتے کیوں نہیں، ساتھ ہو لیے جب پہنچے تو پھر کہا کہ آپ کیوں آئے، فرمایا کہ تم نے دعوت کی ہے، کہنے لگا کہ میں نے تو نہیں کی، خواہ مخواہ آپ آئے۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان! پھر چلے گئے وہ پھر آیا اور کہا کہ آپ بھی ہیں بڑے متکبر، اب آپ کو دس دس دفعہ بلاؤں، جب آپ آویں گے، چلئے پھر ساتھ ہو لئے، غرض اس ظالم نے تین چار مرتبہ ایسا ہی کیا اور وہ بزرگ ہر دفعہ آتے تھے اور

لوٹ جاتے تھے۔اس کے بعد وہ شخص پاؤں پر گر پڑا اور کہا حضرت خدا کے واسطے میرا قصور معاف فرمائیے، میں نے یہ حرکت قصداً آپ کے امتحان کے لیے کی تھی۔معلوم ہو گیا کہ آپ واقعی بزرگ ہیں۔فرمانے لگے کہ بھائی یہ تو کوئی علامت بزرگی کی نہیں ہے یہ خصلت تو کتے میں بھی ہوتی ہے کہ روٹی دکھلا دو آ جاوے، دھمکا دو چلا جاوے۔

حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ بہت تیز مزاج مشہور تھے۔ایک شخص آزمانے کے لیے آیا، مولانا مجمع عام میں تشریف رکھتے تھے۔اس نے پکار کر کہا کہ مولانا میں نے سنا ہے کہ آپ حلال کی پیدائش نہیں ہیں، حضرت مولانا کے اندر ذرا تغیر نہیں آیا اور ہنس کر فرمایا کہ آپ سے کسی نے غلط روایت کیا ہے میرے ماں باپ کے نکاح کے تو گواہ اب تک موجود ہیں۔

حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ بیٹھے حدیث کا درس دے رہے تھے ایک شخص نے برروآ کر گالیاں دینا اور برا بھلا کہنا شروع کیا۔شاگرد بگڑے اور چاہا کہ اس کی خبر لیں، سب کو منع فرمایا اور یہ فرمایا کہ جو کچھ یہ کہتا ہے سب تو غلط نہیں ہے کہ کچھ تو سچ بھی ہے۔

ایسی ایسی حکایتیں دیکھا کرو، پھر انشاء اللہ دعویٰ اور فخر نہ رہے گا۔اس صورت میں تو اقنتی اور وارکعی دونوں کا حاصل ایک ہی ہوگا۔فرق اس قدر ہوگا کہ وَارْكَعِي مَعَ الرَّاكِعِينَ میں تواضع کے حاصل ہونے کا طریقہ بھی ارشاد ہوا ہے اور دوسری توجیہ اور ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اقنتی میں تو تواضع للرب مراد ہے جیسا کہ لربک کی تقید سے ظاہر ہے اور وارکعی سے تواضع للخلق مراد ہو۔خلاصہ یہ ہوا کہ خدا کے سامنے بھی عاجزی کرو اور مخلوق سے بھی تواضع سے پیش آؤ۔اس صورت میں یہ آیت تواضع مع اللہ اور تواضع مع الخلق دونوں کی جامع ہو جاوے گی۔خلاصہ یہ ہوا کہ آدمی کو تکبر اور عجب کسی کے ساتھ بھی روا نہیں۔شیخ شیرازی فرماتے ہیں:

زخاک آفریدت خداوند پاک — پس اے بندہ افتادگی کن چو خاک

(اللہ پاک نے بندہ کو مٹی سے پیدا فرمایا، پس اسے زمین جیسی تواضع اختیار کرنا چاہیے)

ضرورت محاسبہ و مراقبہ

ایک شخص ایک بزرگ کے سامنے سے اکڑتا مکڑتا ہوا گزرا، ان بزرگ نے فرمایا کہ اترا کر مت چل، اللہ تعالیٰ ایسی چال کو دوست نہیں رکھتا، بہت بگڑا اور کہا اما تعرفنی من انا

جانتے نہیں میں کون ہوں، ان بزرگ نے فرمایا جانتا ہوں اولک نطفة قذرة یعنی ابتداء تو تیری یہ ہے کہ ایک گندہ پانی ہے و اخرک جیفته مذرة اور انتہا تیرا مردار ریزہ ریزہ ہے۔ وبین ذالک تحمل القذرة اور اس کی درمیانی حالت یہ ہے کہ تو پاخانہ کا بوجھ اپنے پیٹ میں اٹھا رہا ہے۔ واقعی ہم لوگوں کی حقیقت یہی ہے کہ اب ہم یہاں مجلس میں بڑے معزز بنے بیٹھے ہیں، ابھی اگر پیٹ پھٹ جاوے یا پیٹ میں ایک سوراخ کھل جاوے بدبو کے سبب یہاں لوگوں کو بیٹھنا دشوار ہو جاوے۔ سارا اعتقاد معتقدین کا رخصت ہو جاوے ہم کو اس کا خیال نہیں ورنہ حقیقت کو دیکھا جاوے تو ہماری حالت یہ ہے کہ ایک ایک کے پیٹ میں کم از کم دو دو تین تین سیر نجاست موجود ہے اتنا بڑا عیب تو لیے پھرتے ہیں پھر بھی اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں، کتنی بڑی حماقت اور جہالت ہے۔ یوں نہ سمجھو کہ ہم بڑے ہیں بلکہ یہ سمجھو کہ ہم سڑے ہیں۔

الحاصل بزرگوں کی حکایتیں اور تذکرے دیکھا کرو اور اس کے ساتھ ایک یہ کرو کہ ایک وقت روزانہ مقرر کر کے اپنے گناہوں کو سوچا کرو اور بزرگان دین کے کمالات کو یاد کر لیا کرو۔ اس وقت تم کو معلوم ہوگا کہ ہم تو کسی شمار و قطار میں بھی نہیں ہیں نہ ہمارے اندر کوئی کمال ہے اور جس کو تم کمال سمجھتی ہو اگر غور کرو گی تو ہر ایک کمال کے ساتھ ایک ایسی شے لگی ہوئی ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے ناز اور فخر کسی طرح جائز نہیں۔

دیکھو مال ہی ہے وہ کوئی قابل فخر شے نہیں، اگر آج چور لے گیا تو صفایا ہو گیا۔ علم ہے وہ بھی خدا کے قبضہ میں ہے اگر ابھی سلب کر لیویں تو کورے رہ جاویں۔ بہتیرے واقعات ایسے ہوئے ہیں اور ہوتے ہیں۔

ابھی کا واقعہ ہے۔ میرے ایک دوست ہیں، بڑے عالم فاضل ان کو فالج ہوا، دماغ پر بھی اس کا اثر ہوا، سب پڑھا لکھا بھول گئے۔ حتیٰ کہ ان کو الحمد شریف بھی یاد نہ رہی، علاج ہوا تو بہ مشکل انہوں نے تھوڑی تھوڑی الحمد یاد کی جب پوری یاد ہوگئی اور سنا دی تو بہت سے روپوں کی مٹھائی تقسیم کی۔

خزانہ دماغ اللہ تعالی کی بڑی نعمت ہے جب اس میں خلل آ جاتا ہے سارا علم بلکہ عقل تک رخصت ہو جاتی ہے اور وہی حالت ہو جاتی ہے جس کی نسبت ارشاد ہے لِکَیْ لَایَعْلَمَ

یَعْدَ عِلْمٍ شَیْئًا جب یہ حالت ہے تو ناز کا ہے پر ہے اور اگر اس حیثیت سے ناز ہے کہ خدا تعالیٰ نے ایک نعمت دی ہے تو اس پر ناز نہ کرنا چاہیے، نعمت پر شکر کیا کرتے ہیں اور اس کے زوال سے خوف کیا کرتے ہیں۔

دیکھو! اگر کسی چمار کو بادشاہ کوئی موتی گراں بہا حفاظت کے لیے دیدے تو وہ بجائے اس کے کہ ناز اور فخر کرے یا دعویٰ ملک کا کرے ترساں اور لرزاں رہے گا کہ ایسا نہ ہو کہ مجھ سے یہ کہیں گم ہو جائے اور مجھ پر شاہی عتاب ہو اور اپنے کو ہر وقت نا اہل سمجھے گا۔

اگر عمل پر ناز ہے تو یہ بھی کوئی ناز کی بات نہیں، خدائے تعالیٰ اگر توفیق نہ دیتے تو ہم سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا، دنیا میں ہم سے بڑے بڑے عاقل اور دانشمند موجود ہیں اگر عقل اور دانش سبب اس کا ہوتا تو وہ بڑے عمل کرنے والے ہوتے لیکن ان کو ایمان تک بھی نصیب نہیں تو آخر یہ کون ہے جس نے ہم کو ان اعمال کی توفیق دی۔ ظاہر ہے کہ خدا نے ہی دی ہے۔ پس یہ بھی مقتضی شکر کو ہے نہ کہ فرح اور بطر اور عجب کو۔

اگر قوت پر فخر ہے تو اس قوت کی حقیقت یہ ہے کہ دو تین دن بخار آ جاوے، چار پائی سے اٹھا بھی نہ جاوے، ایسی قوت کیا قابل فخر ہے ہاں شکر کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت ہے۔

اگر شرافت نسب پر فخر ہے تو یہ بالکل ہی غیر اختیاری شے ہے، دوسرے یہ کہ شرافت ایک عرفی کمال ہے کوئی حقیقی کمال نہیں ہے۔ تیسرے یہ کہ جن کی طرف ہم آپ کو نسبت کرتے ہیں خدا جانے واقع میں بھی منسوب ہیں یا نہیں اس لیے کہ دلیل اس کی محض شہرت ہی ہے۔

دیکھئے ہم لوگ تھانہ بھون کے رہنے والے فاروقی کہلاتے ہیں لیکن سلسلہ نسب میں حضرت ابراہیم بن ادھم ہیں کہ وہ بھی فاروقی مشہور ہیں اور اس قدر شہرت ہے کہ درجہ تواتر تک ہم سمجھے ہوئے تھے لیکن معلوم ہوا کہ عجلی یا تمیمی ہیں۔ پھر ایک رسالہ دیکھا اس میں سیادت بھی ان کی لکھی ہے میں نے حضرت مولانا گنگوہیؒ سے پوچھا، حضرت نے فرمایا: ہاں سید بننے کو جی چاہتا ہوگا۔ اس رسالہ میں جو غور کیا تو اس میں بھی خدشات نکلے۔ اب چار روایتیں ابراہیم بن ادھم کے بارے میں جمع ہو گئیں۔ فاروقی عجلی تمیمی، سید پانچواں شبہ یہ ہے کہ ابراہیم بن ادھمؒ بہت سے ہوئے ہیں، واللہ اعلم یہ فاروقی کون سے ابراہیم بن ادھمؒ کی

طرف منسوب ہیں۔ مجھے تو جب سے یہ روایات معلوم ہوئی ہیں تو اس دعوائے نسب کو سلام کرتا ہوں اور نہ میں اپنے آپ کو فاروقی لکھتا ہوں۔ ہاں اس قدر تو محقق ہے کہ جو لوگ فاروقی کہلاتے ہیں یہ ادھمی ہیں۔

ایک بڑا قوی شبہ انساب کے متعلق مجھ کو یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ تو بہت سے تھے پھر یہ کیا بات ہے کہ ہندوستان میں جس قدر شیوخ ہیں وہ صدیقی، فاروقی، علوی، انصاری، عثمانی ہی ہیں۔ کوئی ابوہریری یا مقدادی یا ابوطلحی وغیرہم نہیں ہے۔ آخر یہ سب کہاں گئے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ آئے تو ہیں سب قسم کے لوگ لیکن تفاخراً بڑوں بڑوں کی طرف اپنے کو نسبت کرلیا ہے۔ مجھے سفر میں بہت لوگ فاروقی ملے لیکن وہ سب ادھمی تھے اور میں نے اکثروں سے نسب کے متعلق اپنے شبہات پیش کیے لیکن کسی نے شافی جواب نہیں دیا۔ اس لیے میں نے ان لوگوں سے کہہ دیا کہ آج سے اپنے آپ کو فاروقی نہ لکھو۔ ایسا ہی شوق ہو تو ادھمی لکھ دیا کرو چنانچہ بعضوں کے ان میں سے خطوط آتے ہیں تو وہ ادھمی ہی لکھتے ہیں اور حقیقت تو یہ ہے۔

بندہ عشق شدی ترک نسب کن جامی ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ کہ دریں راہ فلاں بن فلاں چیزے نیست

(جامیؒ تو بندہ عشق ہے نسب کو چھوڑ کر اس راستہ میں فلاں بن فلاں کوئی چیز نہیں)

لیکن میرا مطلب یہ نہیں کہ نکاح کے وقت کفاءت کی تحقیق نہ کیا کرو کفاءت کی ضرور رعایت کرنا چاہیے، لطف نکاح میں جب ہی ہے جبکہ زوجین ہم جنس ہوں اور غیر کفو میں ہونے سے علاوہ بے لطفی کے ذلت اور عار بھی عرفاً ہوتی ہے۔ اس افراط کے مقابلہ میں بعضوں کو تفریط ہوگئی ہے کہ ان کو اس نفی نسب میں غلو ہوگیا ہے کہ وہ اس کو لاشے محض بتلاتے ہیں۔

قنوج میں ایک مولوی صاحب آئے۔ وہ سید تھے اور وہ منھیاروں میں آکر ٹھہرے اور انہوں نے ان کی دلجوئی اور اپنی آمدنی کے لیے یہ کہنا شروع کیا کہ نسب کی شرافت کوئی چیز نہیں ہے اولاد آدم علیہ السلام سب برابر ہیں۔ وہاں کے شیوخ کو یہ گراں ہوا اور انہوں نے یہ شہرت دینی شروع کردی کہ یہ مولوی صاحب اپنی لڑکی منھیاروں کو دیں گے اور ایک چالاک شخص نے مولوی صاحب سے بر رو پوچھا بھی کہ ہم نے سنا ہے کہ آپ اپنی لڑکی

منھیاروں میں دیں گے۔ مولوی صاحب غصہ میں ہو گئے اور طیش میں آ کر کہتے ہیں کہ کون حرام زادہ کہتا ہے، لوگوں نے کہا کہ حضرت مولانا برا ماننے کی بات کون سی ہے سیادت اور شرافت تو کوئی چیز نہیں ہے۔ اس روز ان مولوی صاحب کی آنکھیں کھلیں۔

غرض نسب کے بارے میں افراط تفریط دونوں برے ہیں نہ تو شیخ سید جولاہے ایسے برابر ہیں کہ آپس میں ان کے مناکحت جاری ہوں اور نہ ایسا فرق ہے کہ اس کی بنا پر نسب پر تفاخر کرنے لگیں اور دوسری قوموں کو حقیر اور ذلیل سمجھنے لگیں۔ البتہ جو شئ عرفاً سبب ذلت کا ہے اس سے بچے لیکن حفظ کے ساتھ تواضع کو اختیار کرے۔

خلاصہ تمام بیان کا یہ ہے کہ آدمی کے اندر کوئی شے ایسی نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے فخر اور ناز اور دعویٰ کرے۔ ہر وقت اپنے کو عاجز اور ذلیل سمجھے اور تکبر اور عجب کو چھوڑے۔ یہی مضمون تھا جس کو میں بیان کرنا چاہتا تھا۔ اب اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ توفیق عمل کی عطا فرمادیں۔ (آمین)

ایک صاحب نے کہا کہ مجھ سے نماز کا حق ادا نہیں ہوتا، فرمایا کہ بھائی نماز کا حق کس سے ادا ہو سکتا ہے تم تو یہ بھی سمجھتے ہو کہ ہم سے حق ادا نہیں ہوتا اور ہم اس جہل میں مبتلا ہیں کہ ہم بہت اچھی نماز پڑھتے ہیں اور حالانکہ خاک بھی نہیں پڑھتے۔ بس بھائی اللہ تعالیٰ کو سجدہ کر لیتے ہیں وہ رحیم ہیں، قبول فرمالیں گے۔ ان سے امید قبولیت کی البتہ ہے گو ہماری نماز اس قابل نہیں۔

(کمالات اشرفیہ)

الخشوع مواعظ اشرفیہ

خشوع وخضوع کے متعلق یہ وعظ جامع مسجد کانپور میں
بروز جمعہ ۱۷ربیع الاول ۱۳۲۳ھ کو بیان فرمایا۔
جو۲ گھنٹے ۲۰ منٹ میں ختم ہوا۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

الحمدللّٰہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرورانفسنا ومن سیأت اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلاھادی لہ و نشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا و مولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ و بارک وسلم.

امابعد. الاحسان ان تعبداللّٰہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک[1].

ارشادفرمایا: جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ اگر تم اس کو نہیں دیکھتے پس تحقیق وہ تم کو دیکھتا ہے۔

تعلیم دین

یہ ایک حدیث شریف کا ٹکڑا ہے اور جواب ہے ایک سوال کا جو حضرت جبرئیل علیہ السّلام نے خدمت نبویؐ میں حاضر ہوکر کیا تھا جس کا پورا قصہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اس حالت میں کہ ہم ایک دن رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک موجود تھے۔ ناگاہ ہم پر ایک ایسا شخص ظاہر ہوا جس کے کپڑے نہایت سفید اور بال بہت کالے تھے۔ اس پر سفر کا نشان تو معلوم نہیں ہوتا تھا اور ہم میں سے کوئی اس کو پہچانتا بھی نہ تھا۔ یہاں تک کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مل کر باادب بیٹھ گیا اور پوچھنے لگا یا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم! اسلام کس کو کہتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعمال اسلامیہ کو ذکر فرمایا کہ خدا کے سوا کسی کو معبود نہ جاننا اور محمدؐ کے رسول اللہ ہونے کی تصدیق کرنا، نماز پڑھنا،

---

[1] الصحیح للبخاری ۱۴۴:۶، السنن الکبری للبیھقی ۲۰۳:۱، کنز العمال :۵۲۴۹، ۵۲۵۴

زکوٰۃ دینا، رمضان شریف کے روزے رکھنا اور استطاعت ہونے پر بیت اللہ کا حج ادا کرنا۔

یہ سن کر اس شخص نے آپ کی تصدیق کی کہ آپ سچ ارشاد فرماتے ہیں۔ ہم لوگوں کو تعجب ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتا بھی ہے اور تصدیق بھی کرتا ہے پھر اس شخص نے سوال کیا کہ ایمان کس کو کہتے ہیں؟ حضورؐ نے عقائد اسلامیہ کو ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی تصدیق کرنا اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لانا اور قیامت کے دن پر ایمان لانا اور تقدیر کے خیر وشر پر ایمان لانا۔

اس شخص نے اس کو بھی سن کر کہا کہ آپ سچ ارشاد فرماتے ہیں۔ پھر اس نے حضورؐ سے سوال کیا کہ احسان کس کو کہتے ہیں؟ ارشاد ہوا کہ **ان تعبد اللّٰہ کا نک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک** یعنی احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی اس طرح سے عبادت کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو کیونکہ اگر نہیں دیکھتے ہو تم اس کو پس وہ تحقیق تم کو دیکھتا ہے۔

اس سوال کے علاوہ اس شخص نے اور سوال بھی کئے تھے جو پوری حدیث میں مذکور ہیں اور حضورؐ نے ان سب کے جواب بخوبی ارشاد فرمائے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ اس شخص کے چلے جانے کے بعد حضورؐ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ اے عمرؓ! تم جانتے بھی ہو یہ سوال کرنے والے کون تھے۔ میں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ **اللہ ورسولہ اعلم.** حضورؐ نے ارشاد فرمایا **فانہ جبرئیل اتاکم یعلمکم دینکم**۔ یعنی یہ سوال کرنے والے جبرئیل علیہ السلام تھے۔ تمہارے پاس اس لئے آئے تھے کہ تم کو تمہارا دین سکھلا دیں۔

وجہ اس آنے کی یہ ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ صحابہ کو زیادہ پوچھ گچھ سے منع فرمایا تھا لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ امور دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو وہ جو پیش آئیں واقع ہوں۔ ان کا تو پوچھنا ضروری ہے۔ اس سے ممانعت نہ تھی دوسری یہ کہ محض فرضی صورتیں نکال نکال کر احتیاطاً پوچھ رکھنا اگرچہ ابھی واقع نہ ہوئیں ہوں۔ جیسے اب بھی ایک تو عام لوگ ہیں۔ ان کو تو یہ چاہئے کہ جب کوئی امر پیش آوے اس وقت دریافت کرلیں۔ یا ایسا کوئی امر جس کا واقع ہونا غالب ہو وہ دریافت کرلیں یہ نہیں کہ فرضی بعید الوقوع صورتیں دریافت کر کر کے پریشان کریں۔ البتہ طلباء جن کا کام ہے مسائل کی تحقیق کرنا وہ اگر دریافت کریں تو مضائقہ

نہیں اور بعض لوگوں کو جو یہ عادت ہوتی ہے کہ خواہ مخواہ مولویوں کو دق کرنے کے لئے ایسی ایسی باتیں پوچھا کرتے ہیں کہ جن کی کوئی صورت نہیں یہ سب بیکار وفضول ہے صحابہ کو جو سوال سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمادیا تھا اس کی کئی وجوہات ہیں۔

اول تو یہ کہ ایسی فرضی باتیں دریافت کرنا خلاف ادب تھا۔

دوسرے یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضروری بات خود ہی بیان فرمادیا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: انما بعثت معلماً[1] (میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں) یہ تو آپ کا فرض منصبی ہی تھا اور خود آپؐ اعلیٰ درجہ کی شفقت رکھتے تھے۔ ضرورتوں کو سمجھتے تھے۔ آپؐ بغیر پوچھے بتلا دیا کرتے تھے ایسی حالت میں سوالات کرتے رہنے کی ضرورت ہی کیا تھی جس طرح اگر کوئی طبیب حاذق شفیق ہو۔ اس نے نبض دیکھ لی ضروری امور دریافت کر کے تشخیص کر لی نسخہ لکھ دیا۔ پرہیز بتلا دیا سارے ضروری امور سے خود ہی غایت شفقت کے باعث سے آگاہ کر دیا تو پھر ایسے شخص سے دریافت کرنے کی ضرورت ہی کیا رہ گئی۔

تیسرے یہ بھی مصلحت ہوسکتی ہے کہ بعض منافقین گھڑ گھڑ کر صورتیں پوچھا کرتے تھے اور غرض اس سے محض دق کرنا ہوتا تھا۔ اس لئے مسلمانوں کو بھی منع کر دیا تا کہ منافقین کو آڑ نہ ملے۔

چنانچہ خود مجھ سے ایک شخص نے ایک مرتبہ دریافت کیا کہ دو شخص چلے جاتے تھے اور ان کے ہمراہ ایک عورت تھی۔ ایک شخص اس کا خاوند تھا دوسرا اس کا بھائی اتفاق سے چوروں نے دونوں کو قتل کر ڈالا سر تن سے جدا ہو گئے وہ رونے لگی۔ اتفاق سے ایک درویش کامل کا ادھر سے گزر ہوا۔ واقعہ دریافت کرنے کے بعد اس عورت سے کہا کہ تو دونوں کے سر دھڑ سے لگا دے۔ اس نے خاوند کے دھڑ کے ساتھ بھائی کا سر اور خاوند کا سر بھائی کے دھڑ سے لگا دیا۔ انہوں نے دعا کی۔ دونوں زندہ ہو گئے۔ تو بتلاؤ کہ وہ عورت کس کو ملے گی۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ جناب مجھے نہیں معلوم ایسی باتوں کے پوچھنے سے غرض یہ ہوتی ہے کہ جب یہ جواب نہ دے سکیں گے تو ہم کہیں گے کہ ہم نے ایسی بات پوچھی کہ اس کا جواب عالم سے بھی نہیں آیا۔ ہم ایسے بڑے ہیں ایسے ذہین ہیں اور بس۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ بعض باتیں آسان ہوتی ہیں اور

---

[1] سنن ابن ماجه: ۲۲۹، تفسير البغوى شرح السنة للبغوى ۷: ۲۵، كنز العمال ۲۸۷۵۱، ۲۸۸۷۳

پوچھنے کی بدولت سخت ہو جاتی ہیں چنانچہ جب حج فرض ہوا تو ایک صحابی نے عرض کیا **افی کل عام یا رسول اللہ**۔ آپ نے کچھ دیر سکوت فرمایا پھر ارشاد فرمایا اگر میں نعم کہہ دیتا، تو ہر سال حج کرنا فرض ہو جاتا اور تم لوگوں سے نہ ہو سکتا، مصیبت میں پڑ جاتے اور آپ نے ارشاد فرمایا کہ **ذرونی ماترکتکم** یعنی مجھ کو چھوڑے رکھو جو مناسب سمجھوں گا اس سے تم کو آگاہ کر دیا کروں گا۔ تم کھود کھود کر نہ پوچھا کرو۔ یہ وہ مصلحتیں تھیں۔ جو ممانعت سوال کی باعث تھیں اور اس وقت میرے خیال میں آئیں ممکن ہے کہ اور بھی مصلحتیں ہوں۔ بہرحال ممانعت سوال کی وجہ سے صحابہؓ دریافت کرنے میں بہت احتیاط کرتے تھے۔ بعض امور ان کے خیال میں آتے ہوں گے لیکن اس میں تردد ہو جاتا ہوگا کہ نا معلوم یہ باتیں ضروری ہیں یا نہیں ان کا پوچھنا بے ادبی تو نہیں ہے اس لئے ڈر کے مارے نہ پوچھ سکتے تھے یہ بھی ایک مرتبہ ہے جو حاصل کرنے کے قابل ہے کہ جو دل میں کھٹکے اسے ترک کر دیا جاوے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے **دع مایریبک الی مالا یریبک**[1] یعنی جس چیز سے تمہیں کھٹکا ہو اسے چھوڑ کر ایسی چیز اختیار کرو جس سے کھٹکا نہ ہو۔ پس خدائے تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کو اس لئے بھیجا تھا کہ وہ پوچھیں گے تو صحابہ کو بہت سی دین کی باتیں معلوم ہو جائیں گی۔

ترقی اور اسلام

اب یہ سمجھئے کہ میں نے اس وقت اس لئے احسان کے بیان کو اختیار کیا ہے کہ اس کی بڑی ضرورت ہے لوگ اس سے بالکل غافل ہو رہے ہیں احسان کے متعارف معنی جو اردو میں مشہور ہیں وہ یہاں مراد نہیں یہ عربی لفظ ہے اس کے معنی ہیں اچھا کرنا اور یہاں مراد ہے عبادت کو اچھا کرنا۔

اب دیکھئے اول تو لوگ عبادت ہی سے بھاگتے ہیں۔ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے دنیاوی کاموں میں دن رات لگے رہتے ہیں۔ ذرا ذرا سی باتوں کے لئے مشقت اٹھاتے ہیں۔ خصوصاً اگر تھوڑی سی بھی دنیاوی امید ہوتی ہے تو بڑی بڑی محنتیں کرتے ہیں اور مشقتیں اٹھانے میں دریغ نہیں کرتے لیکن عبادت میں کوتاہی کرتے ہیں اور دنیا طلبی میں سرگرم ہیں۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ اس کی (یعنی دنیا طلبی کی) اور ترغیب دی جاتی ہے کہ جلسے

[1] سنن الترمذی: ۲۵۱۸، سنن النسائی کتاب الأشربہ ب: ۳۸، مسند الإمام احمد ا: ۲۰۰، ۳: ۱۱۲، ۱۵۳

ہوتے ہیں، کمیٹیاں قائم ہوتی ہیں اور کوشش ہے کہ خوب مال و دولت کی حرص بڑھ جاوے ہوا و ہوس میں ترقی ہو۔ دن رات ترقی ترقی کی پکار ہو رہی ہے۔ ہوا و ہوس کا نام بدل کر ترقی رکھ دیا ہے۔ آخر اس سے مطلب کیا ہے یہی نا کہ مال خوب حاصل کیا جاوے۔ مکان بھی نہایت عالی شان ہو۔ کپڑے بھی نہایت قیمتی ہوں۔ اسباب بھی بیش بہا ہوں۔ غرض کہ دنیاوی عیش و سامان جمع کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی جاوے چاہے دین رہے یا جائے۔

لیکن یہ بھی معلوم رہے کہ ترقی کا مسئلہ حضور سرور عالم صلّی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہو چکا ہے آپ اس کا فیصلہ بھی فرما چکے ہیں جس کا نہایت معتبر اور سچا واقعہ اس طرح پر ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ آپ بالا خانے پر تشریف رکھتے تھے۔ وہاں صرف ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی آپ اس پر لیٹے ہوئے تھے۔ جسم شریف پر چٹائی کے نشان بن گئے تھے اور سرہانے کی جانب کچھ کچے چمڑے لٹک رہے تھے۔ پائنتی کی جانب کچھ ببول کی پتیاں پڑی ہوئی تھیں تا کہ ان چمڑوں کو ان سے دباغت دے لیا جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس حالت کو دیکھ کر رونے لگے۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور عرض کرنے لگے کہ یا حضرت قیصر اور کسریٰ وغیرہ جو شرک و کفر میں مبتلا ہیں خدا کی عبادت نہیں کرتے وہ تو چین و آرام سے گزاریں اور آپ اس تنگی کی حالت میں بسر کریں آپ دعا فرمائیے کہ خدا تعالیٰ آپ کی امت کو وسعت عنایت کریں۔ یہ حضرت عمرؓ کا ادب تھا کہ امت کی وسعت کے لئے دعا کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا **افی شک انت یاابن الخطاب**[1] کیا اے عمر بن خطاب تم اب تک شک ہی میں پڑے ہوئے ہو **اولئک عجلت لھم طیباتھم فی الحیوة الدنیا** ان کو لذیذ چیزیں دنیا میں جلدی سے مل گئیں مطلب یہ ہے کہ تمام آرام و آسائش کفار کو دنیا ہی میں مل گیا ہے آخرت میں وہ محروم رہیں گے اور ہم لوگوں کے لئے خدا تعالیٰ نے آخرت میں ذخیرہ کر رکھا ہے۔

اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کے افلاس اور تنگدستی کی شکایت کی تھی اور چاہا تھا کہ دعا کر دی جائے اور فراغت اور وسعت ہو جائے مال و دولت بافراط مل جائے

---

[1] مسند الإمام أحمد ۱:۳۴، سنن الکبری للبیهقی ۷:۳۸، تفسیر ابن کثیر ۸:۱۹، کنز العمال: ۴۶۶۳

خوب ہی آسائش اور آرام سے گزرنے لگے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ ترقی کی درخواست کی تھی اور چاہا تھا کہ جیسے کفار کو مال و دولت میں ترقی حاصل ہے اسی طرح مسلمان بھی ترقی کریں آپؐ نے فیصلہ فرمادیا ہے کہ ان کو یہاں مل گیا ہے ہم کو قیامت میں ملے گا۔

ایک یہ بات لوگ بہت کہا کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں ترقی کی ضرورت نہ تھی کیونکہ دوسری قومیں بھی ترقی یافتہ نہ تھیں۔ اب ضرورت ہے ان سے دریافت کرنا چاہئے کہ کیا اس زمانہ میں کسی نے ترقی نہ کی تھی۔ قیصر اور کسریٰ کی عیش پرستیاں اور عیش ونشاط کے سامان دیکھئے تاریخ پڑھئے مال و دولت میں آرام میں تزک اور احتشام میں کیا تھا جو ان کے پاس نہ تھا۔ عمدہ سے عمدہ سامان عشرت مہیا تھے اور مسلمانوں کے پاس وہ سامان اور اسباب نہ تھا پھر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی ارشاد فرمایا جو اوپر مذکور ہوا تو اب کیا باقی رہ گیا بلکہ اگر غور کیا جائے تو صحابہؓ کو افراط دنیا سے کچھ ضرر بھی نہ ہوسکتا تھا کیونکہ قلب نہایت قوی رکھتے تھے۔ خدا کی اطاعت فرمانبرداری ان کے دلوں اور رگ وریشہ میں گھری ہوئی تھی دل و جان سے احکام شرعیہ کی تعمیل پر آمادہ اور سرگرم رہتے تھے خدا کے خوف سے ہر وقت ترساں ولرزاں رہا کرتے تھے اور یہ بھی یقینی بات ہے کہ اگر کسی شخص کو سانپ پکڑنے اور اس کے زہر کے اثر نہ کرنے کا منتر یاد کرا دیا گیا ہو تو وہ سانپ کو بے کھٹکے پکڑ سکتا ہے اگرچہ سانپ اس کے ہاتھ میں ہو مگر وہ ہر طرح سے مطمئن ہے دنیا اگرچہ سانپ کی مثل تھی لیکن صحابہ کو اس کا منتر یاد تھا یعنی ذکر اللہ خدا کی یاد سے غافل نہ ہوتے تھے ایسی حالت میں ان کو دنیا سے کیا ضرر ہوسکتا تھا بخلاف ہم لوگوں کے منتر تو یاد نہیں اور سانپ کو پکڑنا چاہتے ہیں آخر اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ ہلاکت! جہاں ذرا اس نے ڈسا اور خاتمہ ہوا۔

صحابہ کرامؓ کی وہ حالت تھی کہ اس کا کچھ کہنا ہی نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کی دیانت، حق پرستی، قوت ایمان ایسے ہی تمام اخلاق وصفات موافقین کیا مخالفین کے نزدیک بھی مسلم الثبوت ہیں، ذرا ان کی حالت دیکھئے خلافت کا تو زمانہ اور کپڑے پیوند لگے پہنے ہوئے۔ چکنا سالن تک نہ کھاتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ آپ کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ نے آپ کی دعوت کی تھی اور گوشت پکا رکھا تھا جس میں گھی بھی

کسی قدر ڈالا تھا کھانا کھانے کے وقت حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا کہ میاں تم نے تو ایک سالن کے ساتھ دوسرا سالن بھی جمع کر دیا یعنی ایک تو گھی اس سے بھی روٹی کھائی جا سکتی ہے دوسرا گوشت کہ اس سے بھی روٹی کھا سکتے ہیں اس قدر اسراف اور تکلف کی ضرورت ہی کیا تھی۔ حضرت عبداللہؓ نے عرض کیا کہ میں نے اس مقدار معین سے زیادہ صرف نہیں کیا ہے۔ جس قدر خرچ لے کر گوشت خریدنے نکلا تھا اسی قدر میں بوجہ معمولی ہونے گوشت کے تھوڑے کا گوشت لے لیا اور باقی کا گھی خرید لیا آپ نے فرمایا کہ یہ بات صحیح ہے مگر میرے نزدیک غیر مناسب ہے القصہ آپ نے وہ کھانا نہیں کھایا۔

چھپر رہنے کو تھا کوئی بڑا محل نہ تھا دربان نہ تھے پہرہ چوکی نہ تھا۔ اپنے کام خود کر لیا کرتے تھے۔ راتوں کو گشت لگاتے تھے لوگوں کی حالت دریافت کرتے تھے۔ ضعفا اور مساکین کی خبر لیتے تھے پھر بھی آپ کی کیفیت اور حالت کو دیکھئے بغور ملاحظہ کیجئے کہ حضرت حذیفہؓ جن کا صاحب اسرار لقب ہے اس وجہ سے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو منافقین کے نام بتلا دیئے تھے تو حضرت عمرؓ ان کو قسم دے دے کر پوچھا کرتے تھے کہ سچ بتلانا کہیں میرا نام تو ان لوگوں میں نہیں ہے۔ جب تقویٰ اور خشیت کی یہ حالت ہو تو پھر اگر ایسے لوگوں کے پاس دنیا ہوئی تو ان کو کیا ضرر ہو سکتا ہے اب بتلایئے کہ اس زمانہ کے مناسب کیوں ہے کیا اس زمانہ میں کچھ ترقی نہیں ہوئی تھی اکاسرہ اور قیاصرہ کے پاس کس چیز کی کمی تھی اور صحابہ کو ضرر کا احتمال بھی نہ تھا۔

علاوہ اس کے اور تمام چیزوں میں بھی یہی عذر کیا کرتے ہیں۔ نماز کی نسبت کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں ضرورت تھی۔ جب نئے نئے مسلمان ہوئے تھے۔ کیونکہ بت پرستی حال ہی میں چھوڑی تھی اس لئے ضرورت تھی کہ خدا کی عبادت کریں تا کہ بتوں کا خیال دل سے نکل جائے۔

روزہ رمضان کے متعلق کہتے ہیں کہ پہلے زمانہ میں غصہ وغیرہ کا غلبہ تھا قوت کا زور تھا اس لئے ضرورت تھی کہ روزہ رکھیں تا کہ ضعف آ جاوے۔ وہ سختی جاتی رہی اب خود ہی لوگ ضعیف اور مہذب ہو رہے ہیں۔ اب کیا ضرورت ہے۔ رہا حج چونکہ وہ تجارت کا ذریعہ تھا۔ تجارت کے لئے لوگ جمع ہوا کرتے تھے حج کی بھی بیخ لگا دی۔ رہ گئی زکوٰۃ سو وہ تو ان کی ترقی

کے بالکل ہی خلاف ہے۔ تصویروں کے متعلق کہتے ہیں کہ پہلے لوگ بت پرستی کے ہورہے تھے اس کو اچھا سمجھتے تھے۔ اسلام لانے کے بعد پہلا خیال کچھ نہ کچھ دل میں بسا ہوا تھا۔ اگر تصویر وغیرہ رکھتے تو خیال سابق میں زیادتی ہوتی اور بت پرستی کا ذریعہ ہو جاتا اب کیا ضرورت ہے۔ اب تو بعض بت پرست قومیں بھی اس قباحت کو تسلیم کرتی ہیں اور مسلمانوں میں تو یہ پشت ہا پشت سے بت پرستی کا نام بھی نہیں۔ اب تصویر سے کیا حرج ہے۔

غرض طوفان بے تمیزی برپا کر رکھا ہے جو کچھ جی میں آتا ہے کہتے ہیں یہ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ اسلام ہی کی ضرورت نہیں۔ چلو چھٹی ہوئی۔ دعویٰ تو اسلام کا اور اس کے تمام احکام سے انکار، ہر چیز کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر دین سے انکار کرنا چاہتے ہیں صاف صاف انکار کرنا تو ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ لوگ برا کہیں گے اگرچہ بعض نے ہمت کر کے یہ بھی کہہ دیا کہ مذہب ہی مانع ترقی ہے۔

ایک کمیٹی لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ ترقی کے ذرائع اور موانع سوچنے کے متعلق وہاں ایک صاحب نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ مذہب ہی مانع ترقی ہے ایک صاحب نے وہیں خوب ہی جواب دیا اور کہا کہ واقعی یہی بات ہے لیکن مذہب کی طرح قانون بھی تو مانع ترقی ہے۔ جب مذہب سے دست بردار ہوتے ہو تو قانون کو بھی چھوڑ دو۔ چوری ڈکیتی کی جائے تو بہت سا مال جمع ہو سکتا ہے اگر موقع ہو اور کسی کے قتل سے مال ہاتھ آتا ہو تو اس سے دریغ کرنے کی کیا وجہ غصب کو بھی جی چاہتا ہوگا۔ پھر کون مانع ہے یہی تا کہ قانوناً ان امور کے مرتکب ہونے والے کو سزا ہوتی ہے ذرا خلاف قانون کریں تو خبر لی جائے۔

انصاف تو یہ تھا کہ اگر مذہب سے دست بردار ہوتے تھے تو قانون کو بھی چھوڑ دیتے اس کی بھی پروا نہ کرتے غضب ہے حکام ظاہری کے قانون کا تو اتنا خوف اور حاکم حقیقی اور تمام جہان کے بادشاہ یعنی اللہ تعالیٰ کے قانون میں یہ دلیری اور یہ گستاخی عجب اندھیرا ہو رہا ہے۔ دنیا میں انہماک ہے۔

عبادت کی صورت

ایسی حالت میں عبادت کی بھلا کہاں نوبت آ سکتی ہے۔ اگر کچھ لوگوں کو توفیق ہوئی بھی تو محض صورت عبادت کی ہوتی ہے معنی عبادت کی بالکل نہیں ہوتی معنی سے یہ عبادت محض معرا

ہوتی ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے بادام تو ہو اور اس میں مغز نہ ہو صرف پوست ہی پوست ہو یا جیسے دیوالی کی مورتیں اور تصویریں ہوتی ہیں کہ یہ کمہار ہے یہ لوہار وغیرہ ہے سب ہی کچھ ہے لیکن اصلیت نہیں۔ نام کو آدمی لیکن آدمیت نہیں۔ نام تو ہاتھی ہے اور کام کچھ نہیں کر سکتا کسی چیز کو لادنا تو در کنار وہ خود خریدنے والے اور بنانے والے پر لدا لدا پھرتا ہے اور اگر کوئی حاکم کسی سے کہے کہ ہمیں ایک آدمی کی ضرورت ہے اور کوئی شخص آدمی کی تصویر پیش کر دے کہ حضور اُس کو نوکری میں قبول فرما دیں تو کیا وہ حاکم اس بے وقوف نادان سے ناراض نہ ہوگا اور اس کی اس بیہودہ حرکت کو سخت بے ادبی اور گستاخی نہ سمجھے گا سزا نہ دے گا۔

تو پھر بڑے غضب کی بات ہے کہ ہم خدا کے سامنے اس نام کے آدمی یعنی صورت آدمی کے مثل صورت عبادت کو بے خوف وخطر پیش کریں اور گستاخی کا ذرا خیال تک نہ آئے۔ عبادت بے جان تو پیش کریں اور شرماویں نہیں۔

اب سمجھنا چاہئے کہ عبادت کی روح اور جان کیا ہے اس کی حقیقت اور صورت میں کیا فرق ہے کون سی چیز ہے جس کے ہونے سے صورت عبادت اصلی عبادت ہو جاتی ہے اس کا کیا درجہ ہے پس اس حدیث میں دیکھئے عبادت کے اچھا کرنے کی حقیقت بتائی ہے اور ظاہر ہے کہ کسی چیز کے اچھا ہونے کے کیا معنی ہوا کرتے ہیں۔ یعنی اس میں کوئی نقصان نہ ہو کوئی کسر نہ رہے۔ جیسی چاہئے ویسی ہی ہو۔ غرض ہر چیز کا اچھا ہونا اس کے مناسب جدا طریق سے ہوتا ہے مثلاً اچھی روٹی وہ ہوگی جس کا مادہ بھی اچھا، صورت بھی اچھی ہو جو اس کا ثمرہ ہے وہ بھی اچھا ہو۔

اسی طرح یوں کہا کرتے ہیں کہ فلاں طالب علم امتحان میں اچھا رہا۔ یعنی اس کی تقریر بھی اچھی اور تحریر بھی طرز بیان بھی خوب صاف تھا، مطلب واضح تھا حشو وزوائد سے کلام مبرا تھا یعنی تمام ضروریات مجتمع تھیں۔ کوئی حالت ایسی نہ تھی جس کی کمی رہ گئی ہو۔ اسی پر قیاس کر کے عبادت کے اچھا ہونے کے معنی بھی سمجھئے کہ جتنے امور کی عبادت میں ضرورت ہے۔ جو چیزیں واجب الاجتماع ہیں سب کی سب اس میں پائی جاویں کسی چیز کی کسر نہ رہے۔ یہ تو اجمالاً تھا۔

علم وعمل کی ضرورت

اب اس کی تفصیل کہ وہ کون کون سی چیزیں ایسی ہیں جن سے عبادت اچھی ہوتی ہے۔

شرائع میں غور کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے لوگ عموماً غلطی کرتے ہیں اور صرف صورت اور نقل عبادت ہی کو عبادت سمجھتے ہیں یعنی فقہاء نے جو ضبط کردیا ہے قیام، رکوع، سجدہ، قعدہ، قومہ وغیرہ۔ اس میں شک نہیں جو کچھ فقہا نے لکھا ہے وہ ٹھیک ہے اور جو فقہ کا موضوع تھا اس کے موافق انہوں نے لکھا ہے لیکن یہ تو کہیں نہیں لکھا کہ تمام امور میں جن کو عبادت سے تعلق ہے اس میں منحصر ہیں شریعت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں کے ساتھ اور کچھ بھی ہے اس فقہ کے ساتھ ایک دوسری فقہ یعنی معنی شرع کا بھی اعتبار ہے۔ اس معنوی فقہ کو تصوف کہتے ہیں تصوف کو علیحدہ اور الگ کتابوں میں لکھنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ فقہ سے خارج ہوجاوے۔ یہ علیحدگی ایسی ہے جیسے فقہ مذکورہ میں کتاب الزکوٰۃ اور کتاب الصلوٰۃ الگ الگ کتابیں ہیں۔ کتاب الصلوٰۃ کے مسائل کتاب الزکوٰۃ میں نہیں ملیں گے اور کتاب الزکوٰۃ کے کتاب صلوٰۃ میں۔ اس سے کوئی یہ نہیں سمجھتا کہ کتاب الزکوٰۃ یا کتاب الصلوٰۃ فقہ میں داخل نہیں۔ اسی طرح کتاب التصوف بھی ہے اگرچہ اس کی کتابیں الگ ہیں۔ اگر کوئی ہدایہ کی ہر ہر کتاب کو الگ الگ چھاپ دے تو کیا کتاب الصلوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ وغیرہ ہدایہ سے خارج ہوجاویں گی؟ نہیں ہرگز نہیں۔ اسی طرح توحید اخلاص یا کبر، تواضع عجب وغیرہ اخلاق حمیدہ اور رذیلہ کے احکام بھی فقہ میں داخل ہیں عموماً لوگ نماز میں قیام رکوع وغیرہ ہی کو عبادت کی حقیقت سمجھتے ہیں اور اسی میں عبادت کو محصور جانتے ہیں عوام تو عوام طالب علموں کی بھی شکایت ہے ہم لوگوں کی خود حالت قابل افسوس ہے۔ ہاں اہل علم خود اس کی طرف توجہ نہیں کرتے۔

میں دیکھتا ہوں کہ لوگوں کو علم کی فکر ہے لیکن عمل کی نہیں۔ بڑا اہتمام اس کا ہوتا ہے کہ ہم ساری کتابیں پوری کرلیں ہدایہ بھی، صدرا بھی، شمس بازغہ بھی لیکن عمل کرنے کی ذرا بھی پروا نہیں قوت عملیہ اس درجہ ضعیف ہورہی ہے اس درجہ اس میں خلل آگیا ہے اس قدر مختل ہورہی ہے جس کا حساب نہیں ایسی ایسی خفیف حرکات کرتے ہیں جس سے افسوس ہوتا ہے بہت سے معاصی ہیں کہ ان میں شب و روز مبتلا ہیں اور خیال بھی نہیں آتا کہ ہم نے کوئی گناہ بھی کیا۔ کسی کی چیز بلا اجازت اٹھالی اور جہاں چاہا ڈال دی۔ کسی کی کتاب بلا اجازت لے لی اور ایسی جگہ رکھ دی کہ اس کو نہیں ملتی۔ وہ پریشان ہورہا ہے۔ کسی سے کسی اچھے کام کا وعدہ کیا اور اس کے پورا

کرنے کی اصلاً فکر نہیں۔اسی طرح سینکڑوں قصے ہیں کہاں تک بیان کئے جاویں۔

لیکن باوجود ان سب باتوں کے پھر بھی ان کے علم وفضل میں شک نہیں ہوتا حالانکہ فقط کسی چیز کا جان لینا کوئی ایسا کمال نہیں یوں تو شیطان بھی بہت بڑا عالم ہے۔ بڑے بڑوں کو بہکاتا ہے۔ تفسیر میں وہ ماہر حدیث سے وہ واقف فقہ میں وہ کامل، کیا ہے جس کو وہ نہیں جانتا اور اگر زیادہ نہ جانتا ہوتا تو علماء کو بہکا کیسے سکتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی فن میں ماہر ہوتا ہے جب ہی تو وہ اپنے سے کم جاننے والے کو دھوکا دے سکتا ہے اس میں (یعنی شیطان میں) اگر کمی ہے تو صرف اسی بات کی کہ اپنے علم پر عمل نہیں کرتا چنانچہ حدیث شریف میں بھی آیا ہے ایسا علم جو عمل کے لئے نہ ہو جہنم کا ذریعہ ہے۔

خشوع کی اہمیت

اس حدیث میں لیجادل به العلماء ولیماری به السفهاء[1] وغیرہ الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ ہم لوگ ایسے غافل ہو رہے ہیں کہ اپنی اصلاح کی ذرا فکر نہیں کرتے بعض لوگ گو قصداً گناہ نہیں کرتے لیکن بے پروائی کی وجہ سے ان سے گناہ ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی شکایت کے قابل ہیں۔ اگر کوئی ملازم سرکاری بے پروائی کرے اور کام خراب کر دے تو اس سے باز پرس نہیں ہوگی؟

لوگوں نے عبادت کا ست نکال لیا ہے مثلاً بظاہر اٹھ بیٹھ لئے اور نماز ادا ہوگئی۔ خصوصاً اہل علم بھی اس کا خیال نہیں کرتے کہ سوائے ظاہری قیام قعود کے اور بھی کچھ ہے اور وہ ضروری بھی ہے۔ جس قرآن میں قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ ہے، اسی میں خاشعون بھی آیا ہے جب صلاتهم کے لفظ سے نماز کو مطلوب شرعی سمجھتے ہیں تو کیا وجہ ہے خاشعون سے خشوع کو مطلوب نہیں سمجھتے۔ اسی طرح اور مقامات سے پتہ چلتا ہے کہ خشوع بھی ویسا ہی ہے جیسے قیام و رکوع وغیرہ۔ اس غلطی کو دفع کرنا بہت ضروری ہے۔ ایک کو تو ضروری سمجھیں اور دوسرے کو ضروری نہ سمجھیں حالانکہ دونوں حکم یکساں ضروری ہیں یہ خشوع ہی ہے جس سے عبادت اچھی ہوتی ہے احسان اسی سے حاصل ہوتا ہے۔ احسان کے متعلق تین چیزیں ہیں۔

---

[1] سنن ابن ماجه: ۲۵۳، إتحاف السادة المتقين ۱: ۳۸۱، حلية الأولياء ۷: ۹۶

اول احسان کا ضروری ہونا۔ دوسرے احسان کی حقیقت۔ تیسرے تحصیل طریق احسان۔

اجمالاً اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ احسان خشوع سے حاصل ہوتا ہے اور خشوع کا مطلوب ہونا قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الخ سے معلوم ہو چکا ہے اب اس کا ضروری ہونا سنئے۔ خدائے تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ.

(کیا ایمان والوں کے لئے اس بات کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل نصیحت اور دین حق (جو منجانب اللہ) نازل ہوا ہے اس کے سامنے جھک جائیں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو ان کے قبل کتاب ملی تھی پھر ان پر زمانہ گزر گیا (اور توبہ نہ کی) پس ان کے دل سخت ہو گئے)

یہاں ذکر اللہ میں خشوع کی ضرورت کا بیان ہے اور ذکر اللہ میں ساری عبادتیں آ گئیں۔ دیکھو عبادت میں خشوع نہ ہونے پر کیسی وعید ہے شکایت کی ہے کہ اور یہود نصاریٰ سے تشبیہ دے کر ذکر کیا ہے کہ ایسے نہ بنو۔ اس سے ظاہر ہے کہ ترک خشوع کیسی بری چیز ہے جس کے باعث کفار کے ساتھ آدمی مشابہ ہو جاتا ہے اور اس کا ثمرہ بیان فرمایا ہے فقست قلوبھم قساوت قلب نہایت بری چیز ہے قرآن شریف میں آیا ہے:

فَوَيْلٌ لِّلْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ اُوْلٰٓئِكَ فِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ.

یعنی تباہی اور ہلاکت ہے ان کو جن کے دل خدا کی یاد سے سخت ہو رہے ہیں۔ وہ لوگ کھلی گمراہی میں پڑے ہیں۔

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ارشاد فرماتے ہیں قلب قاسی خدا سے بہت دور ہے ان نصوص سے ثابت ہوا کہ قساوت بری چیز ہے اور خشوع ضروری ہے لیکن خرابی یہ ہو رہی ہے کہ لوگ خشوع کی حقیقت نہیں سمجھتے۔ اسی وجہ سے اس کی فکر بھی نہیں کرتے۔ جو شخص کسی چیز سے واقف نہ ہوگا وہ اس کو حاصل کیا کرے گا۔ عموماً لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خشوع کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے سوا کسی کا خیال نہ آوے۔ ایسی مدہوشی ہو جاوے کہ تیر برچھا کچھ ہی لگے اس کی خبر نہ ہو۔ یعنی انسان جماد کی طرح بن جاوے، آدمیت سے گزر جاوے، کوئی پوچھے یہ معنی لکھے

کہاں ہیں اور کس نے لکھے ہیں۔اس کا کچھ جواب نہیں اور واقعی کہیں بھی یہ معنی نہیں لکھے۔ یہ شبہ کم فہم اور غیر شفیق واعظوں کی بدولت پڑا ہے انہوں نے ایسی حکایتیں بیان کیں جن سے لوگ دھوکا میں پڑ گئے پڑھے لکھے لوگ بھی اس سے ناواقف ہیں اور کیوں نہ ہوں۔ان کے درس میں کوئی تصوف کی کتاب تو ہے نہیں لیکن عام لوگوں کے سنانے کے لئے موجود ہو گئے امراض قلبی اور امراض باطنی کے علاج کرنے پر آمادہ ہیں۔ وعظ و نصیحت کرنے پر مستعد حالانکہ خود نہیں سمجھتے۔ان کی تو ایسے شخص کی مثال ہے جس نے نہ طب پڑھی، نہ مطب کیا اور علاج کرنے لگا۔علاج کے لئے پہلے طب پڑھنا ضروری ہے اور پھر مطب کرنا بھی لازمی ہے بغیر اس کے قابلیت علاج نہیں آ سکتی ایسے ہی مدارس کی نسبت کسی نے کہا ہے۔

ایها القوم الذی فی المدرسة کل ماحصلتموه وسوسه
علم نبود غیر علم عاشقی مابقی تلبیس ابلیس شقی

(اے قوم جو کچھ تم نے مدرسہ علم میں حاصل کیا وہ وسوسہ تھا علم عاشقی کے علاوہ جو علم بھی ہے وہ ابلیس شقی ہے۔)

جیسے کنز و ہدایہ ضروری ہے ویسے ہی ابو طالب مکی کی قوت القلوب اور امام غزالی کی اربعین اور شیخ شہاب الدین کی عوارف کا پڑھنا بھی ضروری ہے یہ گویا طب پڑھنا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے۔

قال را بگذار مرد حال شو پیش مرد کاملے پامال شو

(قال کو چھوڑ، حال پیدا کرو یہ اس وقت ہوگا جب کسی اہل اللہ کے قدموں میں جا پڑو)

کیسی ناانصافی ہے کہ جب دس برس علم ظاہری کی تحصیل میں صرف کئے تو دس ماہ تو باطن کی اصلاح میں صرف کرو اور اس کا یہی طریق ہے کہ کسی کامل کی صحبت میں رہو۔اس کے اخلاق، عادات، عبادات کو دیکھو کہ غصہ کے وقت اس کی کیا حالت ہوتی ہے۔شہوت کے وقت وہ کیسی حالت میں رہتا ہے خوشامد کا اس پر کہاں تک اثر پڑتا ہے اسی طرح تمام اخلاق کا حال ہے کیونکہ پھر جب کبھی اس کو غصہ آئے گا تو سوچے گا کہ اس کامل کی غصہ کے وقت کیا حالت ہوئی تھی۔ہم بھی ویسا ہی کریں۔اس کے اخلاق و عادات پیش نظر ہو جاویں

گے۔ یہ اس کا مطلب ہوا۔ چنانچہ کہا ہے۔

اے بیخبر بکوش کہ صاحب خبر شوی　　　　تاراہ بیں نباشی کے راہبر شوی

درمکتب حقائق پیش ادیب عشق　　　　ہاں اے پسر بکوش کہ روزے پدر شوی

(اے بے خبر کوشش کر کہ صاحب خبر ہو جائے جب تک راستہ دیکھنے والا نہ ہوگا راستہ دکھانے والا کیسا ہوگا، اس لئے حقائق کے مدرسہ میں ادیب عشق کے سامنے کوشش کر ایک نہ ایک روز باپ (لین صلح) بن جائے گا)

واعظوں کی خرابیاں

ساری خرابیاں ان ہی نا عاقبت اندیش واعظوں کی ڈالی ہوئی ہیں ایسی ایسی حکایتیں بیان کرتے ہیں جس سے لوگ سمجھتے ہیں کہ عمل کرنا بہت دشوار ہے اور جو کچھ کرتے ہیں، ایسی حکایتوں کی وجہ سے اس کو بھی چھوڑ بیٹھے ہیں۔

مثلاً طلب حلال کے متعلق یہ حکایت بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص حلال روزی کی طلب میں نکلے۔ ایک ایسے شخص کے پاس پہنچے جس کے پاس حلال روزی کی خبر لگی تھی۔ اس نے جواب دیا، تھی تو میرے پاس لیکن چند روز سے حلال نہیں رہی۔ اتفاق سے میرا بیل دوسرے کے کھیت میں چلا گیا۔ دوسرے کھیت کی مٹی اس کے پیر میں لگ کر میرے کھیت میں آگری ہے اس لئے اب روزی حلال نہیں رہی۔

محض مستبعد بات ہے اول تو یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی کے بیل کھیت ہی میں ہمیشہ رہا کریں۔ باہر نکلنے کی نوبت ہی نہ آئے اگر ہو بھی تو اس سے کہیں حرمت آتی ہے اور تمام امور سے قطع نظر کرکے اگر اس کی کوئی توجیہ بھی ہو تو اس بزرگ کی خاص حالت ہوگی عام تکلیف تو نہیں دی جاسکتی اب ظاہر ہے کہ اس حکایت کو سن کر یہ خیال پیدا ہوگا کہ حلال روزی تو ممکن نہیں۔ اس لئے پھر خوب دل کھول کر حرام ہی کمایا جائے۔ جس طرح ملے چوری سے، دغا بازی سے، رشوت سے سود سے سب لینا چاہئے اور اس طرح تباہ ہو جاتے ہیں ایسی باتیں بیان کرنے سے ان کی غرض ہوتی ہے کہ وعظ میں ذرا رنگ آجائے نئی بات ہونے کی وجہ سے لوگوں کے پسند آئے خوب واہ واہ ہو۔ شریعت میں ہرگز ایسی تنگی نہیں ہے۔

اس تنگی کی تو ایسی مثال ہے جیسے ایک بخیل صاحب کی حکایت ہے کہ ایک دفعہ بے چراغ بڑھائے ہوئے نماز پڑھنے کو مسجد چل کھڑے ہوئے راستہ میں یاد آیا کہ یہ فضول خرچی ہے لوٹ کر چراغ گل کرنے آئے لونڈی نے پوچھا خیر تو ہے حضور کیسے لوٹ آئے۔ اتنی فضول خرچی ہوئی کہ آپ کے یہاں تک آنے میں جوتا گھس گیا ہوگا۔ بڑے خوش ہوئے اور جواب دیا کہ چراغ جلتا چھوڑ گیا تھا اس کے بجھانے کو آیا ہوں۔ اس نے جواب دیا کہ میں نے پہلے ہی گل کر دیا تھا۔ وہ بولے کہ شاباش تو بڑی محتاط ہے اور تجھے فکر ہے کہ کوئی فضول خرچی نہ ہو حتیٰ کہ میرے جوتے گھسنے کا بھی خیال ہے لیکن سمجھ لے کہ میں نے لوٹتے وقت جوتا اتار کر بغل میں دبا لیا تھا۔

لاحول ولاقوۃ الا باللہ شریعت ایسی مہمل باتوں سے پاک ہے ایسی تنگی اس میں کہاں؟ بلکہ جب حلال صورتیں بکثرت بتلائی جائیں گی تب توفیق عمل کی ہوگی حلال روزی کی فکر کریں گے سمجھ لو کہ ہدایہ وکنز وغیرہ میں تو جو چیزیں حلال لکھی ہیں وہ بلا شبہ حلال ہیں۔ اس میں ذرا شک نہیں بات کیا ہے کہ اہل باطن مغلوب الحال تھے یہ ان کی حکایتیں ہیں عوام کے سامنے اس کو بیان کر دیا۔ یہ تو وہی مثل ہے کہ ایک شخص کو پیچش کا عارضہ تھا حکیم صاحب نے اس کے لئے دہی خشکہ تجویز فرمایا اور ایک شخص کو ضعف دماغ تھا۔ اس کے لئے مقوی چیزیں گوشت، یخنی، دودھ، قورمہ تجویز کیا۔ اب اگر پیچش والا سن کر اس پر عمل کرنے لگے تباہ نہیں ہوگا تو کیا ہوگا مرے گا۔

اسی طرح جو حالات بیان کئے تھے سچ تھے لیکن یہ کس کے تھے اہل باطن کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہر سچی بات بیان کر ہی دی جائے لوگ سمجھتے ہیں کہ یہی خشوع ہے اور یہی بڑا کمال ہے کہ تیر بھی لگے تو خبر نہ ہو حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کون ہوسکتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ نماز کو ذرا طویل کروں لیکن کسی بچہ کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو مختصر کر دیتا ہوں کہ اس کی ماں پریشان ہو جائے گی۔

اب بتلایئے کہ یہ کمال کی حالت ہے یا وہ، تیر کی خبر نہ ہونا بھی ایک حالت ہے جسے استغراق ومحویت کہتے ہیں۔ لیکن وہ خشوع نہیں ہے نماز کے معنی اگر کوئی بیان کرے کہ صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک نہ کھانا تو یہ غلط ہے اگرچہ نماز بھی کوئی چیز ہے لیکن یہ

نماز نہیں ہے اسی طرح یہ حالت تو ضرور لیکن یہ خشوع نہیں ہے۔

یہ تو ایسی ہی بات ہوئی جیسے کہ ایک مرتبہ مقدمہ پیش ہوا۔ مدعا علیہ نے گواہ پر جرح کی کہ نماز نہیں پڑھتا۔ اس نے کہا کہ واہ صاحب میں تو حج بھی کر آیا ہوں۔ قاضی نے اس سے پوچھا کہ اچھا بتلا زمزم کیا ہے اور عرفات کیا چیز ہے؟ اس نے جواب دیا کہ زمزم ایک بوڑھا آدمی ہے اور عرفات ایک باغ ہے جس میں وہ بوڑھا بیٹھا ہوا ہے قاضی نے کہا کہ کیا غلط کہتا ہے فضول بکتا ہے، ہم نے خود حج کیا ہے زمزم ایک کنویں کا نام ہے اور عرفات ایک جنگل ہے اس نے کہا جب میں گیا تھا اس وقت تو یہی تھا آپ کے جانے کے وقت بدل گیا ہوگا۔

خشوع کے معنی یہ کہنا کہ کچھ خبر نہ ہوا ایسا ہی ہے جیسے حاجی کاذب نے کنویں اور عرفات کی حقیقت بیان کی تھی۔ ہاں اس کا انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ بھی ایک حالت ہے۔ جیسے عرفات و زمزم کا وجود واقعی تھا گو جو وہ کہتا تھا نہ تھا۔ گو بعض لوگ سرے سے اس حالت ہی کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ امر خلاف فطرت ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی شخص نماز پڑھتا ہو اس طرح کہ اس کو تیر لگنے کی خبر نہ ہو۔ اس منکر کی تو ایسی مثال ہے جیسے کوئی مادر زاد عنین لذت جماع کا انکار کرے یا کوئی مادر زاد اندھا کہے کہ لوگ جس کو دیکھنا کہتے ہیں وہ کوئی چیز نہیں حالانکہ ایسے واقعات ثابت ہوئے ہیں۔

امام مالک حدیث شریف کا بیان کر رہے تھے، ان کی آستین میں کہیں سے کم بخت ایک بچھو گھس گیا تھا۔ وہ ڈنک مارتا تھا جس کے صدمہ سے ان کا چہرہ متغیر ہو جاتا لیکن اف نہیں کرتے تھے۔ اور برابر حدیث شریف کا بیان کرتے رہے۔ حتیٰ کہ گیارہ بار اس نے نیش زنی کی جب گھر میں آ کر کرتہ اتار تو کرتے میں خادم نے بچھو کو دیکھ کر عرض کیا کہ آپ نے اس وقت کیوں نہیں اظہار فرمایا جواب دیا کہ مجھے شرم آئی کہ حدیث شریف کے بیان کے وقت دوسری طرف متوجہ ہوں۔

لیکن باوجودیکہ خشوع کے یہ معنی نہیں کہ دوسرا خیال نہ آوے جو شخص خشوع کی حقیقت نہ سمجھے گا سخت غلطی میں مبتلا ہوگا سمجھے گا کہ دوسرا خیال تو رک نہیں سکتا اور بندہ خشوع کا ہے مکلف، اس لئے لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی وسعت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتے) میں شک کرنے لگا۔ ایسی حکایتوں سے یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے۔

خشوع کی حقیقت

اب چاہئے کہ خشوع کی حقیقت کو خوب سمجھ لیا جائے پہلے لغت کے موافق اس کے معنی بیان کئے جاتے ہیں پھر شرعیات سے اس کی تائید کردی جائے گی اس سے معلوم ہوجائے گا کہ خشوع کیا چیز ہے خشوع کے معنی ہیں دب جانا پست ہوجانا یعنی سکون، جیسا کہ اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے۔

وَمِنْ اٰيَاتِهٖ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَا اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ

(یعنی منجملہ اس کی (قدرت اور توحید کی) نشانیوں کے ایک یہ ہے کہ اے مخاطب تو زمین کو دیکھ رہا ہے کہ دبی دبائی پڑی ہے پھر جب اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ ابھرتی ہے)

چونکہ اهتزت وربت سے خاشعة کا مقابلہ کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ اہتزاز اور بڑھنے اور ابھرنے میں حرکت ہے تو خاشعة کے معنی سکون اور پستی والے کے ہوں گے اور اس مقابلہ سے ثابت کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ خود لغت شاہد ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر شے کی حرکت وسکون جداگانہ ہوتا ہے مثلاً اگر کہا جاوے کہ ہاتھ چل رہا ہے تو اس کے معنی ہلنے اور نقل مکانی کے ہوں گے اور اگر کہا جاوے کہ فلانے کی طبیعت خوب چلتی ہے تو یہاں یہ معنی نہیں مراد ہوں گے بلکہ یہاں اور معنی ہوں گے یعنی ذکر کرنا اور سوچنا جب یہ معلوم ہوگیا تو اب سنئے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو دو قسم کی چیزیں عنایت فرمائی ہیں ظاہر اور باطن یا یوں کہو کہ جوارح اور قلب پس کمال خشوع کے یہ معنی ہوئے کہ جوارح بھی ساکن رہیں اور قلب بھی لیکن دونوں کا سکون جدا جدا ہے۔

جوارح کا سکون تو یہ ہے کہ ادھر ادھر دیکھے نہیں، ہاتھ پیر نہ ہلائے اور اس کے مقابلات کا نام حرکت ہوگا اور قلب کا سکون اس کی حرکت کے مقابل ہے۔ حرکت تو یہ ہے کہ خیال کرنا، تصور کرنا، فکر کرنا یعنی سوچنا فعل اختیاری ہے اور قدرت واختیار ضدین سے متعلق ہوتا ہے پس جب یہ حرکت اختیاری ہے تو اس کے مقابل سکون بھی یعنی نہ سوچنا اختیاری ہوگا۔ اور آدمی اختیاری ہی چیزوں میں مکلّف ہوتا ہے لہٰذا خشوع کے معنی یہ ہوں کہ اپنے اختیار سے دوسرا خیال نہ لانا۔ یہ نہیں کہ دوسرے خیال کا دل میں نہ آنا یہ دونوں

چیزیں الگ الگ ہیں خیال کا آنا تو اختیاری نہیں ہے اور خیال کا لانا اختیاری ہے پس خشوع کے یہ معنی ہوئے کہ اپنے اختیار سے دوسرے خیالات دل میں نہ لاوے رہا اگر کوئی خیال بلا اختیار آوے تو وہ خشوع کے منافی نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض صحابہؓ نے پوچھا کہ ہمارے دل میں ایسے ایسے خیالات آتے ہیں کہ جل کر کوئلہ ہو جانا ان سے آسان معلوم ہوتا ہے آپؐ نے فرمایا او جد تموہ قالو انعم قال ذلک صریح الایمان یعنی آپؐ نے دریافت فرمایا کیا تم نے اس کو پایا ہے یعنی کیا ایسے خیالات آتے ہیں۔ لوگوں نے عرض کیا کہ ہاں آپ نے فرمایا یہ تو صریح ایمان ہے اور کیوں نہ ہو چور تو وہیں آتا ہے جہاں مال ہو متاع ہو۔ اسی طرح شیطان وہیں آتا ہے جہاں متاع ایمان ہو۔ مولانا روم فرماتے ہیں۔

دیو آید سوئے انساں بہر شر　　　پیش تو ناید کہ از دیو بتر

(شیطان تو انسان کی طرف شر کے لئے آتا ہے تیرے پاس نہ آئے گا کہ تو شیطان سے بدتر ہے)

شیطان بڑا استاد ہے اپنا فضول وقت ضائع نہیں کرتا جو خود شیطان بن گیا ہے اس کو بہکانے کی کوشش نہیں کرتا۔ ہاں جس میں کچھ ایمان باقی ہے اسی کی فکر میں رہتا ہے اپنی دھن کا پکا ہے ایمانداروں ہی کے پیچھے پڑا رہتا ہے ہم لوگوں کو تو اس سے اس خاص صفت میں سبق حاصل کرنا چاہئے تھا۔

ایک چور نہایت نامی تھا ہمیشہ چوری کیا کرتا تھا آخر ایک مرتبہ سولی دے دی گئی حضرت جنید نے دوڑ کر اس کے پیر چوم لئے لوگوں نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ اس کی استقامت قابل تعریف ہے اگر ہم خدا کی اطاعت میں ایسی استقامت کریں تو ہمارے مدارج کا کہیں ٹھکانا ہی نہ رہے۔

اپنے کام میں لگا رہنا چاہئے اور وسوسے اور خیالات کی کچھ پروا نہ کرنا چاہئے بڑے بڑے خطرات جن پر عمل نہ ہو مگر طبیعت منقبض ہو ان کی پروا نہ کرے نہ الجھے بزرگوں کو ہی آتے ہیں، فاسقوں کو ایسے خیالات نہیں آتے اور ان وساوس سے پریشانی کا باعث یہی ہے کہ کسی طبیب قلب کی صحبت نہیں نصیب ہوئی۔ اگر کوئی جاننے والا مل جاتا، تو کہہ دیتا کہ اگر وسوسے آتے ہیں تو آنے دو کچھ پروا نہ کرو۔ قلب کی حالت تو شاہی سڑک کی سی ہے کہ اس پر حاکم رئیس اور ادنیٰ چمار دونوں گزرتے چلتے جاتے ہیں۔

بحر تلخ و بحر شیریں ہمعناں درمیاں شاں برزخ لایبغیاں

(بحر تلخ اور بحر شیریں دونوں برابر جاری ہیں مگر ان کے درمیان ایسا پردہ حائل ہے جس کی وجہ سے باہم مختلط اور مشتبہ نہیں ہوئے)

شیطان کی حالت کتے کی سی ہے۔ کتا بھونکا کرے اور التفات نہ کیا جائے تو آپ چپ ہو جاتا ہے اور اگر اس کی طرف متوجہ ہو کر اس کو دفع کرنا چاہئے اور زیادہ غصہ کر کر کے بھونکتا ہے اسی طرح وساوس شیطانی کی طرف التفات ہی نہ کرے۔ کیونکہ شیطان سے جو دبتا ہے اور اس کا خیال رکھتا ہے اس کے سامنے آ موجود ہوتا ہے وسوسہ پر جو غمگین ہوگا وہ سخت پریشان ہوگا بلکہ جب وسوسہ آئے تو اور خوش ہونا چاہئے کہ الحمد للہ دولت ایمان موجود ہے اگر آدمی میں قوت توکل اور اعتماد علی اللہ کی صفت ہو تو ایک شیطان کیا اگر لاکھ شیطان ہوں تو کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ہاں قصداً خیال کا لانا بے شک منافی خشوع اور حضور قلب کے ہے۔

اب اس تقریر سے ذہن نشین ہو گیا ہوگا کہ خشوع اور حضور قلب اختیاری ہے اور نہایت آسان ہے۔

حضور قلب کا طریق

لیکن تاہم جب تک طریق نہ معلوم ہو اور اس پر عمل نہ کیا جائے کامیابی نہیں ہو سکتی کپڑا سینا آسان ہے ہر شخص جانتا ہے کہ کیسے کپڑا سیتے ہیں لیکن سینا جب ہی آ سکتا ہے کہ کسی درزی سے طریقہ سیکھا جائے اور اس پر عمل کیا جائے اسی طرح حضور قلب کا حال ہے اس طریق کا سمجھنا ایک مقدمہ پر موقوف ہے یہ مسئلہ عقل ہے کہ:

النفس لاتتوجه الی شیئین فی ان واحد

یعنی پوری توجہ ایک ہی چیز کی طرف ہوا کرتی ہے ایک آن میں

اگر دو چیزیں خیال میں ہوں تو سمجھنا چاہئے کہ دونوں میں سے کسی کی طرف بھی پوری توجہ نہیں یا دو چیزیں نظر آتی ہیں تو توجہ کامل دونوں میں سے ایک کی طرف بھی نہیں۔ جس چیز کو آدمی گھورتا ہے اسی کی طرف دیکھنے میں توجہ ہوتی ہے اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ طریقہ یہی ہے کہ ایک کا خیال رکھیں تو دوسرے خیالات خود دفعہ ہو جائیں گے اور کوئی خیال نہ آئے گا

کیونکہ اگر یہ کوشش کی جائے کہ ایک ایک کر کے خیالات دفع کئے جائیں تو سخت دشواری پیش آئے گی اور دفعہ ہونا ناممکن ہو جائے گا کیونکہ اول تو دیکھی ہوئی چیزیں انسان کی بکثرت ہیں پھر علاوہ اس کے انسان کی قوت متفکرہ متخیلہ کو ترکیب دے دے کر بے تعداد فرضی صورتیں اختراع کیا کرتی ہے۔

مثلاً آپ نے دوسر کا آدمی کبھی نہیں دیکھا ہوگا لیکن یہ قوت متفکرہ ایک دھڑ اور دوسر کو جوڑ کر خیالی صورت بنا کر سامنے کھڑی کر دیتی ہے اور انسان کو معلوم ہونے لگتا ہے کہ دوسر کا آدمی ایسا ہو سکتا ہے۔

بہر حال ایک ایک خیال کو دفع کرنا بہت دشوار اور بڑی ہی مصیبت ہے۔ کبھی بھول کر بھی خیالات دفع کرنے کے پیچھے مت پڑو۔ بس اس کا طریقہ یہی ہے کہ کسی ایک چیز کی طرف دھیان لگا دو۔ اس دھیان کے باندھتے ہی سارے خیالات خود بخود ہٹ جاویں گے بعض سالکین نے ناواقفی کے باعث ہجوم وساوس سے پریشان ہو کر خودکشی کر لی ہے یہ کیوں ہوا؟ اس لئے کہ یا تو ان کو شیخ نہیں ملا یا شیخ کی تعلیم کی قدر نہیں کی۔ شیخ جس پر یہ امور گزرے ہوتے ہیں جانتا ہے اور بتلا سکتا ہے۔ ایسی پریشانی کی حالت کو قبض کہتے ہیں اس عبادت میں بھی مزہ نہیں آتا اور جی گھٹتا ہے اور جی گھٹنے کی وجہ یہ ہے کہ لذت نہیں ملتی۔ ہم لوگوں کی عجب حالت ہے عبادت بھی ایسی کرنا چاہتے ہیں جس میں حظ نفسانی ملے۔ عبادت بھی چاہتے ہیں تو مزے دار حالانکہ مزہ مطلوب نہیں ہے بلکہ تعبد مطلوب ہے البتہ مزہ سے عبادت سہل ہو جاتی ہے غرض طالب کی یہ حالت ہونا چاہئے۔

خوشا وقت شوریدگان غمش	اگر ریش بینند وگر مرہمش
گدایان از پادشاہی نفور	بامیدش اندر گدائی صبور
دما دم شراب الم درکشند	اگر تلخ بینند دم درکشند
اگر مرد عشقے غم خویش گیر	وگرنہ رہ عافیت پیش گیر
مترس از محبت کہ خاکت کند	کہ باقی شوی چوں ہلاکت کند

''اس کے غم کے پریشان لوگوں کا اچھا وقت ہے اگر زخم دیکھتے ہیں اور اگر اس پر مرہم رکھتے ہیں ایسے فقیر کہ بادشاہی سے نفرت کرنیوالے اور اس کی امید پر فقیری میں قناعت

کرنیوالے ہیں ہر وقت رنج کی شراب پیتے ہیں اور جب اس میں رنج کی کڑواہٹ دیکھتے ہیں تو خاموش ہو رہتے ہیں اگر عاشق ہے تو محبوب کے عشق میں آپ کو فنا کر ورنہ اپنی آسائس کی راہ اختیار کر۔ مت ڈر کہ محبت تجھ کو خاک کر دے گی اس لئے کہ اگر تجھ کو ہلاک کرے گی تو بقائے جاودانی تجھ کو عطا کرے گی''

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق   ثبت است برجریدۂ عالم دوام ما

باغباں گر پنج روزے صحبت گل بایدش   برجفائے خار ہجرا صبر بلبل بایدش

اے دل اندر بند زلفش از پریشانی منال   مرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

''باغبان کو اگر صحبت گل کی خواہش ہے تو اس کو بلبل کی طرح ہجر کے کانٹوں کی اذیت پر صبر کرنا چاہئے۔ اے دل محبوب کی زلف کے پھندے میں پھنس کر پریشانی سے گریہ و زاری مت کر۔ سمجھدار پرندہ جب جال میں پھنس جاتا ہے تو اس کو صبر و تحمل کرنا چاہئے''

ناخوش تو خوش بود برجان من   دل فدائے یار دل رنجان من

''محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ طبیعت کو ناخوش ہی کیوں نہ ہو وہ میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے میں اپنے یار پر جو میری جان کو رنج دینے والا ہے اپنے دل کو قربان کرتا ہوں''

بس زبون وسوسہ باشی دلا   گرطرب راباز دانی ازبلا

''پس براوسوسہ ہوائے دل اگر خوشی کو بلا سے جدا جانئے''

ہمت والوں کا تو یہ قول ہے۔

روزہا گر رفت گورو باک نیست   تو بماں اے آنکہ چوں تو پاک نیست

''ایام تلف ہونے پر حسرت نہ کرنا چاہئے اگر گئے بلا سے عشق جو اصلی دولت ہے اور سب خرابیوں سے پاک وصاف ہے اس کا ہونا کافی ہے''

تم لذت کی فکر نہ کرو کام کئے جاؤ بلا سے نہ آئے حضور قلب کا طریق کلی طور پر تو معلوم ہو گیا۔

حقیقت احسان

اب یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ کون سی شے ہے جس میں دل لگایا جائے اس کے دو طریق ہیں۔ ایک تو مشہور ہے جو لوگوں نے حدیث **ان تعبداللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ**

یراک (تم اللہ کی عبادت ایسے کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو کیونکہ اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے) سے سمجھا ہے لیکن میرے نزدیک یہ سمجھنا صحیح نہیں اور اس کا بیان آگے آئے گا۔

دوسرا طریق (جو استاد علیہ الرحمۃ مولانا محمد یعقوب صاحب نے بتلایا تھا اور الحمدللہ ایک حدیث سے بھی میری سمجھ میں آ گیا اور تجربہ بھی اس مفید ہونے پر شاہد ہے) یہ ہے کہ ایک حدیث میں آیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص دو رکعت نماز پڑھے اس طرح کہ مقبلاً علیھا بقلبہ یعنی حال یہ ہو کہ اپنے دل سے نماز پر متوجہ رہے۔

اب نماز دیکھنا چاہئے کہ نام کس کا ہے سو اس میں بعضی چیزیں تو مختلف ہیں ان کی طرف توجہ کرنے میں مبتدی کو یکسوئی حاصل ہونا ذرا تکلف ہے اس لئے دیکھنا چاہئے کہ اس میں کونسی چیز ہے جو نماز میں برابر ہوتی رہتی ہے سو وہ ذکر اللہ ہے کہ ابتدا سے انتہا تک پایا جاتا ہے تو اب نماز میں متوجہ ہونے کی صورت میں اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی کہ ذکر اللہ کی طرف برابر توجہ رہے یعنی جو کچھ پڑھا جائے سوچ سوچ کر پڑھا جائے پہلے سوچ لو پھر زبان سے نکالو یہ نہیں کہ ریل گاڑی ہے جہاں ڈرائیور نے کل چلادی اور گاڑی اڑی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ اسٹیشن آ گیا اور ڈرائیور نے روکی تو تھمی اس طرح سے اپنے اندر کی ریل گاڑی کو اگر ہم چلائیں گے تو لڑے گی اس کا کیا نتیجہ ہوگا کہ سارے قوائے محمودہ کے مسافر پاش پاش ہو جائیں گے اور زمین باطن میں ہلچل پڑ جائے گی۔ دنیاوی ریل کے لڑنے کا حال تو اسی وقت آنکھوں سے نظر آ جاتا ہے ہماری اندرونی ریل کے لڑنے کا حال قیامت میں کھلے گا بہرحال چاہئے یہ کہ ہر ہر لفظ کو سوچ سوچ کر پڑھو اگرچہ اس میں دو چار دن مشقت معلوم ہوگی جی گھبرائے گا کیونکہ جی روکنا پڑے گا لیکن جہاں ہم اپنے دنیاوی ذرا ذرا سے کاموں میں مشقت اٹھاتے ہیں خدا کیلئے بھی ذرا سی مشقت اٹھانا گوارا کر لیں۔ جب دنیا بے مشقت نہیں ملتی تو خدا کو چاہتے ہو کہ بے مشقت ہی مل جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے قربان جائیے کیسے چھوٹے لفظوں میں اتنے بڑے دشوار کلام کو آسان کر کے بتلا دیا اور کیوں نہ ہوں۔ علمنی ربی فاحسن تعلیمی، وادبنی ربی فاحسن تادیبی[1] (اللہ تعالیٰ نے مجھ کو تعلیم دی پس بہترین میری تعلیم ہے

---

[1] کشف الخفاء للعجلونی: ۱:۷۲، کنز العمال: ۳۱۸۹۵

اور اللہ تعالیٰ نے مجھ کو ادب سکھایا پس بہترین میری تادیب ہے) یہ خدا کی تعلیم ہے۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود　　گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

''آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فرمان اللہ کا فرمان ہے اگرچہ ایک اللہ کے بندے (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے منہ سے ادا ہوا ہے''

درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند　　آنچہ استاد ازل گفت ہمانے گویم

''پس پردہ مجھے طوطی کی طرح بٹھا دیا ہے مجھے جو حکم استاد ازل سے ملا تھا وہی کہہ رہا ہوں''

اس کے علاوہ ایک اور مشہور طریق حضور قلب کا وہ ہے کہ جو حدیث **ان تعبداللہ کانک تراہ** الخ سے لوگوں نے سمجھا ہے یعنی عبادت کرتے وقت یہ خیال کہ میں خدا کو دیکھ رہا ہوں اور اگر یہ نہ ہو تو یہ سمجھے خدا مجھ کو دیکھ رہا ہے پس گویا دو طریق متقابل ہیں لیکن میرے نزدیک یہ صحیح نہیں اول تو لفظوں کے بھی خلاف ہے کیونکہ سوال حقیقت احسان سے ہے نہ طریق تحصیل احسان سے۔ چنانچہ جو جواب دیا گیا ہے اس میں احسان کی حقیقت کی حقیقت بناء ہے نہ کہ طریق۔ چنانچہ اس کے قبل بھی اسلام اور ایمان کی حقیقت ہی سے سوال و جواب کا ہونا اس کا اور بھی موید ہے دوسرے تجربہ بھی شاہد ہے کہ تصور رویت حق حضور قلب کے لئے عموماً اور خصوصاً مبتدی کے لئے بالکل ناکافی ہے کیونکہ طبیعت پریشان ہوتی ہے کہ خدا کو کیسا سمجھوں اور ایک صورت سمجھ میں آتی ہے پھر اس کا دفع کرنا ہے۔ اسی طرح پریشانی میں مبتلا رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ جس چیز کو کبھی دیکھا نہیں اس کا تصور کیسے جم سکتا ہے البتہ منتہی کو خدا کے دیکھنے کا تصور بے کیف ذوقی طور پر میسر ہو جاتا ہے اور طریقہ عام ہونا چاہئے علاوہ بریں اگر مضاف محذوف مان کر (یعنی طریقہ ان الخ) طریق ہی قرار دیا جائے تو تقابل ٹھیک نہیں ہوتا کیونکہ **کانک تراہ** کے بعد یہ کہا ہے کہ اگر تم اسے دیکھتے نہ ہو تو بے شک وہ تمہیں دیکھتا ہے سو یہ مضمون جملہ اولیٰ کے ساتھ جمع ہو رہا ہے یہ نہیں کہا کہ اگر ایسی عبادت نہ کر سکو کہ گویا اسے دیکھتے ہو۔ (تو یہ سمجھو) کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

بہرحال یہ طریقہ الفاظ حدیث اور تجربہ دونوں کے خلاف ہے پس اس حدیث میں حقیقت احسان کا بیان ہے طریق مذکور نہیں۔

اہتمام خشوع کا طریق

رہا یہ کہ حدیث کے معنی کیا ہیں تو اس کا سمجھنا ایک مقدمہ پر موقوف ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص کام کر رہا ہو اور اسے معلوم ہو جائے کہ اس وقت ہمارا مالک اور حاکم دیکھ رہا ہے تو وہ شخص کام بالکل ٹھیک کرنے لگے گا اور احتیاط رکھے گا کہ کوئی خرابی نہ ہونے پائے اور اگر کہیں خود حاکم کو دیکھ لیا تب تو کچھ پوچھنا ہی نہیں ہے اپنی انتہائی کوشش صرف کر کے کام کو خوب اچھی طرح سے انجام دے گا۔

چنانچہ طالب علموں ہی کو دیکھئے کہ استاد کی عدم موجودگی میں آپس میں بیٹھتے ہیں تو ظرافت اور ہنسی کی باتوں میں بھی باک نہیں ہوتا۔ دل کھول کر ایک دوسرے سے بولتے ہیں کہیں پیر پھیلائے ہیں کہیں کوئی شعر پڑھ رہے ہیں اور جہاں کسی نے دیکھ لیا کہ مولوی صاحب دیکھ رہے ہیں فوراً مودب ہو کر بیٹھ گئے اور خاموشی اختیار کر لی اور اگر کہیں اپنی نظر استاد پر پڑ گئی تب تو ادب کا کچھ ٹھکانا ہی نہیں ہوتا خلاصہ یہ کہ حاکم کی نظر کے سامنے ہونے کے وقت کام خوب عمدگی سے ہوتا ہے تو مطلب اس حدیث کا یہ ہوا کہ خدا کی ایسے حسن وخوبی سے عبادت کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو (یعنی اگر فرضاً تم خدا کو دیکھتے تو سوچو کہ اس وقت تمہاری عبادت کس طرح کی ہوتی اب بھی اسی حالت کے مطابق تمہاری عبادت ہونا چاہئے) اس لئے کہ اگر تم اسے نہ بھی دیکھتے ہو تو کیا ہوا وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے (یہ اس لئے بڑھایا کہ پہلے جملہ سے یہ سوال ہو سکتا تھا کہ جب واقع میں ہم نہیں دیکھتے تو اس طرح کی تحسین عبادت کس طرح ممکن ہے اس کا جواب اس سے مفہوم ہو گیا کہ دیکھنے والے کی سی تحسین کے لئے حق تعالیٰ کی رویت کا تعلق بھی کافی ہے) غرض فان لم تکن تراہ میں فائے تعقیب نہ لی جائے بلکہ فائے علت قرار دی جائے۔

یہاں تک تو آپ کو خشوع کی حقیقت بھی معلوم ہو گئی اس کا ضروری ہونا بھی ثابت ہو گیا طریقہ سے بھی واقفیت حاصل ہو چکی اب خاتمہ کے طور پر ایک امر اور بیان کیا جاتا ہے وہ یہ کہ اس خشوع کے پیدا کرنے کا وقت کون سا ہے۔ آیا ہر وقت خشوع ہی کے اہتمام میں رہیں یا اس کا کوئی خاص وقت ہے۔

تو اب سنئے کہ ایک خشوع تو مستحب ہے اور دوسرا واجب ہے مستحب تو یہ ہے کہ ہر وقت یہی حالت استحضار کی قلب پر غالب رہے لیکن یہ ہر شخص کے لئے نہیں ہے صرف اسی کو جائز ہے جس کی ایسی حالت ہو کہ نہ تو خود اس کی ضروریات میں مخل ہو نہ کسی دوسرے کی حق تلفی کا باعث ہو ورنہ تباہی کی نوبت آ جائے گی۔ مستحب کے لئے واجبات ترک ہونے لگیں گے بجائے ثواب کے الٹا وبال ہو جائے گا۔

مثلاً کسی کی بی بی آٹے کے لئے پیسے دے کہ آٹا لے آؤ بچے بھوکے ہو رہے ہیں اور وہ لگے رہیں خشوع حاصل کرنے میں جس کی وجہ سے بچے بھوکے رہیں تو ایسا خشوع موجب قرب نہیں ہو سکتا بلکہ خدا سے دوری کا باعث ہوگا۔

حکایت ہے کہ ایک ولایتی صاحب کسی مسجد میں ٹھہرے تھے۔ جب رات کو تہجد پڑھنے کھڑے ہوئے تو دیکھا کہ ایک مسافر جو وہاں سو رہا تھا خراٹے لے رہا ہے۔ آپ نے اس کو کوئی دفعہ تو اٹھا اٹھا کر بٹھا دیا اور کہا کہ تم کس طرح سوتے ہو ہمارے خشوع میں خلل پڑتا ہے وہ بے چارہ تھکا ہوا تھا پھر سو گیا آپ کو جو غصہ آیا نکال چھرا اس کا کام تمام کر دیا۔ اچھا خشوع کیا کہ بے چارے کی جان ہی لے ڈالی۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ انہوں نے اپنے بی بی بچوں کو تباہ کر رکھا ہے اور غلطی میں مبتلا ہیں۔ دائمی حضور قلب اور خشوع کے پیچھے حق تلفیاں کرتے ہیں۔ یہ نہایت نازیبا امر ہے یہ تو ایسی بات ہوگئی کہ کسی نے نوکر سے کہا کہ ہم بھوکے ہیں کھانا لاؤ وہ بجائے کھانے کے دوڑ کر برف سے ٹھنڈا کر کے پانی لے آیا اور اسی پر اصرار کرتا ہے کہ نہیں جناب پانی ہی لیجئے بہت ٹھنڈا ہے کھانا نہ کھایئے۔ تو ایسے نوکر سے مالک خوش ہوگا یا ناراض؟

جیسے ایک صاحب کا نوکر تھا اس سے مانگا خلال وہ اٹھا لایا بانس مانگا لحاف وہ اٹھا لایا گھوڑے کا چار جامہ اور اصرار کرتا ہے کہ اسی کو اوڑھ لو یہ گستاخی ہے یا نہیں۔ یہ ساری خرابیاں خود رائی کی ہیں رائے بھی بڑی بری شے ہے۔

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست
کفر ست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

(اپنی رائے اور فکر کو راہ سلوک میں کچھ دخل نہیں اس طریق میں خود بینی اور خود رائی کفر ہے)

مناسب تو یہ ہے کہ ایسا ہو جائے۔

چوں قلم در پنجۂ تقلیب رب

یہاں تو جو حکم ہے وہی کرو یہی کمال ہے مثلاً اگر کسی کو پاخانہ زور سے لگا ہے اور وہ نماز پڑھنا چاہے تو برا ہے چاہئے کہ پہلے فارغ ہو جائے پھر نماز پڑھے اگر کوئی اصرار کرے اور کہنے لگے کہ صاحب نماز پڑھنا تو عبادت ہے اور پیشاب پاخانہ تو نجاست کا کام ہے میں تو نماز ہی پڑھوں گا تو بے جا کرتا ہے اس طرح نماز کا بھی ستیاناس کرے گا۔

خشوع کے درجات

خلاصہ یہ کہ اس مرتبہ کے خشوع کا اہتمام اس کے لئے ہے جس سے اس کے باعث نہ تو کسی کا حق تلف ہو نہ دین کا ضرر ہو اور نہ کسی کو دنیا کا ضرر پہنچے۔ دین کے ضرر کی صورت یہ ہے کہ کوئی طالب علم ہے رات کو تو بیٹھے خشوع پیدا کرتے رہے مطالعہ دیکھا نہیں صبح کو جب سبق پڑھنے بیٹھے تو کچھ سمجھ میں آتا نہیں آخر بے دلی سے پڑھ پڑھ کر کتابیں تمام کیں نہ کچھ آیا نہ گیا علم دین ایسی ضروری چیز سے محروم رہے بلکہ علم ناقص سے لوگوں کا مقتداء بن کر تباہ کرنا شروع کیا۔

دنیا کا ضرر یہ کہ بال بچے جن کا نفقہ اس کے ذمہ ہے اس میں کوتاہی ہونے لگی اسی طرح ترک اسباب ظاہری اگرچہ مستحب ہے لیکن اسی کے لئے جس کی وجہ سے اہل وعیال کے حقوق کے ادا کرنے میں کمی نہ ہونے پاوے ورنہ نہیں لیکن ہاں جسے کسی کی فکر نہ ہو اور وہ بھی اس مرتبہ کی تحصیل سے غافل رہے تو بڑا ظلم ہے ایسے ہی شخص کے بارے میں ہے۔

ہر آنکہ غافل از حق یک زماں ست　　　دراں دم کافر ست اما نہان ست

"جو شخص اس سے ایک گھڑی غافل ہے اس گھڑی میں کافر ہے لیکن نہاں ہے"

حضوری گر ہمی خواہی از وغائب مشو حافظ　　　متی ماتلق من تہوی دع الدنیا واہملہا

"اگر محبوب حقیقی کے دربار کی حضوری اور قرب چاہتے ہو تو اس سے غافل مت ہو بلکہ اس کی طرف متوجہ رہو اور جب اپنے محبوب سے ملاقات کرو یعنی اسکی عبادت میں مشغول ہو تو دنیا اور مافیہا کی طرف التفات مت کرو"

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار　　　بگذارند و خم طرہ یارے گیرند

میرے نزدیک مصلحت یہ ہے کہ یارلوگ تمام کاموں کو چھوڑ کر محبوب حقیقی تصور میں لگ جائیں۔

جملہ اوراق و کتب درنار کن سینہ را از نور حق گلزار کن

''جملہ اوراق وکتابیں آگ میں جلادو اور سینہ کو اللہ تعالیٰ کے نور سے روشن کرو''

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرود سمن درآ تو زغنچہ کم نہ دمیدۂ دردل کشا بہ چمن درآ

''تیرے اندر خود چمن ہے اس کو پھاڑ کر تمہارے ہاتھ میں ہے جب جی چاہے سیر کرلو''

آسماں ہاست درولایت جان کار فرمائے آسمان جہاں

در رہ روح پست و بالا ہاست کوہ ہائے بلند و صحرا ہاست

''ولایت جان میں بہت سے آسمان ہیں جو آسمان دنیا میں کارفرما ہیں روح کی راہ میں نشیب وفراز اور بلند پہاڑ وصحرا ہیں''

اے برادر عقل خود رابا خود آر دمبدم در تو خزاں ست و بہار

بردل سالک ہزاراں غم بود گرز باغ دل خلالے کم بود

''ارے بھائی تھوڑی دیر کے لئے ذرا عقل درست کر کے دیکھ تیرے اندر دم بدم بہار اور خزاں موجود ہیں''

بہتیرے لوگ ہیں کہ ان کو خدا نے اطمینان دیا ہے جائیداد کی آمدنی چلی آرہی ہے گھر سے باہر قدم نکالنا نہیں پڑتا پھر بھی دن رات فضول مضمون میں مبتلا رہتے ہیں کہیں یہ ذکر ہو رہا ہے کہ جاپان اور روس میں لڑائی ہورہی ہے کہیں جاپان کو ڈگری دلا رہے ہیں کہیں روس کو فکر پڑی ہے کہ کیا ہونا چاہئے گویا ان کے سامنے روس وجاپان کا مقدمہ پیش ہوگا اور فیصلہ کی ان سے درخواست کی جائے گی، دن رات ایسی ہی لایعنی باتوں میں مصروف ہیں یہ اطمینان رکھیں کہ ان کے پاس یہ مقدمہ نہیں پیش ہوگا۔ ہاں اپنے اندر کے روس وجاپان کی فکر کریں ان سے بے شک اس کی باز پرس ہوگی کہ تم نے قوتوں کو جا سے صرف کیا ہے یا بے جا۔ ایسے شخص کو تو چاہئے تھا کہ حب الٰہی میں غرق ہو کر ان مقربین میں سے ہو جاتا جن کے ساتھ خصوصیت کے معاملات ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک بزرگ تھے انہوں نے پاؤں پھیلا دیئے تھے ان پر عتاب ہوا مقربوں کے احکام ہی دوسرے ہو جاتے ہیں جو باتیں عام لوگوں کو جائز

ہوتی ہیں ان کے لئے بے ادبی میں داخل ہے۔

مقرباں را بیش بود حیرانی (مقربین کے لئے حیرانی بہت ہوتی ہے)

اور گو اس میں مشقت شدید ہے لیکن قرب کے ساتھ اگر مشقت بھی اٹھانا پڑے گی تو کیا۔

ہر کجا یوسف رخے باشد چوماہ جنت ست آن گرچہ باشد قعر چاہ

(جس جگہ محبوب ہو وہ جگہ جنت ہے اگر چہ گہرا کنواں کیوں نہ ہو)

چہ خوش وقتے و خرم روزگارے کہ یارے برخورد وصل یارے

(وہ کیا اچھا وقت اور اچھا زمانہ ہے کہ اس میں کوئی محبّ اپنے محبوب کے وصل سے متمتع ہو)

حاصل یہ کہ ایک تو وہ تھا جو فارغ محض تھا اور ایک وہ ہے جس کے متعلق اور بھی خدمتیں ہیں۔ اہل وعیال کا نان ونفقہ واجب ہے درس وتدریس میں مشغول ہے وعظ ونصیحت سے لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے۔ اس کی طرف لوگوں کو حاجت ہے ایسے شخص کو ایسا اہتمام خشوع کہ ہر وقت اس میں رہے ناجائز ہے۔ اس کے ذمہ خشوع واجب کا حاصل کرنا اس پر واجب ہے کہ عبادت کے وقت خشوع خاص پیدا کرے کیونکہ اس میں کوئی حرج نہیں ہوتا جب تک کسی عبادت میں مشغول ہے۔ دنیا کا کوئی کام تو کر ہی نہیں سکتا۔ پھر فائدہ کیا ہوا کہ اس نے اپنا وقت مفت پریشان کیا اس لئے یہ مرتبہ ہر شخص پر واجب ہے۔ اس سے کوئی نقصان نہیں ہوسکتا خدا کا کیا ہی انتظام ہے کہ نہ ہر شخص کو صوفی مستغرق بنادیا اور نہ غفلت کی اجازت عنایت ہوئی۔

سارے وعظ کا خلاصہ یہ ہوا کہ پہلے تو مقدمہ بیان ہوا جس میں عوام وخواص سب ہی کی شکایت تھی کہ خشوع کیوں حاصل نہیں کرتے۔ اس کے بعد مقصود کا بیان ہوا۔ وہ تین چیزوں پر مشتمل ہے۔ اول حقیقت خشوع.....دوسرے فرضیت خشوع.....تیسرے طریق خشوع

اس کے بعد خاتمہ مذکور ہوا جس میں درجات خشوع کا ذکر ہوا

اب خدا سے دعا کرنا چاہئے کہ خدا تعالیٰ توفیق عنایت کریں

خشوع سے بہرہ ور اور کامیاب بنائیں۔ آمین ثم آمین

مہمات الدعاء (حصہ اول)

تنبیہات متعلقہ دعا کی نسبت

یہ وعظ جامع مسجد تھانہ بھون میں ۲ صفر ۱۳۲۹ھ کو تقریباً دو گھنٹہ بیٹھ کر بیان فرمایا جسے مولوی نور حسین پنجابی نے قلمبند کیا

خطبہ ماثورہ

الحمدللّٰہ نحمدہ و نستعینه ونستغفرہ ونومن به ونتوکل علیه ونعوذ باللّٰہ من شرورانفسنا ومن سیٔات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل له ومن یضلله فلا ھادی له ونشھد ان لا اله الا اللّٰہ وحدہ لاشریک له ونشھد ان سیدنا و مولانا محمدًا عبدہ ورسوله صلی اللّٰہ تعالیٰ علیه وعلی اٰله و اصحابه وبارک وسلم.

اما بعد فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.
وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِی اَسْتَجِبْ لَکُمْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْ خُلُوْنَ جَھَنَّمَ دَاخِرِیْنَ. (المؤمن آیت نمبر۶۰)

(اورتمہارے پروردگار نے فرما دیا ہے کہ مجھ کو پکارو میں تمہاری درخواست قبول کروں گا جولوگ (صرف) میری عبادت سے سرتابی کرتے ہیں وہ عنقریب (مرتے ہی) ذلیل ہوکر جہنم میں داخل ہوں گے)

دعائے کے معنی

اس آیت کے مضمون ہی سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ آج کا مقصود وعظ بیان تنبیہات متعلقہ دعاء ہے اور شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ ہم تو دعا کیا کرتے ہیں اور اس کی ضرورت وغیرہ کو بھی جانتے ہیں پھر کیوں تنبیہ کی جاتی ہے کیونکہ تنبیہ تو اس امر میں ضروری ہے جس کو جانتا نہ ہو یا کرتا نہ ہو۔ سوضرورت تنبیہ کی یوں ہے کہ باوجود جاننے اور کرنے کے بھی جب دعاء کے بارے میں تغافل برتا جاتا ہے یعنی اس کے ضروری آداب وشرائط سے بے پروائی کی جاتی ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ جانی ہوئی چیزوں سے بھی بڑھ کر کوئی قوی حجاب ہے کیونکہ مجہولات میں تو صرف جہل حجاب ہے کہ اس کا رفع ہونا سہل ہے۔ اور جانی ہوئی چیز میں جب

ایسا معاملہ کیا جائے تو وہ حجاب زیادہ سخت ہوگا اور ہر چند کہ یہ تغافل اور قلب کا حاضر نہ ہونا سب عبادات میں قبیح ہے مگر دعا میں اقبح ہے۔ وجہ یہ کہ عبادات میں گو اصل مقصود معنی ہے مگر تاہم ایک درجہ میں صورت بھی مقصود ہے بخلاف دعاء کے کہ اس میں صرف معنی ہی معنی مقصود ہے اور وہ نیاز و افتقار و انکسار و خشوع قلب ہے۔ جب یہ بھی نہ ہوا تو دعا کیا ہوئی۔

بیان اس کا یہ ہے کہ مثلاً نماز ہے کہ قرائن سے اس میں علاوہ مقصود معنوی یعنی توجہ الی اللہ کی صورت بھی مراد اور مطلوب ہے کہ اس کے قیود ظاہری سے مفہوم ہوتا ہے مثلاً وضو، جہت، قبلہ، تعیین رکعات وغیرہ۔ اب اگر کوئی شخص بغیر حضور قلب کے رکوع و سجود وغیرہ شرائط سے نماز پڑھ لے تو گو مقصود معنوی توجہ الی اللہ اس میں نہیں ہوئی مگر فقیہ عالم یہی حکم دے گا کہ فرض ادا ہوگیا اس سے ثابت ہوگیا کہ صورت بھی کسی درجہ میں مطلوب ہے اور اسی کی تحقیق سے صحت صلوٰۃ کا فتویٰ صحیح ہوا۔ اس تقریر سے ان بے دینوں کا یہ شبہ بھی رفع ہوگیا جو کہا کرتے ہیں کہ صاحب دل تو حاضر نہیں پھر نماز کیا پڑھیں۔ معلوم ہوا کہ علاوہ حضور قلب کے کہ معنی اور حقیقت ہے نماز کی یہ صورت ظاہری رکوع و سجود بھی مقصود ہے۔

دوسری نظیر لیجئے۔ روزہ سے مقصود معنوی قوت بہیمیہ کا توڑنا اور مغلوب کرنا مطلوب ہے مگر بایں ہمہ اگر کوئی شخص سحری کو ایسا پیٹ بھر کر کھائے کہ افطار تک اس کو بھوک ہی نہ لگے تو اس صورت میں قوت بہیمیہ تو کچھ بھی نہیں ٹوٹی مگر روزے کی چونکہ ظاہری صورت پوری ہوگئی ہے روزہ صحیح ہوگیا۔

تیسری نظیر اور لیجئے۔ زکوٰۃ کہ مقصود معنوی اس سے اغناء مساکین ہے مگر بایں ہمہ اس کے لئے ایک خاص مقدار، ایک خاص وقت معین ہے جس سے مقصودیت صورت ایک درجہ میں یہاں بھی ثابت ہوتی ہے کیونکہ صرف اغناء تو ان امور پر موقوف نہیں۔

لیکن دعا میں نہ کسی وقت کی شرط، نہ زبان عربی کی شرط نہ کسی خاص جہت کی شرط نہ کوئی مقدار معین نہ وضو وغیرہ کی قید۔ اس میں صرف عاجزی نیاز مندی، اپنی احتیاج کا اظہار اپنے مولیٰ کے آگے بس یہ کافی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہاں صورت پر بالکل نظر نہیں معنی ہی معنی مقصود ہیں۔ پس اب یہ صرف زبانی دعا کہ آموختہ سا رٹا ہوا پڑھ دیا۔ نہ

خشوع نہ خشیت، نہ دل میں اپنی عاجزی کا تصور، یہ خالی از معنی دعا کیا ہوئی۔

اس بے توجہی کی مثال تو ایسی ہے جیسا کہ کوئی شخص کسی حاکم کے ہاں عرضی دینا چاہے اور اس طور پر عرضی پیش کرے کہ حاکم کی طرف پیٹھ کرے اور منہ اپنا کسی دوست یار کی طرف کرکے اس عرضی کو پڑھنا شروع کرے۔ دو جملے پڑھ لئے۔ پھر یار دوست سے ہنسی مخول کرنے لگے۔ پھر دو جملے پڑھ دیئے اور ادھر مشغول ہوگئے۔ اب سوچ لینا چاہئے کہ حاکم کی نظر میں ایسی عرضی کی کیا قدر ہوسکتی ہے بلکہ الٹا یہ شخص قابل سزا ٹھہرایا جائے گا۔

بس یہی معاملہ ہے دعا کا۔ دعا میں جب تک کہ پورے طور پر قلب کو حاضر نہ کرے گا اور عاجزی اور فروتنی کے آثار اس پر نمایاں نہ ہوں گے، وہ دعاء دعاء نہیں خیال کی جاسکتی کیونکہ اللہ تعالیٰ تو قلب کی حالت کو دیکھتے ہیں۔

ما بروں رانگریم و قال را	ما دروں رابنگریم و حال را
ناظر قلبیم گر خاشع بود	گرچہ گفت لفظ ناخاضع بود

دعاء اور خشوع وخضوع

حدیث شریف میں ہے ان اللّٰہ لا ینظر الی صور کم ولکن ینظر الی قلوبکم[1]۔ بے شک اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں کی طرف نہیں دیکھتے لیکن تمہارے دلوں کی طرف دیکھتے ہیں) اور آیت انی وجهت وجهی الخ (میں نے اپنا رخ کیا) میں وجهی سے مراد بھی یہی وجہ قلب ہے ورنہ برتقدیر وجہ ظاہری کے خداوند تعالیٰ کا ذوجہت ہونا لازم آئے گا کیونکہ معنی تو یہی ہیں کہ میں نے اپنے وجہ کو خدا کی طرف کیا۔ اور ظاہر ہے کہ وجہ ایک خاص سمت میں ہوگا۔ تو کیا ذات منزہ اسی سمت میں ہوگی۔ یہ تو محال ہے عقلاً اور شرعاً کیونکہ وہ قیود سے منزہ ہے۔ چنانچہ اَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡهُ اللّٰهِ (جس طرف منہ کرلو ادھر اللہ تعالیٰ ہی کا رخ ہے) اس کی شرعی دلیل ہے۔

اس نفی جہت وتنزہ عن القیود سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ذات باری میں تشخص اور تعین ہی نہیں اطلاق محض ہے جیسا کہ بعض کے کلام میں متوہم ہوتا ہے کیونکہ یہ بدون تشخص اور تعین

---

[1] سنن ابن ماجہ:۴۳، ۴۱، مسند الإمام أحمد ۲: ۲۸۵، ۲۳۹، الصحیح لمسلم: ۱۹۸۷، مشکوۃ المصابیح: ۵۳۱۴

کے تو کسی شے کا وجود خارجی محال ہے البتہ اس کی ذات کے لائق تشخص وتعین ہے کہ ہم اس تشخص تعین کی حقیقت وکنہ کا ادراک نہیں کر سکتے اور اگر شبہ ہو کہ جیسے وجہ کے لئے جہت ہونا ضروری ہے، ایسے ہی قلب کی بھی تو کوئی جہت ہوگی۔ وہی اشکال یہاں لازم آئے گا۔

تو جواب یہ ہے کہ قلب سے مراد یہ مضغۂ صنوبری نہیں بلکہ قلب ایک لطیفہ غیبی ہے مجردات سے اور ہر چند کہ بعض متکلمین کا اس میں اختلاف ہے کہ مجردات کا وجود ہے یا نہیں مگر محققین صوفیاء کا یہ مکشوف ہے کہ بعض اشیاء مجردات سے ہیں مگر حادث ہیں ذاتاً بھی اور زماناً بھی۔ اور یہی فرق ہے درمیان صوفیاء اور حکماء کے کیونکہ حکماء مجردات کو صرف ذاتاً حادث مانتے ہیں اور زماناً قدیم کہتے ہیں اور متکلمین کے پاس نفی مجردات کی جب کہ وہ زماناً بھی حادث ہوں کوئی دلیل سالم نہیں۔ اور یہ مضمون کہ قلب سے مراد ایک لطیفہ غیبی ہے اور مجرد عن المادہ ہے۔ یہ ٹکڑا گوشت کا مراد نہیں جو کہ ذو جہت ہے۔

علاوہ کشف کے ہمارے ایک محاورے سے بھی جو کہ روزمرہ بولا جاتا ہے بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ ہمارا دل اس وقت بازار میں ہے اور فرض کیجئے کہ ہم اس وقت بازار میں موجود نہ ہوں۔ اور مقصود محاورات سے حقائق علمیہ پر استدلال کرنا نہیں۔ محض تنویر اور تقریب ہے۔

غرض یہ بات پورے طور پر ثابت ہوگئی ہے کہ دعا میں حضور اور خشوع ہی مقصود ہے۔ اگر بے اس کے بھی کسی کی دعا قبول ہو جائے تو اس کو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ خداوند تعالیٰ کا مجھ پر ابتدائی احسان ہے۔ دعا کا اثر نہیں۔ یہ ایک تمہید تھی مضمون دعا کی اب آیت کا مضمون سنیے۔

تفسیر آیت کریمہ

اللہ تعالیٰ جل جلالہ نے اس آیت میں بڑے اہتمام سے دعا کا مضمون بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ شروع میں یہ تصریح فرمائی کہ وقال ربکم حالانکہ پہلے سے معلوم تھا کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ کا ہے مگر پھر اس کو اس لئے ظاہر فرما دیا کہ اس کی تاثیر نفس میں قوی ہو جائے اور مضمون مابعد کی وقعت دلوں میں زیادہ ہو۔ پھر لفظ ربکم ارشاد فرمایا۔ اس میں بوجہ اظہار ربوبیت گویا اشارہ ہے دعا کے قبول کر لینے کا اس طور پر کہ چونکہ ہم ہمیشہ سے تمہاری پرورش کرتے آئے

ہیں حتیٰ کو بدون تمہاری درخواست کے بھی کی ہے۔ تو کیا تمہاری عرض کو درخواست کرنے پر بھی قبول نہ کریں گے نہیں ضرور قبول کریں گے۔

مانبودیم و تقاضا مانبود   لطف تو ناگفتہ مامی شنود

(نہ ہم تھے نہ ہمارا تقاضا تھا آپ کا لطف وکرم ہمارے کہے بغیر سنتا تھا)

آیت وَاِذْ اَنْشَاَکُمْ مِنَ الْاَرْضِ وَاِذْاَنْتُمْ اَجِنَّۃٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّھَاتِکُمْ (جبکہ تم کو زمین سے پیدا کیا جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں تھے) الخ میں اس تربیت بے درخواست کا ذکر فرمایا ہے۔ اس کے بعد پیدائش کے بعد کی حالت قابل غور ہے کہ یہ حالت ایسی تھی کہ کسی قسم کی تمیز اور شعور اس وقت نہ ہوا تھا۔ اس حالت میں اگر تمام دنیا کے حکماء سقراط بقراط وغیرہ اکٹھے ہوکر صرف اتنی ہی تدبیر کرنا چاہیں کہ بچہ دودھ پینا سیکھ جائے تو ہرگز وہ قیامت تک اس پر قادر نہیں ہوسکتے۔ یہ اسی قادر ذوالجلال کی حکمت اور اس کی رحمت اور عنایت ہے کہ اس نے بچے کو دودھ چوسنا سکھلایا۔ حکماء کہیں گے کہ یہ خود طبیعت کا فعل ہے مگر جب خود طبیعت ہی کو وہ بے شعور مان چکے ہیں تو ایسے پر حکمت کاموں کا اس کی طرف منسوب کرنا بے شعوری نہیں تو اور کیا ہے۔

تیسرا اہتمام ربکم کی اضافت ہے۔ گویا فرماتے ہیں کہ ہم تمہارے ہی ہیں۔ تم ہم سے مانگو اور اس کی نظیر دوسری آیت میں اضافت ہے۔ وَلَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰہُ النَّاسَ الی قولہ کَانَ بِعِبَادِہٖ بَصِیْرًا۔ (اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں سے مؤاخذہ فرماتے......) اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے (احوال کو) دیکھنے والے ہیں) حالانکہ یہاں عباد ماخوذین کا ذکر ہے مگر ان کو بھی اپنی طرف مضاف فرماتے ہیں۔ سبحان اللہ! کیا رحمت ہے۔

اس آیت کے متعلق ایک فائدہ علمیہ تفسیر یہ سمجھنے کے قابل ہے کہ آدمیوں کے مواخذے کی تقدیر پر تمام دواب کے ہلاک کو کیسے مرتب فرمایا تو وجہ اس کی یہ ہے کہ سب چیزیں انسان ہی کے لئے پیدا ہوئی ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

ھُوَالَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا۔ یعنی تمام چیزیں جو زمین میں ہیں تمہارے ہی لئے پیدا کی ہیں۔

خواہ ان کا نفع بلا واسطہ تم کو پہنچے یا واسطہ در واسطہ۔ پس چونکہ انسان کے لئے ہی سب چیزیں پیدا کی گئی ہیں اس لئے انسان اگر گناہ پر ہلاک کیا جاتا تو دوسری چیزیں اس لئے ہلاک کی جاتیں کہ جب وہی نہ رہا جس کے لئے یہ سامان تھا تو پھر اس سامان کی کیا ضرورت۔ جب آدمی نہ ہوں تو پھر خیمے ڈیرے و دیگر اسباب سامان کس کام کے۔

البتہ یہ شبہ اور باقی رہ گیا کہ بروں کو تو ان کے برے کام کی سزا ملتی ہے اور نیک آدمیوں کو کیوں ہلاک کیا جاتا۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اچھے آدمی قدر قلیل ہوتے ہیں اور انسان کی ضرورتیں تمدن و آسائش کے متعلق اس کثرت سے ہیں کہ تھوڑے آدمی ہرگز ان کو پورا نہیں کر سکتے۔ پھر اگر بروں کے بعد نیک زندہ رہتے تو ان کو جینا وبال ہو جاتا۔ ان کے لئے یہ مرنا ہی مصلحت و رحمت ہوا۔ اس سے بڑھ کر مقدمہ دعا میں اس آیت میں یہ اہتمام فرمایا کہ دعا نہ کرنے والوں کے واسطے ترہیب فرمائی کہ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ الخ۔

اس موقع پر ایک فائدہ علمیہ کا بیان ضروری معلوم ہوتا ہے جس سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ ترہیب اعراض عن الدعاء پر ہے وہ یہ ہے کہ اس آیت کے شروع میں تو مادہ دعا کا اور ترہیب میں مادہ عبادت کا ذکر ہے۔ چنانچہ **یستکبرون عن عبادتی** (میری عبادت سے عار کرتے ہیں) ہے۔ **یستکبرون عن دعائی** (میری عبادت سے عار کرتے ہیں) نہیں اور تطابق ضروری اس لئے یا تو دعا بمعنی عبادت لیا جائے یا عبادت بمعنی دعا قرار دیا جائے احتمال دونوں فی نفسہ برابر ہیں مگر چونکہ کلام مجید کا سمجھنے والا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی شخص زیادہ نہیں ہو سکتا کیونکہ مخاطب اول آپ ہی ہیں۔ اس لئے اس کے تعین کے لئے حدیث کو دیکھا گیا۔ سو آں حضرت نے ارشاد فرمایا:

الدعاء مخ العبادۃ (دعا عبادت کا خلاصہ ہے)

اور پھر اس آیت کی تلاوت فرمائی جس سے ثابت ہوا کہ دعا اپنے معنی پر ہے اور عبادت سے مراد یہاں خاص دعا ہے۔ ان اہتماموں سے دعا کی شان و عظمت کس درجہ ظاہر ہوتی ہے۔

دعا کی خصوصیت

ایک خصوصیت خاص دعا میں اور عبادات سے زیادہ یہ ہے کہ اور جتنی عبادتیں ہیں اگر دنیا کے لئے ہوں تو عبادت نہیں رہتیں۔ مگر دعا ایک ایسی چیز ہے کہ یہ اگر دنیا کے لئے ہی ہو تب بھی

عبادت ہے اور ثواب ملتا ہے مثلاً مال مانگے دولت مانگے یا اور کوئی دنیوی حاجت مانگے جب بھی ثواب کا مستحق بنے گا۔ برخلاف اور عبادات کے کہ اگر ان میں حاجت مطلوب ہو تو ثواب نہیں ملتا۔

چنانچہ حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اگر طبیب نے کسی کو رائے دی کہ تم آج کا دن کھانا نہ کھاؤ۔ اگر کھایا تو ضرر دے گا۔ اس نے کہا لاؤ آج روزہ ہی رکھ لیں۔ پس روزہ رکھ لیا تو اس کو خالص روزہ کا ثواب نہ ملے گا۔ کیونکہ اس کو دراصل روزہ رکھنا مقصود نہیں۔

ایسے ہی کوئی شخص مسافرت میں اس نیت سے مسجد کے اندر اعتکاف کرلے کہ سرائے کے کرایہ وغیرہ سے بچوں گا تو اس کو خالص ثواب اعتکاف کا نہ ملے گا۔

مگر دعا میں یہ بات نہیں۔ چاہے کتنی ہی حاجتیں دنیوی مانگو مگر پھر بھی ثواب ملے گا۔ اور دعا میں یہ خصوصیت اس لئے ہے کہ دعا سراسر نیازمندی ہے اور عجز انکسار اور اظہار عبدیت واحتیاج اور یہ دنیا کے مانگنے کے وقت بھی متحقق ہے اور نیازمندی خود ایک بڑا محبوب عمل ہے کیونکہ جہاں نیازمندی ہوگی وہاں کبر نہیں ہوگا۔ اور کبر اور خودی بھی بڑا مبغوض اور بڑا حائل ہے۔ چنانچہ حدیث قدسی میں ارشاد ہے کہ **الکبریا ردائی والعظمة ازاری**۔ (کبریائی میری چادر ہے، عظمت میری ازار ہے) رداء اور ازار سے مراد یہ ہے کہ دونوں میرے وصف خاص ہیں کہ کوئی دوسرا ان دو وصفوں کا مدعی محق نہیں ہوسکتا۔

بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ انہوں نے ایک دفعہ منام میں جناب باری سے عرض کیا کہ **دلنی علی اقرب الطرق الیک**۔ جواب ارشاد ہوا **دع نفسک وتعال**. حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مضمون کو کیا خوب فرمایا ہے کہ فرماتے ہیں۔

میان عاشق ومعشوق ہیچ حائل نیست　　　تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز

تو درو گم شو وصال این است وبس　　　گم شدن گم کن کمال ایں است وبس

(عاشق ومعشوق کے درمیان کوئی حائل نہیں میری خودی خود حجاب ہو رہی ہے حافظ خودی کو درمیان سے اٹھادو)

حاصل یہ کہ اپنی خودی کو مٹاؤ۔ یہاں تک کہ اس مٹانے پر بھی نظر نہ رہے یعنی اس صفت فنا پر بھی نظر نہ رہے اور اس کا نام اصطلاح میں فناء الفناء ہے اور اس کو شاعرانہ مضمون نہ سمجھا جائے کہ مٹانے کو بھی مٹاؤ۔ اس کے نظائر تو روزمرہ واقع ہوتے ہیں۔

چنانچہ اس مسئلہ فناء الفناء کی توضیح اس مثال سے اچھی طرح ہوسکتی ہے کہ اگر کسی کا کوئی دلربا معشوق ہو اور عاشق اس کے خیال میں مستغرق ہو اس حالت میں اس عاشق کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ میں خیال کر رہا ہوں۔ کسی کو یاد کیجئے اس یاد کی طرف ذرا بھی ذہن نہیں جاتا۔ آدمی سوتا ہے مگر اس وقت یہ خبر نہیں ہوتی کہ میں سوتا ہوں اور اگر یہ خبر ہو جائے تو وہ سوتا ہوا نہیں ہے۔ اور ان احوال حالیہ کو سن کر یہ نا امیدی نہ چاہیے کہ بھلا ہم کو یہ دولت کب میسر ہوسکتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فضل بڑا واسع ہے۔ اس کو کچھ دشوار نہیں۔

تو مگو مارا بداں شہ بار نیست　　　با کریماں کارہا دشوار نیست

(تو یہ خیال مت کر کہ بھلا ہماری پہنچ اس دربار تک کہاں ہے، کریموں کو کوئی کام مشکل نہیں ہوتا)

البتہ ایسے احوال کے حصول کے لئے صحبت شیخ کی ضرورت ہے اور صحبت وہ چیز ہے کہ دیکھو انڈا کیا چیز ہے۔ سفیدی اور زردی کے سوا اس میں کچھ بھی نہ تھا۔ مگر مرغی کے سینے سے اس میں جان آ گئی۔ تو کیا صحبت کاملین کی اس سے بھی گئی گزری ہے۔ اور یہ وسوسہ بھی نہ ہو کہ صحبت تو ایسی چیز ضرور ہے مگر خود وہ لوگ کہاں ہیں جن کی صحبت میں یہ برکت ہو۔ سو یقین کے ساتھ سمجھو کہ اب بھی اللہ تعالیٰ کے نیک بندے اس برکت کے موجود ہیں۔

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں است　　　خم و خمخانہ بامہر و نشان است

(اب بھی وہ رحمت درفشاں۔ ہے خم اور خمخانہ مہر ونشان کے ساتھ موجود ہے)

دل سے میدان طلب میں آنا چاہیے۔ نری سوکھی روکھی آرزو سے کام نہیں چلتا۔ صدق طلب ہونی چاہیے اور کوشش۔

گرچہ رخنہ نیست در عالم پدید　　　خیرہ یوسف وار می باید دوید

(اگرچہ دنیا میں کوئی رخنہ ظاہر نہیں پھر بھی تمہیں حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح دوڑنا چاہیے)

یوسف علیٰ نبینا وعلیہ السلام کو کیسا اپنے مولیٰ پر بھروسا تھا کہ باوجود دروازے بند ہونے کے دوڑے اور کوشش کی۔ اللہ تعالیٰ نے دروازے بھی کھول دیئے۔ اگر صدق دل سے طلب اور کوشش ہو تو مقصود ملنے کی یقینی امید ہے۔ بعض صوفیہ نے بطور تاویل اور اعتبار کے نہ بطور تفسیر اس آیت اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ (تم کو یہ قدرت ہے کہ آسمان اور زمین کی حدود سے کہیں باہر نکل جاؤ تو (ہم بھی دیکھیں)

نکلو) میں امر فانفذوا کو امر تعجیزی نہیں لیا بلکہ تکلفی اسی مضمون کے مناسب سمجھا ہے۔

غرض حاصل یہ ہے کہ دعا کا خلاصہ نیازمندی ہے اور دعا خواہ کسی قسم کی ہو دینی ہو یا دنیوی ہو مگر ناجائز امر کے لئے نہ ہو سب عبادت ہے۔ خواہ چھوٹی سے چھوٹی چیز کی ہو یا بڑی چیز کی۔ حدیث میں یہاں تک آیا ہے کہ اگر جوتی کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو خدا تعالیٰ سے مانگا کرو۔

ایک بزرگ رو رہے تھے۔ کسی نے پوچھا کیوں رو رہے ہو۔ فرمایا بھوک لگی ہے۔ اس نے کہا کیا بچے ہو کہ بھوک سے روتے ہو۔ انہوں نے فرمایا کہ جب مولیٰ کی یہی مرضی ہو کہ میں بھوک سے روؤں تو پھر استقلال کیوں اختیار کروں۔

گر طمع خواہد زمن سلطان دین — خاک برفرق قناعت بعد ازیں

نالہ ام از نالہ ہاخوش آیدش — ازدو عالم نالہ و غم بایدش

دعا کا مہتم بالشان ہونا

بعض اہل لطائف کا قول ہے کہ حضرت ایوب علیہ السّلام کو جب یہ معلوم ہوا کہ اب اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ میں مرضی کی شکایت کا اظہار کروں تب فرمایا رب اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ (اے اللہ مجھے اذیت پہنچی ہے) الخ ورنہ اظہار بے صبری کی وجہ سے نہ تھا۔ اگر بے صبری ہوتی تو اللہ تعالیٰ ان کو یوں تعریف نہ فرماتے اِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ (ہم نے انہیں صابر بنایا وہ اچھے بندے تھے) الخ

درنیا بدحال پختہ ہیچ خام — پس سخن کو تاہ باید والسّلام

غرض ان کاملین کی نظر خدا تعالیٰ کی رضا پر ہوتی ہے اپنا حظ ظاہری یا باطنی کچھ نہیں ہوتا۔ جس میں خدا تعالیٰ راضی ہوں وہی کرنے لگتے ہیں۔

گفت معشوقے بعاشق اے فتا — تو بغربت دیدۂ بس شہرہا

پس کدامی شہرز انہا خوشتر است — گفت آں شہرے کہ دروے دلبرست

ہرکجا یوسف رخے باشد چوماہ — جنت است او گرچہ باشد قعرچاہ

باتو دوزخ جنت است اے جانفزا — بے تو جنت دوزخ است اے دلربا

عاشقوں کی کچھ اور ہی شان ہے۔ حضرت حافظ محمد ضامن شہید علیہ الرحمۃ کی حکایت ہے کہ فرمایا کرتے کہ ہم تو اس واسطے ذکر کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ فرماتے ہیں کہ فاذکرونی

اذکرکم (پس تم مجھے یاد رکھو میں (اپنی عنایت سے) تمہیں یاد کروں گا) یعنی احوال وکیفیات باطنی پر نظر نہ تھی دیکھئے محققین کی تو یہاں تک نگاہ ہے کہ خدا کا نام اور احکام میں کیفیات باطنی تک کا قصد نہ کریں۔ اور افسوس آج کل لوگوں کا یہ حال ہے کہ وظائف تحصیل دنیا کیلئے پڑھتے ہیں۔ کوئی دست غیب تلاش کرتا پھرتا ہے حالانکہ اس میں جواز تک بھی نہیں کیونکہ اس کے ذریعہ سے جو کچھ ملتا ہے وہ حرام ہے کیونکہ جن مسخر ہو جاتے ہیں۔ اور وہ لوگوں کا مال چرا چرا کر عامل کو دیتے ہیں یا اگر اپنا لائیں تب بھی مجبور ہو کر لاتے ہیں۔ ایسا ہی تسخیر قلوب کا حال ہے کیونکہ اس کے ذریعے سے جو مال دیا جاتا ہے وہ طیب خاطر سے نہیں دیا جاتا۔ مغلوب الرائے ومضطر ہو کر دیتا ہے اور اگر کسی عمل میں جواز بھی ہو تب بھی ایسے اغراض کے لئے اللہ تعالیٰ کے نام کی بے قدری کرنا اور بھی بے ادبی ہے اور احادیث میں جو سورہ واقعہ کا پڑھنا وغیرہ آیا ہے وہ دنیا کو معین دین بنانے کی غرض سے ہے جو کہ دین ہی ہے۔ کاش یہ لوگ بجائے ان اعمال کے دعا کیا کرتے۔ اگر مقصود حاصل ہو جائے تو بھی مطلب کا مطلب اور ثواب کا ثواب اور اگر نہ ہوتا تو بھی دعا کا ثواب کہیں گیا ہی نہ تھا۔

مذکورہ بالا خرابیوں کے علاوہ عمل میں ایک اور بھی خرابی ہے کہ دعا سے تو پیدا ہوتی ہے عاجزی اور فروتنی اور عمل سے پیدا ہوتا ہے دعویٰ۔ عامل جانتا ہے کہ بس ہم نے یہ کر دیا اور وہ کر دیا۔

مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی علیہ الرحمۃ کا لوگ ذکر کرتے ہیں کہ فرماتے تھے کہ اگر صاحب نسبت عمل کرے تو نسبت سلب ہو جاتی ہے اس کی یہی وجہ ہے کہ عامل کو خدا پر توکل نہیں رہتا اور عجب پیدا ہو جاتا ہے اور یہ منافی ہے نسبت مع اللہ کے۔ یہ قدر ضروری بیان تھا دعا کے مہتم بالشان ہونے کا۔ اب دعا سے لوگوں کے تغافل کے اسباب کا بیان باقی رہا۔ انشاء اللہ تعالیٰ کسی موقع پر وہ بھی ہو جائے گا۔

فرمایا کہ دُعا کرتے وقت حسن ظن اور قوت رجا کو اپنا نقد وقت رکھو پھر ثمرہ دیکھو کہ کامیابی ہی ہوگی۔ (کمالات اشرفیہ)

مہمات الدعاء (حصہ دوم)

دعا سے تغافل کے اسباب کے متعلق یہ وعظ جامع مسجد تھانہ بھون میں ۱۶ صفر ۱۳۲۹ھ کو تقریباً تین گھنٹہ میں بیٹھ کر بیان فرمایا جسے مولوی نور حسین صاحب پنجابی نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

الحمدللّٰہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرورانفسنا ومن سیٔات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلاھادی لہ و نشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا و مولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ و بارک وسلم.

اما بعد فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم. وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِی اَسْتَجِبْ لَکُمْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْ خُلُوْنَ جَھَنَّمَ دَاخِرِیْنَ. (المؤمن آیت نمبر ۶۰)

ترجمہ: اور تمہارے پروردگار نے فرمادیا ہے کہ مجھ کو پکارو میں تمہاری درخواست کو قبول کروں گا جو لوگ (صرف) عبادت سے سرتابی کرتے ہیں وہ عنقریب (مرتے ہی) ذلیل ہوکر جہنم میں داخل ہوں گے۔

دعا کی ضرورت

اس سے پہلے وعظ میں دعا کی عظمت اور اس کے مہتم بالشان ہونے کا بیان بقدر ضروری کیا گیا تھا۔ وعظ کے ختم پر یہ ظاہر کیا گیا کہ آئندہ کسی موقع پر انشاء اللہ تعالیٰ دعا سے غفلت کرنے کے اسباب کے متعلق بیان کیا جائے گا۔ سو آج ان اسباب کا بیان کرنا مقصود ہے۔ یہ آیت وہی ہے جو پہلے وعظ میں بھی پڑھی گئی تھی۔ آج کا بیان بھی چونکہ دعا کے متعلق ہے اس لئے اس آیت سے بیان کو شروع کیا جاتا ہے اور اس بیان کو بھی اس پہلے وعظ کا بقیہ یا تتمہ سمجھنا چاہئے۔

قبل اس کے کہ غفلت عن الدعاء کے اسباب بیان کئے جائیں۔ یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ دعا صرف امور غیر اختیاریہ کے ساتھ خاص نہیں جیسا عام خیال ہے کہ جو امر

اپنے اختیار سے خارج ہوتا ہے وہاں مجبور ہو کر دعا کرتے ہیں ورنہ تدبیر پر اعتماد ہوتا ہے بلکہ امور اختیاریہ میں بھی دعا کی سخت ضرورت ہے اور ہر چند کہ ان کا وجود اور ترتیب بظاہر تدبیر اور اسباب پر مبنی ہے لیکن اگر غور کر کے دیکھا جائے تو خود ان اسباب کا جمع ہو جانا واقع میں غیر اختیاری ہے اور اس کا بجز دعاء کے اور کوئی علاج نہیں۔

مثلاً کھیتی کرنے میں ہل چلانا، بیج بونا وغیرہ تو اختیاری ہے مگر کھیتی اگنے کے واسطے جن شرائط اور اسباب کی ضرورت ہے وہ اختیار سے باہر ہیں مثلاً یہ کہ پالا نہ پڑے یا اور کوئی ایسی آفت نہ پڑے جو کھیتی کو اگنے نہ دے۔ اس لئے اللہ جل جلالہ فرماتے ہیں کہ اَفَرَئِيْتُمْ مَاتَحْرُثُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ (اچھا یہ بتلاؤ کہ تم جو یہ تخم وغیرہ بوتے ہو اس کو تم اگاتے ہو یا ہم) الخ پھر ان سب کو احتیاج ہے تعلق مشیت خداوندی کی۔ اور صاف ظاہر ہے کہ وہ عباد کے اختیار میں نہیں۔

پس ثابت ہو گیا کہ امور اختیاریہ میں بھی تدبیر اور کسب کے ساتھ دعا کی ضرورت ہے خصوصاً جب کہ اس پر نظر کی جائے کہ ہم جن اسباب کو اسباب سمجھے ہوئے ہیں وہ بھی درحقیقت برائے نام ہی اسباب ہیں۔ ورنہ اصل میں ان میں بھی وصف سببیت بمعنی تاثیر محل کلام میں ہے بلکہ احتمال ہے کہ عادت اللہ اس طرح جاری ہو کہ ان کے تلبس واقتران کے بعد حق تعالیٰ اس اثر کو ابتداء پیدا فرما دیتے ہوں اور جب چاہیں اثر مرتب نہ فرمائیں۔

جیسا کہ ابراہیم علیہ السّلام کے واقعہ میں اثر کو پیدا نہ فرمایا۔ تو جو شخص اس راز کو سمجھ گیا وہ کبھی حضرت ابراہیم علیہ السّلام پر آگ کے سرد ہونے میں تعجب نہیں کرے گا کیونکہ اگر تعجب ہے تو تاثیر کے مسلوب ہونے میں ہے اور اثر پیدا نہ ہونا چنداں عجب نہیں۔ اور آگ اگر مستقل فی التاثیر ہو جیسا طبعیین کہتے ہیں تو ہم پوچھتے ہیں کہ اگر شعلہ کے اندر سے جلدی ہاتھ ڈال کر نکال لیا جاوے تو ہاتھ کیوں نہیں جلتا۔ اگر آگ کی ذات مقتضی احراق ہے تو یہاں پر بھی ہاتھ جل جانا چاہئے تھا۔ معلوم ہوا کہ آگ کی ذات مقتضی احراق کو نہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ مؤثر تو اسی کی ذات ہے مگر مکث یعنی معتد بہ حصہ مدت تک ٹھہرنا اس کے لئے شراط ہے تو اس سے ہم کو انکار نہیں مگر کلام اس میں ہے کہ یہ شرط عادی ہے یا عقلی۔ اس وقت وجود شرط کے ترتب اثر کا آیا لزوم

کے ساتھ ہے یا بلا لزوم۔ سو اس کی فلسفی کے پاس کیا دلیل ہے اور اگر تجربہ کو اس کی دلیل کہا جاوے تو تجربہ سے صرف ترتب ثابت ہوتا ہے لزوم کیسے ثابت ہوا۔ اس کا دعویٰ بلا دلیل ہی رہا۔ کیونکہ تجربہ سبب کے افراد کا ابتداء سے انتہاء تک احاطہ نہیں کر سکتا۔ چند محدود افراد کے تجربہ اور مشاہدے پر حکم لگا دیا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی فرد جس کا اب تک مشاہدہ نہیں ہوا اس کے خلاف ہو۔ درحقیقت ان سب خرافات کے قائل ہونے کی وجہ یہی ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے فاعل بااختیار ہونے کے قائل نہیں۔ اسی لئے ایسی ایسی رقیق تاویلیں کرنی پڑتی ہیں۔

بالجملہ ان اسباب کے تاثیر کی ایسی مثال معلوم ہوتی ہے کہ جیسے سرخ جھنڈی دکھانے سے ریل رک جاتی ہے۔ اب کوئی نادان یہ سمجھے کہ سرخ جھنڈی میں کوئی تاثیر ہے جس سے ریل رک جاتی ہے تو یہ اس کی نادانی ہوگی۔ سرخ جھنڈی سے تو کیا رکتی وہ تو کسی چلانے والے کے روکنے سے رکی ہے سرخ جھنڈی صرف اصطلاحی علامت قرار دی گئی۔

یہی مثال ہے اسباب اور ترتب اثر کی۔ اصل کام تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ یہ اسباب وعلامات محض عباد کی تسلی ودیگر حکمتوں کے لئے مقرر فرما دیئے ہیں۔

ایں سببہا درنظرہا پردہاست   درحقیقت فاعل ہر شے خداست

(یہ اسباب نظروں میں پردہ ہیں درحقیقت ہر چیز کے فاعل اللہ تعالیٰ ہی ہیں)

کب فلک کو یہ سلیقہ ہے ستمگاری کا   کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

عارفین اس بات کو سمجھے اور حقیقت حال معلوم کر کے یوں گویا ہوئے۔

عشق من پیدا و معشوقم نہاں   یار بیروں فتنۂ اودر جہاں

''مجھ میں عشق ظاہر ہے اور معشوق پنہاں ہے یار تو جہاں سے باہر ہے مگر اس کا تصرف جہاں کے اندر ہے اور وہ خود نظر نہیں آتا''

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل   نسیم صبح تیری مہربانی

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں   مصلحت را تہمتے برآہوئے چیں بستہ اند

''مشک بکھیرنا تیری زلفوں کا کام ہے لیکن عاشقوں نے کسی مصلحت کی بناء پر چین کے ہرنوں پر یہ تہمت لگا رہی ہے''

بادوآب وخاک وآتش بندہ اند　　　　بامن وتو مردہ باحق زندہ اند

''ہوا' پانی' مٹی اور آگ سب تیرے بندہ ہیں میرے اور تمہارے نزدیک تو مردہ ہیں لیکن حق تعالیٰ کے نزدیک زندہ ہیں''

مثنوی میں ایک یہودی بادشاہ کی حکایت ہے جو مسلمانوں کو بتوں کے سجدے پر مجبور کرکے آگ میں ڈلواتا تھا۔ یہاں تک کہ اخیر میں یہ قصہ ہوا کہ وہ آگ میں نہیں جلتے تھے۔ اس پر اس یہودی بادشاہ نے آگ سے مجنونانہ غصہ میں یہ خطاب کیا کہ تجھے کیا ہوگیا ہے کہ تو نہیں جلاتی۔ تو آگ نہیں رہی۔ آگ نے باذن خالق جواب دیا۔

گفت آتش من ہمانم آتشم　　　　اندر آتا تو بینی تابشم

''آگ نے کہا کہ میں آگ ہی ہوں تو اندر داخل ہوتا کہ میں تجھے جلادوں''

پھر اس گستاخی کا یہ انجام ہوا۔

بانگ آمد کار تو ایں جارسید　　　　پائے دارائے سگ کہ قہر مارسید

''آواز آئی کام تیرا اسی جگہ تک پہنچا۔ کھڑا رہ اے کتے تاکہ ہمارا قہر وغضب نازل ہو''

دیکھئے وہی آگ تھی ایک کو جلایا ایک کو نہ جلایا۔ اس سے یہ بات بہت وضاحت سے ثابت ہوگئی کہ اسباب بھی باختیار حق ہیں۔ جب یہ ہے تو اسباب کے اعتماد پر خالق سے قطع نظر واستغناء کرنا بڑی غلطی ہے۔ غرض امور اختیاریہ ہوں یا غیر اختیاریہ سب میں دعا کی حاجت ثابت ہوئی۔ البتہ امور اختیاریہ میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ تدبیر بھی کیا جائے اور دعا بھی۔ یہ نہ ہو کہ بلا تدبیر صرف دعا پر اکتفا کیا جائے۔

مثلاً کوئی شخص اولاد کی تمنا رکھتا ہے تو اسے چاہئے کہ اول نکاح کرلے اور پھر دعا کرے اور بے نکاح کے اگر یوں ہی چاہے کہ اولاد ہوجائے تو یہ اس کی نادانی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسباب پیدا کئے ہیں اور ان میں حکمتیں اور مصلحتیں رکھی ہیں۔ مطلق اسباب کا اس طور پر معطل چھوڑنا افراط وغلو ہے اور ایک گونہ تعلیل ہے حکم الٰہیہ کی جو کہ سوئے ادب اور خلاف عبدیت اور مباشرت اسباب میں اظہار عبدیت اور افتقار الی اللہ بھی جو کہ اعظم مقاصد سے ہے۔ اس لئے ایسے امور میں مباشرت اسباب اور دعا دونوں کا ہونا ضروری

ہے کہ اس میں اعتدال اور تعدیل ہے۔

غرض یہ ثابت ہو گیا کہ دعا کی حاجت سب کو ہے اور اگرچہ اعتقاد تو اکثر مسلمانوں کا یہی ہے مگر پھر بھی دعا سے غفلت کی جاتی ہے۔ اب اس کی کیا وجہ ہے۔

اہل سائنس اور اسرار قدرت

اگرچہ اسباب غفلت کے بہت ہیں مگر اس وقت چند اسباب جو بطور امور کلیہ کے ہیں بیان کئے جاتے ہیں۔ باقی اسباب کا بطور تفریح کے ان ہی سے سمجھ لینا اور نکال لینا آسان ہوگا۔ سو ایک سبب تو جس کا آج کل زیادہ تسلط ہے یہ ہے کہ طبائع میں تعلیم جدید کے اثر سے توغل طبیعیات کے سبب جمود، ظاہر بینی، حسن پرستی اس درجہ آ گئی ہے کہ معنوی اور خفی اسباب تک ان کی نظر کو رسائی نہیں ہوتی۔ اس لئے دعا کو بھی بے کار سمجھا جانے لگا ہے اور تمام تر آثار کو ان ہی اسباب طبعیہ میں منحصر مان لیا ہے۔ حالانکہ یہ حضرات جن سائنسدانوں کی تقلید کر رہے ہیں خود ان کے محققین اسباب کے آثار اور قدرت کے اسرار کی پوری تحقیق و احاطہ سے لاعلمی کا اقرار کر رہے ہیں اور کیوں نہ کریں آخر اس سائنس کی ساری پونجی اور تمام دولت استقراء ہی تو ہے جو کہ نہایت ناقص و ناتمام درجہ کی دلیل ہے۔ یہ حضرات چونکہ مسلمان ہونے کی وجہ سے خدائے تعالیٰ کے وجود کا انکار تو نہیں کر سکتے تھے جیسا کہ یورپ کے آزاد منش لوگ کر بیٹھے ہیں۔ انہوں نے یہ کیا کہ ایک قانون فطرت اپنے ظن و گمان میں تجویز کیا اور اس کے بننے میں تو اللہ تعالیٰ کا ماتحت مانتے ہیں لیکن چلنے میں اس کا بھی محتاج نہیں مانتے بلکہ نعوذ باللہ خود واجب الوجود کو اس کا تابع سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بس اس کو خاص انتظام پر پیدا تو کر دیا لیکن وہ اب اسی طرح پر چل رہا ہے اس میں تغیر نہیں ہو سکتا۔ جیسے گھڑی کہ کوک دینے میں تو دوسرے کی محتاج ہے اس کے بعد از خود چلتی رہتی ہے۔ گویا اب اللہ تعالیٰ کو بھی تغیر و تبدل کا کچھ اختیار نہیں۔ معاذ اللہ! مسلمان ہو کر یہ عقیدہ۔ جو اس وجہ سے عقل کے بھی خلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اضطرار اور عجز لازم آتا ہے نیز اس صورت میں مشیت کا تعطل بھی لازم آئے گا۔ اور مشیت کے تحقق پر نصوص قطعیہ شاہد ہیں یہ بھی ایسا ہی ہے جیسے حکمائے یونان اللہ تعالیٰ کے وجود کو حدوث عالم کے لئے علت موجبہ

اضطرار یہ قرار دیتے ہیں اور اختیار مشیت کی جو اس میں نفی لازم آتی ہے اس کے قائل ہوتے ہیں لیکن ان کی اس لئے زیادہ شکایت نہیں کہ وہ التزام اسلام کا کئے ہوئے نہیں اور یہ تو سب سے زیادہ اسلام کے جان نثار و خیر خواہ بنتے ہیں۔ افسوس ہے کہ یہ اتنا نہیں سمجھتے کہ اگر صفت اختیار باری تعالیٰ میں نہ مانی جائے تو احداث عالم میں یا ترجیح بلا مرجح کا قائل ہونا پڑے گا جو عقلاً محال ہے یا عالم کو قدیم کہنا پڑے گا جو سمعاً (نقلاً) محال ہے۔

یہ خدشہ نہ کیا جائے کہ اختیار میں بھی ترجیح بلا مرجح کا لزوم ہوتا ہے کیونکہ اس کی کیا وجہ کہ یہ اختیار پہلے متعلق نہ ہوا پھر متعلق ہو گیا۔

جواب یہ ہے کہ صفت ارادہ واختیار کے لئے یہ امر ذاتی یا لازم ہے کہ تخصیص ماشاء متی شاء اور ذاتی اور لازم کے لئے علت کا سوال نامعقول ہے۔ کیونکہ اس میں تخلل جعل کا درمیان ذات وذاتیات کے یا درمیان ملزوم ولازم کے لازم آتا ہے اور یہ محال ہے۔ پس وہ خدشہ رفع ہو گیا اور اعتقاد اختیار کا بلا غبار ثابت رہا۔

پس اس تمام بیان سے معلوم ہو گیا کہ مذہب تعطل وانکار قدرت بالکل باطل ہے۔ مذہب حق یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ فاعل بااختیار ہے۔ جب یہ ہے تو اس کی قدرت جس کی وجہ سے ممکن کا خود وجود اور ظہور ہوا، ممکنات کی تاثرات کو ظاہر بھی کر سکتی ہے اور روک بھی سکتی ہے۔ اسی وجہ سے دعا کی جاتی ہے کہ آپ اپنی مشیت کا تعلق اس سے فرمائیں۔

قوت یقینیہ اور اجابت دعا

یہ تو جب ہے کہ اسباب خاصہ سے وہ مسبب پیدا ہو لیکن خود یہ بھی ضروری نہیں کہ تمام اسباب جمع ہونے پر ہی ترتب اثر ہو بلکہ بعض دفعہ اللہ جل جلالہ اپنی رحمت وعنایت سے نیک بندوں کی عاجزی اور دعا وزاری پر نظر فرما کر محض اپنی قدرت سے تھوڑے سے ناتمام اسباب سے یا بلا اسباب بھی اثر مرتب فرما دیتے ہیں۔

چنانچہ حدیث شریف میں یہ قصہ موجود ہے کہ ایک نیک بی بی نے تنور میں سوختہ جھونک کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اللّٰھم ارزقنا تھوڑی دیر کے بعد کیا دیکھا کہ تنور میں روٹیوں سے پر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں میں قوت یقینیہ زیادہ تھی پورا یقین اس

کی رزاقی پر تھا۔ چنانچہ اس کا ظہور بلا اسباب ہوا۔

یہ حضرات تو اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ تھے۔ ابلیس کے یقین اور توقع اجابت دعا کی کیفیت دیکھئے کہ عین غضب اور قہاری کے موقع پر بھی پورا بھروسہ تھا کہ غضب الٰہی اجابت دعا کے لئے مانع نہیں ان رحمتی سبقت غضبی (بے شک میری رحمت میرے غصہ پر غالب آ گئی) حالانکہ یہ سوال ایسا بعید ہے کہ خود انبیاء علیہم السّلام کے لئے بھی اور دوام نہیں عنایت کیا گیا۔ مَاجَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِکَ الْخُلْدِ آپ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) سے پہلے ہم نے کسی انسان کو (دنیا میں) ہمیں نہیں رکھا) مگر شیطان نے رحمت کی وسعت کے بھروسہ پر اس کی دعا کردی حکم بھی ہوگیا اِنَّکَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ (بے شک تجھے اس دن تک جس کا وقت اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے مہلت دی گئی) دعا کے قبول ہونے پر بھروسہ اور یقین ہو تو ضرور اثر ہوتا ہے۔ اور یقین ایسی چیز ہے کہ اس سے بڑے بڑے آثار پیدا ہوتے ہیں۔

چنانچہ حضرت علاء بن الحضرمی حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت میں جب غزوہ مرتدین کے لئے بحرین پر گئے اور راستے میں دریا پڑا تو ساتھیوں نے اس وجہ سے کہ کشتی تیار نہ تھی ٹھہرنے کو کہا۔ فرمانے لگے خلیفہ کا حکم جلدی پہنچنے کا ہے اس لئے میں نہیں ٹھہر سکتا اور یہ کہہ کر دعا کی کہ اے اللہ جس طرح تو نے اپنے نبی موسیٰ علیہ السّلام کی برکت سے بنی اسرائیل کو دریا سے پار کیا، اسی طرح آج ہم کو ہمارے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کی برکت سے پار اتار دے اور دعا کر کے گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ دریا پایاب ہوگیا اور سارا لشکر پار ہوگیا۔

مشہور حکایت ہے کہ ایک مولوی صاحب بسم اللہ کے فضائل میں وعظ فرما رہے تھے کہ بسم اللہ پڑھ کے جو کام کریں وہ پورا ہو جاتا ہے۔ ایک جاہل گنوار نے سنا اور کہا، یہ ترکیب تو اچھی ہاتھ آئی۔ ہر روز کشتی کے پیسے دینے پڑتے ہیں۔ پس بسم اللہ پڑھ کے دریا سے پار اتر جایا کریں گے۔ چنانچہ مدتوں وہ اسی طرح سے آتا جاتا رہا۔ اتفاقاً ایک روز مولوی صاحب کی دعوت کی اور گھر لے جانے کے واسطے ان کو ساتھ لیا۔ راستے میں وہی دریا آیا۔ مولوی صاحب کشتی کے انتظار میں رکے۔ اس نے کہا مولوی صاحب آیئے کھڑے کیوں رہ گئے۔ مولوی صاحب

بولے کیسے آؤں۔ مولوی صاحب کی تو ہمت نہ ہوئی مگر اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ ان کو بھی پار اتار دیا۔ یہ قوت یقینیہ ہی تھی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ آسان کر دیا۔

اسی وجہ سے بعض بزرگ تعویذ دیتے وقت کہتے ہیں کہ اس کو کھولنا مت ورنہ اثر نہیں ہوگا۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ کھولنے سے دیکھنے والا وہی معمولی سمجھ کر ضعیف الاعتقاد ہو جاتا ہے اور اثر نہیں ہوتا۔ ان مثالوں سے ظاہر ہو گیا کہ تھوڑے بہت اسباب جمع کر کے اگر اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر دعا کی جائے تو اللہ تعالیٰ اس تھوڑے حیلے میں یقین کی برکت سے سب کچھ دے دیتا ہے۔

ترقی اور تقدیر

یہی معنی معلوم ہوتے ہیں واجملوا فی الطلب وتوکلوا علیہ[1] (میانہ روی اختیار کرو اور اس پر بھروسہ رکھو) کے کہ تدبیر اور مباشرت اسباب میں اختصار ہو۔ اجملوا اس کی طرف اشارہ ہے اور نظر تقدیر پر ہو تو کلوا علیہ میں اس کی طرف اشارہ ہے اور درحقیقت اگر روزی صرف سعی وتدبیر پر ہی موقوف ہوتی تو اکثر آدمی حکمت وتدبیر سے غنا حاصل کر سکتے تھے۔ مگر غنا اور تمول دیکھا جاتا ہے کہ حکمت اور تدبیر اور سعی پر موقوف نہیں بلکہ بکثرت دیکھا گیا ہے کہ ایک معمولی آدمی جو دو آنے تین آنے کی مختصر مزدوری کیا کرتا تھا، چند سال میں وہ لکھ پتی ہو گیا۔

اگر غنا تدبیر اور سعی سے بلا تقدیر حاصل ہو سکتا ہے تو ہم ایک دوسرا آدمی منتخب کرتے ہیں جو قوت اور ہمت رائے وتدبیر میں اس سے زیادہ ہو اور مدت بھی اس کے لئے دوگنا تجویز کرتے ہیں اور اس پہلے کو دو آنے روزانہ ملتے تھے ہم اس کو چار آنے یومیہ دیتے ہیں اور اس پہلے شخص کا تمام کارنامہ اس کو دیئے دیتے ہیں۔ پھر ہمیں دیکھیں گے کہ اس پہلے کے برابر یا اس کے قریب مضاعف مدت میں کما سکتا ہے ہرگز نہیں۔ ترقی کے اسباب اور تدابیر بہت قومیں جانتی ہیں مگر ترقی وہی قومیں کرتی ہیں کہ جن کی تدبیر اور سعی کے ساتھ تقدیر بھی مساعدت کرتی ہے ورنہ ان سے دگنی محنت کرتے ہیں اور افلاس نہیں جاتا۔

اصل یہ کہ نہ تو نرے اسباب پر مدار ہے بلکہ تقدیر اور مشیت کی موافقت شرط ہے اور نہ یہ کارخانہ اسباب بالکل معطل ہے کہ اس کو چھوڑ کر صرف دعا سے ہی کام لیا جائے۔ افراط اور

---

[1] الدر المنثور للسیوطی ۳:۳۵۱

تفریط دونوں کو چھوڑیں اس طرح سے کہ اسباب کو بھی اختیار کریں کیونکہ اس میں بھی اظہار ہے عبدیت اور افتقار الی اللہ کا اور اسباب کے بھروسے سے دعا سے بھی غفلت نہ کی جائے۔ ہم میں بعضے جو متوکل ہوئے تو اس میں بھی غلو کرنے لگے ہیں۔ ہماری بھی وہی مثال ہے۔

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی ‏ ‏ تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

اس غلو کی بدولت بعض اوقات توکل نام کو ہوتا ہے واقع میں تعطل اور کم ہمتی ہے۔

چوں باز باش کو صیدے کنی ولقمہ دہی ‏ ‏ طفیل خوارہ مشو چوں کلاغ بے پروبال

اشراف نفس

البتہ اگر اسباب معشیت میں اشتغال مضر اس کے دین کو یا مانع خدمت دین کو ہو، اور یہ شخص اس کا اہل ہے اور توکل کی ہمت بھی ہے تو توکل بہتر ہے۔ مثلاً اس کے متعلق تعلیم و تربیت دینی ہو تو اس کو توکل اور دینی خدمت سے بہتر کوئی کام نہیں۔ البتہ یہ ضروری بات ہے کہ توکل صرف اللہ پر ہو، لوگوں کی ہدایا وتحف کی طرح نفس کا اشراف نہ ہو۔ حدیث میں من غیر اشراف نفس[1] (بغیر اشراف نفس کے) کی قید آتی ہے۔ ورنہ وہ توکل علی اللہ نہیں۔ غرض لوگوں کے اموال کی تاک میں نہ بیٹھا رہے۔

اس مقام پر ایک نکتہ سننے کے قابل ہے۔ وہ یہ کہ بعض اوقات اہل کشف کو کشف سے آمد معلوم ہو کر مال کی طرف اشراف پیدا ہو جاتا ہے یا بعض اوقات اموال مشتبہ کی حقیقت ظاہر ہو کر مال حلال ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔ سو کشف نہ ہونا بھی اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ عمل بالسنّت میں مخل نہیں ہوتا ہے۔

اشراف کے متعلق بلگرام کے ایک بزرگ عالم کا قصہ یاد آیا کہ ان کے خاص شاگرد یا مریدان کے پاس آئے۔ شیخ کے اضمحلال اور ناتوانی کو دیکھ کر انہوں نے جانچ لیا کہ آج فاقہ ہے۔ اس لئے وہ اٹھے اور کچھ کھانا لے کر حاضر ہوئے اور پیش کیا۔ شیخ نے فرمایا کہ گو یہ پہنچا ہے حاجت کے وقت لیکن مجھ کو اس کے قبول کرنے میں ایک عذر ہے۔ اس واسطے کہ جس وقت تم میرے پاس سے اٹھ گئے تھے اس وقت میرے دل میں خیال آیا تھا کہ کھانا

---

[1] جمهرة أنساب العرب: ۱۶۷

لائیں گے۔ کیوں کہ میرے دل کا اشراف نفس اس کیساتھ ہو گیا اور ایسی حالت میں ہدیہ لینا خلاف سنت ہے اس لئے اس کے لینے سے معذور ہوں۔ ماشاء اللہ مرید یا شاگرد تھے سمجھ دار کہ ذرا اصرار نہیں کیا جیسا کہ بعض کم فہم لوگوں کی عادت ہے کہ بزرگوں سے جھک جھک کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ نہایت سوء ادب ہے بلکہ فوراً کھانا لے کر اٹھ گئے اور آدھے راستے سے پھر لوٹ آئے اور وہی کھانا پھر پیش کیا اور عرض کیا کہ حضرت لیجئے اب تو میرے واپس چلے جانے سے اشراف نہیں رہا ہو گا اب قبول فرمالیجئے۔ شیخ نے قبول فرمالیا اور ان کو اس نکتہ رسی اور ذہانت پر آفرین فرمائی۔ آپ نے سنا بزرگان دین نے اشراف سے کس قدر تحرز کیا ہے غرض توکل کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ اشراف نہ ہو اور بدون اس کے اگر توکل ہو تو محمود ہے اور جو توکل کے شرائط نہ ہوں تو تدبیر مسنون ہے۔ بالجملہ افراط تفریط دونوں سے برکنار رہے اور اعتدال اختیار کر لے۔

اگر توکل ے کنی درکار کن کسب کن پس تکیہ برجبار کن

(اگر توکل کرو تو کام کے اندر توکل کرو پھر اسباب کے اندر اثر رکھنے میں اور ان کے مسبب ہونے پر اللہ پر توکل کرو)

گفت پیغمبر بآواز بلند برتوکل زانوے اشتربہ بند

(پیغمبر صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس سے (جو اونٹ پر سوار ہو کر آیا تھا) فرمایا اونٹ کا زانو رسی سے باندھنے کے بعد اللہ پر توکل کرو)

تدبیر واسباب

جان لینا چاہئے کہ تدبیر واسباب کا اختیار کرنا بھی توکل فرض کے خلاف نہیں ہے۔ اس کی بعینہ مثال توکیل کی سی سمجھ لینا چاہئے۔ مثلاً جب کوئی شخص کسی مقدمہ میں وکیل مقرر کرتا ہے تو کیا وکیل کرنے کے بعد یہ شخص نکما خالی بیٹھ جاتا ہے۔ ہرگز نہیں! بلکہ جتنی کوشش اس سے ہو سکتی ہے خود بھی کرتا ہے اور اس کو خلاف توکیل نہیں سمجھتا بلکہ یہ سمجھتا ہے کہ وکیل کے کرنے کا جو کام ہے کرے گا۔ جو کچھ مجھ سے ہو سکتا ہے مجھ کو کرنا چاہئے۔

اسی طرح تدبیر کرنا اعتدال کے ساتھ توکل کے خلاف نہیں۔ بلکہ تدبیر ایسی چیز ہے کہ جو

امور محض غیر اختیاری ہیں جن میں تدبیر کو اصلاً دخل نہیں محض دعا ہی پر ان کا مدار ہے۔ سنن میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی دعا کے ساتھ کچھ صورت تدبیر اختیار کی جاتی ہے۔

چنانچہ ایک قصہ حدیث سے بیان کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہو جائے گا کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے کس طرح توکل اور دعا کو جمع فرمایا اور اس حدیث کے ضمن میں اور بھی فوائد ہیں۔ ایک صحابی جن کا نام مقدادؓ ہے جو کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مکان پر مسافرانہ مقیم تھے اور ان کو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بکریاں بتلا دیں اور ان کا دودھ نکال کر کچھ خود اور رفقا پی لیا کرو اور کچھ ہمارے لئے رکھ دیا کرو اور ان کا اسی طرح معمول تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک روز حضور کو آنے میں دیر ہوئی تو میں سمجھا کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی کہیں دعوت ہوگئی ہوگی۔ یہ خیال کر کے آپؐ کا حصہ بھی پی گیا۔ مگر اتفاق سے جب پی چکا اس وقت خیال آیا کہ شاید آپ نے کچھ نہ کھایا ہو اور بے چینی کا یہ حال ہوا کہ کروٹیں بدلتا ہوں اور نیند نہیں آتی۔ اسی شش و پنج میں تھا کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم تشریف لائے۔

آپؐ کی عادت شریفہ آنے کے وقت یہ تھی کہ جب تشریف لاتے اور دیکھتے کہ گھر والے لیٹے ہیں تو بہت آہستہ سے سلام کرتے اس طرح کہ اگر حاضرین جاگتے ہوتے تو سن لیتے اور سوتے ہوتے تو آنکھ نہ کھلتی۔ اسی طرح نسائی میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے آپکا شب برات میں بقیع میں جانے کے لئے آہستہ اٹھنا اور آہستہ سے کواڑ کو کھولنا سب کام آہستہ سے کرنا تا کہ سونے والے کو تکلیف نہ ہو آیا ہے۔ سو اسی طرح سلام بھی آہستہ سے فرماتے کہ اگر کوئی جاگتا ہو تو سن لے اور سوتا ہو تو اس کی نیند میں خلل نہ آئے۔

اس موقع پر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بعض لوگ دوسرے آدمیوں کی تکلیف کا اصلاً خیال نہیں کرتے۔ سوتے آدمیوں میں اٹھ کر سب کام بے تکلف زور زور سے کرتے ہیں اور اس سے دوسروں کو ایذا ہوتی ہے اسی طرح یہ امر بھی موجب ایذا ہے کہ مشغول کار آدمی کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں جس سے اس کے ضروری کام میں حرج بھی ہوتا ہے اور پریشانی بھی۔

نواب صدیق حسن خاں صاحب کے بیٹے کی ایک حکایت یاد آئی کہ ایک روز بھوپال میں وہ مغرب کی نماز پڑھتے تھے۔ اور ایک صاحب مدعی عمل بالحدیث ان کے پاس کھڑے

تھے۔ یہ خیال کر کے کہ صاحبزادہ صاحب بہت خوش ہوں گے بڑے زور سے آمین کہی۔ صاحب زادہ صاحب نے بعد نماز کے ان سے کہا کہ آپ سے مجھے کام ہے ذرا مجھ سے مل کر جایئے۔ وہ خوشی خوشی انتظار میں بیٹھ گئے۔ دیکھئے کیا انعام ملتا ہے۔ اتنے میں صاحبزادہ صاحب مسجد کے باہر تشریف لائے وہ صاحب سامنے آئے کہ حضور کیا ارشاد ہے۔ انہوں نے ان صاحب کے ایک دھول جمائی اور فرمایا کہ آمین بالجہر تو ضرور حدیث میں آئی ہے مگر یہ بتلا کہ آمین کی اذان کس حدیث میں آئی ہے، جو تو نے اس زور سے کہی کہ پاس والے بھی گھبرا اٹھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ محض مخالفت بھڑکانے کو ایسا کیا جاتا ہے، اسی لئے یہ سزا دی گئی۔

حضرت ہماری سبھی حالتیں بگڑ رہی ہیں۔ ہر چیز میں افراط تفریط ہو رہی ہے اور عوام کی کیا شکایت کریں۔ انصاف یہ ہے کہ آداب کو بعض اہل علم تک نہیں جانتے محض لفظ پرستی رہ گئی ہے۔

مولوی گشتی و آگہ نیستی — خود کجا واز کجا وکیستی

(مولوی بن گئے لیکن یہ پتہ نہیں کہ خود کہاں ہیں کہاں سے ہیں اور کون ہیں)

اس لفظ پرستی پر ایک مثال یاد آئی ایک شخص کا انتقال ہوا۔ موت کے قریب بیٹے کو وصیت کی کہ جو کوئی میری تعزیت کو آئے اس کو اونچی جگہ بٹھانا اور نرم اور شیریں باتیں کرنا اور بھاری کپڑے پہن کر اس سے ملنا اور قیمتی کھانا کھلانا اب صاحبزادے کی سنئے۔ ایک صاحب ان کے والد کے دوست تعزیت کو آئے۔ آپ نے فوراً نوکروں کو حکم دیا کہ ان کو مچان پر بٹھا دو۔ وہ آئے اور مجرموں کی طرح سے ان کو زبردستی پکڑ کر مچان پر بٹھا دیا اب وہ پوچھتے ہیں کہ کیا معاملہ ہے نوکر کہتے ہیں کہ آقا کا یہی حکم ہے۔ اب آقا صاحب تشریف لائے تو اس انداز سے کہ جاجم دری قالین میں لپٹے ہوئے۔ ایک عجیب بغلول کی سی شکل بنے ہوئے ہیں۔ آخر مہمان نے کچھ تعزیت میں کہا تو جواب فرماتے ہیں گڑ۔ انہوں نے کچھ اور کہا، تو جواب ملتا ہے روئی مہمان بے چارہ دنگ ہے، غرض کھانے کا وقت آیا۔ گوشت گلا نہ تھا، مہمان نے کہیں اس کا شکوہ کیا تو آپ تیز ہو کر کہتے ہیں واہ صاحب! میں نے آپ کے لئے پچاس روپیہ کا کتا کاٹ ڈالا اور آپ کو پسند نہیں۔ اب مہمان اور بھی پریشان۔ آخر تحقیق کیا تو انہوں نے بیان کیا کہ ابا جان نے وصیت کی تھی کہ میرے انتقال کے بعد اگر کوئی شخص تعزیت کے واسطے

تمہارے پاس آئے تو اس کو اونچی جگہ بٹھانا اس واسطے میں نے مچان پر بٹھایا کہ سب سے اونچی جگہ یہی تھی اور یہ کہا تھا کہ بھاری کپڑے پہن کر ان سے ملنا تو اس دری قالین سے بھاری کوئی کپڑا نہ تھا۔ تیسرے یہ کہا تھا کہ نرم اور میٹھی باتیں کرنا تو گڑ اور روئی سے زیادہ نرم اور میٹھی چیز مجھ کو نہ معلوم ہوئی اور وصیت کی تھی کہ قیمتی کھانا کھلانا تو اس کتے سے زیادہ کوئی جانور قیمتی ہمارے گھر نہ تھا۔ مہمان لعنت بھیج کر وہاں سے رخصت ہوا۔

پس یہی حالت ہماری ہے کہ الفاظ یاد کر لئے ہیں۔ حقیقت آداب و اخلاق اعمال کی نہیں سمجھے۔ چنانچہ ہم نے اخلاق نام صرف چاپلوسی اور خوشامد اور میٹھی باتیں کرنے کا رکھ لیا ہے سو حقیقت میں اخلاق کو نفاق سے بدل دیا ہے۔ اخلاق کی حقیقت یہ ہے کہ ہم سے کسی کو کسی قسم کی ایذا ظاہری یا باطنی یا حضور یا غیبت میں نہ پہنچے۔ ہم نے یہ سمجھا کہ اخلاق ظاہر داری کا نام ہے گو اس سے ایذا ہی پہنچے اس کی کچھ پروا نہیں۔ اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی یہ شفقت اور رعایت کو سلام بھی کرتے ہیں، تو اس طرح سے کہ کوئی بے چین نہ ہو۔

غرض آنحضرتؐ عشاء کے بعد تشریف لائے اور حسب معمول سلام کر کے برتنوں کی طرف چلے اور وہ صحابی جو دودھ پی کر لیٹ گئے تھے یہ سب دیکھ رہے ہیں۔ آپ کو اس میں دودھ نہ ملا۔ چونکہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اس وقت بھوک لگی ہوئی تھی اور طعام کی حاجت تھی۔ آپؐ نے حسب معمول نفلیں پڑھیں اور یوں دعا فرمائی کہ **اللّٰھم اطعم من اطعمنی**[1]۔

دیکھئے یہ امر قابل غور ہے کہ اس دعا میں آپ نے توکل کے ساتھ اسباب کی کس لطیف طور پر رعایت فرمائی کہ یہ ظاہر کر دیا کہ کھانا اکثر اس طرح ملتا ہے کہ کوئی شخص ظاہر میں لے آئے۔ ورنہ یہ بھی تو دعا فرما سکتے تھے کہ اے اللہ! آسمان سے مائدہ یا رزق بھیج مگر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے توکل و تدبیر کو کس طرح لطیف طریق پر جمع فرمایا جیسا کہ مذکور ہوا۔

تمہ قصہ کا یہ ہے کہ اس دعا کے سننے کے بعد وہ صحابی اٹھے۔ چونکہ ان کو یقین تھا کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی دعا قبول ہوئی ہوگی۔ اس لئے گو بکریوں کا دودھ دوہ چکے تھے مگر پھر برتن کو لے کر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

---

[1] الصحیح لمسلم: ۱۶۲۶، مسند الإمام أحمد ۶: ۲، ۳، ۴، حلیة الأولیاء: ۱۷۴

غرض اس قصے کے بیان سے یہ تھی کہ دیکھنا چاہئے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دعا و توکل کے ساتھ اسباب کی رعایت کس طور پر فرمائی۔ پس معلوم ہوا کہ نہ دعا کے بھروسہ اسباب کو چھوڑ دے اور نہ اسباب میں ایسا انہماک ہو کہ مسبب الاسباب پر نظر نہ رہے۔ اعتدال اصل طریقہ نبویہؐ ہے اور یہ بدون تحصیل و تبحر علوم دین کے حاصل ہونا مشکل ہے کوئی آسان کام نہیں جو ہر ایک دعویٰ کرنے لگے۔

برکفے جام شریعت درکفے سندان عشق ہر ہوسناکے نداند جام وسنداں باختن

آنحضرتؐ کے افعال سے تو یہاں تک اس اعتدال کا پتہ چلتا ہے کہ معجزات میں بھی جو کہ بالکل بطور خرق عادت ظہور میں آتے ہیں، ان میں بھی تدبیر اور اسباب کی صورت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

چنانچہ حضرت جابرؓ کی دعوت کا قصہ جو جنگ احزاب میں خندق کھودنے کے وقت ظہور میں آیا اس کا شاہد ہے۔ آنحضرتؐ نے ان کو فرمایا تھا کہ ہانڈی چولہے سے مت اتارنا پھر اس میں آکر آب دہن ملا دیا اور وہ چند آدمی کی خوراک لشکر کے لشکر کو کافی ہوگئی۔

اسی طرح حدیث میں اور بھی معجزات کے قصے ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ معجزہ خرق عادت میں تھوڑی سی رعایت اسباب کی گئی۔ مثلاً چولہے ہانڈی اور توئے کا رکھا رہنا اور ڈھک دینا وغیرہ کی صورت کو حجاب بنا دیا گیا۔ ورنہ ویسے بھی کھانا بڑھ سکتا تھا۔ یہ آداب ہیں توکل اور تدبیر کے سید المرسلینؐ سے ان کو سیکھنا چاہئے ان سے غافل رہنا بعض اوقات سبب ہو جاتا ہے۔ انہماک فی الاسباب کا جو ایک سبب ہے ترک دعا کا جس کا حاصل یہ ہے کہ اسباب میں انہماک اور مسبب الاسباب پر نظر نہ رکھنا اور عقیدت کی کمزوری۔

شیطانی وساوس

اب ایک دوسرا سبب دعا نہ کرنے کا سنئے وہ یہ کہ عقیدہ تو دعا کا ہے مگر یہ خیال ہو جاتا ہے کہ ہم دعا کے قابل نہیں ہم کیا دعا کریں۔ اور در حقیقت یہ بھی شیطان کا ایک وسوسہ ہے جو ان لوگوں کے دلوں میں تواضع کے رنگ میں ڈالا گیا ہے۔ در حقیقت بعض احوال باطنہ کچھ اس قسم کے ظاہراً مشتبہ معلوم ہوا کرتے ہیں کہ ان کو بھلا یا برا قرار دینے میں بڑی فہم و دقت نظر آگاہی

شرع شریف کی سخت ضرورت پڑتی ہے چنانچہ آیت۔ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیَانِ بَیْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیَانِ. (اسی نے دو دریاؤں کو ملایا کہ باہم ملے ہوئے ہیں اور ان دونوں کے درمیان ایک حجاب ہے کہ دونوں بڑھ نہیں سکتے) اہل لطائف اس طرف بھی ارشاد فرماتے ہیں چنانچہ اس مقام پر دو امر میں التباس ہو جاتا ہے ایک تو تواضع اور حیاء اس کی علامت یہ ہے کہ گناہ کرتے ہوئے بھی اس کا خیال رہے۔ اپنی عبدیت اور خدائے تعالیٰ سے شرم کرنا ملحوظ رہے ورنہ اگر صرف دعا کے وقت تواضع کے خیال سے دعا نہ کی جائے اور گناہ کرتے وقت بے باک اور نڈر ہو جائیں تو یہ درحقیقت تواضع نہیں ہے بلکہ کم ہمتی اور سستی ہے۔ شیطان نے برکات دعا سے محروم کرنے کے واسطے ایک حیلہ سکھا دیا ہے لہٰذا اس کا وسوسہ بھی دل میں نہ لانا چاہئے اور دعا بڑے اہتمام سے کرنی چاہئے کہ وہ خالی نہیں جاتی اور کچھ نہ ہو یہ کیا کچھ کم ہے کہ آخرت کے لئے اس کا اجر جمع رہے گا اور اہل حال کے جو اقوال ہیں۔ مثلاً

احب مناجات الحبیب باوجہ ولکن لسان المذنبین کلیل

''محبوب مناجات کو از حد پسند فرماتے ہیں لیکن گناہگاروں کی زبان لڑکھڑاتی ہے''

سو وہ غلبۂ حال ہے جس سے وہ معذور ہیں مگر قابل تقلید نہیں۔ الحاصل حیاء و تواضع میں رضائے خداوندی پیش نظر ہوتی ہے اور یہ نہ ہو تو کم ہمتی ہے ان باتوں میں فرق کرنے کے واسطے بڑی ضرورت ہے علم شریعت کی۔ اسی طرح اگر کوئی شخص **لا صلوٰۃ الا بحضور القلب** میں بھی یہی حیلہ جو دعا میں کیا ہے نکال لے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نماز چھوڑ بیٹھے گا۔ لہٰذا ایسے وساوس نا قابل اعتبار ہیں جو کچھ جیسا کچھ ہو سکے کرنا چاہئے بھلا برا جو کچھ بھی ہو خدا کے دروازے پر آنا چاہئے۔

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ نومیدی نیست صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

''تو جیسا کیسا بھی ہے اب بھی گناہوں سے باز آ اگر چہ تو کافر گبر اور بت پرست ہی کیوں نہیں اب بھی توبہ کر لے (اور ایمان لے آ) اس دربار میں نا امیدی نام کو نہیں ہے سو بار بھی اگر تو توبہ توڑ چکا ہے تب بھی باز آ اور گناہوں سے توبہ کر لے''

ایسا شخص ایک غلطی تو یہ کرتا ہے کہ کم ہمتی سے عبادت اور اطاعت اور دعا کی طرف نہیں آتا اور دوسری غلطی یہ کرتا ہے کہ اپنی نسبت گمان کرتا ہے کہ میں کسی وقت پاک وصاف ہو کر حق عبادت ادا کر سکتا ہوں اور ایسے وقت عبادت کروں گا اور جو عبادت کر رہا ہے گویا بزبان حال اس کا حق ادا کرنے کا مدعی ہے اور یہ بھاری غلطی ہے انسان کبھی پورا پاک نہیں ہو سکتا اور اللہ تعالیٰ کی درگاہ کے قابل بننا اور اس کا حق عبادت ادا کرنا کیا اس سے ممکن ہے۔

وجودک ذنب لایقاس بہ ذنب

''تیرا وجود گناہ ہے گناہ کے سوا اور کچھ قیاس نہیں کیا جا سکتا''

مولانا رومؒ فرماتے ہیں:

خودثنا گفتن زمن ترک ثنا است کایں دلیل ہستی و ہستی خطا است

''خودثنا کرنا میری طرف سے ترک ثنا ہے یہ ہستی کی دلیل ہے اور ہستی خود خطا ہے''

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لااحصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک[1] مرزا مظہر جان جاناں علیہ الرحمہ اس معنی میں کہ ہم آپ کی ثنا نہیں کر سکتے فرماتے ہیں۔

خدا در انتظار حمد مانیست محمد چشم برراہ ثنا نیست

خدا مدح آفریں مصطفےٰ بس محمد حامد حمد خدا بس

مناجاتے اگر خواہی بیان کرد بہ بیتے ہم قناعت می تواں کرد

محمد از تو میخواہم خدارا الٰہی از تو حب مصطفےٰ را

''حق تعالیٰ کو ہماری حمد کی ضرورت نہیں ہے نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری ثنا کا انتظار ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خدا کی مدح کافی ہے اور اللہ تعالیٰ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حمد کافی ہے اگر کوئی مناجات کرنا چاہتے ہو تو ان دو ہستیوں پر اکتفاء کرو کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے ہم خدا سے تعلق مانگتے ہیں اور اے اللہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت مانگتے ہیں''

اس لئے پاک سمجھنے کے بارے میں خدا تعالیٰ فرماتے ہیں لاتزکوا انفسکم (اپنے آپ کو مقدس نہ سمجھو) الخ ہم اور ہماری عبادت تو ایسی ہے کہ یہی غنیمت ہے کہ اس

---

[1] مسند الإمام أحمد ٦:٥٨، اتحاف السادة المتقين ٢:٧١

پر مواخذہ نہ ہو کیونکہ ہماری ثنا ایسی ہے جیسا مولانا فرماتے ہیں:

شاہ را گوید کسے جولاہ نیست — ایں نہ مدح است او مگر آگاہ نیست

''کوئی بادشاہ کی یہ تعریف کرے کہ وہ جولاہا نہیں ہے تو یہ اس کی تعریف نہیں ہے اگر چہ وہ اس سے واقف نہیں ہے''

مابری از پاک و ناپاکی ہمہ — وز گر انجانی و چالاکی ہمہ

من نہ کردم پاک از تسبیح شان — پاک ہم ایشاں شوند دور فشاں

''جیسی پاکی تم بیان کرتے ہو ہم اس سے بھی پاک ہیں اور ہر طرح کی سستی اور تیزی سے بھی پاک ہیں میں ان کی تسبیح سے پاک نہیں ہوتا لیکن وہ خود پاک ہو جاتے ہیں اور ان سے خوبیوں کا اظہار ہوتا ہے''

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ **انی لاستغفر اللّٰہ فی کل یوم سبعین مرۃ**[1] (میں ہر روز ستر دفعہ استغفار کرتا ہوں) حالانکہ عصمت انبیاء ایک مسلم مسئلہ ہے۔ پھر یہ استغفار گویا اپنی حالت عبادت کو کمال خداوندی کے مقابلہ میں ناتمام دیکھ کر ہوتا تھا۔ یعنی اپنی عبادت وحمد وثنا کو غیر قابل قرب خداوندی سمجھ کر استغفار کر رہے ہیں۔ یہ حالت ہے اکابر مقبولین کی کہ باایں ہمہ علو مرتبت بمقابلہ کمال حقوق خداوندی اپنے آپ کو محض ہیچ سمجھ رہے ہیں اور یہ نہیں کہ وہ واقع میں کمال ووصال سے خالی ہیں بلکہ

دل آرام در بردل آرام جو — لب از تشنگی خشک و برطرف جو

نگویم کہ برآب قادر نیند — کہ برساحل نیل مستسقی اند

''محبوب سے ہمکنار اور محبوب کی تلاش پیاس سے ہونٹ خشک اور لب دریا سیرابی کے طلب گار۔ میں یہ نہیں کہتا کہ پانی پر قادر نہیں لیکن دریائے نیل کے ساحل پر ہوتے ہوئے پیاسے ہیں''

داماں نگہ تنگ گل حسن تو بسیار — گلچین بہار تو زداماں گلہ دارد

''نگاہ کا دامن تنگ ہے اور تیرے پھول کثرت سے ہیں حسن گلچین اپنے دامن کی تنگی کا گلہ رکھتا ہے کہ اس کو اتنا دامن کیوں تنگ ملا۔''

---

[1] إتحاف السادة المتقين ۵:۵۷، كنز العمال: ۳۹۶۸

جب خواص کی یہ کیفیت ہے تو ہم عوام کس شمار میں ہیں ہم پر یہ ان کی عنایت ہے کہ باوجود ہماری بداعمالی خراب حالی جاننے کے پھر ہم کو اپنی اطاعت وحمد وثنا دعا والتجا کی رخصت دیتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ کرو۔ اگر وہ باوجود علم کے ہمارے کھوٹے مال اور ناقص عبادت کو قبول کرتے ہیں تو پھر بندہ کو کسی قسم کا عذر پیش کرنا گو وہ عذر ناقابلیت ہی کا ہو کس درجہ حماقت ہے۔

چوں طمع خواہد زتو سلطان دیں　　　خاک برفرق قناعت بعد ازیں

''جب دین کا بادشاہ تجھ سے طمع کا اظہار کرے تو پھر ایسی قناعت پر خاک پڑے''

ایں قبول ذکر تو از رحمت است　　　چوں نماز مستحاضہ رخصت است

یہ دوسرا سبب تھا دعا کے نہ کرنے کا۔ یعنی اپنے آپ کو دعا کے قابل نہ سمجھنا جس کی اصل پورے طور سے کر دی گئی۔

اب تیسرا سبب بیان کیا جاتا ہے وہ یہ کہ یعنی یہ سمجھ کر دعا نہیں کرتے کہ قبول تو ہوتی نہیں پھر دعا سے کیا فائدہ سو خود یہی غلط ہے کہ خداوند تعالیٰ دعا قبول نہیں کرتے۔ واقع میں موانع قبول دعا خود اپنی ذات میں ہوتے ہیں۔ مثلاً دل سے خشوع وخضوع کے ساتھ جو روح ہے دعا کی دعا نہ کرنا محض زبان سے کہہ دینا۔ حدیث میں ہے **ان اللّٰہ لایستجیب الدعاء من قلب لاہٍ**[۱] (بے شک اللہ تعالیٰ غافل دل سے دعا قبول نہیں کرتے) سو یہ قصور اپنا ہے ورنہ وہ ذات تو سب پر مہربان اور اس کا فیض سب پر محیط ہے اپنے میں قابلیت نہ ہو تو اس کا کیا علاج۔

اسکے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر　　　تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

ہم لوگوں کی تو یہ حالت ہے:

توبہ برلب سبحہ درکف دل پراز ذوق گناہ　　　معصیت راخندہ می آید براستغفار ما

(زبان پر توبہ، ہاتھ میں تسبیح اور دل گناہوں کے ذوق سے بھرپور، ہمارے اس استغفار پر معصیت بھی مسکراتی ہے)

اور مثلاً گناہ کی بات کی دعا کرنا۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ قبول کرتا ہے جب تک گناہ اور قطعیہ رحم کی دعا نہ ہو۔ سو بعض دفعہ اکثر دعائیں گناہ کی ہوتی ہیں۔ اب ان

---

[۱] مسند الإمام أحمد ۲: ۱۷۷، الترغیب و الترھیب للمنذری ۲: ۳۹۱

کا قبول کرنا نہ ہی خدا تعالیٰ کی رحمت ہے مثلاً موروثی زمین کے جھگڑے میں مالکانہ قبضے کی دعا خود گناہ ہے۔ ایسے ہی بعض لوگ بزرگوں سے دعا کراتے ہیں کہ ہمارا لڑکا فلاں امتحان میں پاس ہو جاوے اس کو ڈپٹی کلکٹری اور تحصیلداری وغیرہ مل جائے۔ سو یہ دعا ہی سرے ناجائز ہے کیونکہ حکومت کی اکثر ملازمتیں خلاف شرع ہیں۔

یہ شبہ نہ کیا جائے کہ بزرگوں کے متعلقین بعض ڈپٹی کلکٹری تحصیلداری وغیرہ حکومت کے عہدوں پر ہوتے ہیں۔ سو اگر یہ نوکری ناجائز ہے تو وہ بزرگ ان کو کیوں نہیں روکتے۔

جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ ہیں تو یہ نوکریاں ناجائز مگر لوگ اس میں مبتلا ہیں اور ان کے روزگار کی صورت بجز اس کے اور کچھ ہے نہیں۔ اگر ان کو اس سے علیحدہ کر دیا جائے اور وہ نوکری چھوڑ دیں تو بوجہ عدم سبیل معاش وہ اس سے زیادہ کسی گناہ میں مبتلا ہوں گے سو درحقیقت ان کو اجازت نہیں دی جاتی بلکہ اور بہت سے بڑے گناہوں سے بچا کر ایک چھوٹے گناہ پر رکھا جاتا ہے۔

ایسی دعا میں خود مشائخ اور علماء کو احتیاط کرنی چاہئے کہ ایسے ناجائز مقدمات اور امور ممنوعہ کے واسطے دعا نہ کیا کریں کیونکہ گناہ ہوگا اور صاحب حاجت تو صاحب الغرض مجنون ہوتا ہے اس پر اعتبار اور بھروسہ نہیں چاہئے اگر ایسا ہی کسی کی دل شکنی وغیرہ کا خیال ہو تو یوں دعا کریں کہ یاالٰہی جس کا حق ہو اس کو دلوایئے۔ باقی ایسی ناجائز دعا نہ اپنے لئے کرے نہ غیر کے لئے۔ ناجائز امور کی دعا یا دعا کا غافل دل سے کرنا منجملہ ان موانع کے ہے جن کی وجہ سے دعا قبول نہیں ہوتی اور اگر موانع بھی مرتفع ہو جائیں تو بعض دفعہ اس وجہ سے قبول نہیں ہوتی کہ درحقیقت وہ دعا اس کے لئے بہتر نہیں ہوتی اور خلاف حکمت ہوتی ہے اس لئے ترحماً قبول نہیں فرماتے۔

اس کی ایسی ہی مثال سمجھئے جیسے بچہ انگارے کو اچھا سمجھ کر منہ میں ڈالنے لگے تو شفیق ماں باپ اس کو منع کرتے اور اس کے ہاتھ سے چھین لیتے ہیں۔

آنکس کہ تونگرت نمے گرداند　　آن مصلحت تواز تو بہتر داند

(وہ شخص جو تجھے تونگر نہیں سمجھتا وہ اس کی مصلحت تجھ سے زیادہ سمجھتا ہے)

چنانچہ حکایت ہے کہ کسی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ دعا کرائی تھی کہ کل کی بات

معلوم ہو جایا کرے موسیٰ علیہ السلام نے اس کو نصیحت کی کہ اس کو جانے دے۔ اس نے نصیحت نہ مانی اور اصرار کیا۔ انہوں نے دعا کر دی اور وہ قبول ہوگئی۔ اس کو معلوم ہوا کہ کل کو میرا گھوڑا مر جائے گا۔ اس نے فوراً بازار میں جا کر بیچ ڈالا اور خوش ہوا۔ پھر معلوم ہوا کہ کل میرا غلام مر جائے گا وہ اس کو بھی بیچ آیا اور بہت خوش ہوا۔ پھر معلوم ہوا کہ کل کو میں مر جاؤں گا۔ بہت پریشان ہوا اور موسیٰ علیہ السلام سے جا کر عرض کیا کہ کیا کروں۔ وحی آئی کہ اس سے کہہ دو تجھ کو اس کشف راز سے منع کیا گیا تھا۔ تو نے نہ مانا۔ آخر تو نے دیکھا کہ اصل یہ ہے کہ تیرے گھر پر ایک بلا آنے والی تھی۔ ہم نے چاہا جانور پر پڑ جائے تو نے اس کو جدا کر دیا۔ ہم نے چاہا کہ غلام پر پڑ جائے تو نے اس کو بھی جدا کر دیا اب تو ہی رہ گیا اور تجھ کو پہلے سے آئندہ کی خبر نہ ہوا کرتی تو گھوڑا اور غلام کیوں بیچا جاتا اور تو معرض ہلاکت میں کیوں پڑتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اپنی بعض مصلحت انسان نہیں سمجھتا۔ تو اس ہونے پر اس کو بہت پریشانی اٹھانی پڑتی تھی۔ یہاں سے ذاکرین، شاغلین کے واسطے بھی نصیحت نکلتی ہے کہ جو حالت غیر اختیاری اللہ تعالیٰ وارد فرمائیں گے اسی کو اپنے لئے بہتر جانیں اور اپنی خواہش سے کسی پسندیدہ حالت کی تمنا نہ کریں۔

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش　　　　که هرچه ساقی ماریخت عین الطاف است

''درد و صاف یعنی قبض و بسط تجویز کرنے کا تم کو کچھ حق نہیں جو کچھ عطا ہو جائے تربیت باطنی کے لئے مصلحت اور وہی عین لطف ہے''

مجاہدے سے کسی خاص حالت کا قصد ٹھیک نہیں۔

تو بندگی چوگدایاں بشرط مزد مکن　　　　که خواجه خود روش بنده پروری داند

''تو عبادت فقیروں کی طرح مزدوری کی شرط پر نہ کر کیونکہ آقائے حقیقی بندہ پروری کا طریقہ خود جانتے ہیں''

راضی برضا رہنے کی ضرورت

ہر حالت جو اس کی طرف سے آئے، وہی مناسب ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ذوق و شوق و انبساط باعث عجب ہو جاتا ہے تو مربی حقیقی اس کا علاج اس طرح فرماتے ہیں کہ

حزن و ملال اور انقباض کو اس پر مسلط کر دیتے ہیں جس سے تواضع و انکسار پیدا ہوتا ہے۔
الغرض اپنے لئے کوئی فکر اپنی خواہش و پسند پر نہ کرنا چاہئے۔

فکر خود ورائے خود در عالم رندی نیست　　　کفر ست درین مذہب خود بینی و خود رائی

''اپنی فکر اور رائے کو راہ سلوک میں کچھ دخل نہیں اس راہ میں خود بینی اور خود رائی کفر ہے''

بعض لوگ ذکر و شغل کرتے ہیں اور کسی خاص حالت اور ثمرہ کے حاصل نہ ہونے پر جس کو غلط فہمی سے انہوں نے مقصود سمجھ رکھا ہے غمگین ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کچھ حاصل نہیں ہوا۔ یہ لوگ بڑی غلطی کرتے ہیں اصل مقصود رضائے حق ہے جس کا طریق ذکر و طاعت ہے جس کو یہ حاصل ہے سب کچھ حاصل ہے تو ان کو خدا کا شکر کرنا چاہئے کہ ان کو ذکر اور طاعت کی توفیق تو دی

بلا بودے اگر ایں ہم نبودے

''اگر یہ بھی نہ ہوتی تو بڑی مصیبت ہوتی''

حقیقت میں یہ طلب اور درد و غم بھی نعمت عظمٰی ہے جس کا شکر کرنا چاہئے۔

گفت آں اللہ تو لبیک ماست　　　ویں نیاز و سوز و دردت پیک ماست

''تیرا اللہ کہنا ہمارا جواب ہے اور تیرا یہ سوز و نیاز اور درد ہمارا قاصد ہے''

اگر حضرت حاجی قدس سرہٗ سے کوئی خادم اس امر کی شکایت کرتا فرماتے کہ خدا کا شکر کرو اس نے اپنا نام لینے کی توفیق تو دی ہے اور اس موقع پر اکثر یہ شعر فرمایا کرتے۔

یابم اورا یا نیابم جستجوئے مے کنم　　　حاصل آید یا نیاید آرزوئے مے کنم

''میں اُس کو پاؤں یا نہ پاؤں اس کی جستجو کرتا ہوں وہ ملے یا نہ ملے میں اسکی آرزو کرتا ہوں''

اور فرمایا کرتے کہ جس طاعت کے بعد پھر اس طاعت کی توفیق ہو یہ طاعت سابقہ کے قبول کی علامت ہے تو قبول کتنی بڑی نعمت ہے غرض قبول اسی میں منحصر نہیں کہ اس کی خواہش کے موافق ہو اور عشاق کی نظر تو کسی قسم کے قبول پر ہی نہیں ہوتی۔ ان کی حالت تو یہ ہے۔

از دعا نبود مراد عاشقاں　　　جز سخن گفتن باآں شیریں زباں

''مراد عاشقوں کی دعا سے محبوب حقیقی کی ہم کلامی کے سوا اور کچھ نہیں ہے''

عاشقان خدا کو عشق میں مجنوں سے تو کم نہ ہونا چاہئے کیا اس کے نام کی مشق کچھ کم

دولت ہے جو اور چیزوں کی تمنا کی جاتی ہے۔

دید مجنوں رایکے صحرانورد — در بیابان غمش بنشستہ فرد
ریگ کاغذ بود انگشتاں قلم — می نمودی بہر کس نامہ رقم
گفت اے مجنون شیدا کیست ایں — میں نویسی نامہ بہر کیست ایں
گفت مشق نام لیلیٰ می کنم — خاطر خود را تسلی مے دہم

''ایک صحرانورد نے مجنوں کو جنگل میں اکیلا غمگین بیٹھا دیکھا اسکی انگلیاں قلم اور ریت کاغذ تھی۔ اس پر کسی کو خط لکھ رہا ہے اس نے پوچھا کہ اے مجنون عاشق یہ کیا تو کسے خط لکھ رہا ہے اور یہ کیا ہے اس نے کہا کہ میں لیلیٰ کے نام کی مشق کر رہا ہوں اور اپنے آپ کو تسلی دے رہا ہوں''

علاوہ اس کے کہ وہ دعا ان کی مصلحت کے مناسب نہ ہو۔ کبھی یہ بھی ہوتا ہے اس کا اجر آخرت کے لئے ذخیرہ کیا جاتا ہے۔ سو تعجب ہے کہ مومن ذخیرہ آخرت پر قناعت نہ کرے۔ متاع دنیا کے حاصل نہ ہونے پر افسوس کرے۔ مومن کامل تو نعمت اخرویہ کے روبرو دنیوی سلطنت تک کو گرد سمجھتے ہیں۔

ایک دفعہ سلطان سنجر شاہ ملک نیمروز نے حضرت پیران پیر شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ اگر آپ قبول فرمائیں تو میں ملک نیمروز آپ کو ہدیہ کرتا ہوں۔ اس کے جواب میں حضرت نے یہ دو شعر تحریر فرمائے۔

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد — در دل اگر بود ہوس ملک سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبراز ملک نیم شب — من ملک نیمروز بیک جو نمی خرم

''اگر میرے دل میں ملک سنجر ہوس تو تو میرا بخت سنجر کے چتر کی طرح سیاہ ہو جائے جب سے آدھی رات کی سلطنت نصیب ہوئی ہے میں ایک ایک جو کے بدلے بھی ملک نیمروز نہیں لینا چاہتا''

یہ بیان تھا بقدر ضروری دعا کا۔

دعا اور رضا بالقضا

بعض لوگوں کو شاید یہ شبہ ہو کہ دعا رضا بالقضاء کے خلاف ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ دعا اور رضا دونوں جمع ہو سکتے ہیں۔ اس طور پر کہ دعا کے وقت یہ قصد رہے کہ اگر دعا کے

موافق ہوگیا تو یہی قضا ہے اس پر راضی ہوں گے اور اگر اس کے خلاف ہوا تو وہی قضا ہے اس پر راضی ہوں گے۔ اور چونکہ دعا بھی مامور بہ ہے اس لئے وہ بھی داخل قضا ہے۔

اگر کوئی شخص حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے آگ میں ڈالے جانے کے قصہ سے استدلال کرلے کہ انہوں نے باوجود جبرائیل علیہ السّلام کے کہنے کے کہ دعا کرو دعا نہیں کی اور فرمایا **حسبه من سوالی علمه بحالی** جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا کرنا رضا بالقضاء اور تفویض وتسلیم کے خلاف ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو یہ قصہ سیر کی روایت ہے جس کو معرض استدلال میں پیش نہیں کیا جاسکتا دوسرے اگر اس حصہ کو مان بھی لیا جائے تو آسان طالب علمانہ یہ جواب ہوسکتا ہے کہ یہ قصہ پہلی امت کا ہے۔ ہمارے پیغمبر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تشریف آوری کے بعد کا نہیں جو ہم پر حجت ہو تیسرے یہ کہ وہ صاحب وحی تھے ان کو معلوم ہو چکا تھا کہ اس وقت دعا کرنا خلاف رضا ہے مولانا روم فرماتے ہیں۔

کفر باشد نزد شاں کردن دعا   کاے خدا از ما بگرداں ایں قضا

ہم لوگ کوئی صاحب وحی نہیں جو خاص وقت کا حکم معلوم ہو سکے ہمیں تو دعا کرنے کا حکم ہے اس لئے دعا کریں گے۔ چوتھے یہ بھی توجیہ ہوسکتی ہے کہ ہمارے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم چونکہ علم میں اتم اور اکمل ہیں حضرت ابراہیم علیہ السّلام پر اس وقت غلبہ حال میں تفویض اور تسلیم کی فضیلت منکشف تھی اور دعا کی فضیلت مستور، اور ہمارے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم پر ہر وقت تفویض تسلیم اور رضا کی فضیلت بھی منکشف رہتی تھی اور دعا کی فضیلت بھی اس لئے دونوں کو جمع فرمایا اور اکثر بزرگوں سے غلبہ حال میں اس قسم کی باتیں ہوا کرتی ہیں کہ جن کی نہ تقلید درست ہے اور نہ ان کی باتوں سے استدلال کیا جاسکتا ہے اور نہ ان پر انکار درست ہے وہ معذور ہیں۔

چنانچہ شاہ فخر دہلوی ایک روز جمعہ کی نماز پڑھ کر مسجد سے باہر نکلتے تھے کہ سیڑھیوں پر ایک بڑھیا نے شربت کا پیالہ پیش کیا اور کہا بیٹا اس کو پی لو۔ شاہ صاحب روزے سے تھے روزے کا کچھ خیال نہ کیا اور شربت پی لیا۔ اس پر لوگوں نے اعتراض کیا فرمایا کہ روزے کی

تلافی قضا سے ہوسکتی ہے مگر دل شکنی کی تلافی نہیں ہوسکتی اس واسطے میں نے پی لیا۔

ہمارے حاجی صاحب علیہ الرحمۃ نے اس قصہ کے متعلق فرمایا کہ خواجہ صاحب پر اس وقت غلبہ حال میں قلب کی فضیلت منکشف اور روزے کی فضیلت مستور تھی۔ اس واسطے ایسا کیا۔ اگر کوئی صاحب تمکین اور اپنی حالت پر غالب ہوتا تو وہ یوں کرتا کہ نرمی سے اس کا جواب دے کر اس کو بھی راضی رکھتا اور روزہ بھی نہ توڑتا۔ مغلوب الحال کی تقلید کسی دوسرے کو جائز نہیں اس کے واسطے خود شریعت کے صاف اور کھلے ہوئے احکام موجود ہیں جن میں کوئی کھٹکا نہیں۔ **فی طلعة الشمس مایغنیک عن رجل** (آفتاب طلوع ہونے میں جو تجھ کو آدمی سے بے نیاز کردے گی)

الغرض یہ چند اسباب موانع دعا کے بطور امور کلیہ کے بیان کئے گئے ہیں۔ اب ان سے اور جزئی اسباب بھی معلوم ہوسکتے ہیں جو سمجھ دار آدمی سمجھ کر نکال سکتا ہے۔

وآخر دعونا ان الحمدللہ رب العلمین والسلام علی المرسلین.

دعا قبول ہونے کے متعلق فرمایا کہ کبھی جو کچھ آدمی مانگتا ہے اس سے بہتر چیز اس کو مل جاتی ہے مثلاً کوئی سو روپیہ اللہ میاں سے مانگے اور دو رکعت آخر شب میں نصیب ہوجاویں اور سو روپیہ نہ ملیں تو دعا قبول ہوگئی کیا دو رکعت سو روپیہ سے بھی کم ہیں۔

(کمالات اشرفیہ)

شکر العطاء

نماز استسقاء کے سلسلہ میں یہ وعظ جامع مسجد تھانہ بھون میں
بروز جمعہ تاریخ ۷ ذیعقد ۱۳۳۶ھ کو دو گھنٹہ بیس منٹ میں فرمایا
جسے حکیم محمد یوسف مرحوم بجنوری نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللّٰہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیٔات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلاھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدناومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ و بارک وسلم.

اما بعد فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم.
قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَفَلَا اَکُوْنَ عَبْدًا شَکُوْرًا
(کیا میں شکرگزار بندہ نہ ہوں)

اکملیت انبیاء

مقصود میرا اس وقت صرف فقہاء کے اس قول کی اصل بیان کرنا ہے کہ انہوں نے نماز استسقاء کے باب میں بیان کیا ہے کہ نماز کا قصد کر لینے کے بعد اگر نماز سے پہلے بارش ہو جائے تب بھی مناسب ہے کہ نماز پڑھ لی جائے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ شکر ہے نعمت کا (کذا فی الدر المختار باب الاستسقاء وقال الشامی و یستزیدون من المطر)

فقہا کا یہ قول نقل کر کے سنت سے اس کی من وجہ اصل بیان کروں گا جس سے قول فقہاء کے لئے استیناس حاصل ہو جاوے۔ من وجہ اس لئے کہا کہ یہ کہیں منقول نہیں دیکھا کہ فقہا کے اس قول کا اصل ماخذ کیا ہے۔ اگر اصل منقول ہوتی تو میں من وجہ کی قید نہیں لگاتا۔ وہی وجہ کافی ہوتی۔ نیز اس لئے بھی من وجہ کہا کہ جو اصل میں بیان کروں گا اس پر کچھ سوالات پیدا ہو سکتے ہیں اور ان سوالات کے جوابات میری سمجھ میں نہیں آئے۔ اس لئے میں اصل کامل کی نقل کا

دعویٰ نہیں کرتا۔ ہاں اس کو قول فقہا کے لئے استیناس کا درجہ ضرور حاصل ہے۔ رہا یہ کہ پوری اصل کیا ہے تو یہ محققین سے معلوم ہوسکتا ہے یا جو محقق ہو خود تحقیق کر لے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ ایک شخص سارے کام کر سکے۔ جو مجھ سے نہیں ہوسکتا اس کو محققین کے حوالے کرتا ہوں۔

یہ حدیث (افلا اکون عبدا شکورا) طویل ہے اس میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد اتنا ہی نقل کر دیا جس کی اس وقت ضرورت ہے باقی الفاظ حدیث کے محفوظ بھی نہیں۔ اس حدیث کا واقعہ یہ ہے کہ حضورؐ کی یہ عادت تھی کہ عبادت میں رات بھر کھڑے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ قدم مبارک ورم کر آتے تھے حالانکہ حق تعالیٰ نے آپ کی شان میں یہ ارشاد فرمایا:

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ

کہ ہم نے آپ کے اگلے پچھلے ذنوب سب بخش دیئے۔

اس پر بعض کا یہ خیال تھا کہ آپ مشقت کو کم کر دیں کیونکہ جب مغفرت ہو چکی تو اب مشقت کی کیا ضرورت ہے اسی بناء پر حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے عرض کیا کہ اب تو حق تعالیٰ نے فضل فرمایا کہ اگلے اور پچھلے ذنوب سب معاف کر دیئے اب اس قدر مشقت نہ اٹھایئے اس پر آپ نے ارشاد فرمایا۔ افلا اکون عبدا شکورا۔ کہ کیا میں شکر گزار بندہ نہ ہوں۔

آیت میں جو آپ کی طرف ذنب کو منسوب کیا تو یہ ذنوب صورۃً ہیں حقیقۃً نہیں۔ کیونکہ انبیاء علیہم السّلام سب ذنوب سے معصوم ہیں اور آپ تو سب سے اکمل و افضل ہیں تو آپ کیوں نہ معصوم ہوں گے۔

یہاں یہ بھی سمجھ لیجئے کہ آپؐ میں اور دیگر انبیاء میں کامل اور ناقص کا فرق نہیں بلکہ کامل اور اکمل الکاملین کا فرق ہے سب انبیاء کامل ہیں ناقص کوئی بھی نہیں اور آپ اکمل الکاملین ہیں بلکہ سب انبیاء اکمل ہیں اور آپ اکمل الاکملین ہیں کیونکہ کمال کے درجے متفاوت ہوتے ہیں۔ کمال کی انتہا نہیں۔ کمال حاصل ہونے پر اور بھی ترقی ہو سکتی ہے دیکھئے حضورؐ کا علم کامل تھا اور پھر بھی آپ کو فرمایا گیا۔ قُلْ رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا کہیے (اے رب میرا علم زیادہ کر)

نیز غیر انبیاء میں بھی بعض خاص بندوں کو کمال دیا گیا ہے اور وہ صراط مستقیم کے کامل درجہ پر ہیں مگر پھر بھی ان کو حکم ہے کہ یوں دعا مانگا کریں۔ (اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ) ہم کو سیدھا راستہ بتا۔

تو یہ اس لئے ہے کہ کمال کے مراتب کی کوئی انتہا نہیں۔ اس اعتبار سے سب انبیاء اکمل ہیں اور آپ اکمل الاکملین۔

معصومیت انبیاء

باقی یہ اعتقاد واجب ہے کہ انبیاء میں کوئی نقص نہ تھا۔ اسی واسطے یوں کہنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مقدم ہیں اور انبیاء مؤخر ہیں خلاف ادب ہے۔ گو کہ آپ کو مقدم کہنے سے ان کا موخر ہونا لازم آتا ہے مگر اس عنوان میں ادب کی رعایت ہے اور ادب کی رعایت عنوان میں بھی مطلوب ہے اور پہلے عنوان میں سوء ادب کا ایہام ہے جن الفاظ میں سوء ادب کا ایہام ہو ان سے بھی بچنا ضروری ہے۔ غرض جب آپ معصوم ہیں تو ذنب کا اطلاق جو کیا گیا ہے وہ صورۃً ہے کبھی صورت پر بھی محاورات میں حقیقت کا اطلاق ہوتا ہے جیسے دیکھا گیا ہوگا کہ بعض لوگ مٹی کے کھلونے لئے پھرا کرتے ہیں کسی پر خربوزہ کا اطلاق ہوتا ہے کسی پر آم کا کسی پر نارنگی کا علیٰ ہذا القیاس یا جیسے دیوالی میں مٹھائی کے کھلونے بناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہاتھی ہے یہ گھوڑا ہے یہ شیر ہے۔ ان کی حقیقت تو خربوزہ اور ہاتھی وغیرہ نہیں مگر چونکہ صورۃً ویسے ہی ہیں اس لئے حقیقت کا اطلاق کر دیا گیا ہے۔ نیز بعض باتیں کسی شخص کے درجہ کے اعتبار سے ذنب کہلاتی ہیں گو حقیقت میں ذنب نہیں ہوتیں۔

اس کی مثال اس حکایت سے سمجھ سکتے ہیں کہ ایک بار امساک باراں سے سخت تکلیف تھی۔ ایک روز بارش ہوئی ایک بزرگ کہنے لگے کہ آج کیسے موقع پر بارش ہوئی ہے میں پوچھتا ہوں کہ یہ کلمہ ثناء شکر کا ہے یا نہیں۔ مدح اور طاعت ہے یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ کلمہ مدح کا ہے انہوں نے شکر بھی ادا کیا اور مدح بھی کی دونوں عبادتیں جمع ہو گئیں مگر چونکہ ہر مرتبہ کا حکم جدا ہوتا ہے اس لئے ان سے اس پر باز پرس ہو گئی الہام ہوا کہ بے ادب کہ تو جو کہتا ہے کہ آج بڑے موقع پر بارش ہوئی تو بتا بے موقع کس دن ہوئی تھی حالانکہ یہ مدح تھی مگر پھر بھی عتاب ہوا۔

اگر کوئی کہے کہ آپ نے زبردستی منوالیا کہ یہ مدح تھی حقیقت میں مدح نہیں تھی کیونکہ لفظ آج قید احترازی ہے میں کہوں گا کہ عوام الناس کے محاورہ میں اور بول چال میں یہ قید احترازی نہیں مثلاً کوئی اپنے گھر کھانا سویرے کھائے اور یوں کہے کہ آج کھانا کیا اچھے

وقت مل گیا تو یہ قید احترازی نہیں ہوتی۔ اسی طرح ان بزرگ کے کلام میں قید احترازی نہ تھی مگر چونکہ اس میں ایہام تھا دوسری جانب کا۔ اس لئے عتاب ہوگیا کہ تم نے ایسا کلام کیوں منہ سے نکالا۔ واقع میں بے ادبی نہ تھی مگر تفاوت مرتبہ کے اعتبار سے عتاب ہوا۔ مطلب یہ تھا کہ تم مقرب ہو، مزاج شناس ہو، واقف ہو۔ پھر تم نے ایسا کلام کیوں منہ سے نکالا جس میں قید احترازی ہونے کا ایہام ہوسکتا تھا۔ بس اتنی بات پر کم بختی آ گئی مگر یہ کم بختی ہی دلیل ہے قرب کی۔ ایسی کم بختی بھی بڑوں ہی کی آیا کرتی ہے۔ ایسے حقوق کا مطالبہ بھی مقربین ہی سے ہوتا ہے، دیکھئے ازواج مطہرات کے بارہ میں حق سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ من یاتِ مِنکُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ یُّضٰعَفُ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَیْنِ.

کہ تم سے اگر ناشائستہ حرکت یعنی ایذاءِ رسول کا صدور ہوا تو دونی سزا ہوگی۔

آگے ارشاد ہے۔ یٰنِسَاءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِنَ النِّسَآءِ کہ تم اور عورتوں کی مثل نہیں ہو تمہارا معاملہ ہی جدا ہے۔

خود حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے لئے تجویز کیا گیا تھا۔

اِذاً لَّاَذَقْنَاکَ ضِعْفَ الْحَیٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَاتَجِدُلَکَ عَلَیْنَا نَصِیْرًا

اگر ایسا ہوتا تو ہم آپ کو حالت حیات میں اور بعد موت کے دوہرا عذاب چکھاتے۔ پھر آپؐ ہمارے مقابلے میں کوئی مددگار نہ پاتے۔

اسی طرح مقربین کو اجر بھی زیادہ ملتا ہے۔ چنانچہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں کہ مجھ اکیلے کو اتنا بخار چڑھتا ہے جتنا تم میں سے دو کو چڑھے کیونکہ ہم کو اجر زیادہ ملتا ہے جتنا مطالبہ زیادہ ہے۔ اسی قدر اجر بھی زیادہ ہے مولانا فرماتے ہیں۔

زاں بلا ہا کانبیاء برداشتند ۔۔۔ سربہ چرخ ہفتمیں افراشتند

(ان بلاؤں کی وجہ سے جو انبیاء علیہ السلام نے برداشت کیں ان کے درجات و مراتب تمام مخلوق سے بلند ہوگئے)

انبیاء اور حجیت

بہرحال بلندی مرتبہ کی وجہ سے ایسے امور پر بھی عتاب ہو جاتا ہے جو واقع میں ذنب

نہیں ہوتے دیکھئے آیت: عَبَسَ وَتَوَلّٰی اَنْ جَآءَ ہُ الْاَعْمٰی تیوری چڑھائی اور منہ موڑا اس سے کہ آیا اس کے پاس اندھا۔

جس واقعہ میں نازل ہوئی ہے وہ کیسی معمولی بات تھی کہ جس پر عتاب ہونے کا وہم و گمان بھی نہ ہوسکتا تھا مگر عتاب ہوا اور عتاب بھی عجیب وغریب عنوان سے کہ غائب کے صیغہ کے ساتھ عتاب فرمایا۔ معنی یہ ہیں کہ ایک شخص ہیں کہ انہوں نے ترش روئی کی اور منہ پھیر لیا عبست و تولیت صیغہ حاضر کا نہیں لائے۔ اس میں آپ کی عظمت و وقعت فرمائی ہے کہ اوروں کو پتہ نہ چلے کہ کس کو عتاب ہوا ہے قرآن شریف تو محاورہ کے موافق نازل ہوا ہے ہم لوگ بھی اگر ایسے شخص کی شکایت کرتے ہیں جس کا ہم کو لحاظ و پاس ہوتا ہے تو اس عنوان سے شکایت کرتے ہیں کہ ایک صاحب ہیں انہوں نے یہ بے جا حرکت کی اس عنوان کے کہنے سے اس کو وہی سمجھے گا جس پر عتاب واقع ہے دوسرے کو بدون ان کے بتلائے ہوئے یہ معلوم نہ ہوگا کہ عتاب کس پر ہے عبس کے صیغہ میں عجیب لطف ہے شکایت بھی ہے مگر اس پیرایہ میں کہ کوئی خود گمان نہ کرسکے۔

جو معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان نابینا صحابی کے ساتھ کیا تھا وہ فتویٰ کی رو سے طاعت تھا جس کا حاصل یہ ہے کہ آپ ایک رئیس کافر کو جو اتفاق سے آ گیا تھا۔ اصول اسلام کی تبلیغ فرما رہے تھے ایک نابینا صحابی آئے اور انہوں نے اسی وقت کچھ درخواست کی جو کہ بے موقع تھی۔ مگر ان کے نابینا ہونے کی وجہ سے منظوری کے قابل تھی۔ جیسے کوئی دیہاتی ناواقف حاکم کے ہاں بے ٹکٹ لگائے عرضی دے دے تو بعض دفعہ حاکم اس کو معذور سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں مگر آپ نے ضابطہ پر عمل کیا کیونکہ اول تو اس وقت ایک شخص کو دعوت ہو رہی تھی ایسے وقت دوسرے شخص کو کیا موقع تھا اس درخواست کا۔

دوسرے اس رئیس کو اصول کی دعوت ہو رہی تھی اور یہ فروع کے دریافت کرنے کو آئے تھے۔

تیسرے وہ ہر وقت کے حاضر باش تھے اور یہ رئیس اتفاق سے آ گیا تھا۔ وہ دوسرے وقت بھی دریافت کرسکتے تھے۔

پس چونکہ یہ بات بے موقع تھی اس لئے آپ پر ضابطہ کے اقتضاء سے عبوس کا اثر

ہو گیا مگر اس عبوس سے ان کا دل نہیں دکھ سکتا کیونکہ اول تو صحابہ عاشق تھے اور عاشق کو محبوب کی ترش روئی بھی اچھی معلوم ہوتی ہے دوسرے وہ نابینا تھے ان کو ترش روئی کا کیا پتہ چلتا وہ چہرے کو دیکھتے ہی نہ تھے جو اس تغیر کو محسوس کرتے۔ جب دل ہی نہ دکھا تو پھر قاعدہ سے وہ شکایت کی بات ہی نہ تھی۔ الغرض آپ نے تو ضابطہ پر بھی اس طرح عمل کیا تھا جس میں کی ملامت بھی ہو سکتی تھی مگر یہ ضابطہ کا برتاؤ نابینا کے ساتھ خدا تعالیٰ کو ناپسند ہوا اور آپ کو جتلایا گیا کہ اس وقت آپ کو رعایت کا برتاؤ کرنا چاہئے تھا اور اس کی بے ڈھنگی درخواست کو منظور کر لیا ہوتا۔ بتلایئے آپؐ نے کون سا جرم کیا تھا۔ آپ نے تو ضابطہ کی پابندی کی تھی۔ ہاں آپ کی دقیق شان کرم سے یہ بات مستبعد تھی کیونکہ اگر وہ صحابی بینا ہوتے تو آپ دل شکنی کے خیال کو ترش روئی نہ فرماتے۔ اس لئے اس پر عتاب ہوا کہ گو وہ دیکھتے نہ تھے مگر کرم کا مقتضا یہ تھا کہ ایسا ہی برتاؤ فرماتے جیسے وہ دیکھتے ہوتے۔

مگر عتاب بھی عجیب عنوان سے نازل ہوا جس کا لطف مخفی نہیں کہ ایک تو غائب کا صیغہ استعمال کیا جیسا اوپر مذکور ہوا۔ دوسرے ان جاء ہ الاعمیٰ (کہ اندھا آیا) سے آپ کا عذر بھی بیان کر دیا کہ آپ نے ترش روئی اس واسطے کی تھی کہ وہ اندھے تھے۔ انہیں ترشروئی کی کیا خبر ہوئی ہوگی۔ کیونکہ وہ تو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے اور جب ترش روئی کی خبر نہ ہوئی ہوگی تو اس سے تکلیف بھی نہ ہوئی ہوگی اور ترش روئی کی برائی اسی وجہ سے ہے کہ دوسرے کو تکلیف پہنچتی ہے اور جس صورت میں اس سے دوسرے کو کلفت کا اثر نہ پہنچے تو اس صورت میں کیا برائی ہے۔ تو یہ آپ کا عذر بھی بتلا دیا مگر باوجود اس عذر کے عتاب اس وجہ سے ہوا کہ آپ نے اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا ہوتا اگر وہ ہوتے تو اس وقت بھی وہ برتاؤ کر سکتے۔

مجھ کو بعض مرتبہ تنبیہ ہوتی ہے۔ راستہ میں کبھی کوئی اندھا ملتا ہے تو میں بعض اوقات اس کو سلام نہ کرتا۔ مزاج پرسی بھی نہیں کرتا مگر بعد میں شرما جاتا ہوں اور اپنے کو بے حد ملامت کرتا ہوں کہ یہ تو خیانت ہے غرض یہاں ضابطہ پر عمل کرنے سے بناء بر معذوری سائل کے عتاب ہوا کیونکہ اس موقع بے موقع کا پورا امتیاز نہیں ہو سکتا تھا۔ باقی جس جگہ سائل کو معذوری نہ تھی وہاں ضابطہ پر آپؐ نے عمل بھی کیا ہے اور اس پر عتاب بھی نہیں ہوا۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ضابطہ پر عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

دیکھئے آپ ایک مرتبہ لقطہ کے احکام کا بیان فرمارہے تھے کہ کسی کو کوئی گمشدہ بکری ملے تو اس کو چاہئے کہ پکڑ لے۔ اگر مالک مل گیا تو وہ لے لے گا ورنہ تصدیق کے بعد اور کسی کے کام میں آوے گی۔ اگر اس کو ویسے ہی چھوڑ دے گا تو ممکن ہے کہ بھیڑیا لے جاوے۔ ایک شخص نے عرض کیا فضالۃ الابل کہ گم شدہ اونٹ کا کیا حکم ہے۔ اس پر آپ کا چہرہ مبارک غصہ سے سرخ ہوگیا اور فرمایا **مالک ولها معها حذاء ها وسقاء ها**[1] مطلب یہ تھا کہ اونٹ ایسا جانور نہیں کہ اس کو کوئی درندہ پکڑ لے کوئی اس کو ستا نہیں سکتا اس شخص نے بے ڈھنگا سوال کیا تھا اس پر آپ نے غصہ فرمایا اور وہ شخص معذور تھا نہیں کیونکہ اتنی بات وہ بھی جانتا تھا اس قصہ میں آپ نے ضابطہ پر عمل کیا اور اس پر کچھ بھی نہیں ہوا۔

نابینا کے قصہ میں مقصود صرف یہ تھا کہ آپ نے غور نہیں کیا کہ بعض حیثیتوں سے اس کی تعلیم مقدم تھی کیونکہ اس کا نفع یقینی تھا اور اس کا فر کو تبلیغ کرنے کا نفع موہوم تھا۔ اور یقینی مقدم ہوتا ہے موہوم پر پس اس غور نہ کرنے پر عتاب فرمایا۔ سو یہ امر بوجہ آپ کے عالی مرتبہ ہونے کے صرف شان کے خلاف تھا۔

اسی طرح حق تعالیٰ نے آپ کی طرف جس ذنب کو منسوب فرمایا وہ سب اسی قسم کے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ذنب دو قسم کے ہوئے۔ ایک تو وہ ہیں جو قانون مقرر کرنے کے بعد معلوم ہوجاتے ہیں۔ مثلاً قانون مقرر ہوا کہ زنا کرنا منع و حرام ہے بس قانون مقرر کرنے کے بعد زنا کا ذنب ہونا معلوم ہوگیا۔ یہ تو ذنب حقیقی ہے اس سے انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں۔ ایک وہ ہیں کہ جن کے متعلق ابھی کوئی قانون نازل نہیں ہوا بلکہ بعد عتاب کے ان کا نامناسب ہونا معلوم ہوتا ہے یہ ذنب صوری ہے بلکہ واقع میں صوری بھی نہیں بلکہ مجازاً اور مجاز بھی ضعیف ذنب کا اطلاق اس پر ہوتا ہے کیونکہ اس واقعہ میں کسی کو ذنب ہونے کا شبہ بھی نہیں ہوا۔ یہ صوری سے بھی گھٹا ہوا ہے۔ یہ معنی ہیں۔

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ

---

[1] الصحیح للبخاری ۱:۳۴،۳:۱۶۹،۱۶۳،۱۶۵،۱۶۶،۷:۶۵،۸:۳۴

(تا کہ اللہ تعالیٰ آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اگلے پچھلے گناہوں کو بخش دیں)
پس کوئی کسی قسم کا وسوسہ نہ کرے آپ گناہوں سے بالکل مقدس ومبرا اور منزہ ہیں۔

انبیاء اور محبوبیت

رہا یہ شبہ کہ اگر یہ گناہ نہ تھا تو پھر عتاب کیوں ہوا؟ جواب یہ ہے کہ محبوب اپنے محبّ کو خلاف شان امر پر بھی عتاب کرسکتا ہے مگر غیر محبوب کی مجال نہیں مگر یہ سمجھ لینا چاہے کہ تنزیہ کی بھی ایک حد ہے اور وہ حد عبدیت ہے یعنی تنزیہ میں الوہیت کے درجہ تک پہنچانا نہ چاہئے۔ جیسا بعض نے آپ کے منزہ ہونے میں بھی غلو کیا ہے اور حد سے بڑھ گئے ہیں۔

کاٹھیاواڑ کی حکایت سنی ہے کہ ایک شخص مسافر سیاح کسی مسجد میں پہنچے لوگوں نے مولوی سمجھ کر آگے کھڑا کر دیا۔ انہوں نے یہ رکوع پڑھا۔ **افحسب الذین کفروا** جس کی آخری آیت یہ ہے کہ **قل انما انا بشرالخ**۔ نماز کے بعد ایک شخص نے اعلان کیا کہ یہ شخص وہابی ہے۔ اس نے ایسی آیت پڑھی جس میں تنقیص ہے آپ کی حضرت کو بشر بنا دیا۔ اس لئے نماز کا اعادہ کرلیا جاوے۔

میں نے اس حکایت کو سن کر کہا کہ یہ بات تو بڑی دور پہنچتی ہے یعنی اللہ میاں پر نعوذ باللہ اعتراض ہے وہابیت کا۔ اللہ بچاوے وہابیت سے ایک شخص سورہ تبت کو پڑھنے سے منع کرتے تھے کہ اس میں آپ کے چچا کی برائی کا ذکر ہے۔ اس کو نماز میں نہ پڑھنا چاہئے مگر ہم کو جو حضورؐ کے رشتہ داروں سے تعلق ہے وہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم ہی کی وجہ سے ہے۔ سو یہ دیکھنا چاہئے کہ حضورؐ پر کیا اثر ہوتا تھا اس سورت کا اور اس میں تو رشتہ داروں ہی کی شکایت ہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو تو خود اپنی شکایت میں مزہ آتا تھا۔ چنانچہ جب ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ (صحابی نابینا جن کی وجہ سے سورہ عبس نازل ہوئی) آتے تو آپؐ فرماتے **مرحبا بمن عاتبنی فیہ ربی**۔ یعنی آیئے آیئے جناب آیئے۔ اس خفگی کے چرکہ لگنے کے باعث آپ ہی تو ہیں۔ آپ کو اس خطاب سے حظ ہوتا تھا عاشق کو محبوب کی شکایت میں بھی مزہ آتا ہے۔ ان مخترعین میں عشق نہیں ورنہ عشاق کی تو یہ کیفیت ہے۔

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی   جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

آپ کو کیا خبر جن پر یہ حالت گزرتی ہے ان سے پوچھئے کہ شکایت میں کیا حظ اور کیا لطف ہے۔
ایک بزرگ تھے عابد کثیر المجاہدہ زاہد۔ ایک دفعہ ان کو یہ خطاب ہوا کہ کچھ ہی کر کافر ہی ہو کر مرے گا۔ اس وقت ان کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی کیسے پیچ وتاب کھائے ہوں گے۔ ایسے وقت میں شیخ کامل کی ضرورت ہے۔ اس پر اگر کوئی سوال کرے کہ جو خود بزرگ ہو اس کو شیخ کامل کی ضرورت۔ سو یہ ایک قصہ سے سمجھ میں آ جاوے گا۔

ایک وکیل سے ریل میں ملاقات ہوئی۔ ان کا سہارنپور میں مقدمہ تھا وہاں جا رہے تھے۔ میں نے کہا کہ آپ کو تو وکیل کرنے کی حاجت نہ ہوتی ہوگی کہا کہ ہوتی ہے کیونکہ اپنا معاملہ ہونے کی وجہ سے طبیعت پر تشویش کا اثر ہوتا ہے جس سے عقل کام نہیں دیتی۔

اسی طرح عارف کو بھی اپنے معاملہ میں پریشانی ہوتی ہے اور دوسروں کی ضرورت پڑتی ہے بلکہ کبھی اپنے سے چھوٹوں سے بھی نفع ہوتا ہے تو بڑوں سے تو کیسے استغناء ہوسکتا ہے۔ مولانا فریدالدین عطار ایسی رہبری کی حاجت کے متعلق فرماتے ہیں۔

بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق عمر بگذشت ونشد آگاہ عشق

(بلا مرشد کے طریق عشق میں جس نے قدم رکھا اس نے عمر ضائع کی اور عشق سے آگاہ نہ ہوا)

مولانا فرماتے ہیں۔

یار باید راہ راتنہا مرد بے قلاؤ زاندریں صحرا مرو

(راہ سلوک میں مددگار ہونا چاہئے اس میں تنہا قدم مت رکھو بلا مرشد کے اس عشق کی وادی میں مدت چلو)

ہر کہ تنہا نادر ایں راہ رابرید ہم بعون ہمت مرداں رسید

(اگر شاذ ونادر کسی نے اس راستہ کو اکیلے طے کیا تو وہ بھی ہمت مرداں کی مدد (غالباً بزرگوں کی دعاؤں سے) طے کیا ہے)

یعنی جہاں بظاہر امداد نہیں معلوم ہوتی وہاں بھی کسی کی امداد ہی ہوتی ہے بعض اوقات صاحب امداد کو بھی خبر نہیں ہوتی۔ دیکھئے ہم کو آفتاب سے فیض پہنچ رہا ہے مگر اس کو خبر نہیں کہ کس کس کو فیض پہنچا رہا ہوں۔ بلکہ بعض وقت دونوں میں سے کسی کو خبر نہیں ہوتی نہ ممد کو نہ ممد

کو۔ جیسے ایک شخص آفتاب کی روشنی میں سی رہا ہے اس کی ضیاء سے منتفع ہے مگر اس کا خیال بھی نہیں آتا کہ آفتاب سے نفع اٹھا رہا ہوں تو سمجھ لو کہ ۔

بے عنایات حق وخاصان حق گر ملک باشد سیاہ ہست اش ورق

(بغیر حکم خداوندی اور خاصان خدا کی عنایت کے اگر فرشتہ بھی ہو تو اس کا ورق سیاہ ہے)

خاصان حق کی عنایت کی بڑی ضرورت ہے۔ غرض ان بزرگ نے اپنے شیخ سے کہا۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ دشنام محبت اور امتحان ہے کچھ غم نہ کرو۔ اگر کوئی شخص کہے کہ یہ جھوٹ ہے کیونکہ واقع کے خلاف ہے۔ پھر محبوب کی طرف سے جھوٹ کیا خدا تعالیٰ تو صادق القول ہیں۔ جواب یہ ہے کہ کافر کے ایک معنی کافر بالطاغوت کے بھی ہیں۔ **کمافی قوله تعالیٰ فمن يكفر بالطاغوت** پس یہ تو بشارت تھی کہ کافر بالطاغوت ہو کر مرے گا۔ مگر ذرا چھیڑنے کو صرف لفظ کافر ذکر کیا۔ اور بالطاغوت کو چھوڑ دیا۔ اس قول کے صدق کی یہ تاویل ہو سکتی ہے اس لئے یہ اعتراض نہیں پڑتا۔

اس قسم کی تاویل کو علم مناظرہ کی اصطلاح میں منع کہتے ہیں (جس کے معنی یہ ہیں کہ کلام میں ایسا احتمال نکال دینا جس پر اعتراض نہ واقع ہو) باقی یہ کہ اللہ میاں کی اس میں کیا حکمت تھی۔ سو وہ ہمیں معلوم نہیں ہم کوئی صلاح مشورہ میں شریک تھے۔ غرض بزرگوں کو امتحان طرح طرح سے پیش آتا ہے۔

بوستان میں حکایت لکھی ہے کہ ایک بزرگ تھے عبادت ومجاہدہ بہت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خطاب ہوا کہ تو کچھ بھی کر قبول نہ ہوگا۔ ان کے مرید نے بھی اس کو سنا اس کو نہایت رنج ہوا۔ پیر کی محبت بھی بڑی ہوتی ہے۔ پیر صاحب کانے ہو جاویں تب بھی ان سے محبت، بڈھے ہو جاویں تب بھی محبت، اگر کسی کو لڑکے کی محبت ہو جاتی ہے بس جہاں داڑھی نکلی اور محبت رخصت ہوئی۔ عورت اگر سر منڈا ڈالے تو محبت کافور مگر یہ محبت عجیب ہے۔ خوب کہا ہے ۔

آں دل کہ دم نمودے از خوبرو جواناں دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے

(وہ دل جس سے میں نے خوبرو جوانوں کو دیکھا تھا وہ دل سال خوردہ بڑھا ایک ہی

نگاہ میں چھین کر لے گیا)

غرض اس محبت کے سبب اس کوندا سے سخت رنج ہوا۔ مگر بزرگ صاحب اگلے دن پھر اپنے کام کے لئے اٹھے تو مرید نے غایت رنج سے کہا کہ حضرت غیرت بھی کوئی چیز ہے آپ تو مجاہدہ کرتے ہیں اور وہاں سے یہ خطاب ہے کہ کچھ بھی کرو قبول نہ ہوگا۔ تو پھر اس مجاہدہ اور عبادت سے کیا نفع۔ جب قبول ہی نہیں تو پھر مشقت سے کیا فائدہ پیر نے جواب دیا کہ بھائی اگر کوئی دوسرا دروازہ ہوتا تو وہاں چلا جاتا اب میں کہاں سر دے ماروں اور کہاں جاؤں یہ ان کا فعل ہے۔ مجھ کو اس سے کیا کام۔ مجھے تو اپنا کام کرنا چاہئے وہ قبول کریں یا نہ کریں۔ بس یہ کہا تھا اسی وقت خطاب ہوا۔

قبول است گرچہ ہنر نیستت کہ جز ماپنا ہے دگر نیستت

(قبول ہے اگر چہ کمال کی کوئی بات اس میں نہیں سوائے اس بات کے کہ تو نے کہہ دیا کہ ہمارے سواہ پناہ کی کوئی دوسری جگہ نہیں)

اس بشارت میں بھی چر کہ لگا ہوا ہے یوں فرما رہے ہیں کہ تم میں کوئی ہنر تو ہے نہیں مگر خیر قبول کئے لیتے ہیں کوئی تعریف ان کی نہ کی کہ تم عابد و زاہد ہو اس لئے قبول کئے لیتے ہیں تا کہ مغرور نہ ہو جائیں ظاہر میں تو چر کہ ہے واقع میں تربیت ہے کہ عبادت و مجاہدہ پر ناز نہ ہو جاوے اور واقعی ہے بھی یہی۔ کس کا فعل قابل قبول ہے ان پر ترس آ گیا۔ پنشن دے دی کہ پڑے رہو۔ ایسے ہی یہ امتحان تھا کہ کافر ہو کر مرے گا یہ دشنام محبت تھی۔ جس کو شیخ نے بتلا دیا غرض محبوب کی تو شکایت میں بھی مزہ آتا ہے۔

چنانچہ اس کے متعلق ایک اور واقعہ ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم حضرت ابوذر غفاریؓ سے بیان فرما رہے تھے کہ جس شخص نے لاالہ الا اللّٰہ کہا تو وہ جنت میں داخل ہو گیا حضرت ابوذرؓ بار بار سوال کرتے تھے وان زنیٰ وان سرق۔ اگر چہ وہ بدکاری اور چوری کرے۔ آخر میں حضورؐ نے فرمایا وان زنی وان سرق وان رغم انف ابی ذر۔ یعنی اگر چہ تم کتنے ہی ناراض ہو اور تمہارا کلیجہ بھی پھٹ جائے اور تمہاری ناک خاک آلود ہو جائے وہ شخص تو جنت میں داخل ہوگا۔ یہ لفظاً عتاب تھا مگر جب ابوذر اس حدیث کو کسی سے نقل کرتے تو یہ ضرور کہتے وان رغم انف ابی ذر اس میں ان کو بڑا مزہ آتا تھا۔ یہ بھی

خیال نہ کرتے تھے کہ مجلس میں اس فقرہ کے بیان کرنے سے فضیحت ہوگی فضیحت تو وہ سمجھتا ہے جس کو عشق نہ ہو اور عاشق کو تو لطف ہی آوے گا۔

شاہ ابوالمعالی صاحبؒ کی حکایت ہے کہ آپ کے ایک مرید حج کو گئے۔ آپ نے فرمایا کہ جب روضہ مبارک پر پہنچو تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں میرا اسلام عرض کرنا۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا وہاں سے جواب ملا کہ اپنے بدعتی پیر سے ہمارا بھی سلام کہہ دینا۔ آپ سماع سنتے تھے مگر وہ سماع جس کا تعلق سماء (یعنی آسمان) سے تھا۔ وہ سماع الی السماء تھا اس کو مولانا فرماتے ہیں۔

دو دہاں داریم گویا ہمچو نے　　　یک دہاں پنہاست درلب ہائے وے

(بانسری کی طرح ہم گویا دو منہ رکھتے ہیں ایک منہ اس کے لبوں میں پوشیدہ ہے ایک منہ کی طرف نالاں ہے، ہائے دھوکہ کے عالم میں ڈالے ہوئے ہیں)

یک دہاں نالاں شدہ سوئے شما　　　ہائے وہوئے درفگندہ درسماء

وہ ہاؤ ہو آسمان تک پہنچتی تھی۔ وہ سماع شہوت سے ناشی نہ تھا مگر وہ صورۃً بدعت تھا۔ اس لئے حضورؐ نے فرمایا کہ اپنے بدعتی پیر سے ہمارا بھی سلام کہہ دینا مرید نے واپس آکر حضورؐ کا سلام پہنچایا آپ نے فرمایا کہ پورے الفاظ کہو جو حضورؐ نے ارشاد فرمائے ہیں۔ آپ کو کشف سے معلوم ہو گیا ہوگا۔ اس نے کہا کہ جب حضور کو معلوم ہو چکا تو مجھ سے ہی کیوں کہلواتے ہیں۔ فرمایا تم قاصد ہو اور قاصد کی زبان مرسل کی زبان ہوتی ہے۔ اس کا لطف الگ ہے غرض مجبوراً اس نے وہی الفاظ کہے تو آپ پر وجد طاری ہو گیا۔ رقص کرتے تھے اور فرماتے تھے۔

بدم گفتی وخرسندم عفاک اللہ نکو گفتی　　　جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

ان حضرات کا سماع شعر کے ساتھ خاص نہ تھا کہ بلکہ مفید الفاظ کے ساتھ بھی نہ تھا۔ چنانچہ ایک بزرگ تھے ان کو کیواڑ کی آواز پر وجد ہو جاتا تھا اور پنکھے کی آواز سے وجد ہوتا تھا۔ ان لوگوں پر ملامت نہیں اور شاہ ابوالمعالی صاحب نے جو اپنے مرید سے حضورؐ کا کلام سننے کی درخواست کی حالانکہ ان کو بذریعہ کشف خود بھی حضورؐ کا فرمانا معلوم ہو گیا تھا وجہ اس کی یہ ہے کہ محبوب کا کلام سننے میں محب کو اور ہی مزہ آتا ہے۔

چنانچہ خود حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ایک صحابی سے فرمایا کہ کلام اللہ سناؤ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم آپ ہی پر تو نازل ہوا اور میں آپ کو پڑھ کر سناؤں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ مجھ کو دوسرے سے سننا اچھا معلوم ہوتا ہے حالانکہ آپ خود بھی تلاوت فرماتے تھے وجہ یہ ہے کہ سننے کا اور مزہ ہے اور پڑھنے کا اور محبوب کا کلام بلکہ نام سننے میں بھی مزہ آتا ہے اس لئے ابونواس شاعر کہتا ہے۔

الا فاسقنی خمرا و قل لی ھی الخمر　　　　ولا تسقنی سراً متی امکن الجھر

(خبردار مجھے شراب پلا اور پلاتے وقت کہہ یہ شراب ہے اور مجھے چھپا کر شراب نہ پلانا جب تک تو کھلم کھلا ظاہر نہ کر دے)

ساقی کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ شراب پلاتا جا اور یوں بھی کہتا جا کہ یہ شراب ہے یہ شراب ہے۔ معلوم ہوا کہ سننے میں کچھ اور ہی لطف ہے صحابہ عشاق تھے۔ ان کو ہر ادا آپ کی محبوب تھی ترش روئی بھی اور خوش روئی بھی جیسے بچہ کی ہر ادا محبوب ہوتی ہے۔ ہنسنا بھی محبوب، رونا بھی محبوب، منہ بگاڑنا بھی محبوب، اس کی شوخی بھی محبوب بلکہ والدین اس کا اہتمام کرتے ہیں کہیں بچہ کا کلہ توڑ لیا۔ چپت مار دیا کہ وہ روئے، منہ بگاڑے، غصہ کرے اور کیا نام بتلایا جاوے محبوب کی بہت سی ادائیں ہیں جن کا نام بھی نہیں۔

خوبی ہمہ کرشمہ و ناز و خرام نیست　　　　بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

(حسن اس کی کرشمہ ناز و خرام کا نام نہیں محبوبوں کی بہت ادائیں ہیں جن کا نام نہیں ہے)

ان کی سب ادائیں دل کش ہیں، دل بند ہیں، عشق کی شان ہی دوسری ہے اس حالت میں صحابہؓ کو حضورؐ کی ترش روئی کیوں ناگوار ہوئی ہوگی۔ اگر ان نابینا صحابی کی آنکھیں بھی ہوتیں تب بھی حضورؐ کی ترش روئی ناگوار نہ ہوتی اور جب کہ آنکھیں بھی نہ تھیں تو ایذاء کا شائبہ بھی نہیں ہوسکتا پھر جو عتاب ہوا تو وجہ اس کی یہ ہے کہ۔

حسنات الابرار سیئات المقربین

کہ اچھے لوگوں کی حسنات مقربین کے لئے سیئات ہوتی ہیں۔

جتنی زلات انبیاء کی مذکور ہیں سب طاعات تھیں مگر چونکہ صورۃً یا مجازاً ذنب تھیں اس

لئے ان کو ذنب کہا گیا۔ زلات انبیاء ذنب حقیقی نہیں کیونکہ وہ اس سے معصوم ہیں۔

عبادت اور توفیق

کلام بہت بڑھ گیا مقصود یہ ہے کہ جب آیت لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَاتَاَخَّرَ (تا کہ اللہ تعالیٰ آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اگلے پچھلے گناہ بخش دے) نازل ہوئی تو ظاہر مقتضیٰ اس کا یہ تھا کہ حضورؐ مشقت کم کر دیتے اور صحابہ نے یہی سمجھا بھی کہ اس سے مقصود مشقت ومجاہدہ کا کم کر دینا ہے۔ مگر واقع میں اس آیت کا یہ مقصود نہ تھا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ عبادت مقصود بالذات ہے اور تعلق بحق اس کو مقتضی ہے کہ کبھی عبادت کم ہی نہ ہو۔

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن   کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

(تو فقیروں کی طرح مزدوری ملنے کی شرط پر بندگی نہ کر کیونکہ خود...... بندہ پروری کرنا جانتے ہیں)

عارف شیرازیؒ کہتے ہیں۔

فراق ووصل چہ باشد رضائے دوست طلب   کہ حیف باشد از وغیر او تمنائے

(فراق ووصل کیا ہو، رضائے الٰہی طلب کر اس کے سوا اور کچھ تمنا سوائے افسوس کے کچھ نہیں)

اگر کوئی کہے اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ رضا مقصود ہے۔ جب رضا مقصود ہوئی تو طاعت مقصود بالغیر ہوئی اور تم نے پہلے کہا ہے کہ عبادت مقصود بالذات ہے حالانکہ یہاں اس کے خلاف ثابت ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ عبادت کے مقصود بالذات ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس سے ایسی کوئی چیز مقصود نہیں جس کا عبادت سے تعلق شدید نہ ہو۔ جیسے کیفیات وغیرہ کہ ان کا عبادت سے تعلق شدید نہیں اور رضا ایسی نہیں بلکہ اس کا عبادت سے دو وجہ سے شدید تعلق ہے ایک تعلق یہ کہ عبادت پر اس کا ترتب موعود ہے دوسرا تعلق یہ کہ خود اس پر بھی عبادت کا ترتب لازم ہے یعنی اول عبادت سے رضا ہوتی ہے پھر اس کی برکت سے عبادت کی مزید توفیق ہوتی ہے بلکہ جب تک ان کی رضا نہ ہو طاعت ہوتی ہی نہیں۔ جس سے اللہ میاں راضی ہوتے ہیں طاعت بھی وہی کرتا ہے اور جس سے راضی نہیں ہوتے اس کو طاعت کی توفیق نہیں ہوتی۔

چنانچہ حضرت حاجی قدس سرہٗ سے جو کوئی آ کر شکایت کرتا کہ حضرت اللہ اللہ کرتا

ہوں مگر نفع نہیں ہوتا۔ اس پر آپ فرماتے ہیں کہ یہ تھوڑا ہے کہ اللہ اللہ کرتے ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ میاں تم سے راضی ہیں۔ اگر تمہارا اللہ اللہ کرنا مقبول نہ ہوتا تو تم کو دربار میں گھسنے ہی کیوں دیتے یعنی اللہ اللہ کرنے کی توفیق ہی نہ ہوتی۔

ایک آقا اور ایک غلام بازار کو جا رہے تھے۔ راستہ میں نماز کا وقت آ گیا غلام نماز پڑھنے گیا اور آقا مسجد سے باہر بیٹھا رہا۔ اس کو مسجد میں دیر ہوگئی تو آقا صاحب نے پکارا۔ اس نے جواب دیا کہ آنے نہیں دیتا آقا نے کہا کون نہیں آنے دیتا اس نے کہا جو تجھ کو اندر نہیں آنے دیتا وہ مجھ کو باہر نہیں آنے دیتا۔

مشہور ہے کہ کسی کا بچھڑا مسجد میں گھس گیا تھا مسجد کے ملا خفا ہونے لگے تو وہ شخص کہتا ہے کہ کیوں خفا ہوتا ہے تو نے ہمیں بھی کبھی مسجد میں دیکھا ہے یہ بے وقوف تھا چلا آیا۔ منحوس مسجد میں نہ آنے پر فخر کرتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ بعض کو توفیق ہی نہیں ہوتی بس جن سے اللہ میاں خوش ہوتے ہیں انہیں کو توفیق بھی ہوتی ہے یہ کیا اچھا نکتہ ہے بھلا کسی کافر سے کلمہ تو پڑھوا لو۔ وجہ یہی ہے کہ اللہ میاں اس سے خوش نہیں ہیں۔ اس لئے اس کو توفیق ہی نہیں ہوتی۔

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰى اَفْوَاهِهِمْ "اس دن ہم ان کے منہ پر مہر کر دیں گے"

دنیا میں بھی ہے آخرت میں تو ہوگا ہی اور وہاں کا ختم یہاں ہی کے ختم کا ثمرہ ہوگا۔

حضرت حاجی صاحب نے ایک حکایت بیان فرمائی مثنوی کی مثنوی میں عجیب اسرار ہیں ایک شخص کا قصہ ہے کہ وہ اللہ اللہ کیا کرتے تھے شیطان ان کے پاس گیا اور کہا کیوں چلاتا ہے کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ تتمہ قصہ سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ بعض بزرگ مرید ہوتے ہیں اور بعض مراد۔ مرید ذرا نخرے کرے تو اللہ میاں پوچھتے بھی نہیں اور یہ شخص مراد تھا۔ اس لئے اس کے ساتھ خاص معاملہ ہوا وہ یہ کہ شیطان کے کہنے پر تو یہ ذکر ترک کر بیٹھا مگر حق تعالیٰ کی طرف سے کشش کی گئی یعنی خطاب ہوا کہ ہمارا نام کیوں نہیں لیتا اس نے کہا کیا نام لوں نہ پیک ہے نہ پیام ہے نہ سلام ہے نہ کلام ادھر سے جواب ملا۔

گفت آں اللہ تو لبیک ماست ویں نیاز و سوز و دردت پیک ماست

یہ قاصد ہر ایک کے پاس نہیں جایا کرتا۔ غرض طاعت کی توفیق ہونا یہ بھی رضا کا اثر ہے۔

طاعت اور ثمرات

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب فرمایا کرتے تھے کہ طالب کو چاہئے کہ ثمرات پر نظر نہ کرے اگر چہ ثمرات حاصل ہوتے ہیں مگر ثمرات کی فکر میں نہ لگے اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی اہلمد سرکاری کام کر رہا ہے تو اگر عین کام کرنے کی حالت میں وہ اپنے ذہن میں یہ سوچنے لگے کہ مجھ کو چوبیس روپیہ تنخواہ کے ملیں گے اس میں یہ چیز گھر کی لاؤں کا گیہوں اتنے کے دال اتنے کی گھی اتنے کا اور یہ خیال ایسا بندھا کہ سرکاری کاغذ میں بھی یہ لکھ جاوے ظاہر ہے کہ اس سے کیسی خرابی ہوگی اور یہ خرابی ہوئی کاہے سے تنخواہ کا خیال جمانے اور اس کے مستحضر رکھنے سے اس کو چاہئے تھا کہ اس وقت خدمت سرکاری کا خیال جماتا اور اسی کو مقصود سمجھتا اور پھر یہ ثمرہ بھی مرتب ہوتا کہ تنخواہ بھی ملتی اور سامان بھی مہیا ہو جاتا۔ اسی طرح مقصود طاعت ہونی چاہئے ثمرات بھی اس پر مرتب ہو جاتے ہیں مگر مطلوب درجہ مذکور میں ثمرات نہ ہونے چاہئیں۔

اسی خیال جمنے کے متعلق ایک لطیفہ یاد آیا۔ ایک منشی جی اپنی بیوی کو خط لکھ رہے تھے۔ کہیں چڑیا اوپر بیٹھی تھی۔ اس نے خط پر بیٹ کر دی آپ نے اس کو گالی دی کہ تری اس میں قلم۔ اور اس مضمون کا ایسا خیال غالب ہوا کہ خط میں بھی یہی لکھ گئے وہ خط بیوی کے پاس پہنچا بیوی نے بہت برا مانا اور ان کو لکھ کر بھیجا انہوں نے لکھا کہ میں نے تو چڑیا کو گولی دی تھی وہ غلطی سے خط میں لکھی گئی۔

پس زمانہ طلب میں ثمرات پر نظر کرنے کا یہی انجام ہوتا ہے کہ کام بگڑ جاتا ہے صاحبو! طلب مطلوب ہے ثمرات مطلوب نہیں ثمرات کے درپے ہونے والا ہمیشہ پریشان رہے گا بعض تو استحقاق کے خیال سے ثمرات کے منتظر رہتے ہیں یہاں تک کہ اگر ثمرات نہ ملیں تو ایک قسم کی شکایت حق تعالیٰ کی دل میں پیدا ہوتی ہے کہ اتنے دنوں سے سعی کر رہے ہیں مگر کچھ بھی نہیں ہوتا یہ تو بہت ہی خطرناک حالت ہے اور بعض محض بھولے پن سے ثمرات کے منتظر رہتے ہیں یہ مذکورہ خرابی ان میں نہیں ہوتی مگر اتنا بھولا پن خود نقص ہے۔

غرض ثمرات کی فکر کو چھوڑ و۔ محبوب ومقصود پر نظر رکھو۔ مثلاً واعظ کے وعظ پر اگر ثمرہ

مرتب نہ ہو (یعنی اثر نہ ہو) تو اس سے پریشان نہ ہو۔ افسوس ہے ان لوگوں پر کہ ثمرات مرتب نہ ہوں تو اس سے پریشان ہوتے ہیں۔

کانپور میں ایک شخص نے ایک عمل پڑھا تھا اور جس کتاب میں دیکھ کر پڑھا تھا اس میں یہ لکھا تھا کہ بعد عمل پورا ہونے کے ایک پری پیکر جنیہ آوے گی چنانچہ وہ عمل پورا کرنے کے بعد اس کے منتظر رہے جنیہ وغیرہ کچھ بھی نہ آئی انہوں نے مجھ سے بیان کیا کہ اس کے نہ آنے پر میں وہاں سے اٹھ کر تھیٹر میں چلا گیا میں نے مزاحاً کہا اسی واسطے نہیں آئی تھی کہ یہ تھیٹر کے ارادہ میں ہیں۔

یہ تو ایک لطیفہ کے طور پر حکایت تھی اصل یہ ہے کہ وصول مطلوب نہیں طلب مطلوب ہے اور تصوفی مذاق پر تو ایک عملی نکتہ ہے لیکن ایک معنی کر یہ محققانہ علمی مسئلہ ہے دیکھنا یہ چاہئے کہ وصول ہے کس کے اختیار میں۔ اللہ تعالیٰ یا بندہ کے ظاہر ہے کہ وصول انہیں کے اختیار میں ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا دوسرا یہ کہ قصد کس کے فعل کے متعلق ہوتا ہے اپنے فعل کے یا دوسرے کے فعل کے۔ اب ظاہر ہو گیا کہ وصول کے مقصود ہونے کے کچھ معنی ہی نہیں وہ تو اس کے اختیار ہی میں نہیں پس طلب ہی خود مقصود ہے کیونکہ یہ اس کا فعل ہے اس لئے اس کو اپنا کام کرنا چاہئے۔

کار خود کن کار بے گانہ مکن　　　در زمین دیگر ان خانہ مکن

جو تمہارا فعل نہیں اس کا قصد کیوں کرتے ہو اس طرح سے یہ محققانہ مستدلانہ نکتہ ہے بہرحال طلب مقصود ہے کام کئے جاؤ کچھ بھی ہو بندہ ہونے کی حیثیت سے یہ ہے کہ طاعت کئے جائے بس طاعت مقصود ہے اگر اس کے بعد کوئی رتبہ یا نعمت بھی مل جاوے تو طاعت کیوں چھوڑے اور آپ کی تو بڑی شان ہے آپ طاعت کیوں چھوڑنے لگے تھے اگر امت میں کسی کو معلوم ہو جاوے کہ میں جنت میں جاؤں گا تب بھی عمل نہ چھوڑے یا اگر معلوم ہو جائے کہ دوزخ میں جاؤں گا تو بھی نہ چھوڑے یہ ہے طلب کا فرض۔

اگر کوئی غلام سے پانی مانگے اور وہ کہے کہ کیا ملے گا تو یہ بڑی بے ادبی ہے سو یہ امر مطلق طاعت کے باب میں تو ظاہر ہے مگر مشقت شدیدہ کے متعلق ظاہر نہ تھا اس لئے آپ سے پوچھا گیا کہ آپ کے ذنوب تو معاف کر دیئے گئے ہیں۔ پھر آپ اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں اور باعث اس کا یہ تھا کہ صحابہ کو حضور سے عشق تھا اس لئے آپ کی تکلیف گوارا

نہ تھی۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ حضورؐ پر مشقت نہ ہو اس آیت کو سننے سے ان کا ذہن اسی طرف گیا کہ اس آیت سے غرض آپؐ کی مشقت کا کم کرنا ہے جیسا دوسری آیت میں ارشاد ہے۔

مَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰۤی

ہم نے آپ پر قرآن اس لئے نہیں اتارا کہ آپ تکلیف اٹھائیں۔

ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔

دوسرا مقدمہ ان کے ذہن میں یہ تھا کہ حضورؐ جو کچھ مشقت گوارا فرماتے ہیں اس کا بڑا حصہ امت کی وجہ سے ہے کہ آپؐ غایت درجہ امت پر شفیق تھے۔ حدیث میں آتا ہے کہ بعض دفعہ تمام تمام رات اسی آیت کے تکرار میں گزر جاتی۔

اِنۡ تُعَذِّبۡہُمۡ فَاِنَّہُمۡ عِبَادُکَ وَ اِنۡ تَغۡفِرۡ لَہُمۡ فَاِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ

کہ اے اللہ! اگر آپ ان کو (یعنی میری امت کو) عذاب دیں تو آپ کے بندے ہیں اور اگر مغفرت فرمادیں تو آپ زبردست حکمت والے ہیں۔

تو ان کو یہ گوارا نہ تھا کہ کسی درجہ میں ہم بھی آپ کی مشقت کا سبب بنیں اس مقام پر آپ کا ایک کمال پیش نظر ہو گیا کہ آپ باوجود اتنے بڑے رتبہ کے ہم ناکاروں کو نہیں بھولتے تھے اور ہماری یہ کیفیت ہے کہ اگر کسی کو ذرا سا رتبہ مل جاتا ہے تو وہ سب کو بھلا دیتا ہے اور تماشا یہ کہ مشہور کیا ہے کہ اصل کمال یہی ہے کہ رتبہ ملنے پر دوسروں کو بھول جائے۔ بعض اس قسم کی حکایات نے لوگوں کے صحیح علوم کا ناس کر دیا ہے۔

مثلاً حکایت ہے کہ ایک شخص نے کسی بزرگ سے عرض کیا کہ حضرت کسی خاص وقت میں میرے لئے بھی حق تعالیٰ سے دعا کیجئے گا۔ ان بزرگ نے جواب دیا کہ نفرین ہے اس خاص وقت پر جس میں تم یاد آؤ۔ یا تو یہ حکایت گھڑی ہے اور اگر کسی بزرگ نے کہا بھی تو یہ غلبہ حال تھا۔

حقیقت غلبۂ حال

غلبۂ حال کی حقیقت یہ ہے کہ عقل ٹھکانے نہیں رہتی غلبۂ حال کی صورت میں بے عقلی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ کمال نہیں ہے۔

ایک درویش سے میرے سامنے ان کے ایک مرید نے پوچھا تھا کہ سلوک افضل ہے

یا جذب۔ انہوں نے جواب دیا کہ شراب کے حرام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے عقل جاتی رہتی ہے اس سے عقل کا نعمت ہونا سمجھ لو۔ اور جذب میں یہی عقل جاتی رہتی ہے۔ اس سے سمجھ سکتے ہو کہ جذب کوئی کمال نہیں۔

اس تقریر میں مجذوب سے مراد عوام کی اصطلاح کا مجذوب ہے۔ باقی خواص کی اصطلاح کے موافق تو سب انبیاء مجذوب ہوئے ہیں مجذوب خواص کی اصطلاح میں اس کو کہتے ہیں کہ جس کے واسطے کشش ہو جاوے حق تعالیٰ کی طرف سے جو اس آیت میں مذکور ہے۔

اَللّٰهُ يَجْتَبِىٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِىٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ

یعنی اللہ کھینچ لیتا ہے جس کو چاہے اور ہدایت کرتا ہے اپنی طرف اسکو جو انابت کرے۔ ینیب کی ضمیر اس شخص کی طرف راجع ہے یہ دونوں دولتیں (کھینچ لینا اور انابت) مقبولوں کو نصیب ہوتی ہیں اور جو گمراہ ہوتا ہے نہ اس کی طرف سے انابت ہوتی ہے نہ ادھر سے جذب ہوتا ہے۔ بس مردود ہو جاتا ہے۔ شیطان جو مردود ہوا تو اسی وجہ سے کہ ادھر سے انابت نہ ہوئی ادھر سے جذب نہ ہوا بس گمراہ ہو گیا اور جو مجتبیٰ ہوتے ہیں اگر ان سے خطا بھی ہو جاتی ہے تو دھو دھلا کر ٹھیک کر دیتے ہیں۔

انبیاء اور مجذوبیت

پس اس اصطلاح خاص کے موافق جملہ انبیاء مجذوب ہوئے ہیں البتہ عوام کی اصطلاح کے موافق کوئی نبی مجذوب نہیں ہوا۔ کیونکہ عوام کی اصطلاح میں مجذوب اس کو کہتے ہیں جس کی عقل جاتی رہے اور نبی کوئی ایسے نہیں ہوئے بلکہ سب اعلیٰ درجہ کے دانشمند تھے۔ عقل ہی انسان میں اچھی چیز ہے جس کی وجہ سے یہ تمام چیزوں پر فوقیت رکھتا ہے۔

ایک حدیث شرح الصدور میں بروایت احمد طبرانی وابونعیم ابن ابی الدنیا نقل کی ہے وہ یہ کہ حضورؐ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ اے عمرؓ کیا حال ہوگا قبر میں جب کہ ایسے ایسے فرشتے آویں گے اور ایسا ایسا پوچھیں گے اس وقت کیا حال ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرمائیے کہ اس وقت عقل بھی ہوگی یا نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جیسی عقل اب ہے ایسی ہی ہوگی حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ پھر کیا ڈر ہے رہبر موجود ہے حق تعالیٰ

کا فرستادہ ہے وہ ہمیں جواب سکھادے گا اسی پر بعضے بزرگوں نے توکل کر کے کہا ہے۔

گر نکیر آید و پرسد کہ بگو رب تو کیست　　　گویم آنکس کہ ربودہ ایں دل دیوانہ ما

بھلا بجز مقبولان خاص کے ایسے خوف میں کوئی ایسا جواب دے سکتا ہے کیا وہاں کوئی چو چلے بگھارنے دے گا مگر ان مقبولین کو وہاں بھی شاعری سوجھے گی۔ سو یہ جب ہی ہو سکتا ہے جب کہ عقل کامل موجود ہو اور اس کے ساتھ ہی ادھر سے بھی تائید ہو۔

اس تائید پر ایک واقعہ سید صاحب پشاور کا یاد آ گیا۔ سید صاحب کے پاس علماء باکمال کہ ہر ایک ان میں سے ایک ایک فن میں ماہر تھا حاضر ہوئے اور غرض ان کی آپ کا امتحان لینا تھا کیونکہ آپ کی شہرت ہو رہی تھی اور یہ بھی مشہور تھا کہ سید صاحب علوم درسیہ میں کوئی صاحب کمال نہیں ہیں۔ ان کو تو مولوی اسمٰعیل صاحب اور مولوی عبدالحئی صاحب نے اڑا رکھا ہے جیسے حضرت حاجی صاحب کی نسبت بعض نے کہا تھا کہ ان کو تو ان کے خلفاء علماء نے مشہور کر رکھا ہے وہ خود صاحب کمال نہیں ہیں۔ سید صاحب نے کافیہ تک پڑھا تھا جیسے حضرت حاجی صاحب نے بھی کافیہ تک پڑھا تھا۔ یہ علماء آپ کو دق کرنے کی غرض سے جمع ہوئے تھے غرض انہوں نے آپ سے مختلف فنون کے چند سوالات کئے سید صاحب کبھی داہنی طرف دیکھ کر جواب دیتے تھے اور کبھی بائیں طرف جب علماء چلے گئے تو کسی نے پوچھا کہ آپ داہنی بائیں جانب دیکھ دیکھ کر کیوں جواب دے رہے تھے۔ فرمایا کہ جب یہ علماء آئے تو میں نے حق تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ میری سبکی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ابوحنیفہؒ کی روح کو میری داہنی جانب اور شیخ بوعلی سینا کی روح کو بائیں جانب حاضر کر دیا۔ جب علماء منقولات کا سوال کرتے ہیں تو میں حضرت ابوحنیفہؒ سے دریافت کر کے جواب دے دیتا تھا اور جب معقولات کا سوال کرتے تو شیخ سے دریافت کر کے بیان کر دیتا تھا یہ وجہ تھی دائیں بائیں مائل ہونے کی خدا تعالیٰ اپنے بندوں کی مدد فرماتے ہیں۔

ان ہی سید صاحب کا واقعہ ہے کہ جب آپ نے کافیہ شروع کیا تو کتاب کے حروف اڑ گئے ایک لفظ بھی آپ کو نظر نہ آیا۔ نہایت مغموم ہوئے حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب سے کہا انہوں نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ کو آپ سے اور کام لینا ہے پڑھنا چھوڑ دو۔

اب جوان سے خدمت دین کی ہوئی معلوم ہے کہ کیا کچھ ہوئی۔

اسی طرح بعض علماء مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی خدمت میں کچھ سوالات لے کر آئے تھے آپ اس وقت گھوڑا مل رہے تھے علماء نے خود انہی سے پوچھا کہ مولوی اسمٰعیل صاحب کہاں ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر ملیں گے تو کہو گے کیا؟ پوچھو گے کیا؟ علماء نے کہا تجھے کیا بتلا دیں تو تو گھوڑا ملنا جانتا ہے تو علمی مضامین کو کیا جانے پھر بھی آپ نے فرمایا کہ مجھ سے کہو تو سہی تا کہ میں دیکھوں کہ یہ سوالات مولوی اسمٰعیل سے کرنے کے ہیں یا نہیں چنانچہ انہوں نے ایک موٹا سا سوال کیا آپ نے اس کا جواب دے دیا پھر ان کو معلوم ہو گیا کہ یہی ہیں مولوی اسمٰعیل تو انہوں نے آپ سے چند سوالات کئے آپ نے فی البدیہہ ان کے جوابات فرمائے علماء حیران تھے کہ یہ کیسا علم ہے گھوڑا کو کھریرا بھی کرتے جاتے ہیں اور علمی اشکالات بھی حل کرتے جاتے ہیں۔ اس کے بعد واپس چلے گئے۔

اصل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی تائید سے سب کام ہوتے ہیں۔ عقل بھی ان کی تائید سے رہبر ہو سکتی ہے خواہ منکر نکیر کچھ ہی کہیں وہی عقل تائید حق سے مل کر جواب بتلا دے گی۔ حضرت عمرؓ اس نکتہ کو سمجھے دیکھا عقل کیسی بڑی چیز ہے اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو عاقل بنایا ہے۔ مغلوب الحال نہیں ہوئے۔ مغلوب الحال سے بے عقلی کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ اگر کسی نے یہ بات (کہ تم دعا میں خاص وقت میں کب یاد آؤ گے گھڑی ہے تب تو بدعقلی ہے ورنہ بے عقلی کا جواب ہے۔

مقام عین اور غین

اب اگر کوئی یہ شبہ کرے کہ دوسری طرف متوجہ ہونا فنا کے خلاف ہے اور فنا مراتب کمال میں سے ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بالکل یاد نہ رہنا یہ بھی ناقص حالت کامل حالت ان کی ہے جو جامع بین الضدین ہے۔

مثال اس کی یہ ہے کہ ایک آئینہ اس میں مثلاً چہرہ نظر آتا ہے محبوب کا مگر ایک شخص تو صرف آئینہ کو دیکھ رہا ہے محبوب کو نہیں دیکھتا یہ شخص آئینہ کا عاشق ہے۔ ناقص ہے ایک شخص وہ ہے جو محبوب کو تک رہا ہے آئینہ کو دیکھتا ہی نہیں۔ یہ محقق نہیں کیونکہ ایک شے درمیان میں ہے مگر اس کو دیکھتا ہی نہیں تو اگر یہ شخص آئینہ کو خریدنے لگے تو کیسے خریدے گا۔ اور ایک شخص

وہ ہے کہ محبوب کو تو دیکھ رہا ہے مگر آئینہ پر بھی اس حیثیت سے نگاہ ہے کہ ذریعہ ہے محبوب کے دیکھنے کا اس کی حالت یہ ہے کہ ؎

برکفے جام شریعت برکفے سندان عشق ہر ہوسنا کے نداند جام وسندان باختن

یہ سب تین حالتیں ہوئیں۔ اس لئے بعض وہ لوگ ہیں جن کی نظر مخلوق کی طرف بالکل نہیں۔ یہ مقبول ہیں مگر ناقص ہیں اور بعض وہ ہیں جن کی توجہ ہمہ تن مخلوق ہی کی طرف ہے یہ مطرود ہیں ایک وہ ہیں کہ اصالۃً تو محبوب کو دیکھ رہے ہیں مگر مخلوق کی طرف بھی اس حیثیت سے نظر ہے کہ مخلوق ذریعہ ہے محبوب کے دیکھنے کا یہ لوگ کامل ہیں انبیاء کی یہی حالت تھی اگر انبیاء کو مخلوق کی طرف توجہ نہ ہو تو وہ نفع ہی نہیں پہنچا سکتے۔ مخلوق کی طرف ان کو نہایت توجہ ہوتی ہے۔

چنانچہ سیر کی روایت ہے کہ جب حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم معراج کے وقت مقام قرب میں پہنچے تو حق سبحانہٗ کی طرف سے سلام ارشاد ہوا کہ **السّلام علیک ایھا النبی و رحمة الله و بر کاته** (اے نبی اکرمؐ آپؐ پر اللہ کی سلامتی، اس کی رحمتیں اور اس کی برکتیں نازل ہوں) آپ نے جواب میں فرمایا **السّلام علینا و علی عباد الله الصالحین** (ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر سلامتی ہو) دیکھئے مخلوق سے وہاں بھی نظر شفقت نہ اٹھائی۔ حالانکہ ایسا قرب کا درجہ تھا کہ کسی کو بھی میسر نہیں ہوا مگر پھر بھی آپ امت کو نہ بھولے۔ اس کے علاوہ قیامت سے کون سا زیادہ پریشانی کا وقت ہوگا۔ یا یوں کہو کہ وہ اس قدر زیادہ قرب کا وقت ہے۔ جس میں عام عشاق کی یہ کیفیت ہوگی۔

عاشقاں را با قیامت روز محشر کار نیست عاشقاں را جز تماشائے جمال یار نیست

(عاشقوں کو اور محشر سے قیامت تک کوئی کام نہیں، عاشقوں کو سوائے محبوب کا جمال دیکھنے کے کچھ کام نہیں)

اور تطبیق یہ ہے کہ عوام کے اعتبار سے تو پریشانی کا وقت ہوگا اور خواص کے لحاظ سے قرب کا۔ ان کو پریشانی بالکل نہ ہوگی۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَکْبَرُ۔ تو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو کس درجہ قرب ہوگا مگر حضورؐ امت کو وہاں بھی نہ بھولیں گے چنانچہ شفاعت فرما دیں گے۔ سو کمال یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ بالذات ہو اور مخلوق کی طرف اس حیثیت

سے توجہ ہو کہ وہ مرآۃ ہیں اور ایسے حضرات اولیاء متوسطین جو محبوب ہی کو دیکھتے ہیں آئینہ کی طرف التفات نہیں کرتے ان کی توجہ دوسری طرف ہوتی ہی نہیں اور کاملین کے اوقات منقسم ہوتے ہیں خلوت کا وقت اور جلوت کا وقت بلاواسطہ محبوب کی طرف نظر کرتے ہیں۔ اس وقت ان کا یہ حال ہوتا ہے جس کو عارف شیرازی کہتے ہیں۔

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے — بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہاؤ ہوئے

(ایک ساعت ایک لمحہ محبوب کو اطمینان سے دیکھنا دن بھر کی دارو گیر شاہی سے بہتر ہے)

اور جلوت میں یہ ہوتا ہے کہ افادہ کرتے ہیں مخلوق کو اور یہ محبوب ہی کا امر ہے کہ اس وقت ہمیں مرآۃ میں دیکھو۔ ہم اس میں نظر آئیں گے گو اس صورت میں اتنی لذت نہیں جتنی بلاواسطہ دیکھنے میں ہے مگر امتثال مقصود ہے گو بواسطہ نظر کرنے میں ایک قسم کا حجاب ہوتا ہے اسی کو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں انہ لیغان علی قلبی مگر وہ حجاب اور کدورت محض طبعیہ ہے شرعیہ نہیں۔ اس کو معصیت نہیں کہہ سکتے۔

اب رہا باوجود معصیت نہ ہونے کے حضورؐ کا استغفار فرمانا۔ تو وہ بوجہ معصیت کے نہ تھا بلکہ قرب پیدا کرنے کے لئے تھا اور استغفار جیسے معصیت کو دور کرتا ہے اسی طرح کدورت طبعیہ کو بھی رفع کرتا ہے بس خواص کی یہ حالت ہوتی ہے کہ کسی وقت عین میں ہیں یعنی مشاہدہ ذات میں اور کسی وقت غین میں یعنی حجاب میں مگر اس وقت بھی وہ عین میں ہی ہیں صرف ایک نقطہ بڑھ جاتا ہے۔ اور وہ نقطہ مخلوق ہے مگر وہ اس میں بھی امتثال امر کر رہے ہیں کیونکہ مرآۃ کے بھی تو حقوق ہیں اس وقت وہ ان کو ادا کر رہے ہیں یہ کمال کی بات ہے کہ کبھی محبوب پر نظر بواسطہ ہے اور کبھی بلاواسطہ۔

اس سے کسی کج فہم کو یہ شبہ نہ ہو کہ جب مخلوق مرآۃ ہے تو لڑکوں اور عورتوں کو بھی واسطہ بنانے میں کچھ حرج نہ ہونا چاہئے اور خوب گھورنا چاہئے اس لئے کہ یہ چیزیں فی نفسہ مرآۃ تو ہیں مگر محبوب نے مختلف مرایا میں سے خود بعض مرآءۃ کی تعیین کر دی ہے کہ ہمیں فلاں مرآۃ میں دیکھو اور فلاں میں سے مت دیکھو۔ پس ایسی مرآۃ دیکھنے کی اجازت نہیں دی۔ اس واسطے درست نہ ہوگا۔

بہرحال انبیاء کی عقل کامل ہوتی ہے۔ ان کو مخلوق کی طرف توجہ کرنے میں بھی طاعت ہی مقصود

ہے۔ اس لئے آپ امت کو یاد رکھتے اور دعا فرماتے اور مشقت اٹھاتے تو صحابہ نے مشقت کے دوسبب سمجھ کرایک کو دل سے ایک کو زبان سے پیش کر کے عرض کیا کہ آپ اتنی محنت نہ کیجئے کیونکہ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَاتَاَخَّرَ (تا کہ اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اگلے پچھلے گناہ بخش دے)

آپ کے لئے نازل ہو چکا ہے آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا افلا اکون عبدالشکورا (کیا میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں) حضور کا مقصود یہ تھا کہ مغفرت نامہ کا جو مطلب سمجھے ہو وہ صحیح نہیں (کہ عبادت میں کمی کر دی جائے) بلکہ یہ معلوم ہو کر تو عبادت میں اور زیادتی ہونی چاہئے اور حق تعالیٰ کا شکر کرنا چاہئے اس عبادت شاقہ کا ایک مقتضی نہ سہی یعنی طلب مغفرت کیونکہ وہ حاصل ہوگئی دوسرا مقتضی تو موجود ہے یعنی شکر۔

مقام عطا اور خطا

اس حدیث سے ایک قاعدہ کلیہ معلوم ہوگیا وہ یہ کہ اگر کوئی طاعت کی جائے کسی مقصود کے واسطے اور قبل طاعت کے مقصود حاصل ہو جائے تو اس طاعت کو نہ چھوڑا جائے پس فقہا کے قول کی من وجہ یہ حدیث اصل ہو سکتی ہے کہ اگر نماز استسقاء سے قبل بارش ہو جاوے تب بھی نماز پڑھ لیں اور اصل من کل الوجوہ اس کو اس لئے نہیں کہا کہ من کل الوجوہ اصل کہنے پر کچھ سوالات ہو سکتے ہیں۔

مثلاً ایک یہی کہ استدلال کلی کی صورت میں اسکا (یعنی افلا اکون عبدالشکورا کا) مقتضا یہ ہوگا کہ اگر استسقاء کی نماز پڑھ کر بھی بارش ہو جائے تو پھر نماز پڑھے اور پھر بارش ہو جاوے تو پھر پڑھے لیکن حالانکہ ایسا نہیں ہے کہ کیونکہ استسقاء بھیت خاصہ منقول ہے اس میں رائے کو دخل نہیں ہو سکتا۔ دوسرے یہ لازم آوے گا کہ ہمیشہ بارش کے بعد نماز استسقاء پڑھا کرے شکر عطا کے طور پر سو باوجودیکہ وہ شکر کر رہا ہے نعمت کا مگر فقہاء اس کو بدعت قرار دیں گے معلوم ہوا کہ اصل نام کچھ اور ہی ہے کیونکہ اگر کوئی اصل مستقل نہ ہوتی تو فقہاء اس پر یہ احکام مرتب نہ کرتے اور وہ وجہ مجھ کو معلوم نہیں۔ پس چونکہ من وجہ یہ حدیث اصل تھی اس لئے بیان کر دیا گیا۔ بہر حال احکام کی خصوصیات میں فقہ کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔

ہاں اگر شکر عام لے لیا جاوے جو مخصوص بھیت نماز استسقا نہ ہو بلکہ کسی دوسری صورت

سے ہو۔ مثلاً مطلق طاعات میں زیادتی یا زبان سے صیغہ شکر ادا کرنا تو اور بات ہے اس کو ہر نعمت کے بعد مشروع کہیں گے۔ بہر حال اتنا قاعدہ ضرور سمجھ میں آتا ہے کہ بعد عطا کے بھول نہ جائے طاعت کو چھوڑے نہیں اس کے مویدات اور بھی بیان کرتا ہوں۔ مثلاً یہ آیت ہے

رَبَّنَا لَاتُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ

اے ہمارے رب! ہم پر دارو گیر نہ فرمایئے اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں، اے ہمارے رب اور ہم پر کوئی سخت حکم نہ بھیجئے جیسا ہم سے پہلے لوگوں پر آپ نے بھیجے تھے اے ہمارے رب اور ہم پر کوئی ایسا بار نہ ڈالئے جس کی ہم کو سہار نہ ہو۔

جو چیزیں اس آیت میں مذکور ہیں یعنی نسیان اور خطا وغیرہ ان پر مواخذہ نہ ہونا اس کا لوگوں سے وعدہ ہو گیا تھا اور پہلی آیت یعنی

اِنْ تُبْدُوْا مَافِیْ اَنْفُسِكُمْ اَوْتُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهِ

جو باتیں تمہارے نفسوں میں ہیں اگر تم ظاہر کرو گے، یا کہ پوشیدہ رکھو گے حق تعالیٰ تم سے حساب لیں گے۔

بالمعنی العام منسوخ ہو گئی تھی نیز رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بھی فرمادیا ہے کہ رفع عن امتي الخطاء و النسيان[1] (میری امت سے خطا اور بھول معاف کردی گئی)

مگر پھر بھی یہ حکم ہوا کہ یوں ہی مانگے جاؤ اور یہ دعا تعلیم کی گئی تو بات یہ ہے کہ منسوخ ہونے کے قبل تو یہ سوال کے لئے تھا کہ ہم سے یوں مانگا کرو اب بطور شکر کے ہے کہ جیسے ہم ملنے سے پہلے محتاج تھے، اب بھی محتاج ہیں۔

اس کی نظیر موجود ہے وہ یہ کہ جب حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم مکہ میں تشریف لائے اور فتح ہوئی۔ مدینہ شریف میں صحابہ کو بخار آیا تھا۔ وہاں کی آب و ہوا خراب تھی حضور کی برکت سے پھر اچھی ہو گئی۔ تو عمرہ قضا کے وقت کفار مکہ نے کہا تھا وهنتهم حمى يثرب یعنی ان کو یثرب کے بخار نے ضعیف کر دیا ہے۔ (یثرب مدینہ شریف کا زمانہ جاہلیت میں لقب تھا

---

[1] کنز العمال: ۱۰۳۰۸، الدر المنتثرہ فی الأحادیث المشتھرہ: ۸۷

حضورؐ نے اس کو بدل کر مدینہ نام رکھا)

غرض اس وقت صحابہ پر علالت کا اثر تھا حضورؐ نے طواف کے وقت فرمایا ذرا دوڑ کر اور سینہ ابھار کر چلنا جس کو رمل کہتے ہیں تا کہ کفار پر مسلمانوں کی قوت ظاہر ہو۔ حالانکہ وہ موقع عبدیت کا تھا مگر قواعد اور پریڈ عبدیت کے خلاف تھوڑا ہی ہے اور یہ فرمانا آپ کا نہ تھا اللہ میاں کا فرمانا تھا۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود   گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا فرمان گویا اللہ کا فرمان ہے اگر چہ ایک اللہ کے بندے محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کے منہ سے ادا ہوتے ہیں)

کیوں کہ جبریل علیہ السّلام کی معرفت اللہ میاں بندوں کو حکم کریں گے تو حضورؐ ہی کے واسطے سے تو کریں گے۔ اللہ میاں تھوڑا ہی کہنے آویں گے منادی تو غائب ہی کی زبان سے ہوتی ہے اسی واسطے جن لوگوں نے بلا واسطہ اس کی طلب کی تھی کہ اللہ میاں ہمیں احکام پہنچانے کیوں نہیں آتے ان پر کیسا عتاب ہوا ہے اسی طرح جن لوگوں نے اللہ میاں کے دیکھنے کی طلب کی تھی اور کہا تھا ارنی ربنا ان پر بھی عتاب ہوا ہے اور حضورؐ کی مظہریت تو بڑے درجہ کی ہے ایک درجہ کی مظہریت ہر شے میں ہے اسی واسطے جو شخص توحید کی تہہ کو سمجھے ہوئے ہے وہ ہر چیز میں اللہ ہی کا نور سمجھے گا اور سب چیزوں کو اللہ تعالیٰ کا مرآۃ جانے گا۔ رسولؐ کے فرمانے کو تو بدرجہ اولی اللہ تعالیٰ ہی کا فرمانا خیال کرے گا اسی لئے کہا ہے۔

جملہ یک نور ست لیکن رنگ ہائے مختلف   اختلافے درمیان این و آں انداختہ

(وہی ایک نور ہے لیکن الوان مختلف ہیں جس کی وجہ سے ایک دوسرے میں اختلاف ہو گیا ہے)

اور اس سے شرک نہ نکالا جائے مثلاً کوئی یوں کہنے لگے کہ جب سب جگہ اسی کا جلوہ ہے تو بتوں میں بھی اس کا جلوہ ہوا۔ اس لئے بت پرستی میں بھی کوئی قباحت نہ ہونی چاہئے۔

جواب یہ ہے کہ گو ہر چیز میں اسی کا جلوہ ہے اور سب چیزیں اس کے لئے مرآۃ ہیں۔ مگر صاحب جلوہ کے کچھ حقوق ہیں۔ وہ حقوق صاحب جلوہ سے بھی پوچھنا چاہئے۔ اگر محبوب یوں کہہ دے کہ میں کپڑے بدلتا ہوں مجھ کو برہنہ مت دیکھنا تو کیا دیکھنا درست ہوگا ہرگز نہیں۔ اسی طرح جلوہ تو ہر چیز میں ہے مگر بتوں میں ہمیں اس جلوہ کے دیکھنے کی اجازت

نہیں اسی طرح عورتوں اور لڑکوں میں جلوہ تو ہے مگر ان میں اس تجلی کے دیکھنے کی اجازت نہیں ہم نے مانا کہ انہی کی تجلی ہر جگہ ہے اور ان ہی کی شان میں صادق آتا ہے۔

حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردۂ　　　پس بچشم عاشقاں خود را تماشا کردۂ

(اپنے حسن کو حسینوں کے چہرے سے ظاہر کرنا ہے عاشقوں کی آنکھ میں اپنے آپ کو تماشا بنایا ہے)

لیکن اگر ہر صورت میں مشاہدہ کی اجازت ہو تو محبوب کے ننگے پن میں کیا کہا جائے گا وہاں بھی اجازت ہونی چاہئے۔ اس تقریر کے بعد یہ مسئلہ مظہریت مشرکین کے کام کا نہیں یہ موحدین کے کام کا ہے غرض بعض مرآۃ وہی ہیں جن میں محبوب کے دیکھنے کا حکم ہے۔

جیسے شیطان کو حکم ہوا تھا کہ آدم کو سجدہ کرو تو آدم مرآۃ تھے باری تعالیٰ کے لئے وہاں اس کو حکم کی تعمیل کرنا چاہئے تھی۔ وہاں بھی تو انہیں کا جلوہ تھا مگر وہ نامعقول بلا واسطہ تجلی کا طالب تھا واسطے سے منکر تھا۔ اس لئے عتاب ہوا کہ کیوں ہمارے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ اس مسئلہ مظہریت کی تعبیر میں کبھی تسامح بھی ہو جاتا ہے چنانچہ بعض اہل حال نے خدا تعالیٰ کو موج کے ساتھ تشبیہ دی ہے چنانچہ کہا ہے۔

ز دریا موج گونا گوں برآمد　　　ز بیرنگی برنگ چوں درآمد

(دریا سے قسم قسم کی موجیں نکلتی ہیں بے رنگی سے مختلف رنگ ظاہر ہوتے ہیں)

مگر اس قسم کے اشعار اہل حال کی زبان پر کہتے ہیں۔ عوام کو بطور دعوے کے نقل کا بھی حق نہیں۔

کار بوزینہ نیست نجاری (بندر کا کام بڑھئی کا نہیں ہے)

اس کا قصہ یہ ہے کہ بندر نقال تو ہوتا ہی ہے ایک موقع پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں دو بڑھئی لکڑی چیر رہے تھے وہ حقہ پینے چلے گئے۔ یہ اس لکڑی پر بیٹھ گیا لکڑی میں کھونٹی لگی ہوئی تھی۔ اس کے بعد دو تین (یعنی خصیتین) اس لکڑی کے اندر آ گئیں۔ اس نے کھونٹی کو نکال دیا اس کے نکالنے سے دونوں تختے لکڑی کے آپس میں مل گئے۔ بس گئے دولت مند اب لگے تڑپنے اور چلانے بڑھئی نے آ کر خوب ڈنڈے سے خبر لی اب یہ مصرعہ ضرب المثل ہو گیا ایسی بات کے لئے جو اپنی کرنے کی نہ ہو اور اس میں دخل دے تو اس قسم کے اشعار اہل حال اور اہل ناز ہی کو کہتے ہیں ہر ایک کا کام نہیں۔

ناز　را روئے　بباید　ہمچو　ورد

(ناز کے لئے گلاب جیسے حسین چہرہ کی ضرورت ہے)

مثلاً باپ کی داڑھی ایک تو بچہ نوچے تو اس پر ملامت نہیں اور بچے کو دیکھ کر بڑا بھی نوچنے لگے تو اس پر جوتیاں پڑیں گی بڑے کو کیا حق ہے ناز کا بہر حال مسئلہ مظہریت و نیابت کی بناء پر حضورؐ کا فرمانا خدا تعالیٰ کا فرمانا ہے۔ آپ نے فرمایا گویا خدا تعالیٰ نے فرمایا، اس لئے طواف میں ابھر کر چلنا گو بظاہر خلاف عبدیت تھا مگر چونکہ اس کا حکم تھا اس لئے وہی عبدیت تھا۔

چوں طمع خواہند زمن سلطان دیں   خاک برفرق قناعت بعدازیں

(جب دین کا بادشاہ طمع کا اظہار کرے تو پھر ایسی قناعت پر خاک)

غرض اس وقت ایک مصلحت سے دوڑ کر چلنے اور سینہ ابھارنے کا حکم ہوا تھا۔ پھر مکہ بھی فتح ہو گیا اور پھر بھی اسی طرح حج وعمرہ ہوا مگر قیامت تک یہی حکم رہا کہ جو لوگ طواف کریں وہ اسی طرح اکڑ کر چلا کریں۔ پہلے تو تھا مصلحت سے پھر رہ گیا اظہار حکمت کے لئے گویا اس وقت کا استحضار مقصود ہے ایک وقت میں قوت دکھانے کی ضرورت تھی اور دوسرے وقت استحضار مقصود ہے۔

اسی طرح استسقاء میں ہے گو کہ مقصود حاصل ہو گیا مگر بھولنا اب بھی نہ چاہئے۔ پہلے طلب کے لئے تھا اور اب شکر کی غرض سے ہے اس کی تائید کلام اللہ میں اور بھی ہے اور وہ یہ آیت ہے۔

رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ.

اے ہمارے پروردگار جو آپ نے وعدہ کیا ہے اپنے رسولؐ کی معرفت وعنایت کیجئے اور ہم کو قیامت کے دن رسوا نہ کیجئے بلاشبہ آپ کا وعدہ خلاف نہیں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ جس امر کا وعدہ حق تعالیٰ فرما چکے ہیں وہ ملے ہی گا خدا تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتے پھر کیا معنی ہیں واتنا ما وعدتنا کے اس کی توجیہ بعض نے یہ کی ہے کہ ہم کو اس وعدہ کے اہل بنا دیجئے مگر یہ تاویل بعید ہے کیونکہ یہ تو مومن سے وعدہ ہے اور وہ تو اس وعدہ کا اہل ہے ہی پھر یہ کہ لاتخلف المیعاد کیوں بڑھایا گیا واقع یہ ہے کہ یہ تذکیر ہے نعمت کی اور عبدیت کی کہ جیسے وعدہ میں محتاج تھے وعدہ کے بعد بھی محتاج ہی رہے۔ بعد وعدہ کے بھی یونہی کہا کریں۔ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا (اور ہمیں وہ عطا فرمائیے جو آپ نے ہم سے وعدہ کیا ہے) اور اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ (بے شک آپ وعدہ خلافی نہیں کرتے)

بہر حال نصوص قرآنیہ اور احادیث موید ہیں اس کے کہ بعد عطا کے بھی طاعت کو نہ چھوڑا جائے جب نصوص سے ایک قاعدہ کلیہ نکل آیا تو اس کی ایک فرع یہ بھی ہے کہ بعد عزم کے اگر بارش بھی ہو جائے تو نماز استسقاء کو ترک نہ کیا جائے۔ پہلے طلب کے لئے تھی اب شکر کے لئے ہے حاصل یہ ہے کہ بعد عطا کے وہ فرد ہوگی شکر کی۔ اس لئے اس کو کیا کرنا چاہئے اور یہ بات میں عیدگاہ میں بیان کر چکا ہوں کہ سبب بارش نہ ہونے کا عصیان ہوتا ہے اس لئے گناہوں سے توبہ کرنا چاہئے اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ توفیق مرحمت فرماویں۔

اعراض کی صورت

یہ میں پہلے دن بیان کر چکا ہوں کہ استغفار کرنا اور گناہوں کا چھوڑنا اور اطاعت میں کوشش کرنا یہ ذریعہ ہے خدا تعالیٰ کی رحمت کے متوجہ ہونے اور بارش برسنے کا مگر افسوس ہے کہ کسی نے اصطلاح نہ کی نہ گناہوں سے توبہ کی بلکہ ایک کھلے واقعہ پر نظر کر کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم لوگوں نے کچھ بھی توجہ نہ کی۔

وہ کھلا واقعہ یہ ہے کہ جیسا مجمع اس سے پہلے ہوا تھا آج اس کا عشر عشیر بھی نظر نہیں آتا۔ صاحبو! یہ اعراض کی صورت ہے یا یوں سمجھ لیا جائے کہ بارش تو ہو ہی گئی اب اللہ میاں کی کیا ضرورت ہے ہاں بھائی جب کھانے پینے کو مل جاوے تو خدا کی کیا ضرورت۔ خیر کسی مسلمان کا یہ عقیدہ تو ہے نہیں مگر طرز عمل یہی ہو رہا ہے افسوس ہماری عقل پتھر کے برابر بھی نہیں۔

ایک پتھر کی حکایت ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کی کہ آپ کا گزر ایک موقع پر ہوا تو آپ نے ایک پتھر کو دیکھا کہ زار وزار رو رہا ہے آپ نے اس کا سبب پوچھا۔ اس نے کہا کہ جب سے مجھ کو یہ خبر ملی ہے کہ دوزخ کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے بوجہ خوف کے میں اس وقت سے رو رہا ہوں۔ آپ کو رحم آیا اور حق سبحانہ تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا کہ اسے تو دوزخ سے بچا ہی دیجئے آپ کی التجا قبول ہوگئی اور آپ نے اس پتھر کو بشارت دے دی اور آپ آگے تشریف لے گئے دوبارہ جو اس پر گزر ہوا تو دیکھا کہ وہ پتھر پہلے سے بھی زیادہ رو رہا ہے اس سے آپ نے فرمایا اب کیوں روتا ہے اس نے عرض کیا کہ یہ دولت تو مجھ کو رونے ہی سے ملی ہے اس کو اور زیادہ کیوں نہ کروں اس وجہ سے میں نے پھر رونا شروع کیا۔

افسوس کہ ہم میں اس پتھر کے برابر بھی سمجھ نہیں۔ چھوٹی موٹی دعا سے تو یہ ہوا کہ تھوڑا سا

مینہ برس گیا اور اس کو تھوڑا کہنا ہم لوگوں کے خیال سے ہے ورنہ تھوڑا کہاں ہے رحمت کا تو ایک قطرہ بھی بہت ہے، ہم کو تو چاہئے تھا کہ اور رغبت ظاہر کرتے مگر شاید یہ سمجھ لیا کہ اب کیا کرنا بارش تو ہو ہی گئی۔ افسوس سمجھتے ہی نہیں یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ میاں قبول تو کرتے ہی نہیں پھر کیا دعا مانگیں میں کہتا ہوں کہ محض حکم ہی سے دعا کرو افسوس ہمیں یہ خبر نہیں کہ مانگنے ہی سے ملا کرتا ہے حاکم مجازی کے یہاں درخواست دینے پر لیٹے رہو تو نوکری ملتی ہے صاحبو! ان کا ارادہ بھی ہمارے مانگنے پر متوجہ ہوتا ہے ان کا امر ہے کہ مانگو ہم دیں گے۔ تم مانگو گے تو ارادہ بھی ہوگا۔ اور وہ تو بے مانگے بھی دیتے ہیں مانگنے پر تو کیوں نہ دیں گے بلکہ اگر نہ ملے تب بھی مانگنا چاہئے۔

دیکھو! جس مریض کی طرف سے ناامیدی ہو جاتی ہے کہ دواء سے اچھا نہ ہوگا تو اس کا علاج ترک نہیں کرتے پھر بھی دوا کئے جاتے ہیں۔ اگر کوئی منع بھی کرے کہ میاں آرام تو ہوتا ہی نہیں پھر کیوں دوا کرتے ہو، تو یہی کہتے ہیں کہ واقعی ناامیدی تو ہے مگر کیا کریں طریقہ یہی ہے۔ دل نہیں مانتا پھر دعا میں ایسا کیوں نہیں کرتے کہ اگر نہ ملے تب بھی مانگے جائیں اور یہ سمجھیں کہ طریقہ یہی ہے ملنے کا ملے یا نہ ملے اور دوا میں تو دام بھی خرچ ہوتے ہیں۔ دعا میں کون سے پتھر ڈھونے پڑتے ہیں ہمیں تو شریعت نے آسان آسان باتیں بتلا دی ہیں اور شاید کسی کو یہ وسوسہ ہو کہ اللہ میاں بکثرت مانگنے سے ناراض ہوتے ہوں گے۔ سو سمجھ لو کہ وہ کسی کے مانگنے سے نہیں گھبراتے بلکہ خوش ہوتے ہیں۔ اس خیال کی اصطلاح کرنا چاہئے اور امید رکھنی چاہئے جی لگا کر دعا کرو۔ دل میں رغبت پیدا کر لو۔ بے رغبتی میں اندیشہ ہے اور لوگ تو بار بار مانگنے سے ناراض ہوتے ہیں مگر اللہ میاں بار بار مانگنے سے خوش ہوتے ہیں بلکہ نہ مانگنے سے ناراض ہوتے ہیں اللہ میاں کو اپنے اوپر قیاس نہ کرو۔ ان کی رحمت بڑی وسیع ہے۔ خوب دل لگا کر دعا کرو۔ انشاء اللہ ضرور بارش ہوگی۔ اس وقت اسی قدر بیان کافی ہے پچھلے مواعظ میں اس کے متعلق بیان وافی ہو چکا ہے۔ اب خوب گڑگڑا کر دعا کرو اور توبہ کرو اور آئندہ کے لئے اصلاح کی فکر کرو۔

وصلّی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقه سیّدنا محمد نبی الرّحمة و سیلة النّعمة وعلیٰ والہ واصحابه اجمعین ، واخر دعوانا ان الحمدللّٰه رب العٰلمین۔

فرمایا کہ شعبان کی پندرھویں رات کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اور راتوں میں تو پچھلے اوقات میں حق تعالیٰ آسمان دنیا پر نزول فرماتے ہیں اور اس شب میں شروع ہی سے نزول فرماتے ہیں۔ (کمالات اشرفیہ)

شب مبارک

یہ وعظ مکان حاجی مبارک حسین صاحب تھانہ بھون میں ۱۴ شعبان ۱۳۳۶ھ کو دو گھنٹہ پندرہ منٹ تک بیان فرمایا۔ اسے حکیم محمد یوسف صاحب نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

الحمدللّٰہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرورانفسنا ومن سیٔات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلاھادی لہ و نشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا و مولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ و بارک وسلم.

اما بعد فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْم. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم.
حٰمٓ وَالْكِتَابِ الْمُبِيْنِ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ فِيْهَايُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ. اَمْرًامِّنْ عِنْدِنَا اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ. (الدخان:۱تا۵)

(حٰمٓ قسم ہے اس کتاب واضح کی جس کو ہم نے لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر ایک برکت والی رات (یعنی شب قدر) میں اتارا ہے ہم آگاہ کرنے والے تھے اس (رات) میں ہر حکمت والا معاملہ ہماری پیشی سے حکم ہو کر طے کیا جاتا ہے ہم بوجہ رحمت کے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رب کی طرف سے ہوتی ہے۔ آپ کو پیغمبر بنانے والے)

تمہید: یہ آیتیں سورہ دخان کے شروع کی ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے اس کتاب کو برکت والی رات میں نازل کیا ہے۔ ایک قول پر اس کی تفسیر اس رات سے بھی کی گئی ہے جو قریب آنے والی ہے یعنی شعبان کی پندرھویں شب۔ لیکن اگر یہ تفسیر ثابت بھی نہ ہو تب بھی اس رات کی فضیلت کچھ اس آیت پر موقوف نہیں احادیث سے اس کی فضیلت ثابت ہے۔ مگر یہ بات طالب علمانہ باقی رہی کہ اگر یہ تفسیر ثابت نہ ہو تو پھر لیلۃ مبارکۃ سے کیا مراد ہوگا۔ سو دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے لیلۃ القدر مراد ہے۔ اسی کو لیلۃ مبارکۃ بھی فرمادیا گیا۔
بہرحال اس آیت کی تفسیر قریب آنے والی شب، شب برأت ہے جو شعبان کی

پندرھویں رات ہے جوکل کا دن گزر کر آنے والی ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس رات کے کچھ فضائل کا اور ان منکرات کا جو آج کل اس میں اختیار کئے جاتے ہیں ذکر کر دیا جاوے۔

لیلۃ المبارک ولیلۃ القدر

سو اس تفسیر محتمل پر حق تعالیٰ نے قسم کھا کر ارشاد فرمایا ہے کہ ہم نے کتاب مبین (قرآن) کو اس برکت والی رات میں نازل کیا۔ اس واسطے کہ ہم منذر یعنی ڈرانے والے تھے۔ اسی انداز کے لئے قرآن نازل فرمایا۔ آگے اس رات کے بابرکت ہونے کی علت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اس رات کی شان یہ ہے کہ اس میں فیصلہ کیا جاتا ہے ہر امر حکمت والے کا کہ وہ ہمارے پاس سے ہوتا ہے اور حکیم کی قید واقعی ہے احترازی نہیں کیونکہ حق تعالیٰ کے تمام امور باحکمت ہی ہیں ان میں کوئی بے حکمت نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ تمام امور کا فیصلہ اس رات میں ہوتا ہے یا یوں کہو کہ **کل امر حکیم** سے مراد امور عظیم الشان ہیں یعنی بڑے بڑے کاموں کا فیصلہ اس رات میں ہوتا ہے۔ باقی چھوٹے امور تو عرفاً بڑے امور کے ذکر سے وہ خود مفہوم ہو گئے پس بڑے امور اصالۃً اور چھوٹے امور تبعاً غرض سب امور آیت میں داخل ہو گئے۔ اب یہ شبہ رفع ہو گیا کہ روایات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جملہ امور کا فیصلہ ہو جاتا ہے اور یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ معظم امور فیصل ہوتے ہیں۔ وجہ رفع یہ ہے کہ چھوٹے امور بڑوں کے تابع ہو کر فہم میں آ ہی جاتے ہیں۔

مشہور تفسیر اس آیت کی اکثر کے نزدیک یہ ہے کہ **لیلة مبارکه** سے مراد لیلۃ القدر ہے، شب برأت مراد نہیں کیونکہ دوسرے موقع پر ارشاد ہے **انا انزلناه فی لیلة القدر** کہ ہم نے قرآن لیلۃ القدر میں نازل کیا اور یہاں فرما رہے ہیں کہ ہم نے لیلۃ مبارکہ میں نازل کیا اور یہ ظاہر ہے کہ نزول سے مراد دونوں جگہ نزول دفعی ہے تدریجی نہیں کیونکہ وہ تو ۲۳ سال میں ہوا اور نزول دفعی ایک ہی مرتبہ ہوا ہے اس لئے لیلۃ مباکہ سے مراد لیلۃ القدر ہوگی۔ یہ قرینہ تو یہ ہے اس بات کا کہ یہاں بھی لیلۃ القدر ہی مراد ہے لیکن ایک قول بعض کا یہ بھی ہے کہ لیلۃ مبارک سے مراد شب برأت ہے۔

باقی رہا یہ اعتراض کہ اس سے لازم آتا ہے کہ نزول دفعی دو مرتبہ ہو تو اس کی توجیہ یہ

ہے کہ نزول دفعی دو مرتبہ بھی اس طرح ہوسکتا ہے کہ ایک رات میں حکم نزول ہوا اور دوسری میں اس کا وقوع ہوا۔ یعنی شب برأت میں حکم ہوا کہ اس دفعہ رمضان میں جو لیلۃ القدر آئے گی اس میں قرآن نازل کیا جائے گا پھر لیلۃ القدر میں اس کا وقوع ہوگیا اور یہ بات کلام میں شائع ذائع ہے کہ قرب کو وقوع کے حکم میں کر دیتے ہیں۔ مطلب یہ کہ انزلناہ فی لیلۃ القدر میں مراد حقیقی نزول ہے کہ وہ لیلۃ القدر میں ہوا ہے اور انا انزلناہ فی لیلۃ مبارکۃ میں حکمی نزول ہے کہ شب برأت میں ہوا ہے اور دونوں راتیں ہیں قریب قریب اس لئے قرب نزول کو نزول کے حکم میں کر دیا ہو۔ بہر حال ظاہر تو یہی ہے کہ لیلۃ مبارک سے مراد شب قدر ہے مگر احتمال اس کا بھی ہے کہ شب برأت مراد ہو مگر جہاں تک اتفاق ہوا اور جو کتابیں نظر سے گزری، ان میں کوئی حدیث مرفوع اس بارہ میں نظر سے نہیں گزری۔ در منثور میں بروایت ابن جریر ابن المنذر و ابن ابی حاتم عکرمہ سے یہ تفسیر منقول ہے۔ البتہ شب برأت کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ اس میں تمام امور جیسے موالید و وفیات و رفع اعمال و نزول ارزاق فیصل ہوتے ہیں اس سے بعض سلف نے یہ سمجھ لیا ہے کہ لیلۃ مبارکہ سے مراد یہی رات مراد ہے لیلۃ القدر مراد نہیں ورنہ اس رات کے برابر اس میں بھی واقعات کا فیصلہ ہونا لازم آئے گا۔ تو دو راتوں میں فیصلہ ہونے کے کیا معنی۔

دوسرے یہ کہ واقعات کا تو شب برأت میں فیصلہ ہونا احادیث سے ثابت ہے۔ وہ کون سے واقعات ہیں جن کا فیصل ہونا شب قدر میں باقی رہا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لیلۃ مبارکہ سے مراد شب برأت ہی ہے۔ پھر یہ کہ شب برأت میں ایک سال کے واقعات کا فیصل ہونا حدیثوں میں آیا ہے اور شب قدر سال گزرنے سے پہلے رمضان میں آ جاتی ہے تو اس میں کیا مکرر فیصلہ ہوتا ہے۔

جواب یہ ہے کہ یہاں دو صورتیں نکلتی ہیں کیونکہ عادۃً ہر فیصلہ کے دو مرتبے ہوتے ہیں ایک تجویز ایک نفاذ۔ پس یہاں بھی یہی دو مرتبے ہوسکتے ہیں مطلب یہ ہے کہ تجویز تو شب برأت میں ہو جاتی ہے اور نفاذ لیلۃ القدر میں ہوتا ہے اور ان میں کسی قدر فیصل ہونا بعید نہیں تجویز کو قدر کہتے ہیں اور حکم کے نافذ کر دینے کو قضا کہتے ہیں کہ شب برأت میں تجویز ہوتی ہوا اور لیلۃ القدر میں اسی کا نفاذ ہوتا ہو۔ اس تقریر سے سارے اشکالات کا جواب ہوگیا غرض آیت میں

لیلۃ مبارکہ سے مراد جو بھی ہو لیکن احادیث سے تو اس رات کا بابرکت ہونا معلوم ہوتا ہی ہے۔

کید نفس

یہ نعمت ہے خدا تعالیٰ کی، اس کی قدر کرنا چاہئے۔ دنیا میں اگر کسی ایسے کام کی خبر مل جاتی ہے جس میں منافع ہوں تو عقلاً اس کی کیسی قدر کرتے ہیں اور ذرا سے نفع کی بھی چیز ہو اس کو احتیاط سے رکھ چھوڑتے ہیں کہ کسی موقع پر کام آئے گی۔ مثل مشہور ہے۔

داشتہ آید بکار (رکھی ہوئی چیز کام آتی ہے)

مجھ کو ایک واقعہ یاد آیا جب میں حج کو گیا تھا تو لکھنؤ کی ایک ماما بھی حج میں تھیں جو کہ راستہ میں میرا کھانا پکاتی تھیں۔ وہ مدینہ طیبہ بھی گئی تھیں اور انہوں نے بڑی ہمت کی تھی کہ پیدل راستہ چل کر گئی تھیں۔ جب مدینہ طیبہ سے واپس آئیں تو ایک پتھر میرے سامنے پیش کیا میں نے کہا کہ یہ کا ہے کے واسطے لائیں تو کہنے لگیں کہ مدینہ شریف سے نکل کر ایک پہاڑ پر یہ پتھر نظر آیا۔ میں نے خیال کیا کہ بڑا اچھا ہے اس کو لے چلو۔ چنانچہ لے آئی۔ میں نے کہا غضب ہے کتنی دور سے بوجھ لائی ہو یہ تو دو حیثیت سے متبرک ہے ایک تو یہ کہ مشقت کا ہے دوسرے مدینہ طیبہ کا ہے سو بنا پتھر کے اٹھانے کی یہ تھی کہ کام کی چیز تھی۔ بلا فرق ادنیٰ اعلیٰ سب میں کام کی چیز کی قدر ہوتی ہے۔

جب ہم دنیا کی چیزوں میں ذرا ذرا سی چیز کی قدر کرتے ہیں پھر تعجب ہے کہ خدا اور رسول کوئی قدر کی چیز بتلائیں اس کو ضائع کر دیا جائے۔ چنانچہ ہمیں ان تاریخوں میں جاگنے کی بہت کم توفیق ہوتی ہے۔ خصوصاً طلباء کو وہ تو یوں کہہ کر ختم کر دیتے ہیں کہ اس رات کی عبادت کے علاوہ اور بھی تو بہت سے کام ثواب کے ہیں سو وہ ابھی۔ اللہ میاں کے یہاں استغفار بھی تو ہے وہی پڑھ لیں گے یا اور کوئی نیک کام کر لیں گے اپنے دل میں اس قسم کی تاویلیں کر لیتے ہیں اکثر طالب علمی میں یہ مرض پیدا ہو جاتا ہے کہ مستحبات کی قدر نہیں رہتی جب تک میں نے منیۃ المصلی نہیں پڑھی تھی تو نفلیں پڑھا کرتا تھا۔ جب منیہ پڑھی اور اس میں میں نے مستحب کی تعریف پڑھی تو نفس کی قید میں آ کر یہ خیال ہوا کہ اگر امر مستحب نہ کریں گے تو کچھ مواخذہ تو ہوگا ہی نہیں۔ اس لئے بہت سے ایسے مستحبات ترک ہونے لگے واقعی ہماری یہ حالت ہے۔

واعظان کیں جلوہ برمحراب ومنبری کنند　　چوں بخلوت می رسند ایں کار دیگر کنند
مشکلے دارم زدانشمند مجلس باز پرس　　توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتری کنند

نفس میں عجیب عجیب کید ہیں۔ حتیٰ کہ یہ جو کچھ میں بیان کر رہا ہوں تعجب نہیں کہ اس میں بھی نفس کی شرارت ہو۔ احتمال ہے کہ اس میں بھی نفس نے کید کر رکھا ہو کہ اپنی کوتاہیاں ظاہر کر کے اپنے صدق کو ظاہر کیا جا رہا ہے۔ نفس سے کسی وقت مطمئن نہ ہونا چاہئے۔ نفس کی تو یہ حالت ہے۔

نفس اژدہاست او کے مردہ است　　از غم بے آلتی افسردہ است

اس کا کشتہ اور گرفتار کرنا ہر ایک کا کام نہیں۔ یہ مکار شیطان سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ اس کو بھی نفس ہی نے خرابی میں ڈالا تھا۔ وہ بالذات تو بدذات نہیں تھا نفس ہی کے کید میں آ کر بدذات ہوا۔ تو یہ شیطان کا بھی باپ ہوا۔ اسی لئے یوسف علیہ السلام حالانکہ نبی ہیں فرمارہے ہیں **ان النفس لامارة بالسوء الا مارحم ربی** یعنی اصل بات تو یہی ہے کہ نفس فی ذاتہ امارہ بالسوء ہے۔ مگر جس کو اللہ میاں اپنی رحمت سے محفوظ رکھیں جیسے انبیاء وہ مستثنیٰ ہیں اگر عوارض کی وجہ سے نفس اپنے کیود سے باز بھی رہے، تو عوارض کے اٹھ جانے پر پھر وہی حالت ہو گی اس لئے نفس کا کید مثل فطرت کے ہو گیا چاہے انسان مقامات ولایت میں بڑی دور تک بھی پہنچ جائے مگر نفس سے نجات نہیں ہے اس سے تو ہمیشہ سوء ظن ہی چاہئے کہ احتیاط سوء ظن ہی ہے چنانچہ مشہور ہے الحزم سوء الظن۔

اس کی تفسیر میں ہمارے حضرت نے فرمایا تھا کہ بنفسہ یعنی دانائی و احتیاط یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس سے سوء ظن ہی رکھے کسی وقت مطمئن نہ ہو ہمیشہ کھٹکتا رہے اگرچہ حکماء نے اس جملہ کے دوسرے معنی لئے ہیں وہ یہ کہ انسان کو کسی پر اعتماد نہ چاہئے ہر شخص پر بدگمان رہے احتیاط رکھے چاہے وہ کیسا ہی مخلص دوست ہو۔ اور معاملہ کے اعتبار سے یہ بھی صحیح ہے مگر عارفین یہ کہتے ہیں کہ دوسروں سے تو حسن ظن رکھے اور اپنے نفس سے سوء ظن رکھے۔

چنانچہ یوسف علیہ السلام سے زیادہ کون ہو گا مگر وہ پھر بھی اپنے نفس سے بدگمان تھے اور جب اکابر نفس سے احتیاط کرتے رہے حالانکہ نفس ان سے بعید تھا تو ہم لوگوں سے تو نفس بہت ہی قریب ہے ہم کو بہت احتیاط چاہئے خصوص طالب علموں کی تو یہ حالت ہے کہ جہاں کسی عمل

کے استحباب کا حکم معلوم ہوا بس فضائل کو چھوڑ دیا جہلاء سو مستحبات کو کر بھی لیتے ہیں مگر لکھے پڑھے بالکل نہیں کرتے الا ماشاء اللہ۔ بس یہ نفس کا بڑا کید ہے جس نے اہل علم کو بہت سی برکات سے محروم کر رکھا ہے اس سے بچنا چاہئے اور مستحبات و فضائل کی بھی بے قدری نہ کرنا چاہئے۔

ایک نعمت عظمیٰ

چنانچہ یہ رات جو آنے والی ہے یہ بھی بہت قابل قدر ہے اس سے محروم نہ رہنا چاہئے بلکہ اگر لیلۃ القدر باعتبار معنی لغوی کے لیا جاوے تو ہر رات لیلۃ القدر اور قابل قدر ہے جیسا کسی نے کہا ہے۔

اے خواجہ چہ پرسی زشب قدر نشانی ہر شب شب قدر است اگر قدر بدانی

صاحبو! ہر روز نعمت ہے اور ہر رات دولت ہے حدیث شریف میں ہے کہ ہر روز نصف شب کے بعد خدا تعالیٰ آسمان دنیا پر تجلی فرما کر بندوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں دنیا ہمارا گھر ہے اور زمین فرش ہے اور گویا آسمان اول دنیا کی چھت ہے اور سقف بیت جز و بیت کہلاتی ہے تو گویا حق سبحانہ تعالیٰ ہمارے گھر تشریف لاتے ہیں اور ہم کو یہ شرف نصیب ہوتا ہے کہ۔

امروز شاہ شاہاں مہماں شدہ است مارا جبریل باملائک درباں شدہ است مارا

غرض شہنشاہ ہر روز ہمارے گھر تشریف لاتے ہیں اور متوجہ ہیں اور وعدے فرماتے ہیں۔ ایک اور لطف دیکھئے اگر ہم کسی دوست کے دروازے پر جائیں خصوصاً مریدین کے دروازہ پر کہ وہ بھی اہل اللہ کے نزدیک ان کے دوست ہی ہیں خادم نہیں ہیں جیسا آج کل مغرور پیروں نے خیال کر رکھا کہ مریدین کو اپنا خادم سمجھتے ہیں اور وہ گھر والے ہم سے نہ بولیں تو یقیناً ان سے بیزار ہو جائیں اور اگر بیزار بھی نہ ہوں تو اس قدر شکایت ضرور کریں گے کہ ہم سے بولے کیوں نہیں اور اگر وہ سوتے ہوں تو کہیں گے ایسا بھی کیا سونا ہے کہ ہمارے آنے کا کچھ بھی خیال نہ کیا پچا اس جرم قائم ہو جائیں گے خصوص اگر کہلا بھی بھیجا ہو کہ ہم تمہارے گھر آدھی رات کے بعد آئیں گے تو اس صورت میں ان مریدوں کو سونے کی بھی اجازت نہ ہوگی۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ ایسے پیروں کو اپنے حقوق پیش نظر رہتے ہیں اگر چہ وہ حقوق وہمی ہی کیوں نہ ہوں اور واقعی اہل اللہ جو ہیں ان کی حالت دیکھئے حضرت حاجی صاحب فرماتے

ہیں کہ میرے پاس جولوگ آتے ہیں ان کے قدموں کی زیارت کو موجب نجات جانتا ہوں کیونکہ وہ یقیناً اچھے ہیں اوران کے اچھے ہونے کی میری پاس دلیل ہے۔ وہ یہ کہ وہ میرے ساتھ باوجود میرے ناچیز ہونے کے حسن ظن رکھتے ہیں۔

غرض ہماری تو یہ حالت ہے کہ حقوق وہمیہ کی کمی پر بھی ناراض ہوجاتے ہیں اور حق سبحانہ تعالیٰ کو خیال کیجئے کہ باوجود اس کے ان کے حقوق واقعی ہیں مگر آپ کی تشریف آوری کی خبر دینے کے بعد بھی تشریف لاکر ہم کو سوتا ہوا دیکھ کر بھی ناراض نہیں ہوتے اور یہ فرماتے ہیں کہ اس بندہ نے ایک مستحب ہی تو ترک کیا ہے۔ اللہ میاں ہم کو بے مروتی کا الزام بھی نہیں دیتے کیا ٹھکانا ہے اس رحم کا (خلاصہ مطلب اس تقریر کا یہ ہے کہ اگر ہم کسی دوست یا مرید کے مکان پر جائیں اور وہ نہ بولے تو ہم کتنے برہم ہوں اور حق تعالیٰ ہمارے گھر روزمرہ تشریف لاتے ہیں اور ہم اس وقت پڑے سوتے رہتے ہیں مگر وہ ہماری اس حالت کو دیکھ کر ناراض نہیں ہوتے) اس عنایت کا مقتضا تو یہ تھا کہ ہم سب کچھ کرتے اس واسطے کہ جو آقا کبھی کچھ نہ کہتا ہو اس کے سامنے تو پگھل جانا چاہئے۔ تو گویا ہر شب شب قدر اس معنی کر ہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ ہر روز ہماری طرف متوجہ برحمت ہوتے ہیں۔ اور جو رات آنے والی ہے (پندرھویں شب شعبان) اس کے تو خاص فضائل آئے ہیں اس معنی کر اس کو مبارک کہنا درست ہے گو احادیث میں مبارک کا لفظ نہیں اور قرآن میں اگرچہ آیا ہے مگر یہ تفسیر خود محتمل ہے مگر یہ احتمال اس لقب میں مضر نہیں کیونکہ برکت کی حقیقت ہے کثرت نفع۔ اگر کسی چیز کا کثیر النفع ہونا ثابت ہوجائے تو اس کو مبارک کہنا صحیح ہوگا۔ پس احادیث میں جو فضائل اس رات کے مذکور ہوئے ہیں جب ان سے کثیر النفع ہونا معلوم ہوتا ہے تو اس کو مبارک کہنا صحیح ہوگا گو مبارک کا لفظ نہ وارد ہوا ہو۔

برکت کی قسمیں

اب برکت کی مناسبت سے اس کے متعلق کچھ ضروری بیان کرتا ہوں وہ یہ کہ اس کی دو قسمیں ہیں ایک دنیوی ایک اخروی آج کل مدعیان ترقی کو ہمارا ممنون ہونا چاہئے کہ منافع دنیوی کی تحصیل سے منع نہیں کرتے اتنا فرق ہے کہ ہم اس کو برکت سے تعبیر کرتے ہیں اور وہ ترقی کے لفظ سے اگر وہ اسی لفظ کو اختیار کر لیتے تو اچھا تھا ترقی کے لفظ کو اختیار کر کے

انہوں نے علماء کو اپنا مخالف بنالیا کیونکہ انہوں نے اس کے معنی میں کوئی قید نہ رکھی۔ مگر ہماری مخالفت ان سے ایسی ہے جیسے باپ کو بچہ کے ساتھ ہوتی ہے کہ جب بچہ بے راہ روی اختیار کرتا ہے تو باپ اس کا مخالف ہوتا ہے اور اس کو مارتا بھی ہے یا جیسے ماں بیمار بچہ کی مخالف ہوتی ہے کہ بچہ اپنی طبیعت کے موافق غذائیں مانگتا ہے مگر ماں اس کو نہیں دیتی بلکہ بسا اوقات ضد کرنے پر اس کو مارتی بھی ہے اور وجہ اس کی یہ ہوتی ہے کہ ان دونوں مثالوں میں دو قسم کے ضرر متعارض ہیں ایک اہون اور ایک اشد ماں باپ اشد الضرر میں سے بچانے کے لئے اہون کو اختیار کرتے ہیں اور یہ قاعدہ عقلیہ ہے کہ جس جگہ دو قسم کے ضرر جمع ہوں ایک اشد اور دوسرا اہون تو اہون کو اختیار کر لینا چاہئے۔

مثلاً باپ نے جو بے راہی کرنے پر بچہ کو مارا تو یہ بھی بچہ کے حق میں ایک درجہ کا ضرر ہے اور دوسرا ضرر یعنی بے راہی اس سے اشد ہے کیونکہ اگر بچہ بے راہی اختیار کئے رہا تو اس کا انجام بہت ہی برا ہوگا۔ مثلاً وہ پڑھتا نہیں یا بری صحبت میں بیٹھتا ہے کہ اس سے آئندہ اس کو بہت ضرر ہوگا اور یہ ضرر پہلے سے اشد ہے اس لئے باپ نے اہون کو اختیار کیا تا کہ بچہ اشد الضررین سے محفوظ رہے۔

اسی طرح ماں جو بیمار بچہ کو مختلف غذاؤں سے روکتی ہے حالانکہ یہ بچہ کے حق میں ایک گونہ ضرر ہے مگر ماں اس کو اختیار کرتی ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ یہاں بھی دو قسم کے ضرر جمع ہیں ایک اشد اور دوسرا اہون۔ اہون ضرر تو غذا سے روکنا ہے اور اشد ضرر وہ ہے جو غذا کے دینے سے ہوگا وہ یہ کہ اگر بچہ کو اس کی منشا کے موافق غذا دی جائے گی تو بیماری بڑھے گی اور ہلاکت تک نوبت پہنچے گی۔ اس لئے وہ اہون الضررین کو اختیار کرتی ہے۔

اسی طرح ہم اس کو مانتے ہیں کہ بعض مشورے ہمارے ایسے ہیں کہ ان سے دنیا کا ایک گونہ ضرر ہے مگر چونکہ وہ ضرر اہون ہے کہ جو آزاد چھوڑ دینے پر پیش آنے والا ہے اس لئے اشد الضررین بچانے کے لئے اہون کو اختیار کیا گیا ہے اور وہ ضرر اشد کیا ہے وہ دین کی خرابی ہے کہ اس سے زیادہ کوئی ضرر نہیں اگر اس کا نام مخالفت ہے تو باپ اور ماں اور استاد سب مخالف ہیں اور وقع میں اہون کو اختیار کرنا تو اصلاح ہے مدعیان ترقی نے ہمیں خواہ مخواہ

اپنا مخالف سمجھ لیا ہے ہم کو ماحی ترقی کہتے ہیں مگر واقع میں ہم ماحی نہیں۔ ہم تو ایسی ترقی کے حامی ہیں کہ سات پشت تک اس کی برکت چلی جاوے اور ان کے پاس اپنے دعوے پر کہ ان کی ترقی حقیقی ترقی ہے کوئی دلیل نہیں اور ہمارے پاس قرآن وحدیث سے دلیل موجود ہے مگر ہم ان الفاظ سے بچتے ہیں جو قرآن وحدیث میں نہیں ہیں اور اس لفظ کو اختیار کرتے ہیں جو قرآن میں ہے۔ وہ کیا ہے، برکت ہے۔ جس کی حقیقت ہے کثرت خیر۔

اگر کوئی اعتراض کرے کہ تم قرآن وحدیث سے تو صرف ترقی دین کی ثابت کروگے ترقی دنیا کا ثبوت کہاں ہے؟

جواب یہ ہے کہ ہم ترقی دنیا کو بھی قرآن وحدیث ہی سے ثابت کرتے ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ احادیث میں دنیا کے لئے بھی لفظ برکت اختیار کیا گیا ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت انس ؓ کے لئے ان کے مال اور اولاد میں برکت ہونے کی دعا فرمائی تھی اس سے ثابت ہوا کہ ایک صحابی کو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ترقی دنیا کی دعا دی تھی۔ اب لوگ خوش ہوئے ہوں گے کہ یہ بات تو ہمارے مطلب کی بتلادی۔

تو خوب سمجھ لیجئے کہ منافع دنیا کے دو درجے ہیں ایک وہ کہ جس میں ضرر نہ ہو دین کا اور دوسرا وہ کہ جس میں ضرر ہو دین کا۔ مولوی پہلی ترقی کے حامی اور دوسری کے ماحی ہیں جیسا کہ گورنمنٹ کو باوجودیکہ حامی ترقی دنیا کہا جاتا ہے اور گورنمنٹ ہی کا قانون ہے کہ ڈکیتی بڑا جرم ہے حالانکہ وہ بھی ترقی ہے اور ترقی بھی کیسی کہ ایک رات میں آدمی مالا مال ہو جاوے مگر گورنمنٹ اس ترقی کی حامی نہیں بلکہ ماحی ہے۔

صاحبو! وہی قاعدہ تو مولویوں نے اختیار کیا ہے کہ بعضی ترقی کے حامی ہیں اور بعضی کے ماحی یعنی جو ترقی مضر دین نہ ہو اس کے حامی ہیں اور جو مضر ہو اس کے ماحی ہیں۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ ایک ہی بات اگر مولوی کریں تو وہ مردود ہوں اور وہی بات گورنمنٹ کرے تو مقبول ہو۔ بات تو دونوں جگہ ایک ہی ہے مگر حیرت ہے کہ ایک جگہ مقبول ہو اور دوسری جگہ مردود ہو جائے۔

یہ تو ایسا ہی ہے جیسے دو طالب علم معقولی تھے اور تھے دونوں حقیقی بھائی بھائی۔ ایک نے

دوسرے کو ماں کی گالی دی۔ کسی نے کہہ دیا کہ وہ تیری بھی تو ماں ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میں اس کو اس حیثیت سے گالی دیتا ہوں کہ یہ اس کی ماں ہے اس حیثیت سے نہیں دیتا کہ میری ماں ہے۔ یہی صورت یہاں بھی ہے کہ بات تو ایک ہی ہے مگر مولوی کی طرف منسوب ہونے سے تو مردود اور گورنمنٹ کی طرف منسوب ہونے کی حیثیت سے مقبول غرض حدیث سے ثابت ہے کہ دنیوی ترقی بھی ایک درجہ میں مطلوب ہے خیر یہ تو یہاں بطور جملہ معترضہ کے آ گیا ہے۔

اب میں پہلے ہی مضمون کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ آیت میں اس شب کی علی سبیل الاحتمال اور حدیث میں علی سبیل الجزم برکت کی تفصیل بھی فرماتے ہیں چنانچہ آیت میں ارشاد ہے کہ فیھا یفرق کل امر حکیم یعنی یہ بھی ایک برکت ہے کہ اس شب میں تمام امور کا فیصلہ ہو جاتا ہے تمام امور میں سب چیزیں آ گئیں صرف نماز روزہ ہی نہیں بلکہ دنیوی امور بھی اس میں داخل ہیں۔ مثلاً اس کھیت میں اتنا پیدا ہوگا جنگ ہوگی فتح ہوگی۔ اتنا پانی برسے گا غرض سب امور دنیہ کا انتظام ہوتا ہے یہ سب انتظام برکت میں داخل ہو گیا سو ایک فرد تو یہ ہے برکت کی۔

دوسری برکت دینی ہے جو احادیث میں مذکور ہے کہ جب شعبان کی پندرھویں رات ہوتی ہے تو حق تعالیٰ اول شب سے آسمان دنیا پر نزول فرماتے ہیں۔ یہ خصوصیت اس رات میں بڑھی ہوئی ہے یعنی اور راتوں میں تو پچھلے اوقات میں نزول ہوتا ہے اور اس شب میں شروع ہی سے نزول فرماتے ہیں یہ بھی وجوہ برکت میں سے ایک وجہ ہے برکت کی۔ اس کی قدر وہ کرے گا جس میں مادہ محبت کا ہو اس کو ایک ایک لحہ غنیمت معلوم ہوگا وہ تو محبوب کی طرف سے پانچ منٹ بڑھا دینے کو بھی بہت غنیمت سمجھے گا یہاں دو ثلث شب کے بڑھ گئے یہاں اضافہ اصل سے بھی زیادہ ہو گیا۔ مجموعہ دونے سے بھی بڑھ گیا۔

شب کا افضل حصہ

اب بات قابل غور یہ ہے کہ کون سے حصہ شب میں جاگنا زیادہ افضل ہے اس کا فیصلہ قرآن سے بھی ہوتا ہے اور حدیث سے بھی کیونکہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اخیر شب میں جاگنا اشد ہے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

اِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً

بے شک رات کے جاگنے میں دل اور زبان کا خوب میل ہوتا ہے اور بات خوب ٹھیک نکلتی ہے۔

اور ناشئۃ اللیل سونے کے بعد متحقق ہوتا ہے (کذا فی الجلالین القیام بعد النوم) جب وہ اشد ہوا کیونکہ اس کے اختیار کرنے سے نفس پر مشقت کا اثر زیادہ ہوتا ہے تو وہی افضل ہوگا آخر سورت سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشد ہے چنانچہ فرماتے ہیں **علم ان لن تحصوہ** اس کو معلوم ہے کہ تم ضبط نہیں کر سکتے۔

اور عدم اعصاء آخر شب میں ہوسکتا ہے۔ یہ تو قرآن سے معلوم ہوا حدیث سے بھی اس کا فضل ہونا معلوم ہوتا ہے چنانچہ آخر شب کی فضیلت میں بکثرت احادیث وارد ہیں اور قواعد عقلیہ بھی اس پر شاہد ہیں کیونکہ وہ وقت سونے کا ہے اور سونا ترک کرنا مشکل ہے اور ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص رات کو اٹھ کر التجا کرتا ہے تو میں اس سے بہت خوش ہوتا ہوں اس لئے کہ میری وجہ سے اپنی بیوی اور گرم بستر کو چھوڑ دیا اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اخیر حصہ رات کا افضل ہے۔

لیکن اگر کسی کو اس حصہ میں جاگنا دشوار ہو وہ اول ہی حصہ میں کچھ کر لے کیونکہ اور راتوں میں تو خدا تعالیٰ کا نزول اخیر شب میں ہوتا ہے اور اس رات میں اول ہی شب سے نزول ہو جاتا ہے اس لئے جن لوگوں کو اخیر شب میں عبادت کرنا دشوار ہو وہ اول ہی شب میں عبادت کر کے فضیلت حاصل کر لیں جس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ عشاء ہی تک عبادت میں مشغول رہیں اور یہ نفس کا ایک کید ہے کہ جہاں آدمی ثواب کا قصد کرتا ہے تو وہ اس کو حیلہ سے روکنا چاہتا ہے چنانچہ اس موقعہ پر وسوسہ ڈالتا ہے کہ اخیر شب میں زیادہ فضیلت ملے گی اس لئے اخیر ہی میں جاگنا چاہئے، اول میں جاگنے سے کیا فائدہ سو اول شب سے تو یوں محروم رہے جب اخیر شب ہوئی اٹھا نہ گیا۔ دونوں طرف سے محرومی ہوئی پوری کے پیچھے لگ کر ادھوری بھی گئی۔

نفس کا خفی کید

ایک خفی کید نفس کا بعض کے لئے اس صورت میں یہ بھی ہے کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ ممتاز ہو کر رہے اور اس میں اس کو حظ ہوتا ہے اس لئے بعضے آدمی یہ چاہتے ہیں کہ اخیر شب ہی جاگیں اور نیت یہ ہوتی ہے کہ اس امتیاز میں حظ ہو۔ سو یہ عجب ہے اور عجب ایسی بری چیز ہے

کہ جس وقت کوئی شخص اپنی نظر میں پسندیدہ ہوتا ہے اس وقت خدا کی نظر میں ناپسندیدہ ہوتا ہے سلف نے تو معاشرت تک میں اس کا اہتمام کیا ہے کہ اپنی نظر میں پسندیدہ نہ ہوں۔

چنانچہ حضرت علیؓ کا واقعہ ہے کہ آپ نے ایک بار کرتہ پہنا اس کی آستینیں خوبصورت معلوم ہوئیں آپ نے انکو فوراً تراش ڈالا کہ بدشکل ہو جاویں آج کل اگر کوئی ایسا کرے تو مجنونوں میں شمار ہوگا اس کو دیوانہ کہیں گے مگر واقعی بات یہ ہے کہ ؎

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد　　　مرعسس رادید درخانہ نہ شد

لوگ اہل اللہ پر ہنستے ہیں وہ بھی ایک دن ان پر ہنسیں گے چنانچہ نوح علیہ السلام نے لوگوں کے ہنسنے پر فرمایا تھا۔

اِنْ تَسْخَرُوْ اَمِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ

اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ہم تم پر ہنستے ہیں جیسا تم ہم پر ہنستے ہو اور اس وقت ہنسنے والوں کی یہ حالت ہوگی۔

فسوف تری اذا انکشف الغبار　　　افرس تحت رجلک ام حمار

عنقریب تم دیکھ لوگے جب کہ غبار ہٹ جائے گا کہ تمہارے نیچے گھوڑا ہے یا گدھا۔

ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا تھا کہ ہم میں اور صحابہؓ میں کیا فرق ہے انہوں نے فرمایا کہ اگر صحابہؓ آج کل لوگوں کو دیکھتے تو وہ ان کو کافر سمجھتے اور یہ ان کو پاگل اور سڑی خیال کرتے واقعی آج تو کوئی کرتہ پھاڑ کر پہن لے تو لوگ کہیں گے کہ کیا پاگل ہو گئے حضرت علیؓ نے یہ اس لئے کیا تھا کہ اپنی نظر میں اچھے نہ معلوم ہوں۔

حضرت عمرؓ کو کسی نے مسلمانوں کے گھروں میں پانی بھرتے ہوئے دیکھا تو پوچھا کہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں فرمایا کہ میں اس وقت اپنے نفس کا علاج کر رہا ہوں اس وقت دو شخص ہرقل کی طرف سے میرے پاس آئے تھے اور میرے عدل کی تعریف کی جس سے نفس خوش ہوا میں نے اس کا علاج کیا ہے۔

اس پانی بھرنے پر ایک واقعہ یاد آیا۔ گنگوہ میں ایک حافظ علی حسن تھے حضرت مولانا گنگوہی سے بیعت تھے۔ نماز تو ایسی طویل عریض پڑھتے تھے کہ دیکھی ہی نہیں۔ آج کل تو

ذراسی عبادت کر کے ولایت پر رجسٹری ہو جاتی ہے خواہ جعلی ہی رجسٹری کیوں نہ ہو مگر وہ اس سے بھی محفوظ تھے لیکن چونکہ وہ عالم نہ تھے اس لئے اتنی کمی تھی کہ امامت میں ہی ایسی ہی طویل عریض نماز پڑھتے تھے جس سے لوگ گھبرا جاتے تھے یہ واقعی غلطی تھی مگر شاید وہ مکلّف بھی نہ ہوں کیونکہ بھولے بہت تھے۔

چنانچہ ایک دفعہ ترکاری لینے گئے کنجڑے نے کہا کہ حافظ جی میں نے تمہیں بہت سی ترکاری دے دی ہے ایک پیسہ میں آنہ کا مال دے دیا حافظ صاحب اپنے ساتھی سے کہتے ہیں کہ ہم نے اس کو ٹھگ لیا جلدی بھاگ چلو۔ کہیں کنجڑا چھین نہ لے ان حافظ صاحب کے محلے میں ایک دفعہ سقہ بیمار ہو گیا۔ لوگوں کو پانی کی تکلیف ہونے لگے۔ حافظ جی اپنے بیٹے سے کہنے لگے کہ بھائی ایک مشک بنالے اور محلّہ میں تو ہی پانی بھر دیا کر لڑکے نے بہت برا مانا حالانکہ بغور دیکھا جائے تو مشک اور پیالہ میں فرق ہی کیا ہے پیالہ میں دوسروں کو بھی پانی پلا دیتے ہیں صرف عرف ہو گیا کہ پیالہ میں پانی پلانا عیب نہیں اور مشک لئے پھرنا عیب ہے مگر حافظ علی حسن صاحب کو عیب نہ معلوم ہوتا تھا کیونکہ ان میں عجب نہ تھا وہ اپنی کچھ شان ہی نہ سمجھتے تھے اور لڑکے میں عجب تھا وہ اس کو عیب سمجھا۔

غرض جب عمل شاق میں عجب کا احتمال قوی ہو تو ایسے موقع پر عمل شاق کا انتظار نہ کرے اس کا بالکل اہتمام نہ کرے کہ ہیئت ممتاز ہی ہو کسی نیکی کو جو بھی میسر ہو جاوے حقیر نہ جانے دوسرے کی چیز کو بھی حقیر نہ سمجھے پڑوسی کے ہدیہ کو بھی حقیر نہ جانے اسی واسطے حدیث میں ہے کہ اگر پڑوسی کے یہاں سے بکری کی کھری بھی ہدیہ بھی آئے تو اس کو حقیر نہ جانے۔

صاحبو! ہر وقت بڑے نفع کے انتظار کی ضرورت نہیں اگر مٹکا نہ ملے تو کیا گھڑا بھی چھوڑ دے طلب کی تو یہ شان ہونی چاہئے۔

مرا از زلف تو موئے بسند است　　　　　ہوس را راہ مدہ بوئے بسند است

شیخ عبدالحق نے اشعۃ اللمعات میں یہ شعر اس حدیث کے بعد جس میں آیا ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حج کے موقع پر بال ترشوائے تھے اور تقسیم کرائے تھے، لکھ کر فرمایا کہ یہ حضور اقدس صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اجزاء شریفہ کے ذکر و یادداشت کا باعث تو ہو گیا گویا

بوئے بسند ست کا یہ بھی ایک مصداق ہو گیا۔ واقعی بڑے صاحب دل تھے غرض یہ ہے کہ جو بھی مل جائے غنیمت سمجھے اس کا انتظار نہ کرے کہ اخیر شب ہی کی فضیلت ملے۔

فضیلت عبادت شب

یہاں سے اختلاف امتی رحمۃ کا راز بھی معلوم ہو گیا کیونکہ اس اختلاف میں کوئی قول تو آسان ضرور ہو گا اس کو لینے والا بھی دین ہی کا لینے والا ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے جو اپنے نیک بندوں کی شان میں فرمایا تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ کہ جدا ہوتی ہیں کروٹیں ان کی خواب گاہوں سے علماء میں اختلاف ہے کہ آیا اس سے مراد اخیر شب میں تہجد کے لئے اٹھنا ہے یا عشاء کی نماز ہے بعض نے تہجد مراد لیا ہے اور بعض نے دوسرے معنی لئے ہیں جس صورت میں تہجد مراد ہو گا تو اس آیت کا ترجمہ یہ ہو گا کہ علیحدہ ہو جاتی ہیں کروٹیں ان کی خواب گاہوں سے یعنی نیند سے اٹھ کر عبادت میں مشغول ہو جاتے ہیں اور اگر عشاء کی نماز مراد ہو تو یہ ترجمہ ہو گا کہ علیحدہ رہتی ہیں کروٹیں ان کی خواب گاہوں سے یعنی جب تک عشاء سے فارغ نہ ہولیں سوتے ہی نہیں اختلاف سے کتنی آسانی ہو گئی کہ جو شخص بدون عشاء کی نماز سے فارغ ہوئے نہ لیٹے اور یہ خیال کرے کہ میں بھی اس آیت میں داخل ہوں وہ بھی اس ثواب کا مستحق ہے کیونکہ حق تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ جو حدیث شریف میں وارد ہے انا عند ظن عبدی بی تو وہ بھی اس میں داخل ہو جائے گا جو شخص یہ سمجھ رہا ہے کہ حق تعالیٰ اس کو تہجد ہی کا ثواب دے دیں گے مگر شرط یہ ہے کہ کوئی بنا اس ظن کی ہونی چاہئے۔

ذرائع قرب ورحمت

انا عند ظن عبدی بی کے متعلق ایک واقعہ یاد آیا وہ یہ کہ یحییٰ بن اکثم جو کہ امام بخاری کے شیخ ہیں جب انتقال ہوا تو ایک شخص نے خواب میں دیکھا پوچھا کیا گزری فرمایا مواخذہ شروع ہو گیا تھا اور حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے بڈھے تو ایسا ایسا کرتا تھا میں سہم گیا اور خاموش ہو گیا سوال ہوا کہ خاموش کیوں ہو گئے میں نے عرض کیا کہ ایک بات سوچ رہا ہوں۔ پوچھا گیا کیا سوچ رہے ہو عرض کیا میں نے تو بسند حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنا تھا۔

ان اللّٰہ یستحی من ذی الشیبۃ المسلم[1] کہ اللہ تعالیٰ بوڑھے مسلمان سے شرماتے ہیں۔ تو میں حیران ہوں کہ میں تو بوڑھا ہوں مگر یہاں دوسرا معاملہ ہورہا ہے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ ہمارے رسولؐ نے سچ کہا اور راوی بھی سچے ہیں آج تیرے بڑھاپے کی بدولت بخشتے ہیں اور تیرے بڑھاپے کا لحاظ کرتے ہیں یہ بھی سمجھ لیجئے کہ خواب وہی معتبر ہے جو کسی حجت شرعیہ کے معارض نہ ہو جیسا یہ خواب ہے۔

ایک اور شخص کا قصہ ہے جو نہایت مسخرہ تھا اس نے مرنے کے وقت اپنے ایک دوست کو وصیت کی کہ جب مجھ کو قبر میں رکھو تو میری داڑھی پر آٹا چھڑکا دینا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا لوگ دیکھ کر ہنس پڑے اور کہنے لگے یہاں بھی مسخرا پن نہ چھوڑا دفن کردیا کسی نے خواب میں دیکھا اور پوچھا تو کہا پیشی ہوئی تھی میں نے عرض کیا کہ میں نے سنا تھا کہ **ان اللّٰہ یستحی من ذی الشیبۃ المسلم** میرے پاس سفید داڑھی تو تھی نہیں۔ میں نے اس خیال سے اس کی نقل کرلی کہ **من تشبہ بقوم فھو منھم** شاید اسی بنا پر مغفرت ہوجاوے چنانچہ مغفرت ہوگئی۔

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ جن کے بالوں کا رنگ قدرتی سفید ہو ان کے لئے یہی امید رحمت ہے ویسے حق تعالیٰ بادشاہ ہیں جو چاہیں کریں ان کو روکنے والا کوئی نہیں، زبردست ہیں بہرحال رحمت کے آسان ذریعے بھی رکھ دیئے ہیں۔ چنانچہ قرب کی برکت روزمرہ بھی نصیب ہوسکتی ہے۔ خاص کر اس شب میں کہ شام ہی سے یہ دولت مل جاتی ہے۔ اگر دشوار کام کی توفیق نہ ہو (یعنی اخیر شب میں نہ جاگ سکیں) تو سہل ہی کو اختیار کرلیا جاوے وہاں تو ذرا سی نیکی کی بھی بڑی قدر ہوتی ہے دیکھئے **رفع الاذی عن الطریق** کو شعب ایمانیہ میں سے شمار کیا گیا ہے حالانکہ معمولی بات ہے۔

ایک شخص کا قصہ ہے کہ وہ چلا ہوا جارہا تھا راستہ میں ایک ٹہنی جھک رہی تھی اس نے اس کو مسافروں کی تکلیف کے خیال سے کاٹ ڈالا محض اس بنا پر بخشش ہوگئی۔

رحمت خداوندی

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ بندوں کو بہت ہی چاہتے ہیں حتیٰ کہ ان کی

---

[1] مجمع الزوائد للھیثمی ۱۰: ۱۴۹، کنز العمال: ۴۲۶۴۴

رحمت ایسی وسیع ہے کہ نافرمانوں کو بھی نفع پہنچانے میں رحمت ہو جاتی ہے حیوانوں پر بھی رحم کرنے سے رحمت فرماتے ہیں چنانچہ ایک شخص کی بخشش کتے کو پانی پلانے سے ہوگئی تھی اسی لئے ذبیحہ کو راحت دینے کا حکم ہے کفار کو علاوہ زکوٰۃ کے صدقہ دینا جائز کر دیا گیا ہے۔ ہاں جس کافر نے ضرر پہنچایا ہو اس کے لئے دوسرا حکم ہے واخرجوھم من حیث اخرجو کم موت کے وقت کافر کو پانی پلانا درست ہے کفار سے ملنے میں بھی رحمت کی رعایت کی گئی ہے کہ ان سے دوستی کا ملنا تو مت ملو مگر ویسے مل لو چنانچہ فرماتے ہیں۔

لَایَنْهٰکُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْ کُمْ فِی الدِّیْنَ وَلَمْ یُخرِجُوْ کُمْ مِنْ دِیَارِ کُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَیْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ اِنَّمَا ینهاکُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ قَاتَلُوْ کُمْ فِیْ الدِّیْنِ وَاَخْرَجُوْ کُمْ مِنْ دِیَارِ کُمْ وَظَاهَرُوْاعَلٰی اِخْرَاجِکُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ۔

کتنی بڑی رحمت ہے کہ نافرمانوں پر بھی رحم کرنے کا حکم ہے اسی واسطے فرماتے ہیں۔

رحمتی وسعت کل شیء میری رحمت ہر شے پر محیط ہے۔

اگر چہ کفار پر آخرت میں رحمت خاص نہ ہوگی مگر رحمت ایک معنی کہ آخرت میں ان پر بھی ہوگی کیونکہ جس قدر عذاب کفار کو آخرت میں دیا جائے گا کفار اس سے زیادہ کے مستحق تھے اور حق سبحانہ تعالیٰ اس سے زیادہ پر قادر بھی ہیں مگر اس استحقاق سے وہ عذاب ہلکا ہی ہوگا غرض ان کی رحمت سے کوئی چیز خالی نہیں۔

شیطان کے مغالطات

اس کے متعلق ایک حکایت شیطان کی یاد آئی شیطان کی ملاقات حضرت سہل سے ہوئی اس نے کہا کہ میں بھی حق تعالیٰ کی رحمت کا مستحق ہوں کیونکہ ارشاد ہے کہ وسعت رحمتی کل شیء اور میں بھی شیء میں داخل ہوں حضرت سہل نے جواب دیا کہ آگے یہ بھی تو ہے فسا کتبھا للذین یتقون جس کا ادنیٰ درجہ ایمان ہے پس ایمان کی قید بھی تو اس میں لگی ہوئی ہے۔ شیطان نے کہا کہ خدا کی صفات میں قید نہیں ہوتی وہ کسی قید کا مقید نہیں وہ خاموش ہو رہے مگر انہوں نے وصیت کی شیطان سے کوئی مناظرہ نہ کرے۔

واقعی شیطان کے مغالطات بھی عجیب ہیں اس نے منطق میں باب مغالطات ہی پڑھا ہے اور کچھ نہیں پڑھا نام بھی اس کا ابلیس ہے جو ماخوذ تلبیس سے اس لئے اگر وسوسے آئیں تو ان میں خوض نہ کرے کہ وہ بھی ایک قسم کا مناظرہ ہے مگر اس کے مغالطہ کا جواب ایک تو یہ ہے کہ یہ قید ذات وصفات کی طرف راجع نہیں فعل کتاب یعنی تجویز وتقدیر کی طرف راجع ہے اور افعال الٰہیہ بوجہ حدوث کے خود ارادہ الٰہیہ سے مقید ہو سکتے ہیں۔

دوسرا جواب اس کے مقدمات کے ابطال سے قطع نظر کرکے یہ ہے کہ عذاب اور رحمت میں تنافی نہیں تجھ پر بھی باوجود تیرے جہنمی ہونے کی خدا کی رحمت ہے اور وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ جتنا عذاب تجھ کو دیں گے تو اس سے زیادہ کا مستحق ہے اور ان کو اس سے زیادہ پر قدرت بھی ہے اس سے کم دینا یہ بھی رحمت ہوا۔ بہرحال جب ان کی رحمت ایسی وسیع ہے آسان عمل پر بھی عطا ہو جاوے گی اس لئے تم دشوار عمل کا انتظار نہ کرو جو توفیق ہو کرلو۔ اگر اخری شب میں جاگ سکو تو اخیر میں ورنہ اول ہی میں سہی۔ مگر ایسا انتظام ہو کہ زیادہ حصہ جاگنے کا ہو پھر جس میں سہولت ہو خواہ اول میں خواہ آخر میں اس کو اختیار کرلو۔

سہولت کے متعلق ضعیف الہمت کے لئے ایک گر حدیث میں آیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ جب آپ کو دو باتوں میں اختیار دیا جاتا تو آپ آسان کو اختیار کر لیتے مجھ کو کہیں دیکھا ہوا یاد آتا ہے کہ شیخ اکبر جو کہ بے حد مجاہدہ کرنے والے ہیں اختلاف مسائل کے بارہ میں فرماتے ہیں کہ جس مسئلہ میں حلت وحرمت کا اختلاف ہو تو ظاہر تو یہ ہے کہ حرام کہنے والا زیادہ محتاط اور اقرب الی الدین ہو لیکن وہ کہتے ہیں کہ حلت کا فتویٰ دینے والا اقرب الی الرحمت ہے کیونکہ رحمت کا اصل اثر یسر ہے یہی راز ہے کہ معاصی کی سزائیں حلال کی تحریم تو ہوئی ہے مگر حرام کی تحلیل کبھی نہیں ہوئی لیجئے اہل مجاہدہ کے قول سے بھی ہمارا مدعا ثابت ہو گیا۔ مگر ہم شیخ اکبر کو کیوں لیں ہم نبی اکبر کو کیوں نہ لیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خود یہی شان تھی کو ماخیر بین الشیئین الااختار اهونهما (سنن أبی داؤد: ۴۷۸۵) جیسا اوپر مذکور ہوا۔

سہولت کی تعلیم

ایک کام کے دو طریقے ہیں ایک آسان اور دوسرا مشکل آپ آسان طریقہ کو اختیار

فرماتے خدا تعالیٰ کی عادت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے حق تعالیٰ کی قدرت کی یہ شان ہے کہ ان کے کن کہتے ہی چیز موجود ہو جاتی ہے اسی واسطے اگر آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں اگر کن فرمادیتے تو سب اسی وقت تیار ہو جاتے کچھ بھی دیر نہ لگتی مگر ایسا نہیں کیا بلکہ چھ دن میں بنائے سب کام آہستہ آہستہ کئے علماء نے فرمایا کہ اس میں تعلیم ہے تثبت اور مہلت کی اور میں اس سے استنباط کرتا ہوں کہ اس میں تعلیم ہے سہولت کی بھی البتہ جس کام کا ایک ہی طریق ہو وہ تو صرف اسی طریق سے ہوگا۔ خواہ سہل ہو یا دشوار باقی جہاں دو طریق ہوں تو سہل ہی کو اختیار کرلے جیسے گھر کے دو راستے ہوں تو جو سیدھا راستہ ہو اس کو اختیار کرلے کہ اس میں سہولت ہوگی اور بعض دفعہ یہ بھی ہوا ہے کہ راستہ بظاہر تو دور معلوم ہوتا ہے مگر معنی قریب معلوم ہوتا ہے کہ بے خطرہ ہے مصرعہ مشہورہ کا یہی محمل ہے۔

راہ راست روگرچہ دور است

یعنی راست کی تفسیر بے خطرہ ہے، خط مستقیم نہیں ورنہ اس مصرعہ پر ایک طالب علمانہ شبہ ہوتا ہے کہ راہ راست بھی فرمارہے ہیں اور دور بھی فرمارہے ہیں اس کے کیا معنی اس لئے کہ راہ راست تو خط مستقیم ہوگا جو مطلوب تک پہنچاتا ہو اور خط مستقیم سب خطوط واصلہ بین النقطتین سے چھوٹا ہوتا ہے پھر دور کہنے کا کیا مطلب ہے؟

جواب وہی ہے جو اوپر کہا گیا کہ یہاں راستی کے معنی عرف کے موافق بے خطر کے ہیں گو وہ ظاہر میں کج ہی ہو مگر معناً راست ہے پس یہاں راست معنوی مراد ہے یعنی جس میں معنوی کجی نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جو راستہ بے خطرہ ہو گو ظاہر میں دور اس سے جانا چاہئے اور اس راستہ کو نہ جانا چاہئے جو بظاہر تو قریب ہو مگر پر خطر ہو کہ حقیقت میں وہی دور ہے۔

بہر حال ان کی ایسی رحمت ہے کہ آدمی تھوڑا سا بھی عمل کرے تو محروم نہیں رہتا اگر چہ تین دفعہ اللہ ہی کہنے کی توفیق ہو جاوے اس کو کہنا بھی مت چھوڑو۔ اگر چہ بے وضو ہی ہو۔

ایک واقعہ قیامت کے دن کا حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص کے گناہوں کے اعمال نامے منتہائے بصر تک ہوں گے اور وہ شخص اس پر مغفرت سے مایوس ہوگا اتفاق سے ایک ذرا سا پرچہ ان میں نکلے گا کہ اس کے رکھنے سے میزان حسنات کا پلہ وزنی ہو جاوے گا اس

پرچہ میں لا الٰہ الا اللہ لکھا ہوگا جس کو اس نے اخلاص سے کہا ہوگا اگر چہ ایک دفعہ ہی کہا ہو۔ دیکھئے ایک بار کے لا الٰہ الا اللہ کہنے سے کتنا فائدہ حاصل ہوا اگر چہ شبہ ہو کہ اس نے لا الٰہ الا اللہ خلوص سے کہا ہوگا اور ہم میں خلوص نہیں ہے جواب یہ ہے کہ اگر خلوص بھی نہ ہو تب بھی کہنا بے کار نہیں کہنے سے استعداد تو ہو جاوے گی اور یہ اول بار ہی کہنا آئندہ عمل پر معین ہو جائے گا لہٰذا ادنیٰ عمل کو بھی بے کار نہ سمجھو اور کوئی ساعت کسی نہ کسی عمل سے خالی نہ رہنے دو اسی لئے مشائخ نے پاس انفاس تجویز کیا ہے کچھ نہ کچھ سلسلہ رہے۔

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی　　　شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

عبادت شب برأت

صاحبو! وقت کو ضائع مت کرو ہر ہر وقت کی قدر کرو، خاص کر ایسی شب کہ جس کا بیان ہو رہا ہے ایک بات یہ بھی سمجھنے کی ہے کہ یہ جو بعضی اوراد کی کتابوں میں پندرھویں شب شعبان میں خاص نوافل پڑھنے کو لکھ دیا ہے یہ کوئی قید نہیں جو چیز شرعاً بے قید ہے اس کو بے قید ہی رکھو حدیث میں نوافل کی کوئی قید نہیں آئی بلکہ جو عبادت آسان ہو وہ کرلو۔ اس میں نوافل بھی آ گئے اور وہ بھی کسی ہیئت کے ساتھ نہیں۔

باقی بزرگوں کے کلام میں جو خاص ہیئت کے نوافل کا ذکر آیا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ کسی بزرگ نے کسی مرید کے لئے اس کی خاص حالت کے اقتضاء سے اس کو تجویز کیا ہوگا اور اس کے حق میں یہی مصلحت ہوگا اب اس کو عام کر لینا یہ بدعت ہے۔ باقی بزرگوں کو برا نہ کہے غرض حدیث میں کوئی خاص عمل وارد نہیں چاہے قرآن شریف پڑھو، یا اللہ اللہ کرو یا نوافل پڑھو۔ خواہ وعظ کہو سنو۔ چنانچہ کانپور میں اس شب کے اندر ہم وعظ کہلواتے تھے۔ کیونکہ وعظ کے شغل میں جاگنا ذرا آسان ہوتا ہے اگر چہ بعض اس میں بھی سو رہتے ہیں۔

ایک شاہ صاحب تھے ان سے کسی نے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ وعظ میں نیند آتی ہے اور ناچ میں نہیں آتی۔ انہوں نے جواب دیا کہ نیند پھولوں پر آیا کرتی ہے کانٹوں پر نہیں۔

مگر یہ ایک لطیفہ ہے حقیقت یہ نہیں ورنہ پاخانہ میں کیوں نیند آتی ہے وہاں پھول کہاں رکھے ہیں۔ دوسرے عبادات ظاہر میں پھول کہاں ہیں وہ تو نفس پر نہایت شاق اور گراں ہیں

ان میں بظاہر حظ اور لذت نہیں اور کھیل تماشے نفس کے موافق ہیں اور ان میں حظ ہے اس بناء
پر معاملہ برعکس ہونا چاہئے تھا بلکہ حقیقت اس کی دوسری ہے وہ یہ کہ نیند یکسوئی سے آتی ہے
کھیل تماشے میں یکسوئی نہیں ہوتی ہر جزو میں جدا جدا لذت ہوتی ہے جس پر مستقل توجہ کی
جاتی ہے۔ اس سے توجہ منقسم ہو جاتی ہے اس لئے نیند نہیں آتی۔ بخلاف نماز کے کہ جب اس
کو شروع کر دیا چونکہ وہ ہم کو ایسی یاد ہوتی ہے کہ سوچنے اور غور کرنے کی اس میں حالت ہی
نہیں ہوتی جیسے گھڑی کی کوک بھر کر رکھ دی کہ بس ایک طریقہ پر چلتی رہتی ہے اس لئے بالکلیہ
نماز میں توجہ کی متجدد کرنے والی کوئی چیز نہیں اس میں یکسوئی ہو جاتی ہے اس لئے نیند آ جاتی
ہے اسی طرح وعظ کو کہ جہاں شروع ہو گیا اور اس طرف کان لگ گئے۔ بس یکسوئی ہو گئی اور
نیند آنے لگی اور کھیل تماشے میں توجہ ہٹی رہتی ہے یکسوئی نہیں ہوتی اس لئے نیند بھی نہیں آتی
باقی شاہ صاحب کا کلام مخاطب کی خاص حالت کے اعتبار سے ایک لطیفہ ہے۔

تغافل و یکسوئی

خلاصہ یہ ہے کہ یکسوئی میں نیند آتی ہے اور اس میں نیند نہ آنے کی تدبیر یہ ہے کہ
متفرق اعمال شروع کر دیئے جاویں تا کہ توجہ منقسم رہے کچھ دیر نوافل پڑھ لئے، تلاوت کر لی
ذکر کرنے لگے پھر وعظ شروع کر دیا یا سننے لگے مگر وعظ میں ایک خرابی ہو گئی ہے کہ لوگوں کا
اجتماع ہو جاتا ہے تداعی بھی ہوتی ہے اس لئے بہتر یہ ہے کہ گھر کے لوگ جمع ہو کر عبادت
کریں اور نیند کے دفع کے لئے متفرق عبادتوں میں مشغول ہوں کسی سے کوئی مختصر مباح
بات بھی کر لی (جیسے کھانے کے ساتھ کبھی کبھی مربہ اور چٹنی کا بھی ذائقہ لے لیتے ہیں) اتنی
بات کا مضائقہ بھی نہیں یہ نہ ہو کہ سارا وقت باتوں میں ہی گزار دیں کیونکہ نرا جاگنا ہی مقصود
نہیں جیسے ایک فقیر کو میں نے دیکھا کہ محض جاگنے کے لئے افیون کھایا کرتا تھا جو خلاف شرع
حرکت تھی۔ تو ایسے جاگنے سے کیا فائدہ سوایسا تو نہ کرنا چاہئے جاگنا تو عبادت کے لئے ہو
مگر تجدید نشاط کے لئے بیچ بیچ میں تھوڑی تھوڑی بات بھی کر لے تو مضائقہ نہیں جیسے حضور
صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہؓ سے باتیں کر لیتے تھے۔ باتیں مقصود نہیں تھی بلکہ طبیعت کی
تازگی کے لئے ایسا فرماتے۔ اس طرح نفس کو خوش رکھ کر جاگے اور اگر تکان ایسا ہو جاوے

کہ نیند سے بے قابو ہو جاوے تو سو رہے کیونکہ ارشاد ہے فلیرقد ایسی حالت میں سونے ہی میں فضیلت ہے۔ بہرحال عبدیت مطلوب ہے سونے میں ہو یا جاگنے میں اپنے کو سپرد بخدا کردے۔ جیسا حکم ہو، وہی کرے بس یہ حالت ہو۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو　　　جاں شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

اور یہ حالت ہو جس کو مولانا فرماتے ہیں۔

ہم چو کلکم درمیان اصبعین　　　نیستم درصف طاعت بین بین

غرض اتباع نفس کے لئے کچھ نہ ہو محبوب کا جو حکم ہو وہ کرو۔ یہ ہے عبدیت اور باقی کوئی شے بالذات مقصود نہیں بعض اوقات نماز پڑھنا ممنوع ہو جاتا ہے اور سونا مطلوب ہو جاتا ہے۔ جیسے دوپہر کے وقت سونا اس غرض سے کہ اعانت ہو، شب بیداری میں معلوم ہوا کہ مقصود امتثال امر ہے۔

اس پر مجھے اس وقت ایک نکتہ عجیب یاد آیا جو آیت وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ کے متعلق ہے۔ اس کو حضرت حاجی صاحب نے فرمایا تھا یا تو آپ کے قلب پر وارد ہوا ہوگا یا اور کسی سے سنا ہوگا واللہ اعلم فرماتے تھے کہ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ الخ میں سوال یہ ہوتا ہے کہ عبادت کرنے والی علاوہ جن اور انس کے اور مخلوقات بھی تو ہے جیسے فرشتے، پھر جن وانس کی تخصیص کیوں فرمائی۔

جواب یہ ارشاد فرمایا کہ عبادت کے معنی ہیں عبد شدن یعنی غلام شدن۔ یہ شان جن و انس ہی کی ہے شرح اس کی یہ ہے کہ خدمتیں دو قسم کی ہیں۔ ایک معین دوسرے غیر معین نوکر کی خدمت تو معین ہوتی ہے اور غلام کی معین نہیں ہوتی۔ غلام کی خدمت کھانا پکانے اور قلمدان اٹھانے اور پاخانہ کمانے سے لے کر نائب بن کر کسی صوبہ کا انتظام کرنے تک ہوتی ہے۔ یہ شان جن وانس ہی کی ہے کہ ان کی عبادت کوئی معین نہیں۔ وقت پر سونا ان کی عبادت، پاخانہ جانا ان کی عبادت اور ان کا کسی شرعی حکم سے مارنا عبادت کوئی کام ایسا نہیں کہ ان کے لئے عبادت نہ ہو۔ بخلاف دوسری مخلوق کے کہ وہ اپنی عبادات میں مشابہ اجیر کے ہیں جن کو خاص کام کے لئے مقرر کیا جاتا ہے۔ پس یہ شان ہے عبد کی کہ جو اس کو حکم ہو

وہ کرے حتیٰ کہ بعض دفعہ رخصت کو ترجیح ہو جاتی ہے اور عزیمت خلاف اولیٰ ہو جاتی ہے۔

ایک دفعہ ایک بزرگ بیمار تھے آپ نماز کے وقت احتیاطاً تیمّم نہیں فرماتے تھے دوسرے بزرگ نے ان سے فرمایا کہ آپ سمجھے ہوں گے کہ میں بڑا کام کر رہا ہوں مگر قلب کو دیکھئے کہ تیمّم میں انشراح نہیں حالانکہ شریعت کا حکم اس موقع پر تیمّم کا ہے۔ پھر اس میں تنگی ہونا مزاحمت ہے احکام شرعیہ کی۔ اس وقت عزیمت تیمّم ہی ہے کیسی عجیب بات فرمائی۔

غرض عبدیت تو یہ ہے کہ جیسے حکم ہو ویسے کرے۔

چوں طمع خواہد زمن سلطان دین　　　خاک برفرق قناعت بعد ازیں

اسی لئے میں کہتا ہوں کہ آسانی سے کام کرو۔ جس موقع پر عبادت کا حکم ہے عبادت کرو اور جہاں سونے کا امر ہے وہاں سوؤ۔ اس میں دن دونی اور رات چوگنی برکات ہوں گی۔ اسی قاعدہ سے اس شب کی برکات حاصل کرو۔

مکروہات شب برات

مگر لوگوں نے اس شب میں برکات چھوڑ کر بیہودہ حرکات اختیار کر رکھی ہیں۔ چنانچہ آتش بازی ایسی منکر حرکت ہے۔ نام ہی میں اس کے منکر ہونے کا اقرار ہے نام بھی ایسا ایجاد کیا گیا جس میں آتش بھی ہے اور بازی بھی ہے، نام ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ خطرہ کی چیز ہے اور لہولعب ہے۔ بھلا آتش سے تلبیس ہونا بھی کوئی اچھی بات ہے۔ حدیث شریف میں تو یہاں تک ارشاد ہے کہ سوتے وقت چراغ کو گل کر دو جو کہ عادۃً دور ہی رکھا جاتا ہے۔ حضورؐ نے اس کو بھی جلتا ہوا چھوڑنا پسند نہیں کیا کیونکہ خطرہ سے خالی نہیں اور اس کے متعلق واقعات بھی ہوں گئے ہیں۔ پھر تلبیس قریب تو ممانعت کیوں نہ ہوگئی واقعی بڑی خطرہ کی چیز ہے چنانچہ بہت سے واقعات اس کی بدولت ہر سال پیش آتے ہیں کسی کا ہاتھ جل گیا، کسی کی جان جاتی رہی، کسی کا مکان خاک سیاہ ہوگیا اور اگر فرضاً کچھ بھی نہ ہو تو اتلاف مال تو ضرور ہے۔

زیادہ تر پیران نابالغ پر تعجب ہے جن کے دل میں تو یہ ہوتا ہے کہ ہم خود تماشا دیکھیں مگر چونکہ وقار کے خلاف ہے اس لئے بچوں کو آڑ بناتے ہیں اور عذر یہ کرتے ہیں کہ بچے نہیں مانتے۔ تماشوں میں بچوں کو ساتھ لے جاتے ہیں صاحبو ان بچوں کو کیوں بدنام کرتے

ہو بلکہ تمہاری ہی گود میں ایک بچہ ہے جس کو نفس کہتے ہیں وہ تم کو لے جاتا ہے۔ ظاہر میں بچوں کو پیسے دیتے ہیں اور مقصود خود تماشا دیکھنا ہوتا ہے اپنی غرض کے لئے اولاد کے اخلاق بگاڑ رہے ہو اور اگر سچ مچ وہی ضد کرتے ہیں تب بھی یہ عذر قابل قدر نہیں۔

دیکھو! اگر تمہارا بچہ باغیوں میں شامل ہو کر گولہ چھوڑنے لگے تو تم اس کو روکو گے نہیں۔ ضرور روکو گے اگر نہ مانے گا جبراً روکو گے۔ اسی طرح یہاں کیوں نہیں روکا جاتا بس یوں کہو کہ گناہ کو برا ہی نہیں سمجھتے اگر تم خود معصیت کو برا سمجھتے تو بچوں کو اس کی عادت کیوں ڈالتے بھلا اگر بچے ضد کر کے سانپ مانگنے لگیں تو کیا دے دو گے پھر جس کو خدا اور رسولؐ نے مضر کہا ہے کیا وجہ ہے کہ اس کی عادت ڈالی جاتی ہے معلوم ہوا ہے کہ خدا اور رسولؐ کے فرمانے کی وقعت نہیں۔

پھر یہ کہ مال تمہارا کہاں ہے سب خدا ہی کی ملک ہے تم محض خزانچی ہو تمہارے ہاتھ میں تو تحویل ہے تم ایسے ہو جیسے غلام ہوتا ہے مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

وَلِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ.

ہمیں یہ اجازت نہیں کہ اس کو جیسے چاہیں خرچ کریں خدا کا مال ہے اس کی بابت قیامت میں سوال ہوگا کہ تم نے کہاں سے کمایا اور کہاں کہاں خرچ کیا پس جب بچوں کو آتشبازی کے لئے پیسے دینا شرعاً حرام ہے تو تم دینے والے کون ہو ہرگز مت دو اور ضد کرنے پر مارو۔ کھیل تماشہ میں بھی ان کو مت کھڑے ہونے دو۔

بچوں کی عادتیں

صاحبو! بزرگوں نے تو بچوں کو ایسی ایسی عادت ڈالی ہیں جس سے ان کو دولتیں مل گئیں اور تم ایسی عادتیں ڈالتے ہو جس سے دنیا اور دین دونوں تباہ ہوں۔

ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ ان کا ایک لڑکا تھا بالکل بچہ کم سن، انہوں نے بی بی سے ابتداء ہی سے کہہ رکھا تھا کہ اگر یہ کوئی چیز مانگے تو اپنے ہاتھ سے مت دو، بلکہ اس کی ضرورت کی چیزیں ایک جگہ اس سے مخفی کر کے رکھ دو، جب یہ کوئی چیز مانگے تو اس سے کہہ دو کہ وہاں جا کر اللہ میاں سے مانگو اور ہاتھ ڈال کر لے لو تا کہ اس کا یہ اعتقاد ہو جاوے کہ اللہ میاں ہی نے دی ہے چنانچہ بی بی نے ایسا ہی کیا ایک روز اتفاقاً اس کے لئے کھانا رکھنا

بھول گئی۔ اس روز بھی بچے نے حسب معمول اللہ میاں سے کھانا مانگا اور ہاتھ ڈالا تو کھانا غیب سے پیدا ہو گیا ان بزرگ کو خبر ہوئی۔ کہنے لگے بحمد اللہ! میں اس ہی حالت کا منتظر تھا اس کے بعد تمام عمر اس بچہ کی یہی حالت رہی کہ جب اس کو ضرورت ہوتی خدا تعالیٰ سے مانگتا اور وہ چیز مل جاتی ان بزرگ نے بچپن ہی میں اس کو صاحب کمال بنا دیا۔

خیر ہم ایسے نہ ہوں تو بچوں کو معاصی میں تو مبتلا نہ کریں۔ غرض یہ ہے کہ اس بارے میں نہایت اہتمام کی ضرورت ہے۔

اصلیت آتش بازی

اس آتش بازی کی اصل دیکھی جاوے تو یہ نکلتی ہے کہ برانکہ ایک قوم ہے یہ اصل میں آتش پرست تھے پھر اسلام لے آئے۔ ان میں اچھے لوگ بھی تھے مگر بعض میں آتش پرستی کا مادہ موجود تھا۔ یہ فعل ان کا ایجاد کیا ہوا ہے تا کہ اس بہانہ مرکز کی طرف توجہ رکھیں پھر دیکھا دیکھی مسلمانوں نے بھی اس کو اختیار کر لیا۔ جب ماخذ اس کا مادہ کفر ہے تو یہ شعبہ کفر کا ہوا اس کو دوسری معصیتوں سے زیادہ اہتمام کے ساتھ چھوڑ دینا چاہئے اور خیر یہ معصیت تو پھر برنگ معصیت ہی ہے کرنے والے بھی اس کو برا ہی سمجھتے ہیں۔

ایک معصیت برنگ عبادت ہے یعنی اس تاریخ کہ تہوار منایا جاتا ہے۔ ہاں اس سے انکار نہیں کہ یہ عبادت کی رات ہے مگر اس میں صرف اتنا منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس رات میں قبرستان میں تشریف لے گئے اور اہل بقیع کے لئے استغفار فرمایا (اور دہ فی ماثبت بالسنۃ من روایت عائشۃ بطریق ابن ابی شیبۃ والترمذی وابن ماجہ وثبت طرق البیہقی)

اس سے زیادہ منقول نہیں کھانے میں توسیع بھی کہیں منقول نہیں جیسے عاشورہ میں بعض روایات وارد ہیں مگر لوگوں نے اس میں حلوے کا اختراع کیا ہے اس کے بارے میں عجیب عجیب روایات گھڑی ہیں۔ چنانچہ بعض کہتے ہیں کہ حضرت حمزہؓ کی اس تاریخ کو وفات ہوئی تھی یہ ان کی فاتحہ ہے یہ واقعہ تاریخ کے بالکل ہی خلاف ہے کیونکہ وفات حضرت حمزہؓ کی شعبان میں نہیں ہوئی بلکہ شوال میں ہوئی ہے۔ اگر کہو کہ وفات گو شعبان میں نہیں ہوئی مگر جو شعبان بعد میں آیا تھا اس میں ان کی فاتحہ دلائی گئی تھی تو جواب اس کا یہ ہے کہ اول تو اتنے دنوں بعد فاتحہ کیسی پھر تم اس کا

ثبوت دو کہ شعبان میں ان کی فاتحہ دلائی گئی تھی اور یہ بھی ثابت کرو کہ اس میں حلوہ ہی پکا تھا۔
ایک روایت یہ ہے کہ اس تاریخ میں دندان مبارک شہید ہوا تھا اور آپؐ نے حلوہ کھایا تھا۔ اس لئے کرتے ہیں تو یہ بھی محض لغو ہے کیونکہ یہ واقعہ شہادت دندان کا بھی شوال ہی میں ہوا تھا۔
غرض یہ باتیں بالکل گھڑی ہوئی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جتنا ثابت ہے اس سے صرف اس قدر ثابت ہوسکتا ہے کہ مُردوں کو اس رات میں نفع پہنچاؤ۔ اس سے صرف اتنا نکلے گا کہ مُردوں کو ثواب بانٹ دو باقی اور پابندیاں کوئی چیز نہیں۔ ثواب پہنچانے کے لئے قرآن شریف پڑھو، نماز پڑھو، خیرات بھی چاہو کر دو۔ مگر حلوے کی تخصیص کیسی کچا اناج بھی کافی ہے، پیسے بھی کافی ہیں۔
بعض لوگ اس میں یوں کہتے ہیں کہ حلوے کے لئے بچے ضد کرتے ہیں جواب یہ ہے کہ چار دن پہلے پکالو اس دن نہ پکاؤ بعض شہروں میں شب برأت سے ایک دن پہلے عرفہ مشہور ہے کہ شب برأت میں تو پرانے مُردوں کو ثواب پہنچاتے ہیں اور ایک دن پہلے جدید مردوں کو تاکہ وہ پرانے مردوں میں شامل ہو جائیں ورنہ شامل نہیں کئے گئے۔ بھلا بتلایئے اس کی کیا اصل ہے اگر علماء ایسی بے اصل باتوں کو منع کرتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں کہ مولوی وہابی ہو گئے۔
صاحبو! ان رسموں کی کوئی اصل نہیں۔ غرض اس رات کے احکام یہ ہیں جو بیان ہوئے اور دن کے احکام یہ ہیں کہ روزہ رکھو یعنی پندرھویں تاریخ کو جواب کی روایت کے حساب سے اتوار کا دن ہوگا وہی روزہ کا دن ہوگا حدیث میں ہے کہ **قوموا لیلھا وصوموا نہارھا** بس اس تاریخ کے متعلق صرف یہ حکم ہے یہ بیان قصداً اس لئے کیا گیا کہ وہ رات آنے والی ہے۔

شعبان کی فضیلت

اس قدر اور کہتا ہوں کہ یہ مقدمہ ہے رمضان کا میرا تو ذوق یہ کہتا ہے کہ رمضان شریف میں جو جاگنا ہوگا۔ اس شب کا جاگنا اس کا نمونہ ہے اور یہ صوم ایام رمضان شریف کا نمونہ ہے پس دونوں نمونے رمضان کے ہیں ان نمونوں سے اصل کی ہمت ہو جاوے گی پھر اس صوم کے بعد جو صوم سے منع فرمایا اس میں حقیقت میں رمضان کی تیاری کے لئے فرمایا ہے کہ جب شعبان آدھا ہو جاوے تو روزہ مت رکھو۔ مطلب یہ کہ سامان شروع رمضان کا یعنی کھاؤ پیو اور رمضان کے لئے تیار ہو جاؤ اور یہ امید رکھو کہ روزے آسان ہوں گے۔
جب معلوم ہوا کہ رمضان کے روزوں میں آسانی مطلوب ہے تو اس کی ذیل میں ایک

عمدہ تدبیر آسانی کی میں بتلاتا ہوں وہ یہ کہ روزہ میں یہ تذکرہ ہی مت کرو کہ آج گرمی ہے، پیاس بہت لگ رہی ہے، بھوک زیادہ ہے، دل گرا جاتا ہے، ضعف بہت ہوگیا ہے۔ یہ تذکرے بالکل نہ کرو اس طرح روزہ بالکل نہ معلوم ہوگا۔ یہ بدون دودھ گھی کے تدبیر ہے میں اس کے تجربہ کا طریقہ بتلاتا ہوں کہ ایک روزہ تو اس طرح رکھو کہ اس میں اس قسم کے تذکرے نہ کرو۔ اور دوسرا ایسا رکھو کہ جس میں ایسے تذکرے کرو دونوں میں بڑا فرق پاؤ گے۔

ایک غرض رمضان کے سامان کے لئے یہ ہے کہ ابھی سے گناہوں کو چھوڑ دو اگر اب بھی مبتلا رہو گے تو رمضان میں کیسے چھوڑ دو گے، خصوص غیبت خاص اہتمام سے چھوڑ دو خصوصاً عورتوں کو اس کے اہتمام کی زیادہ ضرورت ہے اور باقی جتنی بھی باتیں ناجائز ہیں سب چھوڑ دو جن کی کمائی اچھی نہیں وہ ایسی کمائی چھوڑ دیں کیسا افسوس ہے کہ روزہ حرام غذا سے افطار ہو اول تو ایسی کمائی بالکل چھوڑ دیں اور اگر اس میں گرفتار ہی ہیں اور مجبوری ہے تو کم از کم رمضان کے لئے تو نیک کمائی کا اہتمام کرلیں۔

میں اس کا ایک طریقہ بتلاتا ہوں اگرچہ بتلانے کو جی تو چاہتا نہیں کیونکہ لوگ کچھ سے کچھ سمجھ جاتے ہیں مگر اس لئے بتاتا ہوں کہ لوگ رمضان میں تو حرام خوری نہ کریں صورت اس کی یہ ہے کہ تمہارے پاس جو کمائی حرام ہو اس سے برتنے کی چیزیں مت خریدو کسی سے روپیہ قرض لے کر اس سے خریدلو چاہے قرض پھر اپنے اسی مال سے ادا کردینا یہ کرخی کا قول ہے بہتر ہے کہ بنئے کا قرض لے لیں تاکہ بوقت ادائیگی کوڑا کوڑے میں جائے۔

حرام حلال کی تمیز

یہ بھی سمجھ لیجئے کہ جیسے حرام کھانا ناجائز ہے۔ اسی طرح سے دوسرا انتفاع بھی حرام ہے اس غلطی میں بہت لوگ مبتلا ہیں ایک صاحب تھے وہ رشوت کے مال سے کھاتے تو نہ تھے مگر جوتا پہن لیتے تھے غرض لوگوں نے عجب عجب گھڑت کی ہیں اور جانتے ہیں کہ ہم بری ہوگئے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے کھانا بھی ایسے مال کا حرام اور منتفع ہونا بھی حرام۔

یہ احکام مجملاً رمضان اور شعبان کے بیان کردیئے گئے ایک تو مبارک تاریخ کا ذکر یعنی شعبان کی پندرھویں کا روزہ اور اس کے بعد مبارک ماہ کا ذکر یعنی رمضان شریف کا تو یہ نور علیٰ نور ہوگیا۔

شعبان

فضائل شب برأت اور اس میں خراب رسموں کی اصلاح کے متعلق یہ وعظ جامع مسجد تھانہ بھون میں بروز جمعہ ۱۳ شعبان ۱۳۳۱ھ کو ساڑھے تین گھنٹے میں بیٹھ کر فرمایا۔ حاضرین کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو تھی اور احمد حسن صاحب نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

الحمدللّٰہ نحمدہٗ و نستعینہ و نستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرورانفسنا ومن سیٔات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلاھادی لہ و نشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان سیدنا و مولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ الہ واصحابہ و بارک وسلم.

اما بعد فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم.

حٰمٓ وَالْکِتَابِ الْمُبِیْنِ اِنَّا اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَۃٍ مُّبَارَکَۃٍ اِنَّا کُنَّا مُنْذِرِیْنَ فِیْھَایُفْرَقُ کُلُّ اَمْرٍ حَکِیْمٍ. اَمْرًامِّنْ عِنْدِنَا اِنَّا کُنَّا مُرْسِلِیْنَ. رَحْمَۃً مِنْ رَّبِّکَ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ. (دخان آیت:۱تا۶)

ترجمہ: حٰمٓ قسم ہے اس کتاب واضح کی کہ ہم نے اس کو ایک برکت والی رات یعنی شب قدر میں اتارا ہے۔ ہم آگاہ کرنے والے تھے اس رات میں ہر حکمت والا معاملہ ہماری پیشی سے حکم ہو کر طے کیا جاتا ہے ہم بوجہ رحمت کے جو آپ کے رب کی طرف سے ہوتی ہے آپ کو پیغمبر بنانے والے تھے بے شک وہ بڑا سننے والا بڑا جاننے والا ہے۔

شب قدر

یہ چند آیتیں ہیں سورہ دخان کے شروع کی اس میں اللہ تعالیٰ شانہٗ نے ایک رات کی فضیلت ذکر فرمائی ہے اور اس میں اختلاف ہے کہ اس سے کون سی رات مراد ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ شب قدر مراد ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ شب برأت مراد ہے اور زیادہ مشہور یہی دوسرا قول ہے اور چونکہ قرآن مجید کی اور آیتوں اور احادیث سے ثابت ہے کہ دنیا میں نزول تیئس سال کی مدت میں ہوا ہے اس لئے اس آیت میں خواہ شب قدر کا

نزول مراد ہو یا شب برأت کا ہر حال میں اس سے وہ نزول مراد ہے جو دفعتہً عرش سے آسمان دنیا کی طرف پھر شب شعبان میں تو یہ نزول تجویز کیا گیا اور شب قدر میں اس کا وقوع ہوا اور مبارکہ باعتبار فضائل کے فرمایا اور یہاں اس تفسیر سے بحث کرنا مقصود نہیں۔ مقصود و فضائل شب برأت کے بیان کرنا ہیں چونکہ اس آیت کی ایک تفسیر محتمل وہ بھی تھی اس لئے یہ تفسیر بھی ذکر کر دی گئی۔ باقی میری تقریر اس پر مبنی نہیں۔ اس تقریر کا مبنی احادیث صریحہ ہیں چنانچہ حدیث میں اس شب کی نسبت ہے۔

صوموا نهارها وقوموا ليلها۔ اس کی رات میں قیام کرو اور دن میں روزہ رکھو۔

دوسری حدیث سے اس سے زیادہ صراحت کے ساتھ یہ مقصود یعنی فضل و برکت ثابت ہوتی ہے اور حدیث صوموا (روزہ رکھو) سے صرف اشارۃً ثابت ہوا۔ ہے کیونکہ قیام کے لئے کسی زمانہ خاص کی تجویز فرمانے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خصوصیت ہے اس زمانہ کو پس جو زمانہ کسی عبادت کے لئے تجویز کیا جاوے تو اس سے پہلے وہ مبارک ہونا چاہئے۔

ترجیح تجلیات

طالب علموں کو شبہ ہوسکتا ہے کہ زمانہ ایک امتداد موہوم ہے اور اس کا وجود محض انتزاعی ہے گو یہ وجود واقعی ہے پس اس کو برکت سے موصوف کرنا پہلے سے کس طرح صحیح ہوگا بلکہ ظاہر تو یہ ہے کہ زمانہ کا ذی فضائل اور ذی برکت ہونا صرف اس لئے ہے کہ وہ عبادت کا ظرف بنایا گیا پس مدار زمانہ کی برکت کا عبادات پر ہوگا جن کا وجود انضمامی ہے۔

جواب یہ ہے کہ گو اس میں شک نہیں کہ عبادات کی برکت سرایت کرتی ہے زمانہ میں بھی مگر گفتگو اس میں ہے کہ اس کے قبل بھی کسی اور وجہ سے اس میں برکت ہوگئی ہے بات یہ ہے کہ زمانہ میں خداوند جل وعلا کی کسی خاص تجلی اور توجہ سے برکت پیدا ہوسکتی ہے باقی یہ کہ ایسا کیوں ہوا اور اس زمانہ میں کیا وجہ ترجیح کی تھی جو اس کے ساتھ تجلی متعلق کی گئی اور اس کی وجہ سے اس میں برکت رکھی گئی ہے سو یہ سوال بے ہودہ ہے چونکہ ہم حق تعالیٰ کو مختار اور فاعل بالا رادہ مانتے ہیں اور ارادہ نام ہے۔ ترجیح ماشاء متی شاء ترجیح دینا جس کو چاہیں اور جب چاہیں کا اور اس ترجیح کا خاصہ یہ ہے کہ جب چاہے جس چیز میں چاہے جس طرح چاہے

تصرف کرے خدا تعالیٰ جس طرح اعیان میں تصرف کرتے ہیں اسی طرح اعراض میں بھی کرتے ہیں اور زمانہ اعراض واقعہ میں سے ہے تو خدا تعالیٰ نے اس میں یہ تصرف کیا کہ زمانے کے جو حصے ہیں اجزاء تحلیلیہ تو اس میں سے جس کو چاہا ترجیح دے دی۔

شب برأت اور تکوینی واقعات

پس شب برأت ایک زمانہ ہے اس میں فضیلت رکھی اور محض تکوینی واقعات اس زمانے کے متعلق کر دیئے مثلاً یہ کہ اس میں خداوند جل شانہ کو بندوں کی طرف خاص توجہ ہوتی ہے مثلاً یہ کہ اس میں فرشتوں کا نزول ہے اور بندوں کی دعا قبول ہوتی ہے ان واقعات کے تعلق کی وجہ سے اس وقت میں اور فضیلت پیدا ہوگئی اور ان واقعات تکوینیہ کے ساتھ اس کے ساتھ یہ حکم تشریعی متعلق کر دیا کہ تم اس میں عبادت کرو۔ پس یہ شبہ رفع ہوگیا کہ زمانہ ایک امتداد موہوم ہے اور اس کا وجود بھی انتزاعی ہے تو اس کا برکت کے ساتھ موصوف ہونا کیسے صحیح ہوا۔ پھر اتصاف بھی قبل ظرفیت للعبادت (عبادت کے لئے ظرف ہونے سے پہلے) وجہ دفع ظاہر ہے کہ قابلیت اتصاف کی تو واقعیت کے سبب ہے اور اتصاف بالفعل انجلی کے سبب ہے پس زمانہ کے مبارک ہونے کے یہ معنی ہوئے اور حدیثوں میں جو اس شب کی فضیلت بیان کرکے فرمایا قوموا لیلھا (اس میں شب بیداری کرو) اس سے ظاہراً یہی مستنبط ہوتا ہے کہ اس میں پہلے سے فضیلت ہے کہ اس بناء پر عبادت مقرر کر دی اور نفس فضیلت دوسری حدیثوں میں بھی وارد ہے اور ان میں اس رات کے ساتھ واقعات واحکام تکوینیہ کا متعلق ہونا بھی وارد ہے۔

چنانچہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ لیلۃ شعبان کی یہ فضیلت ہے کہ اس میں بندوں کے اعمال بلند کئے جاتے ہیں یعنی قبول کئے جاتے ہیں اور آیا ہے۔ **فیھا تقسم ارزاقکم** یعنی اس رات میں تمہارے رزق بانٹے جاتے ہیں۔

اور اس میں یہ بھی ہوتا ہے کہ جو لوگ اس سال کے اندر اندر پیدا ہونے والے ہیں اور جتنے مرنے والے ہیں وہ فرشتوں کو بتلا دیئے جاتے ہیں اور ایک حدیث میں ہے جو ضعیف ہے موضوع نہیں اگر چہ روایت قوی نہیں کہ عالم غیب میں ایک درخت ہے اور اس میں پتے

ہیں۔تو جو شخص اس سال میں مرنے والا ہوتا ہے تو ایک پتا (جس کا تعلق اس شخص سے ہے) اس درخت کا گرجاتا ہے۔

میں نے ایک لڑکی کے سامنے یہ روایت بیان کی جو میرے گھر میں کی شاگرد ہے اور ماشاء اللہ اب وہ بال بچوں والی ہے تو ہر سال قبل شب برأت اس کا خط آتا ہے کہ میرے لئے دعا کیجئے کہ میرا پتا نہ گرے اس درخت سے بھلا میری اس دعا سے کیا ہوتا ہے جو ہونا ہوگا وہ تو ہو ہی گا۔مگر دعا کرنے میں مضائقہ نہیں۔

اتنا مضمون صحاح کی روایت میں ہے کہ اس سال جو مرنے والے ہوتے ہیں وہ تجویز کر لئے جاتے ہیں اور ایک حدیث میں ہے کہ حق جل وعلا شانہ اس رات میں آسمان دنیا کی طرف توجہ فرماتے ہیں (خاص طور پر) شام سے صبح صادق تک اور فرماتے ہیں۔

الامن مستغفر فاغفرله الامن مسترزق فارزقه[1]

کیا کوئی مغفرت چاہنے والا ہے کہ میں اس کو بخش دوں کیا کوئی روزی مانگنے والا ہے کہ میں اس کو رزق دوں۔

غرض یہ کہ الا کذا الا کذا (اسی طرح اور بھی مضمون ہے) اور استغفار کی طرف متوجہ فرمانے کے ساتھ استرزاق کی طرف متوجہ فرمانے کا اس وقت اہتمام سے اس لئے بیان کیا کہ لوگوں کا گمان ہے کہ خدا کی اطاعت سے رزق کم ملتا ہے تو اس حدیث میں تقدیم استغفار اور تاخیر استرزاق سے معلوم ہوگیا کہ استغفار اور معاصی سے پاک ہونا کہ اطاعت کی ایک فرد ہے اس کو برکت رزق میں دخل ہے۔

رزق اور قسمت

صاحبو! رزق تو وہ چیز ہے کہ اگر نہ بھی مانگو تو اللہ تعالیٰ خود دیتے ہیں بلکہ اگر یہ بھی کہو کہ اے اللہ! مجھے روٹی نہ دینا تب بھی یہ دعا قبول نہیں ہوتی اور دیتے ہیں (بلکہ ایسی دعا مانگنا گناہ ہے)

آنچہ نصیب است بہم میرسد — گرنہ ستانی بہ ستم میرسد

جو کچھ قسمت میں ہے وہ ضرور مل کر رہے گا اگر خوشی سے نہ لو تو زبردستی دیا جائے گا۔

---

[1] العلل المتناهيه: ۲ / ۷۱

تو جب حق تعالیٰ روکنے سے بھی نہیں رکتے تو کیا فرمانبرداری پر روزی نہ دیں گے خاص کر جب وہ خود فرماویں بھی کہ ہم سے روزی طلب کرو اور پھر لوگوں کا یہ خیال فاسد

بدگمانی کردن و حرص آوری کفر باشد نزدخوان مہتری

بدگمانی وحرص کرنا خوان خداوندی کے سامنے کفر کی باتیں ہیں۔

دیکھو! جب حاکم کوئی مضمون بتلاوے کہ یہ مسودہ صاف کر کے ہم کو پیش کرنا اگر قبول نہ کرنا ہوتا تو وہ کیوں ایسا کہتا ایسے ہی رزق کا طلب کرنا تو اللہ تعالیٰ ہی کا بتلایا ہوا ہے اگر ان کو روزی مرحمت فرمانی نہ ہوتی تو حکم کیوں دیتے چنانچہ اس برأت کے موقعہ پر استغفار کی طلب کے ساتھ رزق کی طلب کی طرف بھی توجہ دلائی۔ ہمارے اس ضعف پر نظر فرما کر کہ لوگوں کو روزی کی فکر مغفرت سے بھی زیادہ ہے۔

میں نے مولانا فتح محمد صاحب مرحوم سے جو میرے ابتدائی کتابوں کے استاد تھے سنا ہے کہ ایک شخص نے ضد باندھی کہ کھانا نہ کھاؤں گا۔ دیکھوں کیسے زبردستی کھانا پڑے گا چنانچہ اس نے کھیت چھوڑ دیا جنگل چلا گیا اور کئی روز تک کھانا نہ کھایا۔ اگرچہ اس نے یہ حماقت کی اور اگر ایسی حالت میں اس کو رزق نہ ملتا تو اس کی وجہ یہ ہوتی کہ اس کی قسمت میں رزق نہیں رہا تھا مگر اللہ تعالیٰ سب کی مرادیں پوری کرتے ہیں یہ جارہا تھا ایک قبر راستہ میں پڑی جس پر سولہ لڈو رکھے ہوئے تھے۔ نفس کی سرکشی کے احتمال سے وہاں سے بھاگا کہ ایسا نہ ہو کہ نفس اس کی طرف متوجہ ہو جاوے اور میرا عہد ٹوٹ جاوے اتفاق سے ڈاکوؤں کی جماعت جو تعداد میں سولہ تھی چھپی ہوئی آرہی تھی وہ اتفاق سے ادھر ہی کو گزرے دیکھا کہ ایک شخص بھاگا جاتا ہے سمجھے اس کے پاس گنیاں ہوں گی اور وہ بھی سولہ تھے اور لڈو بھی سولہ تھے وہ سمجھے کہ اس شیرینی میں اس نے زہر ملا دیا ہے۔ انہوں نے مشورہ کیا کہ یہ سب لڈو اسی کو کھلاؤ اور لوٹ لو۔ یہ وہاں سے دوڑا مگر کئی روز کا بھوکا تھا، ان لوگوں نے پکڑ لیا اور اس کو گرا کر تمام لڈو چمٹے سے منہ کھول کر اسی کے پیٹ میں اتارے۔ اس نے توبہ کی۔

آنچہ نصیب است بہم می رسد گرنہ ستانی بہ ستم می رسد

جو قسمت میں ہوتا ہے وہ ضرور پہنچتا ہے اگر خوشی سے نہ لو تو زبردستی پہنچتا ہے۔

رزق وہ ہے کہ دھکے دو جب بھی ملتا ہے۔ یہ رزق کے متعلق عوام کی اصلاح تھی۔ اب اس کے متعلق واعظوں کی ایک اصلاح ہے کیونکہ غیر محقق مولویوں کی بھی اصلاح ضرور ہے وہ وعظ میں کہا کرتے ہیں کہ روزی پہنچانے کا خدا کا وعدہ ہے اور مسلمانوں کو بھروسہ نہیں ،گھبراتے ہیں یہ ان کا عام مضمون ہے اور اس پر وہ ضعف ایمان کا حکم لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر کوئی مخلوق دعوت کر دے تو اس پر تو پکا اعتبار ہوتا ہے اور اس وقت کے رزق سے بے فکری ہو جاتی ہے اور حق تعالیٰ کے وعدہ پر بھروسہ نہیں۔

ضعف ایمان

سو یہ غیر محقق لوگ خوب سمجھ لیں کہ ضعف ایمان نہیں بلکہ ضعف طبیعت ہے ضعف ایمان اور ہے اور ضعف طبیعت اور۔ اور کوئی مسلمان ایسا نہیں جس کو خدا کے وعدہ پر بھروسہ نہ ہو اور تنویر کے لئے جو مثال بیان کی جاتی ہے وہ محض غلط ہے اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ کا قیاس مخلوق کے وعدہ پر صحیح نہیں۔ کیونکہ جو شخص وعدہ کرتا ہے وہ یہ بتلا دیتا ہے کہ فلاں وقت کی دعوت ہے جس سے پورے طور پر یہ حال معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارے کھانے کا اس وقت کا پورا بندوبست ہو گیا اور اگر ایسا ہی تفصیلی وعدہ اللہ تعالیٰ کا ہوتا، تو مسلمانوں کو مخلوق سے زیادہ اس پر اعتماد ہوتا۔ مگر خداوند تعالیٰ کا یہ وعدہ نہیں ہے کہ دونوں وقت دیں گے پاؤ بھر دیں گے ناغہ نہ کریں گے بلکہ مبہم وعدہ ہے کہ روزی دیں گے اس کی کیفیت اور کمیت نہیں بتلائی گئی۔ ممکن ہے کہ تیسرے روز ملے غرض ابہام ہے اور اس شخص کا یہ وعدہ ہے کہ شام کا وقت بتلا دیا ہے تو ضعف ایمان کی وجہ سے تردد نہیں بلکہ اس کی کیفیت اور مقدار معلوم نہ ہونے کی وجہ سے تردد ہے جس کا باعث طبعی ضعف ہے اگر داعی کا بھی ایسا ہی وعدہ ہو، تو اس سے زیادہ تردد ہو جاوے۔

تو یہ ظلم کیا ہے الزام لگانے والوں نے کہ الزام لگا دیا ضعف ایمان کا البتہ اگر یہ وعدہ ہوتا کہ دونوں وقت پکی پکائی مل جایا کرے گی اور پھر بھی تردد رہتا۔ تب البتہ ضعف ایمان سمجھا جاتا واعظوں کو چاہئے کہ ضعف ایمان اور کفر کے فتوے نہ دیا کریں۔ جو ضعف بیان کیا وہ ضعف طبیعت ہے۔

ہاں ایک ضعف ایمان کا بھی ہے کہ معصیت سے رزق ملے گا اور نیکی سے نہ ملے گا باقی

طبعاً بہت سے اللہ پاک کے نیک بندے بھی تنگی میں پریشان ہو جاتے ہیں اور بعضے کافر باوجود تنگی کے بالکل مستقل زاج بےفکرے ہوتے ہیں ان پر اثر بھی نہیں ہوتا سو یہ طبیعت کا ضعف وقوت ہے نہ کہ ایمان کا۔ چنانچہ ہمارے حضرت حاجی صاحب قدس سرہ اللہ کے ایک مقبول بندہ کی حکایت فرماتے تھے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ اللہ! میری قسمت کا کل رزق یکبارگی مرحمت فرما دیجئے ارشاد ہوا کہ کیا ہمارے وعدے پر بھروسہ نہیں ہے۔

وَمَامِنْ دَابَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِيْ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ

اور کوئی جاندار روئے زمین پر چلنے والا ایسا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمے نہ ہو اور وہ جانتا ہے ہر ایک کی زیادہ رہنے کی جگہ کو اور چندروزہ رہنے کی جگہ کو سب چیزیں کتاب مبین یعنی لوح محفوظ میں ہیں۔

عرض کیا کہ بھروسہ کیوں نہیں ہے مگر شیطان بہکاتا ہے۔ **الشیطن یعدکم الفقر** شیطان تم سے تنگی محتاجی کا وعدہ کرتا ہے۔

شب چو عقد نماز بربندم   چہ خورد بامداد فرزندم

یعنی رات کو جب میں نماز کے لئے نیت باندھتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ صبح کو میرے بال بچے کیا کھائیں گے۔

تقدیر اور رزق

اور آپ کے خزانہ پر حوالہ کرنے سے وسوسہ ڈالتا ہے کہ یہ تو خبر نہیں کب ملے گا سو اگر مجھے اپنی قسمت کا کل رزق مل جاوے تو میرے صرف میں تو اسی قدر آوے گا جتنا تقدیر میں لکھا ہے مگر اس کو کوٹھڑی میں رکھ لوں گا اور شیطان جب بہکاوے گا تو میں کہہ دوں گا کہ کوٹھڑی میں موجود ہے پھر کیا فکر ہے۔

تو بعض اولیاء اللہ نے اسباب معیشت اختیار فرمائے ہیں اس لئے کہ وہ ضعیف الطبع تھے اور بعض نے اسباب کو ترک کیا ہے ایمان کا قوی ہونا اور چیز ہے اور طبیعت کا قوی ہونا دوسری چیز ہے۔

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ جو بڑے درجہ کے صحابی ہیں اور جن کی شان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی تھی:

اللّٰھم ایدہ بروح القدس اے اللہ! ان کوقوت دے جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ سے۔

انہوں نے بوجہ ضعف طبیعت کبھی ایک کافر کو بھی نہیں قتل کیا ایسے ہی کسل کو سمجھو کبھی طبعی ہوتا ہے کہ منافی ایمان نہیں اور یہ اہل علم کے کام کی بات ہے۔ مثلاً اٹھے وقت صبح کی نماز کے وقت طبیعت کسل مند ہوتی ہے اور گھسٹ کر اٹھتا ہے تو خود ان کو بھی شبہ ہو جاتا ہے اور دوسرے بھی کہتے ہیں کہ:

اِذَا قَامُوْا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی۔ (یہ منافقین کا ذکر ہے) کہ جب وہ نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو کسل مند ہونے کی حالت میں کھڑے ہوتے ہیں۔

پس اس سے نفاق کا حکم لگا دیتے ہیں سو سمجھ لو کہ ایک کسل ہے طبع کی کمزوری کی وجہ سے اور ایک ہے ضعف اعتقاد کی وجہ سے۔ سو جب باوجود ضعف طبیعت کے بھی طالب حق اٹھتا ہے تو یہ تو اور زیادہ دلیل ہے ایمان کی اکثر ذاکرین ایسی حالت کے متعلق مجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم منافق ہو گئے میں لکھ دیتا ہوں کہ تم شوق سے اٹھنے والوں سے بڑھ کر ہو تم کو ایمان اٹھاتا ہے اور شوق سے اٹھنے والے کو شوق اٹھاتا ہے جس میں وہ مجبور ہو کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جیسے انجن میں آگ بھر دی جائے تو وہ مجبوراً گاڑیوں کو لے اڑے گا۔

سرکشی نفس

تم نفس سے کشاکشی کرتے ہو پس یہ کسل طبیعت کا ہے اعتقاد کا نہیں جس طرح بعضے طبعاً شجاع ہوتے ہیں بعضے نہیں ہوتے یہ طبیعت کا رنگ ہے بعضوں میں کیفیات زیادہ ہوتی ہیں بعض میں کم ہوتی ہیں چنانچہ جن کی طبیعت میں بوجہ قوت ذکاء کے احتمالات بہت پیدا ہوتے ہیں ان کو کیفیات کم ہوتی ہیں اور جن کو احتمالات سے بے فکری ہوتی ہے (بوجہ یکسوئی قلب کے) ان میں کیفیات زیادہ ہوتی ہیں۔

ایک دوست نے جو بڑے عاقل ہیں لکھا تھا کہ مجھ کو کیفیات نہیں وارد ہوتیں جس سے بے قراری ہے کسی طرح تسلی نہیں ہوتی میں نے جواب لکھ دیا کہ جو شخص جتنا زیادہ عاقل

ہوگا اسی قدر کیفیات کم ہوں گی اور جو جس قدر بھولا ہوگا اسی قدر کیفیات زیادہ ہوں گی۔ تم چونکہ زیادہ عاقل ہو اس وجہ سے ورود کیفیات کم ہے یہ امر دیگر ہے کہ اس خاص وجہ سے کوئی زیادہ عاقل ہونا پسند نہ کرے یہ ایک حال ہے اسی طرح باب رزق میں بھی جس قدر ضعف طبیعت ہوگا، تر ددات اور احتمالات بہت ہوں گے اور یہ دلیل بے ایمانی کی نہیں ہاں ضعف ایمان کی یہ دلیل ہے کہ رزق حاصل کرنے میں منہمک ہو اور حلال وحرام کی پروانہ کرے۔

رزق مقسوم ست ووقت آں مقرر کردہ اند　　　　پیش ازاں وبیش ازاں حاصل نگیر دو بجہد

رزق تقسیم ہے اور اس کا وقت مقرر ہو چکا ہے اس (وقت) سے پہلے اس (تقسیم شدہ) سے زیادہ باوجود جدوجہد کے حاصل نہیں ہوسکتا۔

رزق بٹی ہوئی چیز ہے نہ اس سے پہلے مل سکتا ہے نہ کوشش سے زیادہ مل سکتا ہے بہتیرے عقلاء تنگدست ہوتے ہیں اور بہتیرے بیوقوف مالدار ہوتے ہیں۔

بناداں آں چناں روزی رساند　　　　کہ داناں اندراں حیراں بماند

نادان کو اس طرح روزی پہنچاتے ہیں کہ عقل مند لوگ اس میں حیران رہتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيَقْدِرُ۔ زیادہ روزی دیتے ہیں جسے چاہتے ہیں اور کم دیتے ہیں جسے چاہتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ہر شخص سے جدا معاملہ ہے کسی کو اسباب سے ملتا ہے اور کسی کو بغیر اسباب۔ رزق کی طلب میں گناہوں میں منہمک ہو جانا یہ البتہ ضعف ایمان ہے کیونکہ اول تو اس سے زیادہ ملتا نہیں اور دوسرے جتنا ملتا ہے وہ سب کام بھی تو نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ تم کو بیماری لگ جاوے جس میں سب چیزوں کا پرہیز بتلایا جاوے تو اس صورت میں مال تمہارے کس قدر کام آوے گا۔ نوکر چاکر، کباب وغیرہ کھاتے ہیں۔ میاں کو حکیم صاحب کبھی فتوے ہی نہیں دیتے کہ مونگ کی دال کے سوا اور کچھ کھاویں رزق لے لو، سونا لے لو، چاندی لے لو، جب مر جاؤ گے تو زیارت بھی مال کی نہ ہوگی۔ اب زیارت تو ہو جاتی ہے گو وصال نہیں ہوتا اور یہ مشاہدہ سے ثابت ہے پس تمہارا مال تمہارے کس کام آیا۔

ضعف طبیعت کا اثر

مگر ضعف طبیعت سے آدمی ان باتوں کو غور نہیں کرتا بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے اس

ضعف کی بھی یہ رعایت فرمائی کہ طلب مغفرت کے ساتھ طلب رزق کی طرف بھی توجہ دلائی اور رزق طلب کرنے کا حکم فرمایا چنانچہ دعائے ماثورہ میں وارد ہوا ہے۔ **اللّٰھم ارزقنی** اے اللہ مجھے روزی دے۔

اور یہ سب اس شب میں ہوتا ہے اور یہ افعال تکوینیہ ہیں اور حدیثوں کے درمیان میں وارد ہوا ہے کہ اس شب میں حق تعالیٰ بنی کلب کی بکریوں کے بالوں سے زیادہ مغفرت فرماتے ہیں بنی کلب عرب کے ایک قبیلے کا نام ہے جن کی بکریاں بہت تھیں اول تو بکریوں کی کثرت اور پھر ان کے بالوں کی کثرت اور پھر اس سے زیادہ کو ملاحظہ فرمایئے کہ رحمت الٰہیہ اس شب میں کس قدر متوجہ ہوتی ہے۔

حدیث میں ہے کہ اس شب میں سب کی مغفرت کی جاتی ہے مگر مشرک کی اور اس شخص کی جس میں کینہ ہو۔ کینہ بڑی بری چیز ہے مسلمان و چاہیئے کہ ہرگز کینہ نہ رکھے اور کبھی کسی عارض کے سبب طبیعت پر کچھ اثر ہو جاوے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حد لگا دی کہ تین دن بعد اس کو ختم کر دے۔

سبحان اللہ! شریعت مطہرہ نے ضعفاء کی طبیعت کا کیا لحاظ فرمایا ورنہ عقل کا مقتضاء تو یہ تھا کہ ایک گھڑی بھی کینہ رکھنے کی اجازت نہ دی جاتی مگر شریعت نے ہر امر میں ہماری طبیعت کی رعایت کی ہے دیکھا کہ ضعیف ہیں مر جاویں گے گو ممکن تھا کہ جلد کینہ نکال دیا جاوے لیکن سخت دشواری پیش آتی اور اب بھی بعض بندگان خدا ایسے ہیں جن کے دل سے فوراً کینہ نکل جاتا ہے پس اپنے بندوں کی تکلیف پر نظر فرما کر تین دن تک اجازت دے دی کہ تین دن تک رنج رکھنے میں معذور قرار دے دیا کیونکہ اس مدت کے اندر جوش طبعی ختم ہو جاوے گا اب اس کے بعد بھی جوش ختم نہ ہو تو معلوم ہوا کہ نفس کی خباثت اور شرارت ہے طبعی جوش ہوتا تو ایک دن رہتا، دو دن رہتا، تین دن رہتا۔ جب تین دن اور تین رات میں بھی ختم نہ ہوا تو وہ جوش طبعی نہ رہا جس کی رعایت سے اجازت دی گئی تھی۔ اس لئے کہ مقتضائے طبعی سے بچنے میں سخت کلفت ہوتی ہے اس درمیان میں کھانا کھایا ہے بیوی سے بات چیت کی ہے اب بھی غم غلط نہیں ہوا تو شرارت نفس ہے۔

شرارت نفس

چنانچہ حدیث میں ہے لایحل لمؤمن ان یھجر اخاہ فوق ثلثۃ ایام (کنزالعمال:۲۴۷۹۴) کسی مومن کو حلال اور جائز نہیں کہ اپنے بھائی کو تین دن اور تین رات سے زیادہ چھوڑے رہے بھائی کا لفظ شفقت کے لئے فرمایا کہ بھائی کو لائق نہیں کہ بھائی کو چھوڑے (پس یہ کلمہ لانے سے حدیث پر عمل ہونا سہل ہوا اور رغبت میں ترقی ہو) ہاں اگر تین دن تک منہ پھلائے رہے تو اجازت دے دی (گو بہتر یہ ہے کہ بالکل ہی کینہ نہ رکھے اور تین دن تک اجازت مقید ہے امور دنیویہ کے ساتھ اگر کوئی کسی بددین سے اس کی بددینی کی وجہ سے چھوڑ دے تو اگر وہ فاسق ہمیشہ بددین رہے اور دوسرا شخص ہمیشہ اس کو چھوڑے رہے تو اجازت ہے اور ثواب ہوگا اور بعض مواقع پر واجب ہے)

یہاں تک یہ ثابت کیا گیا کہ شریعت نے ہماری طبیعت کی بڑی رعایت فرمائی ہے اگر کوئی شبہ کرے کہ طبیعت تو نماز سے بھاگتی ہے اور شریعت نے اس کے چھوڑنے کی اجازت نہیں دی اور یہاں طبیعت کی رعایت نہیں کی صاحبو! نماز ایسی چیز ہے کہ اس میں رعایت مضر ہے اور اس کے چھوڑنے کی اجازت مناسب ہی نہیں کیونکہ اس رعایت کی ایسی مثال ہے جیسے کسی نے زہر کھالیا ہوا اور اس سے کوئی کہے کہ تو تریاق کھالے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نہیں کھاتا پھر اس کی رعایت کر کے کہنے لگیں کہ اچھا مت کھانا کسی کے حلق میں زخم ہے اور اس کو دوا کرنے کے لئے کہا جاتا ہے وہ منظور نہیں کرتا اور اس میں اس کی رعایت کی جاوے تو اگر ایسا کیا تو یہ ظلم ہے یا رحم ہے۔

پس نماز بھی ایسی ہی چیز ہے کہ اس کے چھوڑنے کی اجازت دینے میں بڑا ضرر ہے بندہ کا ہاں اس میں بھی یہ رعایت کی گئی ہے کہ اس کے اوقات میں توسیع کر دی صبح کی نماز کا وقت طلوع صبح صادق سے آفتاب نکلنے تک ہے جو سوا گھنٹہ سے بھی زیادہ ہوتا ہے اگر اس قدر وقت میں بھی سرکار کی طبیعت درست نہ ہو تو ایسے سرکار کی ترکاری پکالیوے ظہر کا وقت دن ڈھلنے سے دو مثل یا ایک مثل تک ہے علی اختلاف الاقوال اور عصر کا وقت ظہر کا وقت نکلنے کے بعد سے آفتاب غروب ہونے تک ہے اور عشاء کا وقت بعد مغرب سے آدھی رات تک بلا کراہت ہے۔

تلقین نماز

اس کے بعد طلوع صبح صادق تک مکروہ ہے۔ مغرب کے وقت کو عوام الناس بہت تنگ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ وہ تنگ نہیں بلکہ جو مقدار صبح کے وقت کی ہے یعنی طلوع صبح صادق سے طلوع آفتاب تک وہی مقدار مغرب کے وقت کی ہے ہاں تاخیر کرنا بلا ضرورت مکروہ ہے (تارے چٹک آنے کے بعد مغرب کا وقت مکروہ ہو جاتا ہے) ہاں کسی نے نہ پڑھی ہو تو مکروہ وقت میں بھی پڑھ لے اس لئے کہ قضا پڑھنے سے ادا پڑھنا اچھا ہے گو مکروہ وقت میں ہو۔

یہ بیان مغرب کے متعلق میں نے اس لئے کیا کہ رمضان شریف آنے والے ہیں افطار میں لوگ بہت تنگی کرتے ہیں کہ روزہ داروں کو کھانے پینے بھی نہیں دیتے فوراً کھڑے ہو جاتے ہیں سو دق نہیں کرنا چاہئے۔ یہ وقت اتنا تنگ نہیں ہے پس امام کو تمام مقتدیوں کی رعایت چاہئے اور جماعت اس وقت تک قائم نہ کرے جب تک کہ سب لوگ فارغ نہ ہو جائیں (یہ غرض نہیں ہے کہ اس قدر تاخیر کی جاوے کہ وقت جاتا رہے بلکہ بقدر ضرورت اپنی حاجت پوری کر کے جماعت قائم کر لی جاوے)

حدیث میں کھانے کے بارے میں وارد ہوا ہے۔

اذا حضر العشاء والعشاء فابدوا بالعشاء[1]

یعنی جس وقت شام کا کھانا سامنے آ جاوے تو پہلے کھانا کھا لو اور پھر نماز پڑھو۔

کیا ٹھکانا ہے اس رعایت کا اور شریعت کے احکام میں ظاہری مصلحت بھی ہے باطنی بھی ناسوتی مصلحت بھی اور ملکوتی بھی ظاہری اور ناسوتی مصلحت تو یہ ہے کہ کھانا گرم اور حلوا نرم موجود تھا۔ خواہش کھانے کی تھی ضرور تھا کہ اسی میں دل لگا رہتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے سامنے ایسی حالت میں حضور قلب کیسے ہو سکتا تھا اور کس قدر خرابی ہے کہ خدا تعالیٰ کے سامنے ایسی حالت میں حاضر ہو تو اگر اجازت نہ ہوتی تو تم کہہ سکتے تھے اور عذر کر سکتے تھے کہ ہم طبعاً معذور رہیں دل تو وہاں لگا ہے ہم کیسے حضور قلبی سے حاضر ہوں پس تم کو اجازت دے دی کہ پہلے

---

[1] الصحیح لمسلم کتاب المساجد: ۶۴، سنن الترمذی: ۳۵۳، سنن النسائی ۲: ۱۱۱، مسند الامام احمد ۳: ۱۱۰، ۲۳۱، سنن الدارمی ۱: ۲۹۳ بلفظ: اذا حضر العشاء واقیمت الصلوۃ

حلوا کھایئے اور پھر جلوا دیکھیے غرض دونوں مصلحتیں ملحوظ رکھی گئیں جو ظاہر کے دیکھنے والے ہیں انہوں نے یہ مصلحت سمجھی کہ پیٹ بھر گیا اور جو اہل باطن ہیں انہوں نے یہ مصلحت سمجھی کہ وہ حضرت پروردگار کے قابل ہو گئے اور ان میں حضور کی استعداد پیدا ہو گئی۔

بہار عالم حسنش دل وجاں تازہ میدارد　　　　برنگ اصحاب صورت را ببوار باب معنی را

اس کے عالم حسن کی بہار دل وجان کو تازہ رکھتی ہے رنگ سے اہل ظاہر کے دل وجان کو اور بو سے ارباب حقیقت کے دل وجان کو۔

روزہ داری خوشی

اسی کی نظیر یہ ہے کہ حدیث میں روزہ دار کے بارہ میں وارد ہوا ہے۔

للصائم فرحتان فرحة عند الافطار وفرحة عندلقاء الرحمن[1]

روزہ دار کے لئے دو خوشیاں ہیں ایک خوشی افطار کے وقت اور ایک خوشی خدا کے ملنے کے وقت پس پہلی خوشی یعنی روزہ کھولنے کے وقت میں بھی اس طرح دو بناؤں پر ہے اہل شکم کو تو یہ خوشی ہوتی ہے کہ پیٹ بھر گیا اور اہل معنی کو یہ خوشی ہوتی ہے کہ الحمدللہ حق تعالیٰ نے رہزنوں سے محفوظ رکھا اور روزہ کو تمام فرما دیا اور خدا تعالیٰ تک پہنچنے کا ذریعہ قائم ہو گیا ہم اس قابل کہاں تھے اور یہ تقسیم مصلحت کی باعتبار اختلاف مذاق کے ہے اور ہر شخص کا مذاق ہے اپنا اپنا۔

کسی شخص نے کسی زیادہ کھانے والے سے پوچھا کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ چار روٹیاں۔ دو اور دو مکان بھی چار روٹیاں ہی ہوتی ہیں اور سب روٹیاں ہی ہو گئیں غرض یہ ہے کہ جو چیز جس کی طبیعت پر غالب ہوتی ہے ہر جگہ اسی کا خیال ہوتا ہے۔

ایک بادشاہ نے سنا تھا کہ فلاں طرف کی عورتیں بے عقل ہیں چاروں طرف کی چار عورتیں جمع کیں معلوم نہیں کہ وہ باندیاں تھیں یا بیویاں غرض ان کو جمع کر کے آزمایا بات چیت کرتے رہے صبح کے وقت چاروں سے پوچھا کہ کیا وقت ہے، یہ تو علی الاتفاق جواب دیا کہ صبح ہونے لگی مگر دلائل مختلف تھے۔ چنانچہ بادشاہ نے جب کہا کیسے معلوم ہوا ایک نے کہا کہ نتھ کے موتی ٹھنڈے معلوم ہوتے ہیں، دوسری نے کہا کہ چراغ کی روشنی ماند ہو گئی

---

[1] الصحیح للبخاری ۹: ۱۷۵، الصحیح لمسلم کتاب الصیام ب: ۳۰، رقم: ۱۶۴

ہے، تیسری نے کہا کہ پان کا مزہ بدلا ہوا معلوم ہوتا ہے یہ زیادہ لطیف المزاج تھی، چوتھی نے کہا کہ مجھے پاخانہ آیا پس معلوم ہوا کہ صبح ہوئی اس لئے کہ صبح کو پاخانہ پھرا کرتی ہوں بادشاہ نے کہا کہ شاباش تو بڑی لطیف مزاج ہے۔

سو ہمیں تو یوں خوشی ہوتی ہے کہ پیٹ بھر گیا اور واقعی ہم اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کے بھی محتاج ہیں بعض وقت عارف بھی ادنیٰ نیت کو اختیار کرتا ہے اور اعلیٰ کو چھوڑ دیتا ہے جو ابوالحال ہیں اور ابوالوقت (وہ سالک جو اپنے حال پر غالب ہو) بقصد و اہتمام ایسا کرتے ہیں اس لئے کہ حدیث میں آیا ہے:

ان اللّٰہ یحب ان یوتی رخصه کما یحب ان یوتی عزائمه[1]

بے شک اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے کہ اس کی رخصتوں پر عمل کیا جاوے جیسا کہ پسند کرتا ہے کہ اس کی عزیمتوں پر عمل کیا جاوے۔

اور پسندیدگی جب ہی ہے جب کہ بنظر تواضع و افتقار رخصتوں پر عمل کرے بوجہ کاہلی اور سستی جان نہ بچاوے۔

وهذا يستنبط من قوله ايضا افضل الاعمال ماديم عليه. (لم اجد هذا الحديث فی "موسوعة اطراف الحديث"

(نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول افضل الاعمال ماديم علیہ یعنی افضل عمل وہ ہے جس پر دوام و ہمیشگی کی جائے سے مستنبط ہے) اور اس میں ایک راز ہے وہ یہ کہ رخصت پر عمل کرنا ضعف اور افتقار ہے پس وہ حضرات کبھی اپنے اوپر حالت بندگی، احتیاج، افتقار غالب کرنے کے لئے رخصت پر عمل کرتے ہیں (نہ کہ سستی سے) اور اس سے کبھی دعوے کا علاج ہوتا ہے کہ عجب اور خود پسندی نہ پیدا ہو جائے گویا بزبان حال کہتے ہیں کہ اے اللہ ہم اس قابل کہاں کہ عزائم پر عمل کریں یہ تو بڑے لوگوں کا کام ہے۔

درنیابد حال پختہ ہیچ خام　　پس سخن کوتاہ باید والسلام

ناقص کامل کی حالت کو نہیں سمجھتا کیونکہ حالات امور ذوقیہ ہیں دلائل یا ادراک سے ادراک ممکن نہیں جب خام پختہ کے حال کو نہیں سمجھ سکتا تو تطویل کلام سے کیا فائدہ۔

---

[1] الصحيح لابن خزيمه: ۹۵۰، المعجم الكبير للطبرانی ۱۱: ۳۲۳

نیت کی اہمیت

اگر عمل رخص پر اس نیت سے ہو تو یہ بھی بڑا درجہ ہے حضرت حاجی قدس سرہ سے کسی نے عرض کیا کہ حضرت میں چاہتا ہوں کہ حضرت سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مجھے زیارت ہو جائے آپ نے فرمایا کہ بھائی تم بڑی ہمت اور بڑے حوصلہ کے ہو کہ زیارت نبویؐ کے طالب ہو ہماری لیاقت تو فقط اس قدر ہے کہ اگر گنبد خضرا شریف پر نگاہ پڑ جاوے جو مدینہ منورہ سے چار پانچ میل کے فاصلہ پر نظر آتا ہے تو بڑی خوش نصیبی ہے ہماری لیاقت اس قدر کہاں کہ ڈیوڑھی پر حاضر ہو سکیں۔

حدیث میں ہے کہ ایک شخص سب سے اخیر میں دوزخ سے گھسٹتا ہوا نکلے گا اور وہ جہنم میں شور وغل کرے گا کہ اے اللہ میں ہی کیوں رہ گیا۔ حکم ہوگا کہ اس کو یہاں سے نکال کر دوزخ کے کنارہ پر بٹھا دو۔ پس ایسا ہی ہوگا اور اس کا منہ دوزخ کی طرف ہوگا۔ لپٹ لگے فریاد کرے گا۔ حکم ہوگا کہ دوزخ کی طرف اس کی پشت کر دو۔ پشت کرنا تھا کہ اب جنت نظر آنا شروع ہوئی اور اس کی ایک درخت پر نظر پڑے گی تو عرض کرے گا کہ اے اللہ! اس درخت تک پہنچا دیجئے۔ پھر دوسرے درخت پر نظر پڑے گی اس کے لئے بھی یہی تمنا کرے گا۔ ارشاد ہوگا یہ کیا ابھی تو ایک ہی درخت تک کی فرمائش تھی اب دوسرے درخت کی فرمائش ہوگئی، مگر اس پر غلبہ خواہش کا ہوگا اور صبر نہ کر سکے گا۔ پس عرض کئے جائے گا۔ غالباً حضرت امام حسن بصری جو تابعی ہیں یا اور کوئی بزرگ اس حدیث کو بیان کر کے فرمانے لگے کہ کاش میں وہی شخص ہو جاؤں۔ ان پر کس قدر خشیت تھی۔ اپنے کو کس قدر کم درجہ کا سمجھتے تھے کہ اے اللہ میں ہی وہی شخص ہو جاؤں کہ کبھی دوزخ سے نکل جاؤں گا۔

پس حدیثوں سے بھی تائید ہوگئی کہ کبھی ادنیٰ درجہ کی نیت کرنا بھی مقبول عنداللہ ہوتی ہے بہرحال اعلیٰ صورت کو ان کے مذاق کے موافق اور اہل معنی کو ان کے مذاق کے موافق حکمتیں دکھلا دیں کہ اہل صورت کو شکم سیر بنا دیا اور اہل معنی کو قابل حضوری درگاہ بنا دیا غرض تمام اوقات صلوٰۃ میں وسعت ہے۔

مسائل نماز جمعہ

ہاں جمعہ میں ایسی وسعت نہیں بلکہ اذان کے بعد فوراً ہی نماز کے لئے چلنے کا حکم ہیاور

سب کام بعد اذان کے چھوڑ دینے کا حکم ہے اس حکم سے اشارۃً یہ بھی سمجھ آیا کہ جمعہ متعدد مسجدوں میں مناسب نہیں اور سب جگہ نماز جمعہ برابر نہیں اگر برابر ہوتو اس قدر تنگی کیوں کی جاتی کہ فوراً اذان ہوتے ہی نماز کے لئے چلنا واجب کر دیا گیا کیونکہ اگر ایک شخص کو ایک جگہ جمعہ میسر نہ ہوتا تو دوسری مسجد میں پڑھ لیتا اصلی مرضی یہی ہے کہ سب لوگ جمع ہو کر جماعت سے ایک جگہ جمعہ ادا کریں اس زمانہ میں بعضے مجتہدین پیدا ہوئے ہیں، جو بغیر جماعت کے بھی اور جنگل میں بھی جمعہ صحیح فرماتے ہیں اور شہر اور جماعت کو شرائط جمعہ نہیں کہتے۔ سو یاد رکھو کہ مجتہد بننا ہر ایک کے لائق نہیں

نہ ہر کہ آئینہ داد سکندری داند

یعنی یہ ضروری نہیں کہ جو شخص بھی آئینہ رکھتا ہو وہ سکندری بھی جانتا ہو۔

مجتہد ہونا بڑا مشکل ہے، بہت علم اور فہم درکار ہے افسوس ہے کہ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو کہا جاتا ہے کہ فقط سترہ حدیثیں جانتے تھے غضب کی بات ہے کہ اتنی حدیثوں پر اس قدر اجتہاد ممکن نہیں کہ یہ روایت صحیح قرار دی جاوے کیسے ہوسکتا ہے کہ سترہ حدیثیں معلوم کر کے محدث اور مجتہد ہو جاوے۔ بہر حال یقیناً آپ کے ماخذ وسیع ہیں مگر پھر بھی آپ کا زیادہ اجتہاد عمق نظر سے تھا۔ اور اجتہاد ایک ذوقی امر ہے وسعت نظر پر موقوف نہیں اور عمق نظر ہر ایک کو نصیب نہیں۔

شاہد آں نیست کہ موی ومیانے دارد　　　بندہ طلعت آن باش کہ آنے دارد

محبوب وہ نہیں کہ جس کے بال عمدہ اور کمر پتلی ہو بلکہ محبوبیت اس کی ایک آن اور ادا میں ہوتی ہے جو محبوب اور دلکش ہوتی ہے۔

نعمت اجتہاد

بعضے اشخاص کے ہاتھ پیر بھدے مگر سراپا مجموعی اعتبار سے دیکھا جاوے تو اس میں ایک آن دلکش ہوتی ہے تو کیا بات ہے سمجھ میں نہیں آتی ایسے ہی اجتہاد ایک آن ہے خدا جس کو دیتا ہے اس کو ملتی ہے ڈھیر کتابوں کا موجود ہو اور وہ آن نہ ہو تو کچھ بھی فائدہ نہیں ایسے ہی بزرگی ایک آن ہے وظیفہ کی کثرت اور کم گوئی وغیرہ پر اس کا مدار نہیں۔

چند بار روایت میں دیکھا ہے کتاب کا نام یاد نہیں۔

ان ابا بکرلم یفضلکم بکثرۃ الصیام والصلوٰۃ لکن بھا وقرفی قلبہ او کما قال

یعنی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بزرگی صحابہؓ پر اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ وہ اوروں سے زیادہ نماز روزہ کرتے تھے لیکن اس چیز کی وجہ سے جوان کے قلب میں القاء کی گئی تھی۔ بزرگی زیادہ نفلوں کی وجہ سے نہیں بلکہ وہ ایک خاص مناسبت ہے جس کو حقیقت شناس اور اہل نظر پہنچانتے ہیں اور طالب، علامات سے معلوم کرتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ بزرگ کی صحبت میں یہ اثر ہوتا ہے کہ دین کی رغبت معاصی سے نفرت، دنیا سے زہد آخرت کی رغبت پیدا ہو جاتی ہے اور دین کی سمجھ دینی علم اور اس میں ایک خاص اثر پیدا ہو جاتا ہے اسی طرح اجتہاد ایک کیفیت ہے جس کا ادراک ذوق سے ہوتا ہے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی حرص کرنا کہ ہم مجتہد ہیں محض دعویٰ ہے۔

آنچہ مردم میکند بوزینہ ہم

(جو انسان کرتے ہیں وہی بندر بھی کرتا ہے)

ایک نائی نے کسبت رکھی بندر استرہ لے گیا اور درخت پر جا بیٹھا اور استرہ باوجود مختلف تدبیروں کے نہیں دیا نائی نے ایک دوسرا استرا اپنی ناک پر رکھ کر آہستہ آہستہ پھیرا اس نے بھی ناک پر رکھ کر خوب پھیرا ناک کٹ گئی۔ بڑا فرق ہے۔

ایک آنریری مجسٹریٹ جاہل کوئی سفارش لے کر کلکٹر کے اجلاس میں پہنچے فیصلوں کی کیفیت دیکھی سرشتہ دار نے عرضی پیش کی کلکٹر نے حکم دیا کہ منظور پھر دوسری پیش کی اس نے حکم دیا کہ نامنظور اتنی بات دیکھ کر وہاں سے بھاگے اور اپنے سررشتہ دار سے عرضیاں اپنے اجلاس میں پیش کرائیں اول کو منظور دوسری کو نامنظور۔ اسی طرح عدد طاق کو منظور اور عدد جفت کو نامنظور کہنا شروع کیا۔ جب حاکم معائنہ کے لئے آیا حقیقت کھل گئی۔

اسی طرح ہم جیسوں کے لئے مجتہد ہونے کا دعویٰ مسخرہ پن ہے پس اجتہاد تنہا جمعہ کی نماز پڑھنے کا بھی ایسا ہی ہے ہاں مجموعہ اذان و جماعت کے لئے جمعہ کے وقت میں بھی تنگی نہیں مثلاً اگر وقت ہو جانے کے ایک گھنٹہ بعد اذان کہی جاوے تو اس میں بھی تنگی نہیں البتہ

اذان کے بعد دوسرے کاموں میں مشغولی ناجائز ہے پس نمازوں کے متعلق یہ وسعتیں کرکے ہمارے طبائع کی رعایت فرمائی گئی۔

وسعت الصیام

اسی طرح روزہ میں بھی وسعت کی رعایت فرماتے ہیں۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الابيض مِنَ الْخَيْطِ الا سودِ مِنَ الْفَجْرِ

یعنی صبح ہونے سے پہلے تک کھاؤ پیو پھر فرماتے ہیں۔

ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى اللَّيْلِ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ

رات تک روزہ کو پورا کیا کرو تم لوگوں کے واسطے روزہ کی رات میں اپنی بیبیوں سے مشغول ہونا حلال کر دیا گیا ہے۔ فالان باشروھن سو ان بیبیوں سے اب ملو ملاؤ۔

عورتوں کو حلال کیا رات کو۔ سو رات کے شروع سے عورتیں حلال ہو گئیں اور باشروھن پر آگے عطف کیا ہے۔ کلوا واشربوا کو اور اس کو مغیا کیا ہے حتیٰ یتبین کے ساتھ اور متعاطفات متماثل ہوتی ہیں تو مباشرت کی اجازت بھی صبح تک ہوئی اسی طرح اکل وشرب کی بھی پس معنی یہ ہوئے کہ دن چھپے کے وقت سے صبح نکلنے تک دن کی کمی کا عوض اچھی طرح نکال لو سو یہ کتنی وسعت ہوگئی اور یہ اور بات ہے کہ ان میں انہماک مناسب نہیں کہ اس میں بعض مقصود روزہ کے فوت ہوتے ہیں کھانا کم ہی کھانا مناسب ہے اور اس میں راحت روحی بھی ہے لیکن شریعت کھانے وغیرہ سے نہیں روکتی۔ بعضے حریصوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تو کھانے کی اجازت دیتا ہے کہ کلوا واشربوا (تم کھاؤ اور پیو) تو بعض حکماء نے بطور لطیفے کے جواب دیا ہے۔

گرچہ خدا گفت کلوا واشربوا ۔۔۔ لیک نہ گفت ست کلوا تا گلو

اگر چہ اللہ تعالیٰ نے کلوا واشربوا (تم کھاؤ پیو) فرمایا ہے لیکن یہ نہیں کہ گلو تک کھاؤ۔

جس طرح بعضے لوگ جو لاتسرفوا (اسراف مت کرو) میں مبالغہ کرکے تقلیل کو انتہا تک پہنچا دیتے ہیں ان کو کسی نے جواب دیا ہے۔

گرچہ خدا گفت ولا تسرفوا ۔۔۔ لیک فرمود بکلھیا وضو

یعنی اگر چہ خدا تعالیٰ نے لاتسرفوا (اسراف مت کرو) فرمایا ہے لیکن بکلھیا وضو

(ایک کلھیا سے وضو) نہیں فرمایا ہے۔

البتہ کلوا واشربوا (تم کھاؤ پیو) سے محرمات خارج ہیں ولاتسرفوا (اسراف مت کرو) اس پر دال ہے جیسے کسی رند نے کہا تھا۔

ہم توبہ جب کریں گے کباب وشراب سے — قرآن میں جو آیۂ کلوا واشربوا نہ ہو

ایک دیندار شاعر نے جواب دیا۔

تسلیم قول آپ کا ہم جب کریں جناب — جب آگے واشربوا کے ولاتسرفوا نہ ہو

بہرحال اعتدال ہونا چاہئے کھانے پینے میں اعتدال ہو اور امور میں بھی اعتدال ہو غرض تمام چیزوں میں ہماری طبیعت کی رعایت ملحوظ رکھی گئی چنانچہ تاخیر سحور کو مستحب فرمادیا تاکہ جسمانی راحت بھی ہو اور روحانی بھی روزہ تو شروع ہوا ہے صبح سے اگر آدھی رات سے کھانا کھالیتے ہیں تو دن میں بھوک کی کلفت ہوتی خلاصہ یہ کہ احکام شرعیہ میں ظاہری و باطنی ہر طرح کے مصالح مرعی ہیں۔

بہار عالم حسنش دل وجاں تازہ میدارد — برنگ اصحاب صورت رابوار باب معنی را

اس کے عالم حسن کی بہار اصحاب ظاہر کے دل وجان کو رنگ یعنی ظاہری حسن سے اور ارباب معنی کے دل وجان کو بو یعنی باطنی حسن وخوبی سے تر وتازہ رکھتی ہے۔

افطاری میں عجلت

اسی طرح تعجیل افطار کو ملاحظہ فرمائیے کہ تعجیل کا امر فرمایا کہ زمانہ ترک اکل کا کم رہے اور پھر تاخیر سحور وتعجیل افطار میں باطنی مصلحت حد شرعی کی رعایت ہے کہ روزہ کی ابتدا و انتہا خلط نہ ہو جائے اسی طرح اتباعاً للشرع (شرع کی اتباع کر کے) امام کو اہل صوم کی رعایت چاہئے کہ مغرب کا وقت تنگ سمجھ کر جلدی نہ کرے مغرب کا وقت عشاء کے وقت ہونے تک باقی رہتا ہے خوب اطمینان سے آدمی کھانا کھا سکتا ہے لیکن اس قدر دیر نہ ہو کہ نماز ہی خراب ہو جاوے روحانی اور جسمانی امر کی یہاں بھی رعایت فرمائی جیسا اوپر بیان کیا گیا۔

اسی طرح مثل دوسرے رعایتوں کے کینہ وغصہ میں بھی طبیعت کی رعایت کی کہ یہ حکم نہیں دیا کہ ابھی غصہ دھو کر رنج دور کر دو اور اگرچہ کامل مجاہد وہی ہے جو ایسا کرے اور یہ بات

ممکن بھی ہے لیکن اس میں تکلیف بہت ہوتی ہے اس لئے تین دن کی اس میں بھی مہلت دے دی تا کہ سب بسہولت عمل کرسکیں ورنہ بعض کو دشواری ہوتی جیسا حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَلَوْاَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ اَوِاخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَافَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ

(کہ اگر ہم ان پر یہ بات فرض کر دیتے کہ خود کشی کرلیا کرو، یا گھروں سے نکل جایا کرو اور جلاوطن پھرا کرو تو اس حکم کی تعمیل فقط تھوڑے ہی لوگ کرتے)

غرض یہ ثابت ہوا کہ کرتے تو، گو تھوڑا ہی پس اسی طرح غصہ کو فوراً بجھا تو سکتا ہے مگر تکلیف اس میں بہت اس لئے تین دن کی مہلت دے کر اس کے بعد ممانعت فرمادی اور یہ وعید فرمائی کہ شب برأت میں سوائے مشرک اور کینہ رکھنے والے کے سب کی مغفرت ہو جاتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ کینہ ایسی بری چیز ہے کہ عدم مغفرت میں اس کو شرک کے برابر کیا گیا وجہ یہ ہے کہ کینہ رکھنے میں حق عبد فوت ہو جاتا ہے اور یہی مصلحت ایک روایت میں اور طرح مذکور ہے کہ اس میں سال بھر تک کلام نہ کرنے والے کو قاتل نفس سے تشبیہ دی ہے اور حق عبد کا حق تعالیٰ نہیں بخشتے اور شرک بھی ان حقوق الٰہیہ میں سے ہے جس کو حق تعالیٰ نہیں بخشا کرتے پس اس میں دونوں عدیل ہوگئے ہاں قیامت میں حق تعالیٰ ان اہل کینہ میں سے جس کو چاہیں گے اس کے لئے اس سے بھی اس طور رہائی کرا دیں گے جیسے کہ یہاں حکام جن فریقین کو باہم راضی نامہ دلانا چاہیں تو دلا دیتے ہیں، مگر اتنا فرق ہے کہ یہاں تو کبھی دونوں فریق راضی نہیں ہوتے گو جبراً حاکم کے کہنے سے راضی نامہ داخل کر دیتے ہیں اور حاکم کو فریقین پر قدرت نہیں کہ بخوشی ان کو راضی کر دے مگر اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہیں وہ جبر نہ فرمائیں گے بلکہ اسباب خوشی کے پیدا کر دیں گے۔

چنانچہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جس کو قاضی ثناء اللہ نے رسالہ حقیقت الاسلام میں نقل کیا ہے کہ جب قیامت کا روز ہوگا بڑے بڑے عالی شان محل لوگوں کو نظر پڑیں گے اور ندا ہوگی کہ ہے کوئی ان محلوں کا خریدار وہ حیران ہوں گے عرض کریں گے کہ اس کو کون خرید سکتا ہے ارشاد ہوگا کہ قیمت تو پوچھی ہوتی (پھر مایوسی ظاہر کی جاتی) وہ قیمت دریافت کریں

گے جواب ملے گا کہ اس کی قیمت یہ ہے کہ جس کے ذمہ کسی دوسرے کا حق آتا ہو وہ معاف کردے اس کے عوض یہ محل مل سکتے ہیں۔ ہزاروں آدمی محل خریدنے کو حقوق معاف کردیں گے اور یہ انہی لوگوں کے ساتھ برتاؤ ہوگا جن کو بخشنا حق تعالیٰ کو منظور ہوگا لیکن خود معاف نہ فرمائیں گے۔ معافی جب ہی ہوگی جب کہ بندے باہم خود معاف کریں شہادت اتنی بڑی چیز ہے مگر حقوق العباد اس سے بھی نہیں معاف ہوتے۔

حقوق العباد

حقوق العباد اتنی بڑی چیز ہیں۔ لوگوں کو اس کی پرواہی نہیں۔ نماز روزہ کرتے ہیں تسبیح پڑھتے ہیں۔ کسی کا اناج دبالیا، زمین دبالی، خصوصاً زمینداروں کو بالکل اس طرف توجہ نہیں اور وہ کہتے ہیں۔

لا ریاسة الا بالسیاسة ای بالسیاسة المتلفة لحقوق الغیر

ریاست بدون سیاست کے نہیں ہوتی یعنی ایسی سیاست سے جو حقوق غیر کو تلف کرنے والی ہو۔

ایک صاحب بہت معمر ہمارے ہاں کے پرنالہ کا چونا اکھاڑ رہے تھے۔ کہا گیا یہ کیا کرتے ہو۔ جواب دیا اجی میں مخادیم بھی ہوں جیون بھی ہوں۔ غرض یہ مخدومیت و شیخ زادگی کا قیام بغیر ظلم نہیں ہوتا اس لئے ظلم کرتا ہوں کہ ظلم نہ کرنا شیخ زادگی کے خلاف ہے چونکہ مخادیم ہیں اس لئے بغیر ظلم کئے کیسے زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ انہوں نے ہی کہیں مسخرے پن سے کیکر کاٹ لیا کہیں کسی کا قرض لے کر مار لیا چار سو، پانچ سو، چار ہزار، پانچ ہزار کچھ پرواہی نہیں۔ زمینداری میں بڑا ظلم ہوتا ہے۔ اس سے قلب مسخ ہو جاتا ہے۔ (بھلائی برائی کی تمیز نہیں کر سکتا)

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ کافر کا حق مارلو۔ اس کا کچھ حرج نہیں۔ حالانکہ یہ زیادہ حرج کی بات ہے۔ اس لئے کہ قیامت میں جب نیکیاں چھین کر اہل حقوق کو دی جاویں گی تو مسلمان کو ہی اگر ملیں تو اچھا ہے اس سے کہ کافر کو ملیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ بڑے محقق عالم تھے فرمانے لگے کہ اگر بے ایمانی ہی کرنا ہو تو مسلمان کا حق مارے۔ کافر کی حق تلفی نہ کرے تا کہ نیکیاں کافر کے پاس نہ جاویں۔ اسی طرح ایک اور لطیف بات فرماتے ہیں جس سے آپ کی شان محققیت ظاہر ہوتی ہے۔ فرمانے لگے جو شخص اولیاء اللہ اور ملائکہ کو سجدہ کرے وہ زیادہ احمق ہے اس شخص

سے جو فرعون کو سجدہ کرے۔ ظاہر ہے کہ ایک بادشاہ کے سامنے دو شخص ہوں جن میں ایک کہتا ہے کہ میں بادشاہ ہوں۔ دوسرا ہاتھ جوڑے کھڑا ہے کہ میں غلام ہوں۔ اب تین شخص آئے۔ ان میں سے ایک نے تو بادشاہ کو بادشاہ تسلیم کیا اور دوسرا شخص جو دعویٰ بادشاہی کرتا ہے اسے باغی سمجھا اور تیسرے کو غلام قرار دیا۔ یہ شخص منصف اور عاقل ہے اور ایک شخص نے باغی کو بادشاہ سمجھ کر اس کی اطاعت کی اور بادشاہ کی پروانہ کی۔ تو یہ سرکش اور نادان ہے۔ اور تیسرے نے غلام کو بادشاہ سمجھا۔ یہ اس سے زیادہ احمق ہے۔

اسی طرح فرعون تو اپنے کو خدا کہتا تھا۔ اگر اس کے اس دعوے سے کوئی دھوکا میں آجاوے اتنا عجیب نہیں جتنا اولیاء اللہ جو کہ خود غلامی کے مقر ہیں، ان کو سجدہ کرنا اور ان کے ساتھ وہ برتاؤ کرنا جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کرنا زیبا ہے عجیب ہے۔

اسی قبیل سے یہ بات ہے کہ اگر حق تلفی ہی کرنا ہے کسی مسلمان کی کرے تاکہ نیکیاں کافر کو تو نہ ملیں۔ مسلمان ہی کے پاس رہیں۔ پلیٹ فارم پر خلاف قانون بغیر ٹکٹ چلا جانا۔ پندرہ سیر بوجھ لے جانے کی اجازت ہے اس سے زیادہ لے جانا یہ سب حقوق العباد میں داخل ہیں۔

میرے ایک دوست چند بار انٹر میں تھرڈ کا ٹکٹ لے کر سوار ہو گئے اور کبھی بغیر محصول ریل میں قاعدے سے زیادہ اسباب لے گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی۔ فہرست بنائی ہے اور اب ادا کر رہے ہیں۔

اگر کسی کو شبہ ہو کہ اگر ہمارے ذمہ ایک روپیہ رہ گیا تو اب یہ مشکل ہے کہ اسٹیشن پر ادا کر کے اگر رسید نہ لو تو شاید مہتمم اسٹیشن خود ہی رکھ لے اور اگر رسید لو تو اس میں اقرار جرم ہے۔ فوجداری کا مقدمہ قائم ہوتا ہے۔ سو اچھا شریعت پر عمل کیا کہ یہ نوبت پیش آئی۔

جواب یہ ہے کہ اگر واقعی شریعت پر عمل کیا جاوے تو پوری راحت اور چین میسر ہو سکتا ہے۔ یہ خرابی تو جب ہی پیش آئی جب کہ شریعت پر عمل نہ کیا اور اب جو اس نے توبہ و تدارک کا ارادہ کیا ہے تو حق تعالیٰ کا یہ وعدہ اس کے لئے پورا ہوگا۔

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ لَا يَحْتَسِبُ

یعنی جو اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کی رہائی کر دیتا ہے۔ (مشقتوں سے) اور ایسی جگہ

سے رزق دیتا ہے جہاں سے گمان بھی نہ ہو۔

اعلم ان قوله تعالیٰ من حیث الخ یفید انه لا تصیبه المشقة فی امر الرزق ولاینظر الی غیره تعالیٰ علی سبیل الکمال والنظر فی الجملة الی غیره لابدله فی موضع یحتسب منه الرزق فافهم قاله الجامع.

(جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کا قول **من حیث لا یحتسب** (جہاں سے اس کو گمان نہیں) اس بات کا فائدہ دیتا ہے کہ رزق کے بارہ میں اس کو مشقت اٹھانی نہیں پڑتی اور وہ کامل طور سے غیر اللہ کی طرف نہیں نظر کرتا اور فی الجملہ غیر کی طرف نظر کرنا ایسی جگہ میں کہ جہاں رزق ملنے کا گمان ہے اس کو ضروری ہے)

اور وہ وعدہ اس طرح پورا ہوا ہے کہ میرے ایک دوست نے اس رقم ریلوے کے ادا کرنے کی ایک ترکیب سوچی ہے اور مجھ سے بیان کیا کہ جس لائن کی رقم رہ گئی ہے اس رقم کا اسی لائن کا ٹکٹ جتنی دور تک کامل سکے خرید کر چاک کر ڈالے اور استعمال میں نہ لاوے (اس لئے کہ جس لائن کا نقصان کیا تھا وہ اس طریق پر پورا کر دیا گیا) میں نے بھی پسند کیا مگر خیال رہے کہ ایک لائن کا حق دوسری لائن کا ٹکٹ لینے سے ادا نہ ہوگا۔ اس لئے کہ کمپنی جدا ہے۔ ایسٹ انڈیا اودھ روہیل کھنڈ وغیرہ۔ مگر یہ وقت ایسا عجب ہے کہ اگر کوئی حقوق سے سبکدوش ہونا چاہے تو اس کو احمق بتاتے ہیں۔

چنانچہ میرے ایک دوست بی، اے سفر میں بوجہ تنگی وقت بغیر وزن کرائے اسباب کے ریل میں سوار ہو گئے۔ اسٹیشن پر پہنچ کر ٹکٹ بابو سے کہا کہ اسباب بظاہر زیادہ ہے اور قصہ بیان کیا اور کہا کہ آپ وزن کر کے محصول لے لیجئے وہ منہ دیکھنے لگا اور کہا لے بھی جاؤ بغیر محصول کے۔ انہوں نے کہا کہ آپ مالک نہیں اس لئے آپ کیسے چھوڑ سکتے ہیں وہ ان کو اسٹیشن ماسٹر کے پاس لے گیا۔ اس نے بھی وہی کہا جو ٹکٹ بابو نے کہا تھا۔ انہوں نے بھی وہی جواب دیا جو اس کو جواب دیا تھا۔ پھر وہ دونوں باہم انگریزی میں گفتگو کرنے لگے۔ یہ بھی بی اے تھے گفتگو کو سمجھ گئے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اس شخص نے شراب پی ہے انہوں نے کہا میں نے شراب نہیں پی۔ اہل حق کا حق ادا کرنا چاہتا ہوں۔

یہ روایت شاید پہلے بھی میں نے بیان کی ہے۔ لوگوں کو اتنی اجنبیت ہوگئی ہے حق سے کہ کسی کا حق ادا کرنے سے فساد عقل تصور کیا جاتا ہے۔ (ذرا غور فرمایئے مخالفین اسلام کے اخلاق مہذبہ اور دیانت اور نئی روشنی پر) واقعی انہوں نے شراب محبت الٰہی تو پی تھی جس نے ایسا مست کردیا اور وہ مست اور لایعقل ہونے کے لئے پی جاتی ہے۔

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند　　　صاف گر باشد ندانم چوں کند

یعنی جب ایک گھونٹ خاک آلودہ مجنوں بنادیتا ہے گر صاف وشفاف ہوتو نہ معلوم کیا کرے گا یعنی جب تھوڑی محبت الٰہی غیر خالص یہ اثر کرتی ہے اگر خالص ہوتو نہ معلوم کیا کرے گی۔

آزمودم عقل دور اندیش را　　　بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

عقل دوراندیش کو بارہا آزمایا۔ جب اس سے کام نہ نکلا تو اس کے بعد اپنے آپ کو میں نے دیوانہ بنایا۔

بادہ در جوشش گدائے جوش ماست　　　چرخ در گردش اسیر ہوش ماست

یعنی شراب اپنے جوش میں ہمارے جوش کی محتاج ہے۔ آسمان گردش میں ہمارے ہوش کا اسیر ہے۔

غرض ان لوگوں نے محصول نہیں لیا۔ آخر انہوں نے اسباب ورن کر کے ٹکٹ خریدا اور پھاڑ کر پھینک دیا اور اس طریق پر حق ریلوے ادا کیا۔ یہ اسی محبت کا نتیجہ ہے کہ ایسا خوف غالب ہوا کہ بغیر ایصال حق چین نہ پڑا۔ دین وہ چیز ہے کہ بغیر اس کے امن دنیا میں نہیں قائم رہ سکتا۔

لَاتُفْسِدُوا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ (ای اعبدوه)

تم لوگ زمین میں بعد اس کے کہ اس کی درستی کی گئی ہے فساد مت پھیلاؤ اور تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔

عابد کبھی مفسد نہیں ہوسکتا۔ قیامت تک یہ سب حقوق العباد ہیں، جو شہادت سے بھی معاف نہیں ہوتے۔ پس اس شب میں باوجود رحمت کے عام ہونے کے بھی جن کی مغفرت نہ ہوئی، سمجھئے کہ بڑے ہی ناقابل ہیں۔ اس پر ایک مضمون یاد آیا۔

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی سب پر　　　تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ خدا تعالیٰ ان پر رحمت فرمانے کا ارادہ کرتے ہیں اور پھر

بھی ان کی نا قابلیت کے سبب رحمت ان سے متعلق نہیں ہوتی۔ جیسے کسی کا قول ہے۔

نقصاں ز قابل است وگرنہ علی الدوام | فیض سعادتش ہمہ کس را برابر است

نقصان قابل کی طرف سے ہے ورنہ محبوب حقیقی کا فیض سعادت تمام لوگوں پر برابر جاری ہے۔

حدیث کی اہمیت

جس کی ظاہری توجیہ حکماء کے قول پر منطبق ہے چونکہ سب میں قابلیت نہیں اس لئے حق تعالیٰ شانہٗ سب کو وہ فیض نہیں عطا فرما سکتے۔ سو یہ غلط محض ہے اور وہ لوگ جاہل اور مشرک تھے۔ فیض کو اضطراری قرار دیتے ہیں اور ہمارے مذہب کے موافق یہ بات ہے کہ فیض برابر جاری ہے اور حق تعالیٰ اپنے اختیار سے جسے چاہیں مرحمت فرماتے ہیں اور وہ اسی کو چاہتے ہیں جو طالب ہو اور جو طالب نہیں اس کو وہ چاہتے ہی نہیں اور یہ بات نہیں کہ خدا نے ایک کام کرنا چاہا اور وہ نہ ہو سکا۔ وہ فاعل مختار ہے اور پاک ہے عجز سے مگر عادت یہ ہے کہ طالب کو دیتے ہیں ناکارہ کو نہیں دیتے۔

اَنُلزِمُکُمُوھَا وَاَنتُم لَھَا کَارِھُونَ.

یعنی کیا اپنی رحمت تمہارے سر چپکا دیں۔ حالانکہ تم کو اس کی پروا بھی نہیں۔

غرض یہ سب حقوق العباد ہیں جن کی مغفرت نہیں ہوتی، اور بعض روایات اس وقت غیر محفوظ ہیں جن میں اور بھی مستثنیات ہیں۔ وہاں کوئی اور مانع ہوگا۔ یہ ہیں برکات اس شب کے۔ پس اس شب مبارک کو بنایا اور ایک تفسیر پر قرآن میں اس کو مبارک فرمایا۔ لیکن دوسری تفسیر لے لی جائے تب بھی مضر مقصود نہیں۔ کیونکہ تمام مضامین کا قرآن ہی سے ثابت ہونا ضروری نہیں۔ یہ مضمون حدیثوں سے بھی ثابت کر دیا گیا ہے۔ گو آج کل بعضوں کو یہ خبط ہے کہ ہر چیز کی دلیل قرآن سے مانگتے ہیں مگر یہ غلطی عظیم ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے عدالت میں فلاں گواہ فلاں گواہ پکارے جاتے ہیں اور ان کے ذریعہ سے دعویٰ ثابت کیا جاتا ہے۔ مدعا علیہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ گو یہ گواہ مجروح نہیں مگر میری تسلی تو جب ہوگی جب کہ فلاں فلاں گواہ گواہی دیں۔ تو کیا عدالت اس کی درخواست کو پورا کرنا ضروری سمجھے گی۔ ہرگز نہیں۔ پس اسی طرح قرآن حدیث احکام پر

مستقل گواہ ہیں اور اجماع اور اجتہاد مجتہد مستند ہیں انہیں دو اصولوں کی طرف اور اصل قرآن وحدیث ہی ہیں۔ اور اجماع اور اجتہاد مجتہد مظہر حکم ہیں، مثبت حکم نہیں اور حدیث میں کتاب کی طرف ایسا استناد نہیں بلکہ سنت خود مستقل طور پر مثبت احکام ہے۔

بعضوں نے جو قصر مسافت کر کے فقط قرآن ہی کو کافی سمجھا ہے یہ بالکل گمراہی ہے۔ حدیث میں ہے کہ فرمایا جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میں قرآن دیا گیا ہوں اور اس کی مثل اور دیا گیا ہوں۔ (یعنی احادیث جو وحی غیر متلو ہیں) مثل کو مقارن کتاب اللہ کے فرمایا ہے اور چند احکام آپؐ نے فرمائے کہ یہ قرآن میں کہاں ہیں جن میں یہ بھی تھا کہ گدھے کا کھانا حرام ہے۔ پس حدیث سے معلوم ہوا کہ گدھا کھانا حرام ہے۔ پھر کیسے کہہ سکتے ہیں کہ فقط قرآن مجید کافی ہے جب کہ مشاہدہ گواہ ہے کہ بہت احکام قرآن مجید میں نہیں ہیں اور احادیث میں ہیں۔ اور بحکم

مَا اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھَاکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا

جو کچھ رسول تم کو دیں اس کو لے لیا کرو اور جس چیز سے تم کو روک دیا کریں تم رک جایا کرو۔

ان احکام پر بھی عمل مثل باحکام قرآن واجب ہے اور اگر شبہ ہو کہ قرآن تو تبیانا لکل شیء ہے (یعنی ہر چیز اس میں موجود ہے)

جواب یہ ہے کہ تبیاناً لکل شیء من المھمات (یعنی مہمات میں سے ہر چیز اس میں موجود ہے) اور مہمات کا مفہوم مشکک ہے۔ سو جو مہمات قرآن میں مذکور ہیں اسی درجہ کی مہمات مراد ہیں۔ یا تبیان سے مراد عام ہے۔ خواہ جزئیاً ہو یا کلیاً اور کلیاً ہر حکم کا ثابت ہونا یہ قرآن کی طرف منسوب ہو سکتا ہے ان آیات کے اعتبار سے کہ:

مَا اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا

تم کو جو کچھ رسولؐ دیں اس کو لے لیا کرو اور جس چیز سے روک دیں اس سے رک جایا کرو

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ (تم اللہ تعالیٰ کا کہا مانو اور رسول کا کہنا مانو)

چنانچہ ایک عورت نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ تم کیسے لعنت کرتے واشمہ ومستوشمہ وغیرہما پر حالانکہ قرآن میں ایسے موقعہ پر لعنت کرنا کہاں مذکور ہے آپ نے فرمایا

لو قرائیته لو جدتیه یعنی اگر تو قرآن پڑھتی تو اس حکم کو پالیتی اور آپ نے یہ آیت پڑھی۔ ما اتاکم الرسول۔ الخ یعنی جو چیز تم کو رسول دیں وہ لے لو اور جس چیز سے روکیں اس سے باز رہو یعنی ان کے امر کی تعمیل کرو اور انہی سے باز رہو) اور چونکہ رسول نے لعنت کی ہے اس لئے میں بھی لعنت کرتا ہوں اور رسول کے قول وفعل کی اطاعت کا وجوب قرآن سے ثابت ہے۔

غرض حضرت ابن مسعود کے اس قول سے یہ ثابت ہوگیا کہ قرآن کا تبیانا لکل شیء (اس میں ہر چیز موجود ہے) ہونا عام ہے کلیاً یا جزئیاً اور گو قرآن جزئیاً اس مضمون پر دال نہیں مگر کلیاً دال ہے اور حدیث جزئیاً دال ہے۔ اب یہ شبہ رفع ہوگیا کہ قرآن کافی ہے اور سنت کی حاجت نہیں۔ پس اصل حجت اور شاہد حکم یہ دونوں ہیں۔ پس اگر کوئی دعویٰ ایک شاہد سے ثابت کیا جاوے تو کسی کو کہنے کا حق نہیں کہ ہم تو دوسرے شاہد کی شہادت سے مانیں گے۔ پس اگر قرآن سے یہ مضمون نہ بھی ثابت ہو تو حدیثوں سے ثابت ہونا کافی ہے۔ غرض شب برأت کی فضیلت بخوبی ثابت ہوگئی قرآن سے تو احتمالاً اور احادیث سے یقیناً۔

حقیقت بدعت

ان فضائل کے آثار بعض احکام ہیں جو دو قسم کے ہیں۔ ایک کرنے کے یعنی جن کا کرنا مستحب ہے۔ دوسرے نہ کرنے کے یعنی جن کا کرنا بدعت و معصیت ہے اور بدعت کو گو لوگ برا نہیں سمجھتے مگر فی الواقع بدعت بہت بری چیز ہے۔

مثلاً کہ اس شب کو تیوہار بنا لیتے ہیں، ورعید بقرعید کے مشابہ کرلیا خوشی منائی، کھانے پکانے بچوں کو عیدی دی، کپڑے پہنے۔ آپس میں تیوہاری بھیجی، یہ سب اپنی من گھڑت ہے اور شریعت کا مقابلہ ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے انگریزی قانون کے موافق تعطیلیں مقرر ہوں اور کاتب یا ٹائپ پریس والوں نے ایک تعطیل بڑھادی کہ جس روز صاحب کلکٹر کا تقرر ہوا تھا اس روز بھی تعطیل دی جاوے چونکہ بڑے حاکم ہیں۔ اس لئے ان کے تقرر کی خوشی کے مناسب ہے کہ تعطیل کی جاوے اس کے بعد گزٹ صاحب کلکٹر کی نظر سے گزرا تو اب اہل قانون سے جا کر پوچھ لو کہ اس پر سخت مقدمہ قائم ہوگا۔

سو اچھی خوشی منائی کہ جن کے تقرر کے لئے یہ کارروائی کی وہی مقدمہ قائم کرتے ہیں۔ خوشی کرنا بری بات نہیں سمجھی گئی۔ لیکن اس میں ایک دوسرا جزو مذموم ہے اور وہ گورنمنٹ کے تجویز کردہ احکام رعیت میں تغیر کرنا ہے اور اس وجہ سے مجموعہ فاسد ہوگیا۔ اس وجہ سے یہ مقدمہ قائم ہوا۔

اسی طرح شب برأت میں کھانا پکانا' کپڑے بدلنا' خوشی منانا' ان امور پر باعتباران کی ذات کے عتاب نہیں مگر عتاب اس امر پر ہے کہ اس میں بدل دینا ہے حکم شریعت کو اور قانون خداوندی کو اور یہ بغاوت ہے۔ رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تو فقط دو تیوہار تجویز فرمائے ہیں۔ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ۔ اب اس کے سوا تیسرا تیوہار تجویز کرنا مقابلہ شریعت کا ہے اور تغیر ہے احکام شرع کی۔ کم سمجھ لوگ بدعت کی برائی کو نہیں سمجھتے۔ دین کے معاملہ میں بھولے بن جاتے ہیں۔ مگر میں نے تو اوپر احکام گورنمنٹ کی مثال دے کر بھی بدعت کی مذمت سمجھا دی۔ خوب یاد رکھو حجتہ اللہ ختم ہو چکی اور مجھ کو دلائل شرعیہ کے بعد اس مثال کے پیش کرنے سے بھی افسوس ہے کہ اب قال اللہ اور قال الرسول کا زمانہ نہ رہا۔ گورنمنٹ کے احکام پیش کر کے سمجھانا پڑتا ہے میں نے رنج و افسوس کے ساتھ گورنمنٹی حکم کی نظیر بیان کر کے بدعت کی برائی سمجھائی۔ بعضے لوگ اس سے خوش ہوتے ہیں کہ کیسی کافی دلیل ہے اور میں ہمیشہ رنجیدہ رہتا ہوں کہ اس کی نوبت کیوں آئی۔ قال اللہ و قال الرسول کافی نہ ہوا۔

مولوی منفعت علی صاحب مرحوم ایک مجلس میں تشریف رکھتے ہیں۔ معاملات میں سے کسی مسئلہ کا تذکرہ ہوا۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ یہ مسئلہ اس طرح عالمگیری میں لکھا ہے۔ کسی نے مولوی صاحب سے اتفاق نہ کیا۔ پھر کسی نے کہا کہ کلکٹر نے بھی اسی کے موافق فیصلہ دیا تھا یہ سنتے ہی سب متفق ہوگئے۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ ڈوب مرو۔ عالمگیری جو شریعت کی کتاب ہے اس کا نام سن کر تو کسی نے اتفاق نہ کیا اور صاحب کلکٹر کا فیصلہ سن کر سب متفق ہوگئے۔ دنیاوی احکام کی تو اس قدر منزلت اور شرعی احکام کی کچھ بھی پرواہ نہیں۔

ایک شہر میں ایک انجمن میں صاحب کلکٹر مدعو کئے گئے۔ خیر اس میں تو کوئی حرج نہیں دنیوی مصلحت تھی مگر وہاں تو یہ کارروائی کی گئی کہ واعظ صاحب کو ان کے سامنے پیش کیا گیا اور کہا

یہ لیڈر رہیں۔ نام بھی بدل دیا وعظ نہ کہا اور لیڈر رکھا۔ افسوس اور پھر زیادہ افسوس یہ کہ پیش کرنے والے بھی مولوی تھے مگر خان بہادر کا خطاب پائے ہوئے تھے اور پیشی اس لئے کی گئی تا کہ رجسٹری شدہ لیڈر سمجھے جاویں یعنی ان سے درخواست کی کہ آپ اپنے ہاتھ سے ان کو دستار بندی کر دیں صاحب کلکٹر خلیق تھے حیران تو ہوئے لیکن کچھ کہا نہیں۔ خان بہادر صاحب نے صاحب بہادر کا ہاتھ دستار کو لگا کر وہ دستار مولوی صاحب کے جو واعظ تھے باندھ دی وہ مولوی صاحب کہنے لگے کہ میری سند پر بھی کلکٹر کے دستخط کرا دو جب ہی تو وہ معتبر تصور ہوگی۔

لوگوں پر الزام ہے کہ یہ لوگ زمانہ کا رنگ نہیں دیکھتے ہم مصالح پر نظر کر کے کام انجام دیتے ہیں۔ حالانکہ انگریز ایسے احمقوں کی خوشامد سے خوش نہیں ہوتے وہ عاقل قوم ہے اس میں تو ان کا استہزاء ہے۔ احکام شرعیہ کی یہ گت بنائی جاتی ہے۔ پہلے بھی بھدے لوگ ہوئے ہیں۔ میں نے ایک فتوی پرانا دیکھا ہے جس میں یہ حدیث درج تھی جو حقیقت میں حدیث نہیں۔

لعن اللّٰہ اربعاً ذابح البقر وقاتل الشجر. (لم اجد هذا الحديث في "موسوعة اطراف الحديث"

(خدا نے لعنت کی گائے کے ذبح کرنے والے پر اور درخت کاٹنے والے پر)

اور تیسری چوتھی کوئی اور چیز تھی جو یاد نہیں اور اس پر داروغہ اصطبل کے بھی دستخط تھے یعنی وہ مفتی تھا۔ اکبر شاہ کی بھی مہر تھی۔ دہلی میں ظفر شاہ شاعر تھے دیندار بھی نہیں تھے۔ مگر فتاویٰ پر ان کی مہر ہوتی تھی۔ میں نے خود ایک فتویٰ پر دیکھی ہے غرض ہم کو اس پر قلق ہوتا ہے کہ جب تک دین میں ہم دینا کے جوڑ نہ لگا دیں مخاطبین اس جزو دین کو ثابت نہیں سمجھتے جس سے ہم کو بدعت کے لئے وہ مثال دینا پڑی۔

غرض بدعت میں سنکھیا چھپی ہوئی ہے۔ سمیات کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو برنگ سم دوسری برنگ شیرنی جیسے لڈو میں زہر ملا ہوا ہے، ہی معصیت کے بھی دو رنگ ہیں ایک تو برنگ معصیت اور دوسرا برنگ عبادت۔ جس طرح تعطیل عدالت کا بڑھا دینا بظاہر تو خیر خواہی تھی مگر حقیقت میں عداوت تھی اس لئے کہ اس میں تبدیلی تھی حکم عدالت کی۔

دوستی بے خبر جوں دشمنی ست حق تعالیٰ زیں چنیں خدمت غنی ست

بے وقوف کی دوستی حقیقت میں دشمنی ہے۔ حق تعالیٰ ایسی خدمت سے جس میں ان کے حکم میں تغیر لازم آوے، بے پرواہ ہیں۔

اللہ پاک ہے بدعت سے اس کو حاجت نہیں کہ آپ بدعت کی صورت میں عبادت پیش کریں۔ یہ تو بدعت کی مذمت میں تقریر تھی۔

شب برأت کی مستحبات

اس شب میں بھی بعض بدعات ہیں، جن کا بیان آتا ہے اور بعض کھلی معصیت اور بعض مستحبات۔ مستحب تو اس شب کے متعلق تین حکم جو حدیث میں وارد ہوئے ہیں۔ دو قول حدیث میں۔

صوموا نهارها و قوموا ليلها

(اس کے دن میں روزہ رکھو اور رات میں شب بیداری کرو)

اور ایک فعلی حدیث میں وہ یہ کہ آپ بعد عشاء بقیع الغرقد میں (جو مدینہ منورہ میں ایک قبرستان ہے) تشریف لے گئے اور وہاں مردوں کے لئے دعائے مغفرت فرمائی۔ حضرت عائشہ کے پوچھنے پر آپ نے فرمایا تھا کہ میرے پاس جبرائیل علیہ الصلوٰۃ والسلام آئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہاں جا کر مردوں کے لئے دعائے مغفرت کریں۔ یہ روایت ترمذی اور نسائی میں ہے۔ یہ تو ثابت ہے حدیث سے۔ پھر اس پر حاشیہ چڑھایا گیا اور اس پر درحاشیہ اور پھر برحاشیہ۔ اول حاشیہ تو موضح اور مفسر تھا مغیر نہ تھا اور اس میں جائز ہے کہ کوئی مفتی خلاف کرے مگر ہمارے اساتذہ نے خلاف نہیں کیا اور وہ حاشیہ یہ تھا کہ جس طرح حدیث سے استغفار ثابت ہے اسی طرح مردوں کو نفع پہنچایا جاوے۔ قراءۃ قرآن سے صدقات سے۔ اور یہ تینوں بھی مساوی نہیں استغفار تو متفق علیہ ہے معتزلہ بھی اس کے قائل ہیں۔ اور اہل بدعت بھی۔ باقی قراءۃ قرآن میں بعض اہل سنت بھی اور معتزلہ صدقات میں بھی اختلاف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کا ثواب نہیں پہنچتا۔ منکرین وصول ثواب عبادت بدنیہ کے عدم نص سے استدلال کرتے ہیں اور معتزلہ اس نص سے ليس للانسان الا ما سعى (انسان کو اپنی ہی کوشش کا نفع ملتا ہے)

جواب اول کا ورود بعض نصوص کا اس کے اثبات میں جب حضرت ابو ہریرہؓ نے کسی سے کہا تھا کہ مسجد عشار میں دو رکعت پڑھ کر کہہ دے هذا لابی هريرة (یہ ابو ہریرہ کے

لئے ہیں) اور ثانی کا جواب یہ ہے کہ یہ حصر حقیقی ہے یا اضافی۔ اگر حقیقی ہے تو اس استغفار سے بھی ثواب حاصل نہ ہوگا حالانکہ یہ تم بھی نہیں کہتے ہو۔ پس حصر اضافی ہے اور مسئلہ مذکورہ مستقل دلیلوں سے اپنے موقع پر ثابت ہے۔ یہ اس کا موقع نہیں اور اہل سنت والجماعت میں حضرت امام اعظم صاحب تو قائل ہیں کہ عبادت مالی و بدنی دونوں کا نفع مردوں کو پہنچتا ہے اور بعض فقط عبادت مالیہ کے نفع پہنچنے کے قائل ہیں جیسا کہ ذکر کیا گیا۔

شب برأت کی بدعات

بعض بدعات و معاصی اس شب میں واقع ہوتی ہیں۔ چنانچہ ۱۴ شعبان کو لوگوں نے یہ دستور کر رکھا ہے کہ حلوا پکاتے ہیں اور تیوہار کی طرف عزیزوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ سو یہ عید بنانا ناجائز ہے۔ ہاں اتنی تو وسعت ہے کہ پندرھویں شب کو نہ کہ چودھویں دن شعبان کو (اس لئے کہ فضیلت چودھویں شعبان کی نہیں) کھانا پکا کر خیرات کر دیا جاوے اور اگر زیادہ ہو اور ہمیشہ کسی عزیز کے لئے دینے کا قاعدہ ہو تو اس روز بھی دے دے۔

جیسے ہمارے بھائی کا گھر ہمارے گھر میں ہے۔ جو چیز یہاں پکتی ہے بوجہ محبت ہم بغیر ان کے نہیں کھا سکتے اور یہی ان کی حالت ہے تو اس روز بھی ایسی جگہ دینا مضائقہ نہیں اور جب یہ عید نہیں تو اس کی عیدی بھی مہمل ہے۔

ایک معلم نے شب برأت کی عیدی محمد اختر میرے چھوٹے بھائی کو دی۔ میں نے ان معلم کو لکھ دیا کہ کیوں صاحب حلوا تو بدعت ہے یہ عیدی دینا بدعت نہیں۔ ان معلم صاحب نے سب لڑکوں کے پیسے لوٹا دیئے۔ محبت دین کی یہ دلیل ہے کہ میانجیوں کے کان کھلنے چاہئیں۔ البتہ اگر کوئی لڑکا تنخواہ مقررہ بھی کسی طرح نہ دیتا ہو تو خیر اسی بہانے سے لے لو۔ مگر عزیمت یہی ہے کہ ایسی حالت میں بھی عیدی نہ لو۔ جو قسمت کا ہوگا خود ہی آ رہے گا۔

حیدرآباد میں ماہ صفر کے آخری چہار شنبہ کی عیدی کا دستور ہے۔ حضور نظام کے استاد مولوی محمد زمان خان صاحب سے حضور نظام نے بچپن میں عرض کیا کہ عیدی دیجئے جیسی مشہور ہے۔ آخری چہار شنبہ آیا ہے۔ غسل صحت نبی نے پایا اور اصرار کیا مولوی صاحب نے عیدی کیا دی۔ اس میں تبلیغ بھی کر دی اور عید کی نفی بھی کر دی۔

آخری چار شنبہ ماہ صفر   ہست چوں چار شنبہائے دگر

ماہ صفر کا آخری چہار شنبہ مثل دوسرے چار شنبوں کے ہے۔

نہ حدیث شدہ راں وارد　　نہ درو عید کرد پیغمبر

اس میں نہ کوئی حدیث آئی ہے نہ اس میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عید منائی۔

مولوی صاحب کو حضور نظام نے اکیس اشرفیاں نذر دیں۔ عید کیا تھی بقرعیدی تھی کہ وہ عید ہی ذبح ہوگئی۔ تو دیکھو انہوں نے نفی بھی کر دی اور جو قسمت کا تھا وہ بھی مل گیا۔ میاں جی کیوں لوگوں کو بگاڑتے ہیں۔ بدعت کو مٹانا چاہئے اور لکھے پڑھے لوگوں کو زیادہ احتیاط چاہئے۔ عید کے لوازم میں سے ہے کھانا بھیجنا، پیسے بچوں کو دینا، چوڑیاں پہننا اور یہ سب باتیں شب برأت میں ہوتی ہیں۔ حاشیہ برحاشیہ در حاشیہ چڑھا رکھا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔

اسی طرح یہ رسمیں ہیں۔ سویاں، تیجہ، تیرھویں، دسواں، چوتھی اور بھوڑابری، یہ سب ہندوانی الفاظ ہیں۔ چنانچہ برخاوند کو کہتے ہیں اور دیور دراصل دیبر ہے۔ اور اس کے معنی ہیں دوسرا شوہر۔ ہندوؤں کی بعضی قوموں میں دیور کو بھاوج سے وہ انتفاع درست ہے جو اپنی زوجہ سے۔ اس لئے یہ لغت بنایا گیا ہے۔ میں نے اپنے دوستوں سے کہا ہے اور اب بھی کہتا ہوں کہ اس لفظ کی بجائے اور لفظ تجویز کریں۔ یہ برا لفظ ہے اور ہندوانی لفظ ہے ان الفاظ سے نفرت چاہئے۔ حدیث میں تو مسلمانوں کو جاہلیت کے لفظوں کا استعمال مذموم شمار ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

لا تغلبنکم الاعراب علی اسم صلوتکم العشاء[1]

تمہاری عشاء کے نماز کے نام پر اعراب تم پر غلبہ نہ کریں۔ وہ عشاء کی نماز کو عتمہ کہتے ہیں۔ تم بھی ان کی ریس میں عتمہ نہ کہو۔

اور الفاظ مذکورہ تو کافروں کے الفاظ ہیں۔ بری جو بر کی طرف سے ہو اور ظاہر ہے کہ وہ خاوند کی طرف سے جاتی ہے منڈھا ہندی ٹھیٹ لغت ہے۔ ایسے ہی چوتھی بھوڑہ یہ لفظ بتلا رہے ہیں کہ یہ ہندوانی الفاظ ہیں۔ غمی میں بھی دسواں تیجا وغیرہ انہیں کی رسمیں ہیں۔ اور آتش بازی تو کھلی بیہودگی ہے۔ بعض جگہ اس کو بہادری سمجھتے ہیں۔

دیوبند میں باوجود اہل علم وفضل کی کثرت کے بیلوں سے لڑتے ہیں۔ علماء کا خیال نہ

---

[1] الصحیح لمسلم کتاب المساجد ب: ۳۹، رقم: ۲۲۹، سنن ابی داؤد: ۴۹۸۴، مسند الامام احمد ۲: ۱۰، ۱۹، کنز العمال: ۱۹۴۶۸، ۱۹۴۶۹، ۱۹۵۰۷

اولیاء کا۔ بعض جگہ انار پٹاخے ہیں۔ یہ ہولی کی نقل ہے یا دیوالی کی۔ اسی طرح دیوالی کی نقل چراغوں سے ہوتی ہے۔ آدھا تیتر آدھا بٹیر۔ کفر بدعت عبادت، جو جس کو پسند آوے کئے جاتا ہے۔ یاد رکھو متبرک زمانہ میں معصیت کا کرنا زیادہ گناہ ہے۔ تخصیص حلوے کی یہ اعتقادی گناہ ہے کچھ پکا کر دے دیوے خواہ حلوہ ہی ہو۔ حلوے کے ضروری سمجھ لینے کی وجہ سے دینے سے روکا جاتا ہے یعنی لوگوں نے چونکہ حلوے کا التزام کر رکھا ہے۔ اس واسطے روکا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کھانے پینے سے روکتے ہیں۔

علمی فائدہ

آیت محتمل تھی دو معنی کو۔ یا تو اس سے شب قدر مراد ہو یا شب برأت۔ سو اگر شب برأت مراد ہو تو اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ یعنی بے شک ہم نے اس کو مبارک رات میں نازل کیا۔ کے معنی کیا ہوں گے۔ جب کہ نزول قرآن کا لیلۃ القدر میں ثابت ہے۔

جواب یہ ہے کہ اس رات میں سال بھر کے واقعات لکھے جاتے ہیں جو کچھ ہونے والے ہوتے ہیں تکتب (لکھے جاتے ہیں) کا لفظ حدیث میں آیا ہے۔ منجملہ ان واقعات کے ایک واقعہ ہے نزول قرآن کا بھی۔ پس مطلب یہ ہوا کہ اس رات میں یہ مقرر کر دیا گیا کہ شب قدر میں قرآن مجید نازل ہوگا۔ پس انا انزلنا (نازل کیا ہم نے) کے معنی ہوں گے قدرنا نزولہ (یعنی مقدر کیا ہم نے اس کا نزول) سو اس تقریر پر اشکال رفع ہو گیا۔

اگر کسی کو تقدیر واقعات پر شبہ ہو کہ تقدیر تو ایک بار مقدر ہو چکی ہے جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے اور اس حدیث سے ہر حال مقدر ہونا معلوم ہوتا ہے تو کیسے تطبیق ہو گی۔

جواب یہ ہے کہ ہر سال ایک سال کا انتظام فرشتوں کو بتلا دیا جاتا ہے اور لوح محفوظ میں کل حالات یکبارگی محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔ جیسے ایک بڑے کاغذ پر ایک زمانہ دراز تک بندوبست لکھ دیا جاوے پھر تھوڑے تھوڑے روز کا کاروبار اس میں سے نقل کر کے ایک معین وقت تک کارکنوں کے سپرد کیا جاوے۔ یہ مثال ہے لوح محفوظ اور سالانہ تقدیر کی۔ اگر اس رات سے شب قدر مراد ہو تو فِیْهَا یُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِیْمٍ (اس رات میں ہر حکمت والا معاملہ ہماری پیشی سے حکم ہو کر طے کیا جاتا ہے) کے کیا معنی ہوں گے۔ کیونکہ احکام اور

واقعات تو حسب حدیث اسی شب میں تقسیم ہوتے ہیں نہ کہ شب قدر میں۔

اس کے جواب میں دونوں شبوں میں اس کے وقوع کے قائل ہوں گے مگر شب قدر میں اس کا قائل ہونا کسی حدیث سے متاید نہیں۔ اسی وجہ سے آیت کی تفسیر یعنی آیت سے شب برأت مراد ہونا ارجح ہے اور یہ وجہ پہلے کبھی سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ فائدہ طلباء کے لئے مفید ہے اور اگر شب برأت اس آیت سے مراد نہ بھی ہو۔ تب بھی مقصود احادیث سے ثابت ہے اور میں نے مدار کار آیت پر نہیں رکھا۔ پس آیت سے اس کا مدعا ثابت ہونا محتمل ہے اور احادیث سے مصرح اور یقینی۔

اب بیان ختم کرتا ہوں اور اصل مقصود کو مکرر بیان کرتا ہوں۔ اس دن میں روزہ، اس رات میں جاگنا، اپنی حاجت طلب کرنا، مردوں کے لئے دعا کرنا مستحب ہے اور بدعت سے بچو۔ بدعت ایک طرح کا شرک ہے یعنی شرک فی النبوہ ہے۔ کیونکہ اس میں خدا یا رسول بنتا ہے۔ اس لئے کہ تجویز احکام خدا اور رسول ہی کا کام ہے۔ صبح کو روزہ رکھو، رات کو عبادت کرو۔ مردوں کو نفع پہنچاؤ۔ اور بہتر یہ ہے کہ اسی طریق پر نفع پہنچاؤ۔ جس طور پر جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے یعنی بعد عشاء کے قبرستان میں جا کر مردوں کے لئے دعا کرو۔ پڑھ کر بخشو مگر فرداً فرداً جاؤ جمع ہو کر مت جاؤ۔ اس کو تہوار مت مناؤ اور عجب لطف حق ہے کہ پندرھویں شب میں ہمیشہ چاندنی ہوتی ہے۔ قبرستان جانے میں وحشت بھی نہ ہوگی۔ اگر انگریزی تاریخوں کے حساب سے یہ شب ہوتی تو کبھی کوئی موسم ہوتا، کبھی کوئی کبھی اندھیری ہوتی کبھی چاندنی۔

اللہ تعالیٰ نے تکلیف رفع فرمانے کے لئے کس قدر سہولت فرما دی ہے۔ بچوں کو اور مردوں کو آتش بازی سے بچنا چاہئے۔ پیسے بچوں کو اس موقع پر نہ دو۔ یہ نہ خیال کرو کہ یہ تو بچے ہیں کھیلنے بھی دو۔ اس میں کیا حرج ہے وہ بچے ہیں۔ ان کی اصلاح تو تم پر فرض ہے تم کو گناہ ہوگا۔ دنیا و دین دونوں کا نقصان ہے۔

یہاں پر ایک صاحبزادے کا ہاتھ جل گیا۔ ہم کو امید تھی کہ اب حرکت یہاں سے چھوٹ جائے گی۔ اللہ و رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بھی مخالفت ہے اور دنیا کا مالی و جانی نقصان ہوتا ہے لیکن بہادر لوگ نہیں باز آتے۔ حق تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرماویں۔ آمین۔

شرائط الطاعت

یہ وعظ جامع مسجد کیرانہ ضلع مظفر نگر شب پنج شنبہ بعد مغرب
۶ شوال ۱۳۳۸ھ کو ڈیڑھ گھنٹہ تک بیان فرمایا۔
جسے خواجہ عزیز الحسن صاحب نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمدللّٰه نحمده و نستعينه و نستغفره ونومن به ونتوكل عليه ونعوذ باللّٰه من شرورانفسنا ومن سيّات اعمالنا من يهده اللّٰه فلا مضل له ومن يضلله فلاهادی له و نشهد ان لا اله الا اللّٰه وحده لاشريک له ونشهد ان سيدنا و مولانا محمدًا عبده ورسوله صلی اللّٰه تعالیٰ عليه وعلیٰ اله واصحابه و بارک وسلم.

اما بعد فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْم. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

فَقَدْ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصِّيَامُ فِی السَّفَرِ.

سفر کی ایسی حالت میں روزہ رکھنا کہ انسان مرنے کے قریب پہنچ جائے کیونکہ نیکی کا کام نہیں۔

سفر اور روزہ

یہ ایک حدیث ہے جس کے سمجھنے کے لئے ایک قصہ کے بیان کرنے اور سننے کی ضرورت ہے۔ اس قصہ کے سننے کے بعد اس حدیث کا صحیح مفہوم سمجھ میں آوے گا۔ اس سے مجھے ایک مسئلہ کا مستنبط کرنا مقصود ہے جو ایک قاعدہ کلیہ ہے اور جو دین میں نہایت ضروری ہے۔

وہ قصہ یہ ہے کہ ایک سفر میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک بہت سا مجمع ہے۔ لوگ کھڑے ہیں کسی چیز کو گھیرے ہوئے حضورؐ نے تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ ایک شخص نے سفر کی حالت میں روزہ رکھا تھا۔ وہ بیہوش ہوگیا ہے۔ لوگ جمع ہو رہے ہیں اور اس کی حالت دیکھ رہے ہیں۔ اس وقت حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

ليس من البر الصيام فی السفر[1]

یعنی سفر کی ایسی حالت میں روزہ رکھنا کہ انسان مرنے کے قریب پہنچ جائے اور

---

[1] سنن ابی داؤد كتاب الصيام ب:۴۳، سنن النسائی ۴:۱۷۶، ۱۷۷، سنن ابن ماجه:۱۶۶۴، ۱۶۶۵، سنن الترمذی: ۷۱۰، مسندالامام احمد۳:۳۱۹، ۵:۴۳۴

ہلاکت کی نوبت آجائے کوئی نیکی کا کام نہیں ہے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

اس ترجمہ سے اس حدیث کا صحیح مفہوم سمجھ میں آیا ہوگا اور اگر نہ آیا ہو تو اب سمجھ لیجئے تاکہ غلطی واقع نہ ہو کیونکہ بعض نے اس حدیث سے یوں سمجھ لیا ہے کہ سفر میں روزہ رکھنا چاہئے ہی نہیں۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ اس واسطے کہ صحابہ نے حضورؐ کے ساتھ اکثر سفر کئے ہیں اور وہ فرماتے ہیں:

منا الصائم ومنا المفطر

ہم میں سے بعضے روزہ دار تھے اور بعضے غیر روزہ دار تھے۔

ولا یعیب بعضنا علی بعض

لیکن کوئی ایک دوسرے پر ملامت یا عیب گیری نہ کرتا تھا۔

نہ روزہ دار افطار کرنے والوں کی عیب گیری کرتے تھے نہ افطار کرنے والے روزہ داروں کی عیب گیری کرتے تھے۔ اس سے خود معلوم ہوتا ہے کہ سفر میں دونوں باتیں جائز ہیں۔ روزہ رکھنا بھی اور روزہ نہ رکھنا بھی مگر یہاں عوام ایک غلطی کرتے ہیں اس پر تنبیہ کر دینا ضروری ہے تاکہ مبحث متعین ہو جاوے کہ کون سے سفر میں گفتگو ہے۔ کیونکہ وہ گفتگو جو کہ علماء کی ہے اس کے متعلق تو میں آگے چل کر بیان کروں گا۔ ایک غلطی ایسی ہے جس سے علماء تو محفوظ ہیں لیکن اس میں عوام مبتلا ہیں۔ وہ یہ کہ سفر کو بعض عوام مطلق سمجھتے ہیں یعنی کوئی سفر بھی ہو یہاں تک کہ چار پانچ آٹھ دس کوس کے سفر میں بھی روزہ افطار کرنے کو جائز سمجھتے ہیں۔

سو خوب سمجھ لیجئے کہ وہ سفر جس میں روزہ رکھنا جائز ہے وہ سفر ہے جس کے اختیار کرنے سے احکام سفر متعلق ہو جاتے ہیں یہ میں نے اس لئے کہا کہ بعض احکام ایسے بھی ہیں جو عام ہیں حالت سفر اور حالت حضر دونوں کو۔

مثلاً ایک شخص نے دس کوس کا سفر کیا اور روزہ رکھا کیونکہ اتنے کوس کے سفر میں اس کو روزہ رکھنا واجب تھا۔ پھر دوران سفر میں اس کی بری حالت ہوگئی۔ تو اس حالت خاص میں اس کو روزہ افطار کر دینا چاہئے لیکن یہ افطار عذر سفر کی وجہ سے نہیں۔ یہ تو ایک حالت خاص ہوگئی اس حالت کی وجہ سے اس کو افطار جائز ہوگیا۔ حتیٰ کہ اگر گھر پر بھی یہی حالت ہو جاتی تو وہاں بھی اس کو افطار جائز ہو جاتا۔ مثلاً پہلے بیمار تھا یا ضعیف القویٰ تھا لیکن ہمت کر کے اس

نے روزہ رکھ لیا پھر اس کی بری حالت ہوگئی یا عین روزہ کی حالت میں بیمار پڑ گیا۔ اور بری حالت ہوگئی تو اس کو جائز ہے کہ روزہ افطار کردے۔ تو اس حکم افطار میں تو سفر کی کوئی تخصیص نہیں۔ غیر حالت سفر میں بھی یہ عذر پیش آ جاتا تو وہاں بھی یہی حکم متوجہ ہو جاتا۔

لیکن اس وقت گفتگو اس میں ہے کہ وہ سفر کون سا ہے جس میں محض سفر کی وجہ سے افطار جائز ہو، قطع النظر کسی خاص حالت کے سو خوب سمجھ لیجئے کہ وہ ہر سفر نہیں ہے۔ اس میں عوام یہ غلطی کرتے ہیں کہ جہاں دس پانچ کوس چلے اور روزہ کھا بیٹھے کہ بھائی ہم تو سفر میں ہیں۔ حالانکہ جس سفر میں روزہ نہ رکھنا جائز ہے خود نفس سفر کی وجہ سے نہ کسی اور عارض کی وجہ سے وہ سفر ہے جس کی حد تین منزل ہے جس کی مقدار علماء نے یہاں کے کوسوں کے حساب سے ۳۶ کوس اور انگریزی میل کے حساب سے ۴۸ میل مقرر کر دی ہے لیکن انگریزی میل کا حساب آسان ہے کیونکہ یہ ہر جگہ یکساں ہے، بخلاف کوس کے کہ اس کا حساب مختلف مقامات پر مختلف ہے۔ چنانچہ یورپ میں بہت بڑا کوس ہوتا ہے یعنی وہاں دو میل کا کوس ہوتا ہے۔ لہٰذا ۴۸ میل کا حساب زیادہ آسان ہے کیونکہ وہ ذرا منضبط ہے۔

ہر چند یہ تین منزل شرعی مقدار تھی جس کی تحدید میلوں سے شرع نہیں کی۔

لیکن علماء نے جیسا کہ حوض میں ایک تحدید مقرر کر لی ہے یعنی دہ دردہ کی مقدار انتظام اور سہولت کے لیے مقرر کر لی ہے اسی طرح یہ حد بھی سفر کی انتظام اور سہولت کے لیے مقرر کر لی ہے ورنہ شریعت نے تو دارومدار احکام سفر کا تین منزل کو قرار دیا ہے مگر چونکہ عرفاً اوسط منزل بارہ کوس کی ہوتی ہے اس لیے علماء نے سفر شرعی کی مقدار ۳۶ کوس مقرر کر دی ہے تاکہ عوام میں پریشانی اور اختلاف نہ ہو ورنہ اگر عوام کی رائے پر چھوڑ دیتے تو وہ صرف پانچ کوس ہی کی منزل کر کے پندرہ کوس ہی کے اندر احکام سفر کو جاری کر لیتے اور کہہ دیتے کہ ہم تو صاحب پانچ کوس سے زیادہ نہیں چل سکتے تو تحدید کے اندر یہ ایک نفع ہوتا ہے انتظام کا۔ بہر حال جو سفر ۳۶ کوس کا ہو یا ۴۸ میل کہیے وہی سفر شرعی ہے اور اسی سفر کے اندر روزہ کا افطار بھی ہے اور اسی سفر کے اندر نماز کا قصر بھی ہے۔

لیکن ایک فرق ہے وہ یہ کہ نماز کا قصر کرنا تو واجب ہے اور روزہ کا افطار کرنا واجب نہیں، ہاں روزہ کا افطار کرنا جائز ہے لیکن فی نفسہ واجب نہیں جب تک کہ سخت ضرر کا

اندیشہ نہ ہو اور نماز کا قصر کرنا بہرحال واجب ہے۔ تو یہ وہ سفر ہے جو سفر شرعی کہلاتا ہے تو گفتگو اس سفر کے اندر ہے یعنی سفر شرعی میں افطار و قصر جائز ہے اس سے کم میں جائز نہیں، چاہے ریل کا سفر ہو چاہے پیدل کا۔

دین اور مشقت

اب یہاں بعض اہل تشکیک کی طرف سے یہ اشکال ہوگا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ چھوٹے سفر میں بھی بعض اوقات ہم تو جان کو آ جاتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ وہ سفر جو شرعی ہے اس میں تو مشقت حقیقی مان لی گئی ہے۔ خواہ بعض حالات میں وہ مشقت دراصل واقع نہ ہو اور اس سے کم کے سفر میں اگر مشقت حقیقی ہوگی تب تو افطار کی اجازت ہوگی ورنہ نہیں۔ خلاصہ یہ کہ اگر تکلیف ہو تو مقدار شرعی سے کم کے سفر میں بھی افطار کی اجازت ہے کیونکہ وہاں علت اجازت افطار کی تکلیف ہی ہے مگر پہلے سے تو یہ معلوم نہیں کہ تکلیف ہوگی۔ بعض اوقات اندازہ بالکل غلط ثابت ہوتا ہے۔

مثلاً جس وقت سفر کیا تھا اس وقت تو سخت گرمی تھی لیکن بعد کو ہوا چلنے لگی یا بارش ہوگئی اور ٹھنڈ ہوگئی تو اس کو کیا حق ہے پہلے سے فیصلہ کا کہ ضرور تکلیف ہوگی۔ ارے بھائی اگر ہوگی شرعاً اس کی رعایت کی جاوے گی اور افطار کی اجازت ہو جاوے گی۔ پہلے ہی سے کیوں فکر میں پڑ گئے لیکن حضرت یہ یاد رہے کہ تھوڑی بہت تکلیف کا کچھ اعتبار نہیں۔ یوں تھوڑی بہت تکلیف تو گھر بیٹھے بھی ہوتی ہے اور روزہ ہی میں کیا نماز میں بھی ہوتی ہے کہ اٹھ کر وضو کرو، پھر نیت کیا باندھی گویا بالکل بند ہو گئے کہ اب بولنے کے رہے نہ چالنے کے، نہ دیکھنے کے نہ بھالنے کے اور صاحب دین ہی کے کاموں میں کیا کھانے میں بھی تو تکلیف ہوتی ہے۔ انصاف کیجئے کمائی میں کیسی کیسی مشقت اٹھانا پڑتی ہے پھر یہاں کبھی نہیں کہتے کہ اجی کہاں کا جھگڑا ہے، چھوڑو بھی میاں بیٹھ بھی جاؤ توکل پر۔

دیکھئے بچپن ہی سے کیسی کیسی تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں کہیں پڑھائی کی تکلیف کہیں فیس کی تکلیف، کہیں کتابوں کی تکلیف، لہو ولعب چھوڑنے کی تکلیف، آزادی کے برابر ہونے کی تکلیف، پھر اگر کہیں ہو ہوا گئے تو بعضے عہدوں میں کام اتنا ہوتا ہے کہ گھر پر لا لا کر راتوں کو

جاگ کر اجیر یا معین مقرر مقرر کر کے کام کو پورا کرتے ہیں، تب کہیں جا کر بمشکل پورا ہوتا ہے۔ پھر اگر ایسے ہی نازک اور ایسے ہی مرزا پھریا ہیں تو کمانا بھی چھوڑ دیں مگر ہم تو دیکھتے ہیں کہ ان تکلیفوں کی وجہ سے کمانا کوئی بھی نہیں چھوڑتے تو دین کے واسطے بھی اگر تھوڑی بہت مشقت اٹھالی جائے تو ایسا کون سا بڑا مشکل کام ہے۔ تو گویا تھوڑی بہت تکلیف تو تکلیف ہی نہیں۔ اتنی تکلیف تو ہر کام میں ہوتی ہے۔ البتہ ایسی تکلیف جس کی برداشت نہ ہو سکے یہ ہے تکلیف، سو اگر ایسی تکلیف ہونے لگے تو پھر شریعت سے خود ہی اجازت ہے کہ روزہ افطار کر لے۔

لیکن گفتگو یہ ہے کہ سفر شرعی میں تحقیقی تکلیف شرط نہیں بلکہ محض حکمی تکلیف ہے اور حکمی تکلیف کسے کہتے ہیں۔ حکمی تکلیف اسے کہتے ہیں کہ جو حکم میں ہو حقیقی تکلیف کے خواہ تکلیف حقیقی متحقق ہو یا نہ ہو۔ سبحان اللہ! شریعت نے کیسی شفقت فرمائی ہے کہ سفر شرعی میں جو روزہ افطار کرنے کی اجازت دی ہے تو افطار صوم کی اصل علت تو مشقت تھی لیکن قبل تحقیق مشقت ہی کے شریعت نے احتمال پر کہ ممکن ہے مشقت ہو انتظام یہ کیا کہ جو چیز کہ سبب ہے مشقت کا اسی کو قائم مقام مشقت کا بنا کر یہ فرض کر لیا کہ اسے مشقت ہوگی اور یہ حکم کر دیا کہ ایسے شخص کو افطار کر لینا جائز ہے، خواہ مشقت کا وقوع ہو یا نہ ہو۔

دیکھئے کتنی بڑی عنایت ہے، کیا انتہا ہے رعایت کی تو اس تقریر سے مبحث متعین ہو گیا۔ یعنی بحث یہ ہے کہ مطلق سفر شرعی میں قطع نظر مشقت کے روزہ رکھنا جائز ہے یا نہیں۔

سفری روزہ کی شرط

سو جمہور کا اس پر اتفاق ہے کہ سفر میں بھی روزہ رکھنا جائز ہے۔ البتہ شرذمہ قلیل یعنی بہت تھوڑے لوگ اس طرف گئے ہیں کہ جس طرح بحالت سفر نماز میں قصر واجب ہے ایسے ہی روزہ میں افطار واجب ہے اور ان کی دلیل یہی حدیث ہے۔ "**لیس من البر الصیام فی السفر**" وہ کہتے ہیں کہ دیکھو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ روزہ رکھنا سفر میں اچھا نہیں، دیکھو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سفر میں روزہ رکھنا جائز نہیں ہے بلکہ وہ تو بہتر ہے۔

وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ. ''اگر روزہ رکھو تو بہتر ہے''

اوپر سے یہ ذکر چلا آتا ہے:

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ.

"پھر جو کوئی تم سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے ایام کا شمار رکھنا ہے۔"

یعنی مسافر اور مریض کے لیے ارشاد ہے کہ روزہ افطار کر لینا جائز ہے۔ "وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ". یہ شیخ فانی کا حکم ہے یعنی اس کے لیے روزہ کا فدیہ ہے۔ ایک مسکین کا کھانا دو وقت کا شکم سیر کر کے اور اگر کوئی زیادہ دے دے اپنی خوشی سے تو یہ زیادہ اچھا ہے۔ گو بعض یہ سمجھتے ہیں کہ "اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ" سے متعلق ہے مگر اس کی کوئی دلیل نہیں۔ ظاہراً تو تینوں ہی کے متعلق ہے۔ یعنی مسافر مریض اور شیخ فانی ان تینوں کے لیے روزہ رکھ لینا بہتر ہے مگر دوسرے دلائل کی وجہ سے اس حکم میں قید یہ ہے کہ تحمل ہو یعنی اگر تحمل ہو تو روزہ رکھ لینا اچھا ہے۔ تو "اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ" سے مسافر کے لیے بھی روزہ رکھنا افضل ہوا اور اگر قرآن کو اس بارے میں نص نہ کہا جائے کیونکہ بعض کے نزدیک اس کا تعلق شیخ فانی کے ساتھ محتمل ہے اور "اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال" مگر حدیثیں تو صریح ہیں۔ چنانچہ صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سفر میں روزہ رکھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار نہیں فرمایا، اس سے خود معلوم ہوتا ہے کہ سفر میں روزہ رکھنا جیسا جاویسا ہی افضل بھی ہے۔ بہر حال سفر میں روزہ رکھنا ہی افضل ہوا۔

جمہور کی دلیل تو یہ ہے جو میں نے عرض کی البتہ اس حدیث کا جس کو میں نے ابھی پڑھا جواب ان کے ذمہ ہے۔ سو وہ جواب میرے ترجمہ سے معلوم ہو گیا ہوگا۔ میں نے ترجمہ کیا تھا کہ ایسے سفر میں جس میں یہ حالت ہو جائے روزہ رکھنا کوئی نیکی کا کام نہیں ہے پس السفر میں الف لام عہد کا ہے۔ مطلب حدیث کا یہ ہے کہ جو سفر ایسی حالت تک پہنچا دے یعنی قرائن قویہ سے پہلے معلوم ہو کہ روزہ رکھنا ایسی حالت تک پہنچا دے گا تو ایسی حالت میں روزہ رکھنا اچھا نہیں ہے۔

میں نے اس مقام پر اس واسطے ذرا تطویل کر دی ہے کہ بظاہر اس حدیث سے یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ سفر میں روزہ رکھنا کسی حال مناسب ہے ہی نہیں جیسے بعضے لوگ اس حدیث سے یہی سمجھ گئے ہیں۔ اس حدیث کا پھر میں مکرر ترجمہ کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں جناب رسول مقبول

صلی اللہ علیہ وسلم کہ جس سفر میں روزہ رکھنا ایسی حالت تک پہنچادے یعنی قریب تک اس میں روزہ رکھنا کوئی اچھا کام نہیں ہے بلکہ ایسی حالت میں روزہ نہ رکھنا بہتر ہے، روزہ رکھنے سے۔

عبادت میں غلو

اب مجھے اس سے ایک مسئلہ مستنبط کرنا ہے اکثر اوقات اور اکثر حالات میں یہ دکھا جاتا ہے خصوصی زاہدوں اور عابدوں میں یہ مرض بہت کثرت سے ہے کہ غلو کرتے ہیں عبادت میں۔ ہر جماعت کا مرض جدا ہے، عابدین کا مرض غلو فی العبادة ہے، افراط اور تفریط دونوں مذموم ہیں۔ جیسے ترک عبادت برا ہے ایسے ہی عبادت میں غلو بھی برا ہے عبادت میں غلو کیا ہے؟

خوب سمجھ لیجئے عبادت میں غلو یہ ہے کہ ہر بات میں تشدد کیا جائے سو یہ تو تفریط ہے کہ ذرا سی مشقت میں ہمت چھوڑی دی جاوے۔ جب عبادت مجاہدہ نفس ہے تو تھوڑی تکلیف ہونا تو لازم ہے۔ چنانچہ اب کے بھی روزوں میں تھوڑی سی تکلیف ہوئی تھی۔ واقعی چند تاریخیں سخت تھیں مگر وہ سختی ایسی نہیں تھی کہ قابل برداشت نہ ہو۔ آخر لوگوں نے ان تاریخوں میں بھی روزہ رکھا ہے پھر بھی نہ کچھ زیادہ ضعف ہوا نہ زیادہ مشقت وکلفت ہوئی بلکہ اس مشقت میں بھی ایک لطف تھا اور سچ تو یہ ہے کہ روزہ خوروں کو ایک وقت بھی اتنا لطف نہیں آتا جتنا کہ روزہ داروں کو افطار کے وقت ہر روز آتا تھا۔ گویا روزہ خور دنیا کی خوشی سے محروم رہے۔ اسی لیے جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمادیا ہے:

للصائم فرحتان عندالافطار وعند لقاء ربه[1]

"روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں ایک افطار کے وقت دوسری خداتعالیٰ کی ملاقات کے وقت۔"

روزہ دار کو دو خوشیاں ہیں۔ ایک خوشی تو وہاں آخرت میں ہوگی لیکن وہ خوشی تو جب ہوگی جب وہاں جائے گا۔ اس کے علاوہ ایک اور خوشی یہاں دنیا ہی میں افطار کے وقت روزہ دار کو حاصل ہوجاتی ہے۔ بیچارے روزہ نہ رکھنے والے اس سے بھی محروم ہیں۔ اپنے نزدیک تو انہوں نے راحت اور لذت طلب کی تھی مگر راحت اور لذت تو کیا ملتی بلکہ اگر تھوڑا سا ایمان ہو تو اور الٹی کلفت ہوتی ہے۔ ایسا شخص جس وقت کھانا کھائے گا ٹٹول لیں بے روزہ

---

[1] الصحیح للبخاری ۹: ۱۷۵، الصحیح لمسلم کتاب الصیام ب: ۳۰، رقم: ۱۶۴

دار کو اگر اس میں ایمان ہو تو اور اگر کسی نے ایمان ہی کو دھکے دیدیئے ہوں تو اس کا ذکر ہی کیا جس وقت کھانا بلا عذر شرعی کھائے گا۔ ایسا معلوم ہوگا جیسے پاخانہ کھا رہا ہے۔ اس قدر ذلت اور شرمندگی ہوگی بلکہ یہ عذر شرعی بھی اس قدر تنگی ہوتی ہے کہ آنکھ نہیں اٹھتی مارے ذلت کے بلکہ ایسا شخص کوشش کرتا ہے چھپانے کی تو جناب جب عذر کے اندر یہ حالت ہوتی ہے تو جو بلا عذر کھاتا ہے اس کی ذلت اور شرمندگی کا تو کیا ٹھکانا ہے اور ہاں کوئی حیا ہی کو اتار کر رکھ دے تو وہ اور بات ہے کیونکہ جب عادت معصیت کی ہو جاتی ہے تو پھر حیا بھی جاتی رہتی ہے۔

گناہ اور حیاء

حیاء کے جاتے رہنے پر ایک حکایت یاد آئی۔ ایک مولوی صاحب میرے ملنے والے تھے۔ وہ اب مر گئے وہ اپنا واقعہ بیان کرتے تھے کہ جب وہ مدرسہ دیوبند میں پڑھنے کے لیے گئے تو ایک صاحب کے یہاں ان کا کھانا مقرر ہو گیا۔ جب اول روز کھانا لینے ان صاحب کے مکان پر پہنچے تو بڑی شرم آئی۔ باہر کوئی موجود نہ تھا، مارے شرم کے آواز بھی نہیں دے سکے۔ شرم کے غلبہ میں اتنا منہ سے نہ نکلا کہ کھانا بھیج دو۔ بس ایک کونے میں چپکے کھڑے ہو گئے، خاموش تھوڑی دیر بعد گھر میں سے خود ہی صاحب مکان نکلے، انہوں نے پہچانا نہیں، پوچھا کیا کچھ کہنا ہے لیکن ان کے منہ سے یہ بھی نہ نکلا کہ میں وہی طالب علم ہوں جس کا کھانا آپ نے مقرر کیا ہے مگر وہ قرائن سے خود ہی سمجھ گیا۔ کہا اچھا آپ وہ مولوی صاحب ہیں جن کا کھانا مقرر ہوا ہے۔ تب انہوں نے تصدیق کی۔ انہوں نے بہت قدر کی، بٹھلایا۔ پھر پوچھا کہ آپ کھانا یہیں کھائیں گے یا لے جائیں گے، انہوں نے دبی زبان سے کہا کہ یہیں کھانا کھالوں گا۔ یہاں تو ایک ہی کے سامنے رسوائی ہے وہاں تک تو سینکڑوں آدمی گلی کوچہ میں ملیں اور دیکھیں گے کہ بھیک مانگ کر لایا ہوں۔

خیر صاحب مکان نے چارپائی بچھائی اور کھانا لا کر عزت کے ساتھ سامنے رکھ دیا۔ یہ سکڑے سکڑائے جیسے تیسے کھا پی کر چلے آئے۔ یہاں مدرسہ میں پہنچے تو اور طالب علموں نے پوچھا کہ کھانا نہیں لائے، انہوں نے کہہ دیا کہ میں تو وہیں کھا آیا، انہوں نے کہا واہ صاحب! یہ کیا واہیات حرکت ہے، دیکھو بھائی یہاں ہر طرح کے طالب علم ہیں، کسی کا کھانا

مقرر ہے کسی کا نہیں ہے، سب مل جل کر کھا پی لیا کریں گے۔ خبردار! اب ایسا نہ کرنا۔

خیر صاحب! برادری کا زور اگلا وقت پھر آیا۔ پھر کھانا لینے گئے تو صاحب مکان نے پھر پوچھا کہ یہیں کھاؤ گے یا لے جاؤ گے، انہوں نے کہا کہ لے جاؤں گا۔ چنانچہ ان صاحب نے کھانا لا دیا، لے کر چلے تو یوں کہتے تھے کہ مارے شرم کے قدم نہیں اٹھتا تھا۔ ایک پیر سو سو من کا ہو گیا۔ ہاتھ میں لے کر چلتے ہوئے بھی شرم آتی تھی کہ آنکھیں نہیں اُٹھتی تھیں۔ بہر حال سر جھکائے کھانا دامن میں چھپائے بڑی مصیبت سے مدرسہ تک پہنچا۔ پھر اگلے دن کچھ کم شرم آئی پھر اور کم پھر اور کم، ہوتے ہوتے یہاں تک نوبت پہنچی، تھے بڑے ظریف کہتے تھے اور اب تو اگر کہو بھنگیوں میں سے مانگ لاؤں۔

خیر یہ حکایت تو ظرافت کی ہے اور ایک امر مباح کے متعلق ہے۔ مطلب میرا یہ ہے کہ جب آدمی گناہ کا خوگر ہو جاتا ہے تو پھر حیا شرم کچھ نہیں رہتی۔ چنانچہ بہت لوگوں کو آپ نے دیکھا ہوگا، کھلم کھلا گناہ کرتے ہیں، میں ذرا صبح کے وقت جنگل چلا جاتا ہوں، منزل پڑھتا ہوں کیونکہ مجھ سے بیٹھ کر قرآن پڑھا نہیں جاتا۔ رمضان شریف کا زمانہ تھا، ایک باغ میں پہنچا تو دیکھتا کیا ہوں کہ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور کھیت والے، الٰہی توبہ ہے، تربوز لے کر کاٹ کر بیٹھے ہوئے صبح کے وقت کھا رہے ہیں۔ بھلا اس وقت کون سی گرمی نے ستایا تھا، ارے کم بختی مارو! ارے کم بختو! جب تکلیف ہوتی جبھی کھاتے صبح کے وقت کون سی آگ تمہارے اوپر برس رہی ہے جو تربوز کھانے کی حاجت ہوئی۔ اجی کچھ بھی نہیں بالکل شرارت ہے نفس کی بس یوں کہو کہ خدا کا خوف اور خدا کی عظمت دل میں نہیں۔

خیر خدا کو تو کس نے دیکھا ہے خدا کا خوف تو بڑی چیز ہے، لوگوں کا بھی تو خوف نہیں۔ جو لوگ نسب کے لحاظ سے عرفاً بالکل ادنیٰ درجہ کے ہیں وہ بھی تو ایسے شرفاء کو جو روزوں میں کھلم کھلا کھاتے پیتے ہیں، بالکل رذیل بلکہ جانور سمجھتے ہیں۔ یہ اپنے دل میں اپنے آپ کو کتنا ہی شریف سمجھتے ہوں لیکن دوسرے لوگ انہیں ذلیل جانوروں سے بھی زیادہ ذلیل سمجھتے ہیں۔ یہ حالت تو ان کی میں نے بیان کی جو روزہ نہیں رکھتے، وہ خیر گنہگار ہیں، ان کے اس فعل کی قباحت اور ان کی اس حالت کا منکر ہونا تو ظاہر ہے۔

غلو کا معیار

باقی جس چیز کو میں اس وقت بیان کر رہا ہوں کہ بعض لوگ عبادت میں غلو کرتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کی غلطی ہے جو بڑے عابد وزاہد کہلاتے ہیں لیکن اب یہاں سمجھ لینا چاہیے کہ غلو کا معیار کیا ہے؟ سو غلو کا معیار کسی کی رائے پر نہیں ورنہ پانچ کوس ہی پر بعضے سمجھتے ہیں کہ بڑی مشقت ہوگی۔ ذراسی گرمی پڑی بڑی مشقت ہوگئی اور ذراسی سردی پڑی بڑی مشقت ہوگئی، بس پھر وضو بھی معاف ہوگیا، جماعت بھی معاف ہوگئی، حج بھی معاف ہوگیا۔

چنانچہ اب میں دیکھتا ہوں کہ چھوٹے چھوٹے عذروں کی بنا پر لوگ حج کو موقوف کر دیتے ہیں۔ ذرا سن لیا کہ راستہ میں کچھ گڑبڑ ہے بس حج کو مت جاؤ، ذرا سن لیا کہ کچھ بیماری ہے بس حج کو مت جاؤ، ذرا یہ سن لیا کہ عملداری ترکوں کی نہیں بس حج کو مت جاؤ، آخر ترکوں کی عملداری میں اور حج میں جوڑ کیا، لوگوں نے آج کل یہی ایک مسئلہ خواہ مخواہ تراش لیا ہے۔

صاحبو! امام المسلمین کا ہونا جمعہ کی نماز میں تو ایک خاص تفصیل کے ساتھ شرط ہے بھی لیکن حج میں یہ شرط کہاں ہے کہ جب کوئی امام المسلمین ہو تب حج ہو بلکہ جس عبادت کے لیے شرط بھی ہے اس کی حقیقت بھی یہ لکھی ہے اور یہی ہے وہ تفصیل موعود کہ امام المسلمین کا ہونا اس میں فی نفسہ مقصود نہیں بلکہ ایک خاص مصلحت سے ہے۔ اگر وہ مصلحت بدون امام المسلمین کے حاصل ہو جائے پھر شرط نہیں، چنانچہ ہدایہ میں اس کی حکمت کے متعلق صاف لکھا ہے:

لئلا یقع التنازع فی التقدم و التقدیم. ''یعنی امام المسلمین کے شرط ہونے کی یہ وجہ ہے تاکہ جھگڑا نہ پڑے، آگے بڑھنے میں یا پیچھے ہٹے میں''

کہ میں امام بنوں گا یا میں فلاں کے پیچھے نماز نہ پڑھوں گا تو کوئی شخص ہونا چاہیے جو اس اختلاف کے وقت فیصلہ کر سکے۔ غرض علت یہ ہے اس شرط کی ورنہ فی نفسہ امام کا وجود مقصود نہیں۔

اسی پر فقہاء نے تفریع کی ہے کہ اگر سب مسلمان مل کر ایک کو امام جمعہ مقرر کر لیں تو چونکہ امام المسلمین کی مصلحت حاصل ہوگئی باتفاق اہل شہر کے بس اب ضرورت نہیں رہی، اس شرط کی، حالانکہ حدیث شریف میں ہے:

من ترک الجمعه و له امام عادل او جائر[1]

---

[1] لم اجد الحدیث بهذه الالفاظ فی "موسوعة اطراف الحدیث"

''یعنی جو شخص جمعہ ترک کرلے اس حال میں کہ اس کا کوئی بادشاہ ہو خواہ عادل ہو یا ظالم اس کے لیے یہ وعید ہے۔''

تو دیکھئے حدیث اور نص کی رو سے جمعہ کے لیے امام المسلمین کا ہونا شرط تھا، جب اس پر بھی امام کے نہ ہونے سے جمعہ ساقط نہ ہوا تو حج کے لیے تو امام المسلمین کا ہونا کہیں شرط بھی نہیں۔ ہاں بعض شرائط ایسے ہیں جمعہ کے بغیر جن کے جمعہ جائز ہی نہیں ہوتا۔ مثلاً مصر ہونا یہ شرط ایسی ہے کہ بغیر اس کے جمعہ پڑھنا جائز ہی نہیں، یہ شرط صرف واجب ہونے کی نہیں بلکہ جواز کی بھی ہے، حاصل یہ ہوا دوسرے لفظوں میں کہ گاؤں میں جمعہ جائز نہیں مگر گاؤں والوں کو جمعہ کا بڑا شوق ہوتا ہے۔

ایک گاؤں والے نے مجھ سے پوچھا کہ گاؤں میں جمعہ کیوں جائز نہیں، میں نے کہا ممبئی میں حج کیوں جائز نہیں، اس نے کہا وہ تو موقع حج کا نہیں ہے، میں نے کہا وہ موقع جمعہ کا نہیں ہے، اس نے کہا کیوں نہیں، میں نے کہا وہ کیوں نہیں، اس نے کہا شریعت کی دلیل سے میں نے کہا یہ بھی شریعت کی دلیل سے ہے کہ گاؤں میں جمعہ جائز نہیں اور تمہیں پہچان کیا شریعت کی، شریعت نے جو حکم مقرر کردیا تم کون دخل در معقولات دینے والے بس چپکے ہو گئے۔

بہرحال بعض شرطیں وجوب کی ہیں اور یہ بعض شرطیں جواز کی ہیں، ان میں مصر ہونا بھی ہے۔ اب لوگ شرط کی ان دونوں قسموں میں فرق نہیں کرتے اور افسوس یہ ہے کہ یہ شبہ بعض اہل علم کی زبان سے بھی سنا ہے، وہ باوجود حنفی ہونے کے گاؤں میں اجازت جمعہ کی دیتے تھے۔ جب ان کے سامنے شرائط جمعہ پیش کیے گئے اور کہا گیا کہ ان شرائط میں سے ایک شرط مصر ہونا بھی ہے تو آپ کہتے ہیں کہ بینا ہونا بھی تو شرط ہے۔ پھر باوجود اس کے اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اگر کوئی نابینا جمعہ کی نماز پڑھ لے تو اس کی نماز ہو جائے گی تو اگر اس شرط کا ہونا ضروری ہوتا تو نابینا کی نماز بھی نہ ہوتی۔ حالانکہ سب کے نزدیک اس کا جمعہ ہو جاتا ہے۔

تو جیسے وہاں شرطیں نہیں ہیں تب بھی جمعہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں اگر مصر نہ بھی ہو تب بھی جمعہ ہو جائے گا۔ یہ غلطی وہ ہے جس میں بعض اہل علم بھی مبتلا ہیں اس واسطے میں اس کا جواب دینا چاہتا ہوں اور جواب تو میری اوپر کی تقریر سے ہی ہو گیا ہوگا کہ مصر ہونا

شرط جواز ہے نہ کہ شرط وجوب۔

تفصیل اس جواب کی یہ ہے کہ شرائط کی دو قسمیں ہیں ایک شرائط ہیں وجوب کی اور ایک ہیں جواز کی، ان دونوں کے اثر میں بڑا فرق ہے، شرائط وجوب کا اثر تو یہ ہے کہ بغیر ان کے مشروط کا وجوب نہیں ہوتا لیکن وجود ہوسکتا ہے اور شرائط جواز کا اثر یہ ہے کہ جب شرط کا وجود متحقق نہ ہوگا تو مشروط کا وجود شرعی بھی متحقق نہ ہوگا۔ بس اس قسم کی شرائط کا مقتضا یہ ہے کہ بدون ان کے جمعہ کا جواز ہی نہیں ہوتا تو مصر ہونا جو شرط ہے وہ جمعہ کی شرائط جواز میں سے ہے اور ذی بصر ہونا یہ شرائط وجوب میں سے ہے تو اس کا قیاس اس پر جائز نہیں۔

تو میرا مقصود یہ ہے کہ جمعہ جس کے لیے امام المسلمین ہونا شرط ہے جب اس کا نہ ہونا یعنی امام کا نہ ہونا مخل نہ ہوا فرضیت جمعہ میں تو اس کے نہ ہونے سے حج کیسے ساقط ہو جائے گا، خدا جانے لوگ کیا گپڑ سپڑ کر رہے ہیں جو جی میں آیا کرلیا، نہ کسی سے تحقیق کرنے کی ضرورت ہے نہ کچھ ہے۔

ترک عبادت کے بہانے

میں اس کو بیان کر رہا تھا کہ لوگ عبادتوں کے ترک کے لیے بہانہ ڈھونڈھا کرتے ہیں، یعنی ذرا سی تکلیف ہوئی، حج ساقط کردیا، ذرا سی مشقت ہوئی نماز اڑادی، روزہ میں ذرا پیاس زیادہ لگی تھی کیونکہ پیدل چلنا پڑا تھا، اگلے دن روزہ ہی کھا بیٹھے۔ (جن کے یہاں حضرت مہمان تھے انہوں نے ایک بار ایسا ہی کیا تھا۔ وہ بھی وعظ میں موجود تھے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی یہی شان ہونی چاہیے کہ کسی کی مروت مانع نہ ہو) مگر اسی مریض کو اگر ڈاکٹر کہہ دے کہ دیکھو دو دن تک پانی نہ پینا تو بجائے دو دن کے تین دن تک پرہیز رکھے گا کہ بھائی پیاس کی تکلیف ہو بلا سے ہو جان کا رکھنا ضروری ہے، نازک معاملہ ہے، ڈاکٹر صاحب کی تجویز ہے خلاف نہ کرے۔

افسوس کہ ایک طبیب کی تو اتنی قدر ڈاکٹر کی تجویز کی تو اتنی وقعت اور جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی تجویز کی اتنی بھی وقعت نہیں۔ پھر وہ بھی تمہارے ہی نفع کے لیے اپنے نفع کے لیے نہیں بلکہ طبیب کا تو تمہارے پرہیز کرنے میں نفع بھی ہے۔ یعنی دو ہیں،

منافع طبیب کے ایک تو خیر فوت نہیں ہوتا لیکن ایک فوت ہو جاتا ہے۔

طبیب کا ایک تو یہ نفع ہے کہ کچھ فیس مل جاتی ہے مثلاً ڈاکٹر کو بلایا، اس نے سولہ روپے فیس کے رکھوا لیے، پھر اس کی طرف سے چاہے کوئی مرے چاہے جئے، یہ تو وہ نفع ہے جس کسی حال میں فوت نہیں ہوتا۔ دوسری منفعت طبیب کی یہ ہے کہ اگر تم پرہیز کرو گے تو اچھے ہو جائے گا تو وہ طبیب نیک نام ہوگا۔ اگر نیک نام ہوگا تو زیادہ لوگ رجوع کریں گے، جب زیادہ رجوع ہوں گے تو فیس زیادہ آئے گی اور اگر کسی نے بد پرہیزی کی اور اچھا نہ ہوا تو وہ نیک نامی فوت ہوگئی جو سبب تھی زیادتی رجوعات کی اور زیادتی فیس کی تو اتنی غرض طبیب کی بھی ہے پرہیز کرانے میں اور یہاں تو حق تعالیٰ کی اور جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ بھی غرض نہیں۔ سراسر تمہاری ہی مصلحت ہے۔

من نکردم خلق تا سودے کنم — بلکہ تا بر بندگاں جو دے کنم

من نگردم پاک از تسبیح شاں — پاک ہم ایشاں شوندو درفشاں

مابری از پاک و ناپاکی ہمہ — وزگراں جانی و چالاکی ہمہ

یعنی اگر کسی نے ہماری مدح میں سبحان اللہ کہہ دیا تو ہم تو اس کے اس کہنے سے کیا پاک ہوتے وہ خود ہی پاک ہوگیا اور ہماری تو یہ شان ہے کہ ہم ناپاکی سے تو پاک ہیں ہی بندے جس پاکی کو ہماری طرف نسبت کرتے ہیں ہم تو اس پاکی سے بھی پاک ہیں، ہماری شان تو اس سے بھی آگے بڑھی ہوئی ہے۔

آگے مولانا نے اس مضمون کی کس غضب کی مثال دی ہے جس نے ثابت کر دیا اس مضمون کو ورنہ ظاہر میں تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ پاکی سے پاک ہونے کے کیا معنی؟ سو فرماتے ہیں:

شاہ را گوید کسے جولاہا نیست — ایں نہ مدح است اومگر آگاہ نیست

(بادشاہ کی شان میں یہ کہنا کہ آپ جولاہے نہیں ہیں، یہ بھی کوئی مدح ہوئی)

میں دوسری مثال عرض کرتا ہوں۔ ایک شخص بہت بڑا حسین ہے اس کی ایک شخص تعریف کر رہا ہے۔ تو کیا کہے کہ سبحان اللہ! آپ کے حسن کے کیا کہنے ہیں۔ آپ کے چہرے پر چیچک کے گڑھے پڑے ہوئے نہیں ہیں، یعنی آپ اتنے حسین ہیں کہ چیچک کی وجہ سے جو

گہرے گہرے گڑھے پڑجاتے ہیں وہ آپ کے چہرہ پرنہیں ہیں۔ کیوں صاحب! یہ بھی بھلا کوئی حسن ہوا، پھر کیا کچھ یہ تعریف ہوئی افسوس! اس شخص نے حسن کی کچھ بھی قدر نہ کی۔

اسی طرح ہمارا یہ کہنا کہ اے اللہ آپ پاک ہیں امکان سے، آپ پاک ہیں حدوث سے، آپ پاک ہیں حاجت سے، آپ کی بیوی نہیں، آپ کے بچے نہیں، یہ سب اپنے فہم کے موافق ہم نے حق تعالیٰ کی تعریف کی۔ یعنی جن چیزوں کو ہم عیب سمجھتے ہیں ان سے حق تعالیٰ کے بری ہونے کا دعویٰ کیا، لیکن حق تعالیٰ کی شان کے مناسب جو پاکی ہے وہاں ہمارا تو کیا ذہن پہنچتا، سیدالحامدین صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہ عرض کررہے ہیں:

لا احصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک[1]

"اے اللہ! میں آپ کی ثناء کا احاطہ نہیں کرسکتا، آپ ویسے ہی ہیں جیسے آپ نے خود اپنی تعریف کی۔"

یعنی اگر کوئی آپ کی تعریف کرسکتا ہے تو وہ خود آپ ہی ہیں کیونکہ تعریف حقیقی کے لیے معرفت بالکنہ شرط ہے اور معرفت بالکنہ کس کو حاصل ہوسکتی ہے۔ بجز خود ذات حق کے تو ہم تو کیا چیز ہیں، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنا عجز ظاہر فرما رہے ہیں۔ یہی معنی ہیں اس فرمانے کے۔

من نگردم پاک از تسبیح شاں پاک ہم ایشاں شوند و درفشاں

(میں ان کی تسبیح و تقدیس بیان کرنے سے پاک نہیں ہوتا بلکہ اس تسبیح کرنے سے وہ خود پاک ہوتے ہیں)

تو ہماری ہی مصلحت ہے عبادت میں، تو غرض طبیب نے جو پرہیز بتایا ہے وہاں تو اس کی بھی کچھ نہ کچھ مصلحت ہے اور یہاں عبادت میں سراسر ہماری ہی مصلحت ہے۔ پھر بھی جو ہم اس میں بہانے ڈھونڈتے ہیں تو خود اپنا ہی ضرر کرتے ہیں حالانکہ قدر کرنا چاہیے تھی۔ اللہ اکبر! خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو کیسے کیسے کام کی اور شفا کی چیزیں بتلائی ہیں مگر ان سے بچنے کے لیے بہانے ڈھونڈتے ہیں، ذرا گرمی ہوگئی روزہ معاف، ذرا سردی ہوگئی وضو معاف، نماز معاف۔

دیندار و بے دین کا فرق

میرے ملنے والے ایک مولوی صاحب تھے۔ وہ ایک صاحب کے بچوں کو انگریزی

---

[1] مسند الامام احمد ۶: ۵۸، اتحاف السادۃ المتقین ۲: ۷۱

پڑھانے پر نوکر ہوئے۔ وہ مولوی صاحب گو انگریزی پڑھے ہوئے تھے مگر تھے دیندار۔ انگریزی پڑھانا خیر برا نہیں، وہ تو معاش کی ضرورت سے پڑھتے ہیں، سو پڑھو بھائی مگر دین سے تو بے پروائی نہ کرو۔ یہ کیا ضرور ہے کہ انگریزی پڑھو تو دین کو بالکل خیر باد ہی کہہ دو۔ وہ صاحب جن کے بچوں کو مولوی صاحب انگریزی پڑھاتے تھے، عدالت کے سر رشتہ دار تھے۔ مولوی صاحب نے ان کے لڑکوں سے نماز پڑھوانا شروع کی، جب وقت آتا حکم دیتے کہ ہمارے سامنے نماز پڑھو، سردی کا زمانہ تھا، بچوں کو کہیں زکام ہوگیا، ان کی ماں روز کوستی کہ نہیں معلوم یہ کم بخت مولوی کہاں سے آ گیا ہے، خدا اسے کھودے، خدا اسے اُڑا دے۔ جب سے آیا ہے میرے بچوں کو زکام ہی رہنے لگا، استاد کیا ہے، ظالم ہے قصائی ہے، رحم بھی تو نہیں آتا، اس عمر میں نماز پڑھواتا ہے، کہتا ہے کہ نماز سکھلاتے ہیں، اچھی نماز سکھلائی میرے بچوں کو زکام ہوگیا، کھانسی ہوگئی۔

یہ دیکھئے کیسی بے دینی کی باتیں ہیں اور بعضی ایسی بھی ہیں اللہ تعالیٰ کی بندیاں جو دین کی عاشق ہیں۔ ایک اور حکایت ہے ذرا بیہودہ سی، ایک نواب کی لڑکی کا قصہ ہے، گو ہے ان بی بی کی خوبی لیکن اس کے ضمن میں ایک بات کی بیہودگی کا قصہ بھی ہے جو اس نے ان کی طرف منسوب کیا۔

قصہ یہ ہوا، انہی مولوی صاحب کو ہی یہ واقعہ بھی پیش آیا اور یہ عجیب بات ہے کہ ان دونوں قصوں کا تعلق ایک ہی شخص سے ہے۔ اس دوسری حکایت کے شروع کرنے کے بعد یاد آیا کہ یہ بھی انہی کا واقعہ ہے۔ وہی مولوی صاحب ایک زمانہ میں ان بی بی کے بچوں کو فارسی پڑھاتے تھے، ان میں سے ایک بچہ تھا ذرا شریر، رئیسوں کے بچے یوں بھی ذرا آزاد ہوتے ہیں۔ خصوصاً جہاں صحبت بھی اچھی نہ ہو وہاں اور بھی زیادہ آزاد ہو جاتے ہیں، وہ نوکروں کی صحبت میں رہتا تھا اور نوکر اکثر شریر ہوتے ہی ہیں۔ خصوصاً رئیسوں کے نوکر تو بہت ہی شریر ہوتے ہیں، اول تو وہ لڑکا خود ہی شریر، پھر نوکروں کی صحبت، کریلا اور نیم چڑھا۔ مولوی صاحب سے یوسف زلیخا پڑھتا تھا، ایک دن سبق میں حضرت زلیخا کا سراپا تھا کہ رخسارے ایسے تھے، آنکھیں ایسی تھیں، ہاتھ پاؤں ایسے تھے، غرض پورا حلیہ یہاں بیان کیا ہے۔ خیر مولانا جامی نے کی ہے اس میں ذرا شاعری، نوکر نے کیا شرارت کی (لاحول

ولا قوۃ الا باللہ) اس لڑکے سے یہ کہا کہ تم اپنے مولوی صاحب سے یہ پوچھنا کہ حضرت زلیخا کی چھاتیاں کیسی تھیں، وہ بیباک تھا ہی اس نے پوچھ لیا، پس ان کے سر سے پاؤں تک آگ ہی تو لگ گئی، جل کر جواب دیا ایسی تھیں جیسی تیری ماں کی، واقعی بڑا سخت جواب تھا۔ آخر امیر کا بچہ تھا، نہایت ناگوار ہوا کہ میری ماں کو گالی دی، زلیخا کو گالی دیتے ہوئے تو کچھ برا نہ معلوم ہوا اور وہی بات اپنی ماں کے بارے میں سن کر ایسی ایسی ناگواری ہوئی۔

غرض اس کو بڑا غصہ آیا اور اس نے جا کر اپنی ماں سے شکایت کی کہ آج مولوی صاحب نے تمہیں ایسا ایسا کہا، یہ ایک ایسی بات تھی کہ جس کو نواب کی لڑکی جو عفیف بھی ہو، شریف بھی ہو، سن کر کیا آگ بگولا نہ ہو جاتی لیکن وہ نہایت دیندار تھیں۔

غرض کہ مولوی صاحب کو بلایا اور پوچھا کہ آپ نے کوئی کلمہ بیہودہ میرے بارے میں کہا ہے۔ مولوی صاحب نے بے دھڑک کہہ دیا کہ ہاں صاحب کہا ہے، وہ بھی بڑے حضرت تھے، کہنے لگے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے سارا قصہ بیان نہیں کیا گیا۔ آپ سے اصل سبب میری اس گستاخی کا ظاہر نہیں کیا گیا ورنہ آپ کو اس قدر ناگوار نہ ہوتا، وہ بولیں کہ کہئے، مولوی صاحب نے کہا سنئے! حضرت زلیخا پہلے جیسی بھی ہوں لیکن اخیر میں ان کا نکاح حضرت یوسف علیہ السلام سے ہو گیا تھا اور انبیاء سب مسلمانوں کے باپ ہیں اور ان کی بیویاں مائیں ہیں۔ اس نے حضرت زلیخا کے بارے میں یہ بیہودہ سوال کیا، اس کا میں نے یہ جواب دیا، اس نے میری ماں کو کہا، میں نے اس کی ماں کو کہا، تو وہ بڑی خوش ہوئیں کہا آپ نے بہت اچھا کیا اور اس نالائق کے منہ پر آپ نے جوتا نہ مارا، پھر انہوں نے اس لڑکے سے کہا دور ہو جا کم بخت! نکل جا گھر سے، ہٹ جا میرے سامنے سے، تیرا منہ دیکھنے کے قابل نہیں اور مولوی صاحب سے کہا آپ نے بہت ہی اچھا کیا۔

تو غرض یہ ہے کہ ایک دیندار عورت کی حکایت جو مجھے اس وقت یاد آئی اور ایک وہ تھی جو کوستی تھی، گویا نماز اور وضو کو اتنا ناگوار سمجھتے ہیں کہ ذرا سے بہانہ میں وضو بھی نماز بھی ندارد۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا توکل

بہت لوگ ہم نے دیکھے کہ اچھے خاصے نمازی لیکن ریل میں نماز ہی نہیں پڑھتے۔ کہتے

ہیں کہ صاحب ریل میں وضو کا معاملہ بھی ٹھیک نہیں، صاحب قبلہ کا بھی ٹھیک نہیں، بھیڑ بھاڑ میں سجدہ کا بھی موقع نہیں، کھڑے ہونے کی بھی گنجائش نہیں، کیا نماز پڑھیں اور کیسے نماز پڑھیں، حالانکہ جو نماز پڑھتے ہیں انہیں ریل ہی میں سارے سامان مہیا ہوجاتے ہیں۔

چنانچہ اتنا زمانہ ہوا میں نے ریل میں کبھی بے وضو یا بیٹھ کر یا بے رخ نماز نہیں پڑھی اور میں اکثر تیسرے درجہ میں سفر کرتا ہوں، احباب بہت ترغیب دیتے ہیں کہ انٹر میں سفر کرو، بعضے اصرار کرتے ہیں کہ سیکنڈ میں بیٹھو، مگر غریبوں کو تو غریبوں ہی کی طرح رہنا چاہیے۔ اپنی حیثیت سے زیادہ نہیں بڑھنا چاہیے، غرض اکثر تیسرے درجہ ہی میں سفر کرنے کا اتفاق ہوتا ہے جس میں اکثر مسافروں کی بہتات ہوتی ہے اور بہت بھیڑ بھاڑ رہتی ہے لیکن بفضلہٖ تعالیٰ ہمیشہ نماز پڑھی۔ نیز وضو کے ساتھ رکوع وسجود کے ساتھ قبلہ رخ ہوکر بات یہ ہے کہ اگر انسان ارادہ کرے تو حق تعالیٰ ساری رکاوٹوں کو دور کرتے چلے جاتے ہیں۔ خوب فرماتے ہیں مولانا:

گرچہ رخنہ نیست عالم راپدید   خیرہ یوسف دارمی باید دوید

(گو رستہ نظر نہ آوے لیکن تم دوڑو تو سہی رستہ خود بخود پیدا ہوتا چلا جاوے گا)

حضرت یوسف علیہ السلام کا بھی تو یہی مقصود۔ ان کے واسطے بھی رستہ کہاں تھا، سات قفل آگے پیچھے لگے ہوئے تھے، ایسی حالت میں کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہاں سے بھاگ جانا ممکن تھا، یا کسی کو اس کی امید ہوسکتی تھی کہ میں باہر نکل جاؤں گا جبکہ زلیخا نے ساتوں کواڑ بھی محل کے بند کردیئے تھے اور اوپر سے بڑے بڑے قفل بھی لگادیئے تھے، پھر وہاں سے بچ کر نکل جانے کی کیا صورت ہوسکتی تھی۔ مگر اللہ اکبر! حضرت یوسف علیہ السلام کا توکل دیکھئے بس بات یہ ہے کہ وہ مسئلہ جانتے تھے کہ آدمی کے قبضہ میں جتنا ہو وہ کرے، آگے جو کچھ ہوا سے حق تعالیٰ کے سپرد کرے اتنا توکل تھا کہ باوجود اس کے کہ جانتے تھے کہ میں قفلوں کے اندر محبوس ہوں لیکن پھر بھی مایوس نہ ہوئے اور جو کام اس وقت ان کی قدرت میں تھا، وہ کیا یعنی زلیخا سے دامن چھڑا کر دروازہ کی طرف کو جھپٹے، اب ان سے کوئی پوچھے کہ آپ جا کہاں رہے ہیں وہاں تو قفل لگا ہوا ہے لیکن جناب حق تعالیٰ کو تو سب کچھ قدرت ہے، بس دروازہ کے پاس پہنچنا تھا کہ پھٹ سے قفل نیچے، اسی طرح جس دروازے کے پاس پہنچے خود بخود قفل ٹوٹ کر گر پڑے اور کھٹ

سے کواڑ کھل جائیں۔ غرض ساتوں دروازوں کے پار ہو گئے۔ مولانا اسی کو فرماتے ہیں:

گرچہ رخنہ نیست عالم راپدید　　خیرہ یوسف دارمی باید دوید

(گو رستہ نظر نہ آوے لیکن تم حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح دوڑو تو رستہ تو خود بخود پیدا ہوتا چلا جاوے گا، تم اپنا کام تو کرو پھر رستہ پیدا کرنا حق تعالیٰ کا کام ہے، وہ اپنا کام کریں گے۔)

میرے ذہن میں بھی ایک مثال آئی ہے۔ میں نے پہلے بھی کسی موقع پر اس مثال کو بیان کیا ہے لیکن چونکہ مثال بہت اچھی ہے اس لیے اس وقت پھر یاد آئی۔ یہاں سے مظفر نگر جاؤ تو سڑک پر آپ دیکھیں گے کہ دو طرفہ درخت کھڑے ہوئے ہیں، پھر کھڑے ہو کر دور تک دیکھئے تو جہاں تک نگاہ جا سکتی ہے وہاں پہنچ کر نگاہ کے سامنے گویا دونوں طرف کے درخت مل کر کھڑے ہو جاویں گے۔ ایسا معلوم ہوگا کہ سڑک بند ہو گئی اور آگے رستہ چلنے کا نہیں ہے، جب جی چاہے جا کر دیکھ لیجئے، جب ہی ایسا معلوم ہوگا اب اگر کوئی ناواقف ہے تو یہی سمجھ کر لوٹ آوے گا کہ آگے راستہ تو ہے نہیں پھر چلنے سے کیا فائدہ اور اگر کوئی واقف کار مل گیا تو وہ کہے گا تم چلو تو رستہ ملے گا۔ لیکن یہ کہتا ہے کہ میاں آنکھوں سے تو ہم دیکھ رہے ہیں کہ آگے چل کر رستہ بند ہے پھر اپنے مشاہدہ کو بھی ہم غلط سمجھیں۔ وہ کہتا ہے کہ ہاں واقعی تمہاری آنکھیں غلط دیکھ رہی ہیں یہاں بیٹھے بیٹھے تمہیں راستہ نظر نہیں آتا، جب وہاں پہنچو گے تب دیکھو گے کہ رستہ بالکل کھلا ہے۔ تم بیٹھے ہو کنارہ پر اس لیے رکاوٹیں نظر آرہی ہیں، بس چلنا شروع کر دو اور دور تک نظر کو دوڑاؤ نہیں۔ مولانا کا شعر ہے:

اے خلیل ایں جا شرور دو دنیست　　جز کہ سحر دخدخہ نمرود نیست

(اے خلیل! ڈرنا نہیں یہ آگ نہیں ہے، یہ نمرود کا دھوکہ ہے فریب ہے، بسم اللہ کر کے تیار ہو جاؤ۔)

تو حضرت اسی طرح جتنی رکاوٹیں دین کے راستہ میں نظر آرہی ہیں خدا کی قسم وہ رکاوٹیں ہی نہیں تم یہاں بیٹھے بیٹھے فیصلہ کر رہے ہو کہ رکاوٹیں ہیں، وہاں پہنچ کر دیکھو گے تو رستہ بالکل کھلا ہوا پاؤ گے۔ پھر جب وہاں پہنچ کر آگے دیکھو گے تو پھر راستہ نظر آئے گا، پھر راستہ کھلا ہوا ملے گا۔ غرض تمہیں نظر آتا ہے کہ راستہ بند ہے حالانکہ واقعی میں کھلا ہوا ہے مگر

چلنا شرط ہے اب کوئی بدن کو حرکت ہی نہ دے تو اس کا کیا علاج!

ریل کی نماز

کہتے ہیں کہ صاحب ریل میں نماز پڑھنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے اور حالت یہ ہے کہ نہ اہتمام کرتے ہیں نہ مسافروں سے کہتے ہیں کہ بھائی ہمیں تھوڑی سی جگہ دیدو، تھوڑی دیر کے لیے کھڑے ہو جاؤ ہمیں نماز پڑھنی ہے، بس بیٹھ کر خود ہی فیصلہ کر لیا کہ چاروں طرف تو آدمی ہیں کہاں نماز پڑھیں، بس ایسی حالت میں نماز معاف ہے، یہ بڑے بڑے نمازی جو ہیں ان کا حال ہے۔

بعضوں نے ایک اور مسئلہ گھڑ رکھا ہے کہ چاہے کھڑے ہونے پر قدرت ہو لیکن ریل میں بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے، بس بیٹھے اور ٹکریں مار لیں حالانکہ فرض نماز میں بشرط قدرت قیام فرض ہے۔

بعض نے یہ مسئلہ گھڑ رکھا ہے کہ تشہد میں بیٹھنا ہی ضروری نہیں۔ پس پاؤں لٹکا کر اطمینان سے دوسرے تختہ پر سر ٹیک دیا اور اپنے نزدیک نماز ادا کر لی، ذرا مشقت بھی تو گوارا نہیں، چاہے فرض سر سے اترے یا نہ اترے، بعضوں کو دیکھا کہ قبلہ رخ ہونا بھی ضروری نہیں سمجھتے، ریل میں کیا بیٹھے گویا اپنے نزدیک خانہ کعبہ کے اندر پہنچ گئے۔

وہاں بڑا لطف آتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے ہمیں بھی اندر پہنچنا نصیب کیا تھا ہم نماز پڑھ رہے تھے، بھیڑ بہت تھی، سجدہ کا موقع نہ ملا تو ہم نے گھوم کر دوسری طرف سجدہ کر لیا کیونکہ وہاں تو چاروں طرف کعبہ ہی کعبہ ہے ہر طرف سجدہ کرنا جائز ہے، مثلاً چار رکعتیں پڑھنی ہوں تو چاروں سجدے چار مختلف سمتوں میں کر سکتا ہے۔ ایک ادھر ایک ادھر ایک اس طرف مگر یہ آزادی صرف اندر اندر ہی ہے، باہر پہنچ کر دنیا میں کوئی ایسی جگہ ہی نہیں جہاں یہ آزادی ہو کہ جس طرف چاہے سجدہ کر سکے۔ مولانا فرماتے ہیں:

در درون کعبہ رسم قبلہ نیست   چہ غم ارغواص راچبلہ نیست

(کعبہ کے اندر قبلہ رخ ہونے کے اہتمام کی ضرورت نہیں، ہر طرف قبلہ ہی ہے۔)

تو کعبہ کے اندر قبلہ کی قید نہیں اور یہ حضرت ریل ہی میں بیٹھ کر قبلہ رخ ہونے کی ضرورت نہیں سمجھتے اور غضب یہ ہے کہ اگر کہا بھی گیا کہ نماز نہیں ہوئی تو یہ کہہ دیا کہ اجی سب

ہوگئی نہ پڑھنے سے تو اچھا ہے۔ جیسے جمعہ کے بارے میں کہہ دیتے ہیں کہ گاؤں میں اگر جمعہ پڑھ ہی لیا تو کیا بگڑ گیا، نہ پڑھنے سے تو پھر بھی اچھا ہے، میں کہتا ہوں کہ پھر بمبئی جا کر حج بھی کر آیا کرو بلکہ کیرانہ ہی کر لیا کرو کیونکہ حج نہ کرنے سے تو اچھا ہے۔ بس اس کی طرف ضرورت ہی نہیں سمجھتے کہ شرائط بھی ہوں، حدود بھی ہوں۔ یہ تو ہم نے نمازیوں کا حال دیکھا ہے اور اس کا کوتاہی ہونا ظاہر ہے اور اس کا حاصل طاعت کے اندر سستی اور بے پروائی یہ تو تفریط ہے۔

غلو فی الطاعت

ایک حالت ہے غلو فی الطاعت یعنی زیادتی کرنا طاعت میں یہ افراط ہے لیکن میں نے کہا تھا کہ غلو کا بھی ایک معیار ہے جو لوگوں کی رائے پر نہیں چھوڑا گیا اور اگر چھوڑ بھی دیا جاتا تو بوجہ اختلاف طبائع کے کوئی معیار ہی قائم نہ رہ سکتا تھا۔ وہ معیار یہ ہے کہ حدود سے آگے بڑھ جانا، خلاصہ کیا ہے اس معیار کا۔ خلاصہ یہ ہے کہ شریعت نے ہر عمل کی ایک حد اور کچھ شرائط مقرر کی ہیں تو ہر عمل کے کچھ احکام ہیں، کچھ شرائط ہیں، کچھ حدود ہیں، کچھ ضوابط ہیں، کچھ قواعد ہیں، ان کے خلاف کرنا حدود سے گزر جانا ہے، اسی کا نام ہے غلو اور مجھے اس وقت اسی کو بیان کرنا مقصود ہے کیونکہ ایک یہ بھی مرض ہے ہم لوگوں میں، پس ہماری یہ حالت ہے۔

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

اور مولانا فرماتے ہیں:

چوں گرسنہ می شوی سگ می شوی چونکہ خوردی تند بدرگ می شوی

جب بھوکا ہوتا ہے تو کتا بن جاتا ہے اور اگر کھانے کو مل جائے تو بداخلاق ظالم بن جاتا ہے۔

ہمارے کھانے میں اور طرح کی خرابیاں ہیں، نہ کھانے میں اور طرح کی خرابیاں ہیں۔ غرض ہر حالت میں خرابی ہی خرابی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

ہرچہ گیرد علتی علت شود کفر گیرد کاملے ملت شود

بری طبیعت کا آدمی اچھائی میں بھی برائی کا پہلو نکالے گا اور اچھی طبیعت کا آدمی برائی میں بھی خیر کا پہلو نکالے گا۔

علتی جس چیز کو اختیار کرتا ہے علت ہی بنالیتا ہے جیسا کہ اگر کسی میں خلط غالب صفرا

ہے تو وہ مٹھائی بھی کھائے گا وہ بھی صفرا ہی ہو جائے گی، انار شیریں کھائے گا وہ بھی صفرا ہی ہو جائے۔ اسی طرح ہم میں جہل اتنا بڑھا ہوا ہے اگر ہم دین کا بھی کوئی کام کرتے ہیں تو اس میں بھی جہل ہی ہوتا ہے۔ پس خلاصہ دینداری کا یہ نکال لیا ہے کہ ہم نے دین کا کام کیا ہے۔ ارے بھائی دین کا کام تو وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ بھی پسند کریں، رات بھر تو آقا کو پنکھا جھلا اور حال یہ ہے کہ کبھی سر میں ماردیا، کبھی منہ پر ماردیا، کبھی ٹوپی اتاردی یہ تو اپنے نزدیک خدمت کررہا ہے اور اس کی کبھی ناک چڑھتی ہے کبھی تیوری پر بل پڑتے ہیں، غرض جتنی وہ خدمت کرتا ہے اتنا ہی وہ دل میں ناراض ہوتا چلا جاتا ہے اور یہ حضرت صبح کو سمجھتے ہیں کہ میں نے بڑا کام کیا، رات بھر آقا کی خدمت کی آرام پہنچایا۔

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے حاصل خواجہ بجز پندار نیست

خواجہ نصیحت کر کے سمجھتا ہے کہ اس نے بڑا کام کیا حالانکہ اسکی نصیحت کا مقصد سوائے اپنی بڑائی کے جتانے کے کچھ نہیں۔

اسی طرح ہم نے دین کا جو کام بے ڈھنگے طور پر کیا اور سمجھا کہ ہم نے بڑی طاعت کی مگر ایسی طاعت کی جیسی مولانا فرماتے ہیں:

دوستی بے خرد چوں دشمنی ست حق تعالیٰ زیں چنیں خدمت غنی ست

بے عقل کی دوستی بھی دشمنی ہے اللہ تعالیٰ اس قسم کی خدمت سے بے نیاز ہے۔

مشہور ہے کہ کسی نے ریچھ کو پنکھا جھلنا سکھایا تھا کہ بیٹھ کر مکھیاں جھلا کرے گا۔ چنانچہ تھوڑے دنوں میں اس نے پنکھا جھلنا سیکھ لیا، مالک پڑا سوتا رہتا اور وہ بیٹھا مکھیاں جھلا کرتا، وہ صاحب بڑے خوش کہ نوکر کی تنخواہ ہی بچی، ایک شخص نے کہا بھی کہ میاں یہ کیا کرتے ہو جانور ہے، اس کا کیا اعتبار، کبھی خطا نہ کھاؤ، مگر انہوں نے کہا کہ نہیں صاحب اس سے کوئی اندیشہ نہیں، یہ تعلیم یافتہ ہے، بہت اچھا صاحب وہ تعلیم یافتہ تھا، مڈل پاس تھا، ایک دن مالک سو رہا تھا اور وہ بیٹھا پنکھا جھل جھل کر مکھیاں اڑا رہا تھا، بعضی مکھی بڑی ضدن ہوتی ہے ایک مکھی آقا صاحب کے ناک پر آ بیٹھی، اس نے اس کو اُڑا دیا، وہ پھر آ بیٹھی، اب وہ بہت جھلایا، اس نے کہا اچھی بات ہے تو یوں نہیں جاوے گی، آپ جا کر ایک بڑا سا پتھر اٹھا لائے

اور کہا اب کے تو آ جو پتھر ہی نہ مارا ہو مگر وہ بھلا کب ماننے والی تھی اس کی تو یہ عادت ہی تھی پھر آ بیٹھی، آپ نے تاک کر جو پتھر مارا تو خدا جانے وہ تو کچلی یا نہ کچلی مگر آقا کا بھیجہ تو نکل ہی پڑا، یہ ریچھ صاحب کی دوستی کا نتیجہ نکلا۔ تو مولانا فرماتے ہیں:

دوستی بے خرد جوں دشمنی ست　　　حق تعالیٰ ازیں چنیں خدمت غنی ست

(بے عقل کی دوستی بھی دشمنی ہے، حق تعالیٰ اس حکم کی خدمت سے بے نیاز ہیں)

اے صاحب! اگر ہر عبادت مطلوب ہوتی اور ہر طریق سے مطلوب ہوتی کوئی حد اور شرط نہ ہوتی تو پھر عید کے دن کا روزہ بھی حرام نہ ہوتا، دو پہر کے وقت کی نماز بھی حرام نہ ہوتی، ایسی حالت میں سفر کے اندر روزہ بھی جائز ہوتا حالانکہ فرما رہے ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "لیس من البر الصیام"[1] بس یہی مسئلہ مجھے مستنبط کرنا تھا اس حدیث سے کہ طاعت بھی وہی ہے جو حدود کے اندر ہو۔ دیکھو نماز کیسی اچھی چیز ہے۔ اگر اس کو ننگے پڑھو یا گھٹنے کھول کر پڑھو، حالانکہ کپڑے موجود ہیں نماز نہ ہوگی، ہمیشہ سے یہ مرض ہے عابدوں میں اور دین کے کام کرنے والوں میں کہ بس یہ دیکھ لیا کہ یہ دین کا کام ہے۔ پھر یہ خیال نہیں کرتے کہ یہ حدود کے اندر ہے یا نہیں۔ حالانکہ شریعت میں یہاں تک حدود کی حفاظت ہے کہ ابھی بیان کر رہا تھا کہ فلاں وقت میں نماز پڑھنا جائز نہیں، فلاں فلاں وقت روزہ جائز نہیں، یہاں تو خیر حرمت ہے اور بعض جگہ حرمت تو نہیں لیکن کراہت ہے۔

دیکھئے نماز کیسی اچھی چیز ہے لیکن ایک صحابی تھے، وہ بہت نمازیں پڑھا کرتے تھے، یہاں تک کہ رات بھر نفلوں میں ہی گزار دیتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو ان کو بلایا اور فرمایا: **ان لنفسک علیک حقا وان لعینک علیک حقا ولزوجک علیک حق**[2] "یعنی دیکھو! بھائی نمازی اتنی نمازیں نہیں پڑھا کرتے تھے کیونکہ تم پر تمہاری جان کا بھی حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی حق ہے، تمہارے مہمان کا بھی حق ہے۔"

ایسی طرح رہو کہ کسی ذی حق کا حق فوت نہ ہو اور ایسی طرح رہو کہ بیمار نہ پڑ جاؤ، بیوی

---

[1] سنن ابی داؤد کتاب الصیام ب: ۴۳، سنن النسائی ۴: ۱۷۶، ۱۷۷، سنن ابن ماجہ: ۱۶۶۴، ۱۶۶۵، سنن الترمذی: ۷۱۰، مسند الامام احمد ۳: ۳۱۹، ۵: ۴۳۴

[2] مسند الامام احمد ۲: ۲۲۸، المستدرک للحاکم ۳: ۲۰، اتحاف السادۃ المتقین ۳: ۱۵۲

کی حق تلفی نہ ہونے پائے، مہمان کو بھی تکلیف نہ ہو، جاگتے جاگتے آنکھیں نہ ابل آدیں اور یہ بھی فرمایا: "ان اللہ لایمل[۱]" حق تعالیٰ تو تھکتا نہیں، آخر تم ہی تھک جاؤ گے حالانکہ وہ صحابی کسی مکروہ وقت میں بھی نماز نہیں پڑھتے تھے مگر چونکہ تحمل سے زیادہ پڑھتے تھے، اس لیے یہ احتمال تھا کہ کہیں فرضوں میں کوتاہی نہ ہونے لگے اور اگر فرضوں میں کوتاہی نہ بھی ہو تو خود اس عبادت میں بھی کراہت اور ناگواری پیدا ہو جانا بھی تو برا ہے اور تحمل سے زیادہ کام کرنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ جب عبادت میں ناگواری پیدا ہونے لگے تو پھر لطف ہی کیا رہا۔ اس لئے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابی کو زیادہ جاگنے سے اور زیادہ نمازیں پڑھنے سے روکا۔

اسی طرح ایک صحابی کے بارے میں سنا کہ روزے بہت رکھتے ہیں ان کو کمی کا طریقہ بتایا۔ انہوں نے زیادہ کی اجازت پر اصرار کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اخیر میں فرمایا: کہ سب سے افضل یہ ہے کہ ایک دن روزہ رکھو اور ایک دن روزہ افطار کرو، انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں اس سے بھی افضل کی طاقت رکھتا ہوں مجھے کوئی اس سے بھی افضل صورت بتلا دیجئے، تو آپؐ فرماتے ہیں "لاافضل من ذالک" اس سے افضل کوئی صورت نہیں اور یہ صورت تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست پر تجویز فرمائی تھی۔ یہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل رائے ظاہر نہیں ہوتی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل رائے خصوصاً ضعفاء کے لیے تو یہ ہے کہ تحمل کی قدر رکھے حتیٰ کہ اس کو بھی کافی سمجھا کہ ہر مہینہ میں تین روزے رکھ لئے جایا کریں زیادہ مصیبت اٹھانے کی ضروری نہیں کیونکہ

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا

"جو شخص ایک نیکی کرتا ہے اس کو دس نیکیوں کا ثواب مل جاتا ہے۔"

تو تین روزے رکھنے سے تیس روزوں کا ثواب مل جائے گا اور ثواب ہی مقصود ہے تو ہر مہینہ میں تین روزے رکھنے کے یہ معنی ہوئے کہ گویا سال بھر برابر روزے رکھے۔

---

[۱] الصحیح للبخاری ۶۸:۲، ۵۱:۳، ۲۰۰:۷، موطا مالک :۱۱۸، الصحیح لمسلم، صلوٰۃ المسافرین:۲۱۵، کتاب الصیام:۱۷۷

یہاں ایک باریک بات سمجھنے کے قابل ہے وہ یہ کہ ظاہر میں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عبادت میں کمی کرائی لیکن دراصل یہ بات نہیں، کمی نہیں کرائی بلکہ کمی سے روک دیا یعنی نفل عبادت میں زیادتی ہوگی تو قوی مضمحل ہوکر فرض عبادت میں کمی ہو جاوے گی۔

دوسرے یہ کہ اگر ابتداء سے تھوڑا کام مقرر کیا جائے گا تو اس کا نباہ آسان ہوگا ورنہ اگر شروع زیادہ کرلیا تو اس کا نباہ نہ ہوسکے گا اور کچھ دن بعد پھر بالکل ہی موقوف ہو جاوے گا تو نفل عبادت میں زیادتی کر کے گویا فرض میں بھی کمی ہوئی اور خود اس نفل میں بھی کمی ہوئی۔

بہرحال عبادت میں زیادت تو مطلوب ہے، زیادت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہیں روکتے بلکہ کمی سے روکتے ہیں تو دیکھئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تجویز فرمایا۔ ان کے حق میں کہ ایسا نہ کرو کہ رات بھر نفلیں ہی پڑھتے رہو، ایسا نہ ہو بیمار پڑ جاؤ، ایسا نہ ہو بیوی کا حق ضائع ہونے لگے، ایسا نہ ہو مہمان کی ضروری خدمت میں بھی خلل پڑ جائے۔

ایک مرتبہ چند صحابیوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کا طرز دریافت کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ آپ رات کو سوتے بھی ہیں جاگتے بھی ہیں، کبھی روزہ رکھتے ہیں کبھی افطار کرتے ہیں۔ راوی کہتے ہیں: **"فکانهم تقالوها"**. حضرات صحابہ نے اتنی عبادت کو قلیل سمجھا، کیسے اچھے تھے وہ حضرات، ہم تو اس قلت سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جب حضور افضل العابدین ہوکر صرف اتنی ہی عبادت کرتے ہیں تو ہم تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کچھ بھی نہیں، ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر عبادت کہاں کر سکتے ہیں۔

انحراف سنت کا نتیجہ

حضرات نے یہ نتیجہ نکالا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا ضرورت ہے عبادت کی، اس واسطے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تو حق تعالیٰ خود فرما چکے ہیں:

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ.

''تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کی سب اگلی پچھلی خطائیں معاف فرمادے۔''

پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا ضرورت ہے مصیبت بھرنے کی۔ حضور اکرم صلی

اللہ علیہ وسلم کے تو اگلے پچھلے سب خطائیں حق تعالیٰ نے بخش دی ہیں، ہم گنہگار ہیں، ضرورت تو عبادت کی ہم کو ہے۔ لہٰذا ہم اپنے کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر کیوں قیاس کریں، ہم کو تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ عبادت کرنی چاہیے۔ وہاں یہ اثر ہوا۔

چنانچہ انہوں نے آپس میں مختلف عہد کئے۔ ایک جماعت نے تو یہ کہا کہ ہم عورتوں سے ہمیشہ الگ رہیں گے۔ یعنی نکاح ہی نہ کریں گے، بعض نے یہ کہا کہ ہم ہمیشہ روزے ہی رکھا کریں گے، کوئی بولا کہ بس میں رات بھر جاگا ہی کروں گا، اتنے میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف لے آئے۔ آپؐ نے فرمایا جو کچھ تم آپس میں کہہ رہے ہو وہ میں نے بھی سنا مگر یاد رکھو کہ ہم تو روزہ بھی رکھتے ہیں، افطار بھی کرتے ہیں، بھوکے بھی رہتے ہیں، پیٹ بھرے بھی رہتے ہیں، سوتے بھی ہیں، جاگتے بھی ہیں، پھر فرمایا: "ذالک من سنتی" بس میرا طریقہ یہ ہے میری یہ سنت ہے۔ "فمن رغب عن سنتی فلیس منی[1]" پس یاد رکھو! جو اعراض کرے گا میرے طریقہ سے اور میری سنت سے اس کو مجھ سے کوئی علاقہ نہیں، تو آپؐ نے ان سب کو منع فرما دیا کہ اپنی ان تجویزوں پر ہرگز عمل نہ کریں بلکہ اس طرح رہو جیسے ہم رہتے ہیں۔

اس میں دو راز ہیں، ایک تو ہے ظاہری اور ایک ہے باطنی۔ ظاہری یہ ہے جب راحت ہوتی ہے تو سہولت سے کام ہوتا ہے اور باطنی راز یہ ہے کہ راحت کا خاصہ ہے کہ منعم کے ساتھ محبت ہو جاتی ہے۔ بشرطیکہ نعمت سے تمتع کے وقت منعم پر نظر بھی ہو کہ یہ نعمت کس کی طرف سے ہے، غرض راحت سے بسر کرنے اور آرام لینے سے حق تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے کہ سبحان اللہ! خدا نے مجھے کتنا سامان راحت دے رکھا ہے۔

دوسرے ایسا شخص یہ سمجھتا ہے کہ ہمارا عمل کم ہے۔ کسی کیفیت یا ثمرہ کا اپنے آپ کو مستحق نہیں سمجھتا نہ متوقع رہتا ہے۔ جانتا ہے کہ میں کر ہی کیا رہا ہوں جو مجھے کچھ حاصل ہو اور جتنا کچھ بھی حاصل ہوتا ہے اس کو محض حق تعالیٰ کی عطا سمجھتا ہے، اپنے عمل کا نتیجہ نہیں سمجھتا۔ بخلاف اس کے جو حدود سے زیادہ عبادت اور بڑے بڑے مجاہدے اور ریاضت کرتا ہے۔ وہ

---

[1] الصحیح للبخاری ۷: ۲، الصحیح لمسلم کتاب النکاح: ۵، سنن النسائی کتاب النکاح ب: ۴

ہمیشہ اسی کا منتظر رہتا ہے کہ وجد ہو، سکر ہو استغراق ہو اور جانے کیا کیا ہو اور گر یہ نہیں ہوتا یا کم ہوتا ہے تو اس کے دل میں یہ شکایت پیدا ہوتی ہے کہ میں اتنا زیادہ کام کرتا ہوں پھر مجھے کوئی بات حاصل نہیں ہوتی جس کا دوسرے الفاظ میں یہ مطلب ہوتا ہے کہ میں تو خدا کا پورا حق ادا کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ مجھے پوری جزا نہیں دیتے، میرے اعمال کا پورا صلہ نہیں دیتے تو یہ شخص اپنی عبادت کا پلہ بھاری سمجھتا ہے اور حق تعالیٰ کی عنایت کا پلہ ہلکا سمجھتا ہے کہ یہ میرا پلہ بھاری ہے خدا کا پلہ ہلکا ہے ''غلوفی العبادۃ'' میں ایک یہ مرض باطنی پیدا ہوجاتا ہے۔ اسی واسطے غلو اور تشدد کرنا مناسب نہیں، حدود کے اندر رہنا چاہیے۔ حضرت حافظ فرماتے ہیں:

گفت آساں گیر بر خود کارہا کز روئے طبع — سخت میگیر د جہاں برمرداں سخت کوش

(عمل میں آسان راستہ کر، سخت روی اختیار نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ مشقت میں ڈال دیتے ہیں)

یہ اس حدیث کا ترجمہ ہے ''من شاق شاق الله علیه حدود الله''[1]

خلاصہ یہ ہے کہ عبادت بھی اس کی رائے پر نہیں ہے، عبادت میں بھی حدود سے آگے نہ بڑھنا چاہیے۔ چنانچہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ''تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَاتَقْرَبُوْهَا'' کہیں فرماتے ہیں: ''فَلَاتَعْتَدُوْهَا'' یہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی حدود ہیں، ان سے آگے نہ بڑھو بلکہ ان کے پاس بھی نہ پھٹکو، اس وقت یہ عام غلطی ہے خصوصاً جو دین کا کام کرتے ہیں۔ انہوں نے حدود کا یہ خلاصہ نکال لیا ہے کہ اصل میں کام مقصود ہے، جس طریق سے بھی حاصل ہوجائے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی نے دل میں یہ ٹھان لیا کہ لوگوں سے جماعت کی نماز پڑھوانی چاہیے کیونکہ یہ بڑا ثواب کا کام ہے۔ اس کا طریق جو شریعت نے بتلایا ہے وہ یہ ہے کہ مؤذن کھڑا ہو کر پکاردے ''حیّ علی الصلوٰۃ'' چنانچہ اذان کہہ دی گئی لیکن کوئی بھی نہیں آیا، اس نے سوچا یہ طریقہ تو کافی نہیں ہوا، کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ بس آپ نے کیا کیا کہ گانے بجانے والے بلالئے اور بجائے اذان کے یا بعد اذان کے ان سے کہہ دیا کہ ہاں ذرا شروع تو کرو، بس راگ کا شروع ہونا تھا کہ لوگ چاروں طرف سے آآکر جمع ہونا شروع ہوگئے، یہاں تک کہ ساری مسجد بھر گئی۔ پھر اس نے پھاٹک بند کرا کے

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الاقضیه ب: ۳۱، سنن الترمذی: ۱۹۴۰، سنن ابن ماجه: ۲۳۴۲

وضو کا اہتمام کیا اور سب سے نماز پڑھوائی۔ وہ کوئی ذی اثر شخص تھا نہیں، براہ راست لوگوں کو بلا سکتا نہ تھا، اس لیے اس نے بلانے کی یہ ترکیب کی۔ پھر بلانے کے بعد سب سے نماز پڑھنے کے لیے کہا تو کون انکار کر سکتا تھا، بہت بڑی جماعت کے ساتھ نماز ہوئی اور جنہیں عمر بھر بھی جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی توفیق نہ ہوئی تھی انہیں بھی جماعت کا ثواب مل گیا۔ آپ بڑے خوش کہ سبحان اللہ! میں نے کیسا اچھا کام کیا، دیکھا اس ترکیب سے نماز پڑھوایا کرتے ہیں، اسی طرح ثواب کماتے ہیں۔

تو میں استفتاء کرتا ہوں عام صاحبوں سے کہ گانا بجانا یا رنڈی نچانا اس غرض کے حاصل کرنے کے لیے کہ لوگ جماعت کے ساتھ نماز پڑھیں کیونکہ اذان سے تو وہ مسجد میں آتے نہیں کیا یہ جائز ہے؟ یا یہ حکم شرعی ہے کہ تم اپنی طرف سے اذان کہہ دو پھر چاہے کوئی آوے یا نہ آوے اس جزئی میں تو کسی کا کلام نہیں ہوتا مگر اس کے ماننے والے دوسری جگہ اس کے امثال میں غلطی کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اعمال سے مقصود حق تعالیٰ کو راضی کرنا ہے تو عمل فی نفسہ کوئی بھی مقصود بالذات نہیں تو رضائے حق مقصود بالذات ہے۔ اس کے طرق اور اسباب مقصود بالغیر، لیکن طرق اور اسباب اگر متعدد اور مختلف ہوں تو ان کی تعیین آپ کی رائے پر نہیں بلکہ شریعت نے جیسے مقصود کو متعین کیا ہے ایسے ہی طرق اور اسباب کو بھی متعین کر دیا ہے کہ رضا کی یہ سبیل ہے اور یہ طریق ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

اِنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ.

''یہی مجھ تک وصول کا سیدھا راستہ ہے، پس اس پر چلتے رہو۔''

یعنی خدا کی ایک سڑک ہے جو مقصود تک پہنچاتی ہے اس کی ایسی مثال ہے میں ایک کام کی مثال بیان کرتا ہوں (یہاں تک بیان فرمایا تھا کہ عشاء کی اذان ہونے لگی، حضرت ساکت ہو گئے، بعد ختم اذان پھر شروع فرمایا) مثلاً بہت لوگوں کو ہم نے اس بلا میں مبتلا دیکھا کہ کوئی مسجد بنوانی چاہی یا کسی مدرسہ وغیرہ کو جاری کرنا چاہا تو اس کے مختلف طریق ہیں۔ جائز طریق تو یہ ہے کہ اعلان کر دیا کہ بھائی جسے توفیق ہو چندہ میں شرکت کرے، یہ صورت تو خطاب عام کی ہے اور اگر خطاب خاص ہو تو اس کے لیے چند شرطیں ہیں۔

ایک شرط تو یہ ہے کہ مجمع میں نہ کہو جس سے وہ شرما جائے اور خواہ مخواہ کچھ دینا ہی پڑے۔
ایک یہ کہ ایسا شخص نہ کہے جس کا دباؤ پڑے۔
ایک یہ ہے کہ کسی ذی وجاہت کا واسطہ نہ ہو، خیر اس کا بھی حاصل وہی ہے جو اس سے پہلی شرط کا ہے۔

تو خلاصہ سب شرطوں کا یہ ہے کہ دباؤ نہ ہو، یعنی کہنے والا ذی اثر نہ ہو، الحاح کے ساتھ نہ کہے، اصرار نہ کرے، مجمع کے سامنے شرمندہ نہ کرے، نیز صاف کہہ دے کہ صاحب نیک کام ہے اگر اس میں شریک ہو گے تو تمہارا ہی نفع ہے، ہماری کوئی غرض نہیں، دو گے تو ثواب ہے نہ دو گے تو کوئی جبر نہیں ہے اور ہم کسی سے کہیں گے بھی نہیں نہ بدنام کریں گے، یہ سب باتیں صاف صاف کہہ دینی ضروری ہیں تاکہ دباؤ نہ پڑے۔ اس واسطے کہ

لايحل مال امراء مسلم الا بطيب نفس منه[1]

''کسی مسلمان کا مال حلال نہیں ہے جب تک کہ وہ طیب خاطر سے نہ دے۔''

اب ایک صاحب نے شروع کیا، مدرسہ اول تو چونکہ جائز طریق سے تحریک تھی اس لیے کچھ زیادہ چندہ اکٹھا نہ ہوا۔ کہنے لگے لو جی مولانا کے فرمانے کے مطابق کسی پر دباؤ نہیں ڈالا تھا، پھر کیا خاک ملا، دس روپے ماہوار بھی نہیں ملتے۔ اب ہم اپنی کارگزاری دکھاتے ہیں۔ اب ہم چندہ جمع کریں گے کن لوگوں سے میونسپل چیئرمین سے، نمبرداروں سے، بڑے بڑے رئیسوں سے، سب رجسٹرار سے، تحصیلدار سے، وکیلوں سے یعنی ان کے ذریعے سے چندہ جمع کریں گے۔ اگر ان کا کہنا ایک ایک نے بھی مان لیا اور دو دو چار چار روپے بھی ہر شخص نے دیئے جیسا کہ ان کی وجاہت اور اثر سے بھی توقع ہے تو ذرا سی دیر میں ساٹھ روپے ہو گئے، اب بڑے سرخرو ہیں کہ دیکھو مولانا نے جلسہ میں ترغیب عام دی تھی وہاں سو ساٹھ پیسے بھی جمع نہ ہوئے، یہاں ہم نے ذرا سی دیر میں ساٹھ روپے کر لیے مگر میں کہتا ہوں کہ مطلب کیا ہے، یہی تاکہ مدرسہ چلے اور مدرسہ چلنے سے کیا مقصود ہے یہ کہ خدا راضی ہو اور جب خلاف حکم خدا کے کیا تو مدرسہ تو چلا مگر جو اصلاً غرض تھی یعنی خوشنودی حق تعالیٰ کی وہ تو حاصل نہ ہوئی۔

غرض اس میں یہ غلطی کرتے ہیں کہ بس دین کے کام کا نام سیکھ لیا اور اس کو جس طرح بن پڑا کرنا

---

[1] كتاب التمهيد لابن عبدالبر ۰ ۱ : ۲۳۱

شروع کر دیا، پھر یہ نہیں دیکھتے کہ ہم اپنے مقصود کو جائز طریق سے حاصل کر رہے ہیں یا ناجائز طریق سے، بس ایک ہڑ بونگ ہے کہ اس کام کو پورا کرنا چاہیے، جائز طریق سے پورا ہو یا ناجائز طریق سے۔

جیسے کسی نے یہ ٹھان لیا کہ میں شہر بھر کے مسکینوں کو دو دو روپے تقسیم کروں گا۔ اس مقصود کے حاصل کرنے کے لیے اس نے چند مسلح اور ہتھیار بند ڈاکوؤں کو ہمراہ لے کر کوئی بارات جا رہی تھی اس پر جا چھاپہ مارا اور لوٹ لیا سارا مال و اسباب۔ تو صاحب یہ تو ایسا ہو گیا تو کیا یہ دین ہے دین تو وہ ہے کہ نہ مقصود دین کے خلاف ہو نہ اس کے طرق دین کے خلاف ہوں ورنہ وہ دین میں نہیں ہے اس کی بظاہر اور مثالیں بھی ہیں لیکن میں نے بہت مثالیں پیش کر دی ہیں اس لیے میں اب ختم کرتا ہوں۔

ضرورت رضائے حق

خلاصہ اس بیان کا یہ ہے کہ جب کوئی کام کرو تو جی میں یہ نہ ٹھان لو کہ فلاں مطلب جس طرح بن پڑے حاصل ہو ہی جاوے بلکہ اپنا اصل مطمح نظر رضائے حق کو رکھو اور یہ قصد رکھو کہ رضائے حق حاصل ہو جائے، چاہے کامیاب ہوں یا نہ ہوں۔

سلطان صلاح الدین نے جب ملک شام فتح کیا تو وزراء نے عرض کیا کہ حضور نے یہاں کے لیے کوئی قانون بھی تجویز فرمایا، اس نے کہا کہ قانون شرع موجود تو ہے، قانون جدید کی ضرورت کیا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ حضور شریعت میں نرم سزائیں ہیں، یہ عیسائیوں کا نہایت سرکش اور فسادی فرقہ ہے، ان کے لیے سخت سزاؤں کی ضرورت ہے، ان پر اثر نہ ہوگا، اس نرم قانون کا اس واسطے حضور اپنی رائے سے کوئی نیا قانون ان کے لیے مقرر کر دیں ورنہ یہ آیا ہوا ملک ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ سلطان یہ سن کر بہت برہم ہوا اور کہا کہ خلاف خدا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی قانون ہرگز نافذ نہیں کیا جائے گا اور تم مجھے ڈراتے ہو کہ سلطنت جاتی رہے گی تو کیا مجھے کچھ سلطنت کرنی مقصود ہے؟ سو واللہ! میں نے جو کچھ کیا ہے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کیا ہے، سلطنت کرنے کے شوق میں نہیں کیا، اگر خدا تعالیٰ مجھے فقر و فاقہ اور ذلت و گدائی کی حالت میں بھی رکھیں میں اس پر بھی ویسا ہی خوش ہوں جیسا کہ سلطنت کی حالت میں میں کسی حالت کو ترجیح نہیں دیتا، بس خدا تعالیٰ راضی رہیں، نہ مجھے پروا سلطنت کی ہے نہ گدائی سے عار ہے اور واقعی عاشق کا تو یہی مذہب ہوتا ہے۔ مولانا جامی فرماتے ہیں:

دلارامے کہ داری دل درد بند　　　دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(عاشق کا کام یہ ہے کہ محبوب کے ساتھ دل کو وابستہ رکھے اور باقی سارے عالم سے نظریں ہٹالے)

حضرت عارف شیرازی فرماتے ہیں:

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار بگذارند وخم طرۂ یارے گیرند

(میں تو اسی میں مصلحت سمجھتا ہوں کہ سب کے کاموں سے نظر ہٹا کر صرف محبوب کے کام میں لگ جاؤں)

بس مصلحت یہی ہے کہ ایک خدا کی خوشنودی کو لے کر باقی سب مصلحتوں پر خاک ڈال دو۔ تو طریقہ یہی ہے کہ جو کام بھی دین کا یا دنیا کا کرنا چاہو اسی طرح کرو۔

طریق کار

ایک موٹی اور سیدھی بات بتائے دیتا ہوں کہ علماء سے پہلے فتویٰ حاصل کرلیا کرو اور علماء بھی کون علماء محققین، پھر اگر وہ فتویٰ غلط دیں گے تو ان کی گردن ناپی جائے گی تم پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا لیکن شرط یہ ہے کہ تمہارے جی کو لگ جاوے کہ یہ فتویٰ صحیح ہے اب چاہے وہ مطلوب حاصل ہو یا نہ ہو جو تم نے اپنے دل میں جمار کھا ہے، خدا تعالیٰ خوش ہونے چاہئیں۔ اگر مطلب حاصل ہوگیا لیکن اللہ تعالیٰ ناراض رہے تو فائدہ ہی کیا ہوا۔

غرض یہ ہے حاصل دین کا اور یہ تھا مجھے مقصود بیان کرنا کیونکہ لوگ اس میں بہت غلطیاں کرتے ہیں بالخصوص اس وقت میں بہت غلطیاں کر رہے ہیں اس لیے میں نے متنبہ کر دیا ہے بس اس قاعدہ کو یاد رکھو کہ جو کام کرو علماء سے پوچھ کر کرو۔ اگر اختلاف ہو تو جس عالم کا دل زیادہ جی کو لگے اور دل یہ گواہی دینے لگے کہ اس میں کوئی مصلحت یا پالیسی نہیں ہے اس کو اختیار کرلو اور عالم کا ہر قول معتبر نہیں ہے جو فتویٰ ہو وہ قابل اعتبار ہے کیونکہ ایک تو ہوتی ہے رائے اور مشورہ وہ حجت نہیں بلکہ جو فتویٰ ہو شرعی دلیل ہے جس کو یوں کہہ دے عالم کہ فلاں کام شرعی دلیل سے جائز ہے یا فلاں کام شرعی دلیل سے ناجائز ہے خواہ وہ دلیل ظاہر نہ کرے اس کا اعتبار ہے پھر اگر وہ غلط کہے گا تو وہ مواخذہ دار ہوگا۔

اگر کسی عالم کا کوئی اشتہار دیکھو یا تقریر سنو یا تحریر دیکھو تو اس پر عمل نہ کرو۔ جب تک کہ بالتصریح یہ نہ پوچھ لو کہ یہ رائے ہے، مشورہ ہے یا حکم شرعی ہے۔ اگر وہ کہہ دے کہ رائے ہے تو فتویٰ حاصل کرو اور اگر کہے کہ حکم شرعی ہے تو دیکھو کہ دل کو بھی لگتا ہے یا نہیں، اگر نہیں لگتا تو اور علماء سے

بھی پوچھو، اگر سب جگہ سے وہی فتویٰ ملے تو پھر دل کے لگنے نہ لگنے کا اعتبار نہ کرو اور اسی پر پھر عمل کرلو اور کسی عالم کے یہاں سے اس کے خلاف فتویٰ ملے اور وہ دل کو لگ جاوے تو اس پر عمل کرو، سیدھی سی بات ہے اگر اس پر عمل کرو گے تو ساری پریشانیاں اور تشویشات رفع ہو جاویں گی۔

اب ایسے کام کو بھی لوگوں نے مشکل سمجھ رکھا ہے یعنی دو قسم کے لوگ ہیں یا تو یہ کرتے ہیں کہ اس اختلاف کی صورت میں جو قول اپنے نفس کے موافق ہوا اس کو ہی قبول کرلیا حالانکہ جس کا قول قبول کیا ہے وہ خود بھی نہیں کہہ رہا کہ یہ حکم شرعی ہے یا یہ کرتے ہیں کہ دوسرے اہل علم کو تنگ کرتے ہیں کہ وہ مولوی صاحب تو یوں کہتے ہیں اور آپ یوں کہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ضرورت ہی کیا ہے، ایک کے سامنے دوسرے کے قول کو نقل کرنے کی، بھائی اپنے اپنے طور پر تحقیق کرلو۔ جس کا حکم شرعی کو نقل کرنا جی کو لگے اور دل گواہی دے کہ ہاں یہ حکم شرعی ہونے کی حیثیت رکھتا ہے بس اس پر عمل کرو، اس طرح کرنے سے اگر غلطی عمل میں بھی ہوگی اس میں بھی اجر ملے گا اور اگر نفس کی آمیزش ہے تو چاہے عنوان دین ہی کا ہو لیکن سخت اندیشہ ہے گناہ کا۔

دیکھئے بدعت میں بھی تو یہی ہوتا ہے کیونکہ جتنی بدعات ہیں وہ سب برنگ عبادت ہی تو ہیں لیکن چونکہ حدود سے خارج ہیں اس لیے ان کا دین میں کچھ اعتبار نہیں، وہ صورۃ عبادات ہیں لیکن معنی معاصی ہیں۔ تو حضرت خوب سمجھ لیجئے۔

کہ معنی کا اعتبار ہے صورت کا اعتبار نہیں جو دین حدود کے اندر ہے وہ تو دین ہے اور جو حدود کے باہر ہے وہ دین ہی نہیں بلکہ ہوائے نفسانی ہے تو خدا کے لیے ہوائے نفسانی کے تابع نہ بنو۔ گو اس کو دین ہی کی شکل پہنا دی گئی ہو چاہے دین کے اختیار کر لینے سے دنیا کا خسارہ ہی کیوں نہ ہو، بطور فرض کے کہتا ہوں ورنہ خدا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکموں پر چلنے سے کبھی دنیا کا ضرر ہوتا ہی نہیں اور اگر ہو بھی تو کچھ پروا نہ کرنی چاہیے بلکہ تمہارا تو یہ مذہب ہونا چاہیے۔

دلارامے کہ داری دل درو بند دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(عاشق کا کام تو یہ ہے کہ محبوب کے ساتھ دل کو وابستہ رکھے اور باقی سارے عالم سے نظریں ہٹالے)

اور اگر ہوائے نفسانی کا اتباع کیا تو اس کی نسبت مولانا فرماتے ہیں:

باہواؤ آرزو کم باش دوست چوں یضلک عن سبیل اللہ اوست

(خواہشات اورآرزوؤں کے ساتھ دوستی کم کرو کیونکہ اللہ کے راستہ سے بھٹکانے والے یہی ہیں)

فرماتے ہیں کہ ہواؤ آرزو کے دوست نہ بنو کیونکہ اس کی شان یہ ہے کہ بچلا دیتی ہے حق تعالیٰ کے راستے سے۔ آگے فرماتے ہیں اور بس میں اسی پر ختم کروں گا۔

ہیچ چیزے نشکند اندر جہاں ... ایں ہواؤ جز کہ سایہ ہمرہاں

(کوئی چیز ہوا اور آرزو کو نہیں توڑتی بجز شیخ کامل کے سایہ کے)

کیونکہ ہوا اور آرزو کا منشا ہوتا ہے نفس اور صحبت اہل اللہ اور شیخ کامل کا خلاصہ یہ ہے کہ:

نفس نتواں کشت الاظل پیر ... دامن آں نفس کش راسخت گیر

(نفس) پیر کے سایہ کے علاوہ کسی سے نہیں ٹوٹتا۔ اس نفس کش کے دامن کو سختی سے پکڑلو)

اور یہ ضرورت نہیں کہ بعت ہی ہو جائے بلکہ جس کو سمجھے کہ یہ اللہ والے ہیں بس اس کی تجویز پر عمل کرتا رہے اور ہر صغیر و کبیر نقیر و قطمیر کو پوچھ لیا کرے۔

بس یہ ہے خلاصہ دین کا اللہ اللہ اور خیر صلا۔ اگر اس میں جان بھی چلی جائے گی تب بھی پریشانی نہ ہوگی۔ بس یہ بیان کرنا تھا مجھے۔

اب دعا کیجئے اللہ تعالیٰ فہم سلیم اور توفیق عمل کی نصیحت فرمائیں۔ (پھر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی جس کا کچھ حصہ جہر کے ساتھ فرمایا جو آگے آتا ہے) "اللهم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه" (اے اللہ ہمیں حق کو حق کر کے دکھلا اور باطل کو باطل کر کے دکھلا، حق اور باطل اچھی طرح متمیز کر دے اور ہر طرح کی تلبیس اور نفس کی آمیزش سے محفوظ رکھ، یہ تو علم کا درجہ ہوا اور عمل کا درجہ یہ ہے کہ حق کو واضح کر کے اس پر عمل کی توفیق بھی عطا فرما۔ (پھر کچھ دیر تک حسب معمول سکوت کی حالت میں دعا مانگتے رہے)۔

فرمایا کہ ایک حدیث میں ہے جو شخص رات کو اٹھ کر التجا کرتا ہے تو میں اس سے بہت خوش ہوتا ہوں اس لیے کہ میری وجہ سے اپنی بیوی اور گرم بستر کو چھوڑ دیا۔ (کمالات اشرفیہ)

آثار المحبة

یہ وعظ مسجد حلوائیاں قصبہ کھتولی رات کے وقت
۴ رجب ۱۳۳۰ھ کو ہوا۔
تقریباً ۲ گھنٹے تک کھڑے ہو کر بیان فرماتے رہے۔
سامعین کی تعداد ایک ہزار کے قریب تھی۔
مولانا سعید احمد صاحب تھانوی نے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بسم الله الرحمن الرحیم

الحمدلله نحمده و نستعينه ونستغفره ونومن به ونتوكل عليه و نعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له ونشهدان لااله الاالله وحده لاشريک له ونشهدان سيدنا ومولانا محمدا عبده ورسوله صلى الله تعالى عليه وعلى اله واصحابه و بارک و سلم.

امابعد فاعوذ بالله من الشيطن الرجيم بسم. الله الرحمن الرحيم.

قَالَ اللّٰهُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ. (البقرة:۱۶۵)

تمہید وضرورت بیان

یہ ایک بڑی آیت کا ٹکڑا ہے اس میں حق سبحانہ وتعالیٰ نے ایک نہایت ضروری مضمون جس کے جاننے کی سب کو ضرورت ہے بیان فرمایا ہے اور چونکہ ضرورت مشترک ہے تمام مسلمانوں میں اور پھر ہر وقت کے اعتبار سے ضروری ہے لہٰذا یہ بیان بہت سے مضامین کے قائم مقام ہوگا جن کے لیے مختلف اوقات میں متعدد جلسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ چونکہ اس وقت یہاں بیان کرنے کا پہلا موقع ہے اور پھر خدا جانے کب موقع ملے اس لیے یہ مناسب معلوم ہوا کہ ایسا مضمون اختیار کیا جائے جو کہ جامع ہو۔ چنانچہ یہ مضمون اسی قبیل کا ہے اور قرآن شریف میں اس قبیل کے اکثر مضامین ہیں۔

نیز یہ بھی ارادہ ہے کہ نہایت سہل عنوان سے اس کو بیان کیا جائے کیونکہ یہاں اکثر لوگوں کو یہ پہلا موقع وعظ سننے کا ہوگا اور دقیق مضامین سمجھنے کے لیے اکثر پہلے سے مناسبت کی صورت ہوتی ہے خاص کر اس لیے بھی کہ اس وعظ میں عورتوں کا بھی مجمع ہے اور دقیق مضامین ان کے فہم

سے بالا ہیں اس لیے دقیق مضامین کو بیان نہ کیا جائے گا بلکہ بہت سہل مضامین ہوں گے۔

خدا تعالیٰ نے اس آیت میں بلا تخصیص مسلمانوں کی ایک شان کو بیان فرمایا ہے اور ہر چند کہ عنوان کے اعتبار سے یہ جملہ خبر یہ ہے کہ لیکن غور سے معلوم ہوگا کہ مراد اس سے ایک انشاء ہے اور قرآن مجید میں جس قدر بھی جمل خبر یہ ہیں ان سے کوئی نہ کوئی انشاء ہی مراد ہے بلکہ روزمرہ کے معاملات میں بھی دانشمندوں کے کلام میں جملہ خبر یہ سے انشاء ہی مراد ہوتی ہے کیونکہ مقصود ہر خبر سے کوئی نتیجہ ہوتا ہے اور وہ انشاء ہوتی ہے۔

مثلاً اگر کوئی شخص کسی کے مرض کی خبر دے تو ہر عاقل سمجھتا ہے کہ مقصود اس سے یہ ہے کہ اس کی خبر لو یا اس کے ساتھ ہمدردی کرو۔ اسی طرح ہر خبر کو دیکھ لیجئے تو ہر کلام میں مفید میں خبر سے مقصود انشاء ہوتی ہے اور جب ادنیٰ درجے کے حکماء کے کلام میں ایسا ہے تو خدا تعالیٰ کے کلام میں تو بدرجہ اولیٰ ایسا ہوگا۔ بس یہ کلام بھی جو اس موقع پر پڑھا گیا ہے اگرچہ بظاہر خبر ہے لیکن بقاعدہ مذکور اس سے بھی ایک نتیجہ مقصود ہے اور وہ جملہ انشائیہ ہے یہ حاصل ہے اس آیت کا نتیجہ کا پتہ انشاءاللہ اس آیت کے ترجمہ سے تفسیر سے معلوم ہوگا اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ نہایت غور کے قابل ہے۔

مسلمان اور حب اللہ

فرماتے ہیں کہ جو لوگ ایمان والے ہیں وہ خدا تعالیٰ کی محبت میں بہت مضبوط ہیں اوپر سے بعضے لوگوں کی حالت بیان ہوتی چلی آ رہی ہے۔ اگرچہ اس وقت اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں لیکن چونکہ یہ جملہ پہلے جملے پر معطوف ہے اس لیے توضیح ارتباط کے لیے ترجمہ میں اس کی بھی ضرورت ہوئی۔ فرماتے ہیں کہ بعض لوگ ایسے ہیں کہ وہ خدا کے سوائے ایسے شریک بھی ٹھہراتے ہیں کہ جن کو خدا کے برابر محبوب رکھتے ہیں اور جو لوگ ایماندار ہیں وہ خدا تعالیٰ کی محبت میں بہت مضبوط ہیں۔ حاصل جملہ کا یہ ہوا کہ مسلمان خدا تعالیٰ کی محبت میں بہت مضبوط ہوتے ہیں۔

ترجمہ سن کر معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس مقام پر ایک جملہ خبر یہ ارشاد ہوا ہے لیکن بقاعدہ مذکور یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس خبر سے ایک نتیجہ مقصود ہے اور وہی اس خبر کا ثمرہ ہے لیکن بصورت خبر اس لیے بیان فرمایا کہ یہ حکم بہت ہی مہتم بالشان ہو جائے۔ جیسا کہ علم بلاغت میں ثابت ہو چکا

ہے کہ اس تعبیر میں یہ نکتہ ہوتا ہے کہ مخبر صادق کے کلام میں خبر تو ضروری الوقوع ہے ہی پس انشاء کو اس کی صورت میں لانا تحریض ہے، سامع کو کہ اس کو ضرور واقع کرے تاکہ صورت عدم وقوع کی نہ ہو اور وہ نتیجہ اور ثمرہ یہ ہے کہ ہر مسلمان کو خدا تعالیٰ کی محبت میں نہایت مضبوط ہونا چاہیے اور خدا تعالیٰ کے برابر کسی کی محبت اس کے دل میں نہ ہونی چاہیے۔

اب دیکھنے کے قابل بات یہ ہے کہ جو شان مومن کی خدا تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے وہ ہم میں پائی جاتی ہے یا نہیں یعنی ہم خدا تعالیٰ کی محبت میں پورے طور پر مضبوط ہیں یا نہیں، اگر پورے طور سے مضبوط ہیں تو ہم "والذین امنوا" کے پورے مصداق ہیں ورنہ جس درجہ کی محبت ہوگی اسی درجہ کا ایمان ہوگا۔ یعنی یہ تو کہہ ہی نہیں سکتے کہ کسی مسلمان کو خدا تعالیٰ سے بالکل ہی محبت نہیں، تھوڑی بہت تو سب کو ہی ہے کیونکہ یہ آیت کی رو سے ایمان کے لیے لازم ہے اور انتفاء لازم مستلزم ہوتا ہے انتفاء ملزوم کو۔ پس اگر محبت کی بالکل نفی کی جائے گی تو اس کے ساتھ ہی ایمان کی نفی کر دینی پڑے گی حالانکہ ایمان بحمد اللہ ہم سب میں پایا جاتا ہے تو معلوم ہوا کہ محبت سب میں ہے بلکہ محبت۔ کے ساتھ اس کی شدت بھی ہر مومن میں پائی جاتی ہے۔ اسی آیت کی رو سے لیکن خود سدت کے بھی مراتب مختلف ہیں کہ کسی میں بہت شدت ہے اور کسی میں اس سے کم اور اسی مناسبت سے ایمان کے مراتب بھی مختلف ہوں گے۔ باقی ضعف محبت کسی مسلمان میں پایا ہی نہیں جاتا اور نہ پایا جا سکتا ہے کیونکہ شدت محبت کی نفی سے بھی ایمان کی نفی ہو جائے گی تو اس اعتبار سے مراتب کا اختلاف شدت بلکہ اشدیت ہی میں رہا یعنی کسی کو اشد محبت ہے اور کسی کو اشد سے بھی اشد تو اس سے معلوم ہوا کہ اشدیت محبت ہر مسلمان کے لیے لازم ہے۔

اب اپنی حالت کو دیکھئے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ آپ کو اشدیت محبت کس درجے کی ہے اور اس میں کلام ہی نہیں کہ آپ کو اشدیت محبت حاصل ہے اور یہ بالکل نئی بات ہے ورنہ سب واعظین یہی کہتے ہیں کہ ہم کو خدا تعالیٰ سے محبت نہیں تو گویا میں نے آپ کو یہ نئی بشارت دی ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص فاسق فاجر گنہگار شرابی بھی ہے تو اس میں بھی اشدیت محبت کی ہے لیکن باوجود اس اشتراک کے پھر بھی مراتب اس کے مختلف ہیں کیونکہ ہر اشدیت برابر نہیں ہوتی اور اشتراک اشدیت اگرچہ اسوقت محسوس نہیں ہوتا لیکن امتحان

کے موقع پر یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے۔

مثلاً اگر کسی مسلمان کے سامنے کوئی شخص خدا تعالیٰ کی شان میں یا اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرے تو اگر چہ وہ مسلمان نہایت درجہ کا ضعف الایمان ہو لیکن اس گستاخی کو سن کر اس قدر بے چین ہو جاتا ہے کہ ماں کی گالی سننے سے بھی اس قدر بے چین نہیں ہوتا اور اس درجہ کی بے چینی بدوں اشدیت محبت کے نہیں ہو سکتی۔ پس معلوم ہوا کہ ہر مسلمان کو خدا تعالیٰ سے اشد محبت ہے اگر ضعیف محبت ہوتی تو اس قدر بے چین نہ ہوتا۔ گو بے چینی کسی نے کسی مرتبے میں اس وقت بھی ہوتی ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کسی شخص کا ایک پیسہ گم ہو جائے تو اس کو بھی قلق ہوتا ہے اور اگر کسی کا ایک روپیہ گم ہو جائے تو اس کو بھی قلق ہوتا ہے اور کسی کی گنی گم ہو جائے تو اس کو بھی قلق ہوتا ہے اور دس گنی گم ہو جائیں تو اس کا بھی قلق ہوتا ہے۔ لیکن پیسے کے گم ہونے کا قلق ضعیف ہوتا ہے اور روپے کے گم ہونے کا قلق شدید اور گنی کے گم ہونے کا قلق اشد ہوتا ہے اور دس گنی کا اشد سے بھی اشد ہوتا ہے۔

غرض کوئی فاسق بھی شدت محبت سے خالی نہیں ہے لیکن اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں فسق کی اجازت دیتا ہوں لیکن جو بات واقعی ہے اس کو ظاہر کیا جاتا ہے۔

اسلام سے تمسخر کا اثر

اگر کوئی شخص کہے کہ ہم تو خود اسلام کے ساتھ مسخرا پن کیا کرتے ہیں اور ہنسا کرتے ہیں اور ہم کو ذرا بھی بے چینی نہیں ہوتی تو ایمان کے لیے شدت محبت لازم کہاں ہوئی؟ تو میں کہوں گا کہ خدا کی قسم اگر کسی شخص کی یہ حالت ہے تو وہ ہرگز مسلمان نہیں۔ اگر چہ وہ اپنی زبان سے اپنے کو مسلمان کہے اور اگر چہ وہ کسی مسلمان کے گھر پیدا ہوا ہو اور اس وقت ایسے بہت سے لوگ ہیں کہ جو اپنے کو مسلمان کہتے ہیں لیکن ان کو ذرا بھی پروا اس بات کی نہیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔

ہمارے وطن میں ایک ماسٹر عارضی طور پر آئے ہیں اور داڑھی منڈاتے ہیں ان سے جب داڑھی رکھنے کو کسی نے کہا تو کہنے لگے کہ داڑھی تو بکرے کی ہوا کرتی ہے۔ افسوس ہے کہ لوگ مولویوں

کوفتویٰ تکفیر میں متعصب بتلاتے ہیں لیکن ان کو انصاف کرنا چاہیے کہ کیا یہ بات بھی کفر کی نہیں۔ میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ ایک ایسا شخص جس کو معلوم ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی رکھی ہے اور تمام انبیاء علیہم السلام داڑھی رکھتے تھے۔ صحابہ کرامؓ نے سب نے رکھی اور پھر وہ یہ کہے کہ داڑھی تو بکرے کی ہوتی ہے کیا آپ لوگ انصاف کی رو سے اس کو مسلمان کہیں گے۔

دیکھو! اگر کوئی شخص عدالت کی توہین کرنے لگے تو وہ کتنا بڑا جرم سمجھا جاتا ہے تو کیا یہ توہین عدالت کی توہین کے برابر بھی نہیں ہے۔ ہر معنی شناس جانتا ہے کہ عدالت کی توہین سلطنت کی توہین ہے اسی طرح اسلام کے کسی حکم کی توہین شارع علیہ السلام اور بانی اسلام یعنی خدا تعالیٰ کی توہین ہے۔ پس اگر خدا تعالیٰ کی توہین کرنے کے بعد بھی ایمان نہیں گیا تو گویا ایمان سریش اور گوند ہوا کہ وہ ایسا چپکا ہے جو کسی طرح چھوٹتا ہی نہیں۔

صاحبو! اسلام ایسا سستا اور اتنا بے غیرت نہیں ہے کہ اس کو کوئی شخص دھکے بھی دے اور وہ نہ ٹلے آج اکثر مسلمان روزے اور نماز کو فاقے اور اٹھک بیٹھک کہتے ہیں اور پھر اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ حالانکہ

كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا.

''بڑا ہے وہ کلمہ جو ان کے مونہوں سے نکلتا ہے وہ سوائے جھوٹ کے اور کچھ نہیں کہتے۔''

اور حدود بھی کوئی چیز ہیں یا نہیں یہ اچھا اسلام ہے کہ تمسخر اور اہانت کرنے سے بھی نہیں جاتا۔ افسوس ہے کہ اپنی ماں کے متعلق تو دوسروں سے بھی بے موقع الفاظ نہ سن سکیں اور اسلام کے متعلق خود خرافات اور تمسخر پر آمادہ ہوں۔ سمجھ لینا چاہیے کہ ایسے لوگوں کا نکاح اگر کسی مسلمان عورت سے ہوا ہے تو اس قسم کے تمسخر سے وہ نکاح فوراً ٹوٹ گیا اور جو اولاد ان سے اس کے بعد پیدا ہوگی وہ سب ولد الزنا ہوگی۔

صاحبو! کھلی ہوئی بات ہے مگر لوگوں کو اس پر ذرا التفات نہیں ہے اور نظیر اس کی وہی ہے کہ اگر عدالت کی توہین گنی جائے تو وہ سلطنت اور گورنمنٹ کی توہین گنی جاتی ہے۔ سو کیا وجہ ہے کہ دفعات اسلام میں سے کسی دفعہ کی توہین یا کسی نبی کی توہین خدا تعالیٰ کی توہین نہ سمجھی جائے۔ پس یہ شبہ جاتا رہا کہ تمسخر کے بعد بھی ہم تو مسلمان ہیں اور رفع اس طرح ہوا

کہ وہ مسلمان نہیں۔ اگرچہ کسی مسلمان کے گھر میں پیدا ہوئے ہوں اور یہ مسئلہ بلاغبار ثابت رہا کہ جو مسلمان ہوگا اس کو خدا تعالیٰ سے شدت محبت ضرور ہوگی۔

شدت محبت کے درجات

لیکن اس میں درجات متفاوت ہوں گے۔ مثلاً ایک شدت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے متعلق گستاخی سن کر بے چین ہو جائے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ محض خدا تعالیٰ کا ذکر ہی سن کر قلب میں ایک ولولہ پیدا ہوا اور نافرمانی کے چھوڑنے کی فکر ہو جائے اور یہ سوچے کہ خدا تعالیٰ کے یہ انعامات مجھ پر ہیں اور اس قدر فضل و کرم ہے حالانکہ اگر دنیا میں کوئی چار پیسے ہم کو دیتا ہے تو اس کی کس قدر اطاعت کی جاتی ہے تو جب چار پیسے دینے والے کی اتنی اطاعت ہوتی ہے تو خدا تعالیٰ کی اطاعت تو اس سے کہیں زیادہ ہونی چاہیے اور اس کی نافرمانی کا تو وسوسہ بھی دل میں نہ آنا چاہیے۔ غرض خدا تعالیٰ کا نام اور احکام سن کر یہ خیالات اطاعت کے پیدا ہوئے مگر چند روز کے بعد پھر ذہن سے نکل گئے۔ ایک درجہ یہ تھا۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ اس خیال کے ساتھ ہی اس پر عمل بھی شروع کر دیا۔ یعنی جس قدر اسباب معاصی تھے سب کو ترک کر دیا، اگر اپنے پاس تصویر تھی اس کو چاک کر ڈالا اور اگر حرام کی کمائی تھی اس کے مالک کو واپس کر دیا، اگر مالک نہ مل سکے تو اس کو مالکین کی طرف سے صدقہ کر دیا۔ اگر نماز نہ پڑھتے تھے، نماز شروع کر دی، پاجامہ اگر ٹخنوں سے نیچا تھا اس کو کاٹ کر ٹخنوں سے اونچا کر لیا۔ یہ پختہ قصد کر لیا کہ اب کوئی حرکت خلاف حکم نہ کریں گے اور اس قصد کو نباہ دیا، یہ درجہ سب سے بڑھ کر ہے اور اس کے بہت سے اور مراتب بھی نکل سکتے ہیں لیکن میں نے قصر مسافت کے لیے مثال میں کم کر دیئے کہ عاقل آدمی خود ہی سب مراتب کو سمجھ لے گا۔

حاصل یہ ہوا کہ شدت محبت لازم ایمان اور اس کے مراتب مختلف اور جس مرتبے کی شدت اسی مرتبے کا ایمان ہوگا اور یہی بات خدا تعالیٰ کو اس آیت میں بتلانا ہے اور مقصود اس بتلانے سے یاد دلانا ہے کہ تم شدت محبت اختیار کرو جس کی علامت اطاعت کاملہ ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی شخص اپنے نوکروں سے یہ کہنے لگے کہ جو ہمارا وفادار نوکر

ہوگا وہ ہماری اطاعت کرے گا۔ تو ہر عاقل سمجھتا ہے کہ اطاعت اختیار کرو ورنہ جس قدر اطاعت میں کمی ہوگی اسی قدر وفا میں بھی کمی سمجھی جائے گی تو خدا تعالیٰ نے بھی اسی خبر کے ذریعے سے ہم کو متنبہ کیا ہے کہ تم شدت محبت اختیار کرو ورنہ اسی ضعیف درجے کا تمہارا ایمان بھی ہوگا۔

اب غور کی بات یہ ہے کہ آپ اپنے قلب کو ٹٹول کر دیکھئے کہ آپ میں کس درجہ کی محبت ہے۔ سو اس کا پتہ آسانی سے لگ سکتا ہے کیونکہ اس کے کچھ آثار ہوتے ہیں کہ وہ آثار جس مرتبے میں پائے جائیں محبت بھی اسی مرتبے میں ہوگی اور یہ گویا محبت کے پرکھنے کی کسوٹی ہے کہ جس طرح چاندی کا کھوٹا کھرا ہونا کسوٹی سے معلوم ہوتا ہے اسی طرح محبت کا کم اور زیادہ ہونا ان آثار سے معلوم ہوگا اور یہی کسوٹی ہے جس کو حافظ شیرازی علیہ الرحمتہ نے بیان فرمایا ہے کہ:

خوش بود گر محک تجربہ آید بمیاں　　　تا سیہ روئے شود ہر کہ در و غش باشد

(اگر تجربہ کی کسوٹی درمیان میں ہو تو اچھا ہے تا کہ جھوٹ بولنے والے کا چہرہ سیاہ ہو جائے)

حقیقت امر یہ ہے کہ بدون امتحان کے پتہ نہیں چل سکتا۔

شدت محبت کے آثار

اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ ہم نے اپنے کو جانچا ہے یا نہیں اگر نہیں جانچا تو اب جانچنا چاہیے اور اپنے افعال واقوال کو غور سے دیکھنا چاہیے کہ وہ شدت محبت کے آثار ہیں یا نہیں اور اگر آثار یوں سمجھ میں نہ آئیں تو آثار دنیا کے نظائر پر قیاس کر کے دیکھئے یعنی اگر دنیا میں کسی مرد یا عورت سے محبت ہو جاتی ہے تو اس کے کیا آثار ہوتے ہیں۔

سو آثار اس کے یہ ہوتے ہیں کہ اول تو ہر وقت کی یاد کہ کوئی وقت ایسا نہیں گزرتا جس میں محبوب کی یاد سے دل پر نہ ہو، دوسرے نہایت خوشی سے اطاعت کرنا اور اس میں ذرا بھی کلفت نہ ہونا، مثلاً اگر وہ گھر بھر بھی مانگ لے تو اس میں کچھ بھی دریغ نہیں ہوتا۔ پس جب یہ دو چیزیں آثار محبت سے ہیں تو انہیں کو پیش نظر رکھ کر اپنے کو جانچ لیجئے اور دیکھ لیجئے کہ بیس گھنٹے میں کتنی دیر آپ خدا تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں، خاص کر جبکہ ہر وقت اس کی نعمتوں میں بالکل سرتاپا غرق بھی رہتے ہو، جن سے ہر وقت یاد آ جانا طبعاً بھی ضروری ہے۔ صاحبو! یہ باتیں بھولنے کی نہیں ہیں کہ خدا کے دیئے ہوئے مکانوں میں رہتے ہو اس کا دیا ہوا کھانا

کھاتے ہو، اس کی دی ہوئی اولاد سے متمتع ہوتے ہو لیکن اس کو یاد نہیں کرتے۔

دیکھو! اگر کوئی دوست تم کو دو آم بھیج دے تو ان کو کھاتے وقت دل میں اس کا تصور ضرور ہی رہتا ہے۔ ذرا انصاف سے کہئے خدا تعالیٰ کا دیا ہوا کھانا دونوں وقت تمہارے سامنے آتا ہے لیکن تم نے کسی دن بھی کھاتے وقت خدا تعالیٰ کو یاد کیا ہے سارا کھانا کھا جائیں گے لیکن کسی لقمے پر بھی یہ خیال نہ ہوگا کہ یہ خدا کی دی ہوئی نعمت ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بوجہ عقیدہ درست ہونے کے کسی کے پوچھنے پر ہم کہہ دیں کہ یہ خدا تعالیٰ نے ہم کو دیا ہے۔ کیوں صاحبو! پھر کیا اسی منہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم کو خدا تعالیٰ سے شدت محبت بدرجہ مطلوبہ ہے اور ہم کامل ایماندار ہیں۔ دیکھ لیجئے کہ اس کی خاصیتیں کس حد تک ہم میں پائی جاتی ہیں۔

اگر کوئی کہے کہ ہم میں محبت کے خواص مشترک تو پائے جاتے ہیں جو ادنیٰ مسلمانوں میں بھی مشترک ہیں۔ مثلاً یہی کہ اس کی شان میں گستاخی سن کر بے چین ہو جانا۔ تو میں کہوں گا کیا آپ کو ان مشترک خواص پر قناعت ہے۔ صاحبو! ذرا غور کر کے دیکھو کہ تمہارے پاس سوائے دولت ایمان کے اور کیا دھرا ہے۔ پھر اگر اس کے بھی ادنیٰ درجے پر قناعت کر لو تو غضب ہے۔

لازوال دولت

اگر کسی کو دولت دنیا پر ناز ہو اور اس لیے دولت ایمان کے کمال کا طالب نہ ہو تو یاد رکھو کہ یہ دولت بہت جلد تم سے چھوٹ جانے والی ہے۔ مثلاً چوری ہو گئی، آگ لگ گئی اور یا تم اس سے بہت جلد چھوٹنے والے ہو جبکہ مرنے تک تمہارے پاس ہی رہی۔ دنیا میں سب سے بڑا خوش قسمت وہ شخص سمجھا جاتا ہے کہ مرتے دم تک دولت اس کے پاس رہے لیکن پھر بھی مرتے وقت آخر چھوڑنا پڑے گی اور اس وقت دس منٹ بلکہ ایک سیکنڈ کی مہلت بھی نہیں ملتی۔ صاحبو! کیا کوئی عقلمند آدمی ایسے سرمایہ کو جو اتنی جلدی چھوٹنے والا ہو اور بعد کو ایسے لوگوں کے پاس جانے والا ہو جو کہ آپ کے دشمن ہوں اور آپ اپنا سرمایہ ان کو دینا پسند نہ کرتے ہوں، سرمایہ کہہ سکتا ہے؟ جب یہ سرمایہ قابل اعتبار نہیں تو اب بتلائیے کہ ابدالاباد تک کام آنے والا اور ہر وقت آپ کے ساتھ رہنے والا سرمایہ سوائے ایمان کے اور کیا ہو سکتا ہے اور چونکہ یہ جلسہ مسلمانوں کا ہے اس لیے اس کے منوانے کے لیے دلائل قائم

کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ مثل اصول موضوعہ کے پیشتر سے مسلم ہے۔

تو معلوم ہوا کہ ایمان ہی ایسی دولت ہے کہ چندروز کے بعد یہ قبر میں ساتھ دے گا اور اس کے بعد پل صراط پر کام آئے گا، اس کے بعد میزان پر تولنے کے کام آئے گا تو، گر اس کا کمال مطلوب نہ ہو تو ستم ہے اس لیے دیکھنا ضرور ہوا کہ اس کا کمال ہم کو حاصل ہے یا نہیں۔ مثلاً یہی دیکھ لو کہ جو ایمان ہمارے پاس ہے آیا وہ اس قابل ہے کہ ان مواقع مذکورہ میں ساتھ دے سکے گا یا نہیں۔ اگر ہمارا ایمان ایسا ہے اور ہم کو یہ امید ہے کہ اس کی بدولت ہم پل صراط وغیرہ پر اول ہی مرتبہ سرخرو ہو جائیں گے تو نہایت خوشی کی بات ہے اور اس کا اس قابل ہونا اس کے خواص اور آثار سے معلوم ہوگا اور اگر ہمارا ایمان ایسا نہیں ہے تو کیا کسی کو دوزخ کے سانپ، بچھو اور طرح طرح کی تکالیف کی برداشت ہے۔ اگر کوئی اس کا مدعی ہو۔ تو ذرا مہربانی کر کے ہمارے سامنے ایک معمولی چراغ میں اپنی ایک انگلی جلا کر دکھلا دے اور اگر اس کی تاب نہ ہے تو دوزخ کی آگ کی تاب کیوں کر ہوگی اور جب اس کی تاب نہ ہوگی تو اس سے بچنے کا کیا سامان آپ نے فراہم کیا ہے اور کیا تدابیر اس کے لیے اختیار کی ہیں۔

صاحبو! اگر کوئی شخص دردگردہ میں مبتلا ہو جائے تو اس کی کیا حالت ہوتی ہے اور وہ اس کے ازالے کی کتنی تدبیریں کرتا ہے حالانکہ دردگردہ کا کمال اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ زندگانی کا خاتمہ کر دے اس کے بعد پھر ابدالاباد تک اس سے نجات خود بخود ہو جاتی ہے۔ برخلاف اس تکلیف کے کہ اگر یہ شروع ہوگئی تو یا تو بالکل ختم نہ ہوگی اور یا اگر شمہ ایماں کی وجہ سے ختم بھی ہوئی تو خدا جانے کتنی مدت کے بعد جہاں ایک دن ہزار برس کے برابر ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وَاِنَّ یَوْماً عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ.

"بے شک آپ کے پروردگار کے نزدیک ایک دن ایک ہزار سال کے برابر ہے جو تم شمار کرتے ہو۔"

تو اگر چار برس کی سزا بھی ہوگئی تو چار ہزار برس ہوئے۔

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہیں وہ سب تکالیف سے نجات دیں گے لیکن اگر یہ ہوس کافی ہے تو تھوڑا سنکھیا بھی کھا لینا چاہیے کیونکہ خدا تعالیٰ غفور و رحیم ہیں وہ بچا لیں گے اور اگر سنکھیا کھا کر مر جانا خدا تعالیٰ کے غفور رحیم ہونے کے منافی نہیں تو گناہ

کر کے دوزخ میں جانا بھی اس کے غفور ورحیم ہونے کے خلاف نہیں ہے۔ پس اس کا بچاؤ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ایمان اور محبت کی تکمیل اس کے آثار سے کی جائے جس کا حاصل یہ ہے کہ اطاعت پوری کی جائے اور گناہ کو ترک کیا جائے۔

صاحبو! کس قدر افسوس ہے کہ دنیا کے مکان کی تکمیل میں تو اس قدر انہماک کہ اگر ایک پرنالہ بھی رہ جائے تو چین نہ آئے اور قصر ایمان کی بنیاد تک ضعیف ہونے پر بھی پروا نہیں اور کچھ خیال نہیں کیا جاتا علیٰ ہذا اگر کسی کپڑے کی آستینیں ناقص رہ جائیں تو اس کے لیے دس جگہ سے کپڑا تلاش کریں گے اور پیکر ایمان کے ہاتھ پاؤں قلم ہو جانے پر بھی غم نہیں۔ غرض آپ صاحبوں کے نزدیک ہر چیز کی تکمیل کی ضرورت ہے مگر ایمان کی تکمیل گویا محض بے سود ہے حالانکہ اس کی تکمیل سب سے اول وضروری ہے۔

ایمان اور راحت

اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ وہ سرمایہ ہے کہ دونوں جہاں میں ساتھ رہنے کے علاوہ دونوں جہاں کی راحت بھی اسی سے ہے۔ آخرت کی راحت تو سب ہی جانتے ہیں کیونکہ ایمان ہی کی بدولت دوزخ سے نجات ہوگی لیکن ایمان کے کامل ہونے سے دنیا کی بھی راحت ہوتی ہے۔ یہ بات شاید ابھی سمجھ میں نہ آئی کیونکہ ظاہراً تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس قدر علم وعمل والے لوگ ہیں اور جو زیادہ پکے ایمان دار کہلاتے ہیں، دنیوی مصیبت میں وہی زیادہ گرفتار نظر آتے ہیں۔ کوئی افلاس میں مبتلا ہے کسی پر مخالفوں کا نرغہ ہے، علیٰ ہذا بڑے بڑے متقی فقر وفاقے میں اکثر مبتلا رہتے ہیں تو ان کو کیا خاک راحت ہوئی لیکن آپ نے غور نہیں کیا کہ راحت کس چیز کا نام ہے اگر آپ دنیا کے حالات اور دنیاوی نظائر میں غور کریں تو اس کا پتہ چل جائے گا۔ اول میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ راحت کی حقیقت کیا ہے۔ آیا ظاہری ٹیپ ٹاپ، چہل پہل یا کہ قلب کا اطمینان سو ظاہر ہے کہ محض ٹیپ ٹاپ کا نام راحت نہیں۔ کیونکہ اگر کسی شخص کے پاس دس گاؤں بھی ہوں بڑے عالی شان قصر بھی رہنے کے لیے ہوں، حشم خدم بھی ہوں لیکن سلطنت کی طرف سے اس کو یہ حکم ہو جائے کہ ایک ماہ کے بعد تم کو پھانسی دیدی جائے گی، کیا کوئی عقلمند آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ ساز وسامان

اس خبر سننے کے بعد کچھ بھی، اس شخص کے لیے موجب راحت ہوسکتا ہے بلکہ اگر سوچا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت یہ ساز و سامان اور زیادہ کلفت اور حسرت کا موجب ہوگا تو معلوم ہوا کہ یہ سامان موجب راحت نہیں بلکہ گاہے باعث کلفت ہے۔

اس کے مقابلے میں ایک مزدور کو لیجئے جو کہ دو آنے روز کماتا ہے لیکن اس پر نہ کوئی دفعہ جرم کی عائد ہے نہ اس کو کوئی دوسرا غم ہے، اب اگر اس رئیس سے کہا جائے کہ تم اپنی ساری جائیداد اس مزدور کو دے دو اور دو آنے روز لینا گوارا کرو تو تم کو پھانسی سے نجات ہو جائے گی، تو کیا وہ اس پر راضی نہ ہوگا، ضرور راضی ہو جائے گا اور اگر اس مزدور سے پوچھا جائے کہ تم کو اس شخص کی ساری جائیداد دی جاتی ہے لیکن ایک مہینہ کے بعد تم کو پھانسی دی جائے گی تو کیا یہ مزدور اس جائیداد کو لینا گوارا کرے گا، ہرگز نہیں۔ پس مزدور کا انکار اور اس رئیس کی رضا صاف بتلا رہی ہے کہ راحت اصل میں اطمینان کا نام ہے نہ کہ ظاہری چہل پہل اور بھڑک کا۔

اب اس کے بعد آپ دیکھ لیجئے کہ حضرات اہل اللہ پر اگر ظاہری کوئی مصیبت بھی آتی ہے تو اگرچہ طبعاً کچھ اثر ہو لیکن پریشانی نہیں ہوتی نہ وہ مضطر ہوتے ہیں بلکہ وہ اندر سے نہایت خوش ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے اگر اہل دنیا پر ایک صدمہ بھی آ جائے تو کھانا پینا اور آرام سب چھوٹ جاتا ہے اور یہ محض نقص ایمان کی وجہ سے ہوتا ہے تو وہ شبہ جاتا رہا کہ ایمان والے بھی تکلیف میں ہوتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ ایمان کامل دنیا میں بھی موجب راحت ہے تو پھر غضب ہے کہ ایسے نایاب اور عجیب و غریب سرمایہ کی تکمیل کی طرف سے اس طرح بے پروائی کی جائے۔

صاحبو! آپ کو اس کی تکمیل کی فکر کرنی چاہیے اس طرح سے اس کی علامات و آثار یعنی ذکر دائم اور اطاعت دائمہ اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے لیکن ذکر اس کو نہیں کہتے کہ محض زبان سے رٹ لیا اور دل میں وہی دنیا کی خرافات بھری رہیں۔ ایسے ذکر سے کچھ نفع نہیں، کسی نے خوب کہا ہے۔

بر زباں تسبیح در دل گاؤ خر   ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

(زبان پر تسبیح اور دل میں گاؤخر، ایسی بات کب اثر رکھتی ہے)

یہ یاد تو ایسی ہے جیسے کوئی طوطے کو نبی جی بھیجو یاد کرائے کہ وہ ہر وقت اسی کو رٹا کرے گا

مگر جب بلی آ کر دبائے گی سوائے ٹاں ٹاں کے کچھ بھی یاد نہ آئے گا۔ یہ ذکر بھی ایسا ہی ذکر ہے، ذکر تو وہ ہے کہ دل اور زبان سب اسی میں محو ہو جائیں، کم سے کم ایسی حالت تو ہو جو ایک مردار بازاری عورت کے ساتھ ہوتی ہے۔ گو یہ حالت تدریجاً ہو مگر اس کا قصد تو رہنا چاہیے۔ پس ایک اثر تو کمال ایمان ومحبت کا یہ ہے۔

دوسرا اثر اس کا سہولت طاعت ہے سو اس کو بھی دیکھ لیجئے کہ خدا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم سن کر ہماری کیا حالت ہوتی ہے جیسے کسی نے گولی ماردی ہو اس سے زیادہ اُس کا کیا ثبوت ہوگا کہ ہر عمل ہر خلق میں ہم نے شریعت کے خلاف ایک نرالا طریقہ تجویز کر رکھا ہے۔ گویا شریعت اسلام کے مقابلے میں ایک دوسری شریعت بنائی ہے اور اس کو اپنے لیے فخر اور ہنر سمجھا جاتا ہے۔

شریعت اور رسوم

اس کے متعلق اگر ایک ایک جزئی کو بیان کیا جائے تو بہت سا وقت صرف ہو لیکن میں مختصر طور پر بیان کرتا ہوں۔

مثلاً شادی اور غمی کی رسمیں ہیں، کیا آج کوئی مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ رسمیں شریعت کیخلاف نہیں ہیں اور اگر واقعی کسی کو معلوم نہیں تو اس کو چاہیے کہ اس قسم کی کتابیں مطالعہ کرے جو اس کے بیان کرنے کے لیے تصنیف کی گئی ہیں یا جو لوگ اس مجمع میں موجود ہیں وہ اسی وقت کچھ سن لیں۔

سنئے شادی غمی کی رسمیں دو قسم کی ہیں ایک تو وہ ہیں جن کا قبیح ہونا نہایت ہی ظاہر ہے اور شرفاء وثقات نے ان کو بالکل ہی چھوڑ دیا ہے اب صرف اسافل اور فساق الناس اس میں مبتلا ہیں۔ مثلاً ناچ رنگ وغیرہ اور بعض وہ رسمیں ہیں کہ ان کا قبح اتنا ظاہر نہیں ان میں عوام اور خواص قریب سب مبتلا ہیں اور ان کو بالکل جائز سمجھا جاتا ہے بلکہ بسا اوقات ادعائے تقویٰ کے طور پر کہا جاتا ہے کہ ہم نے شادی میں کون سی رسم کی ہے نہ ہمارے ہاں ناچ ہوا اور نہ باجا منگایا گیا پھر ہم نے کیا گناہ کیا۔

سو میں بتلاتا ہوں کہ آپ نے کیا گناہ کیا ہے لیکن پہلے مجھے یہ بتلا دیجئے کہ گناہ کہتے ہیں کس کو۔ ظاہر ہے کہ جو امر شرعاً ممنوع ہو وہ گناہ کہلاتا ہے خواہ وہ ناچ ہو یا کوئی دوسرا امر

ہو کیونکہ ناچ بھی تو اسی واسطے حرام ہوا کہ شریعت نے اس کو حرام اور جرم قرار دیدیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ناچ کے علاوہ دوسرے رسوم کو بھی شریعت نے جرم قرار دیا ہے یا نہیں۔

اس پر مفصل گفتگو تو "اصلاح الرسوم" میں ملے گی میں مختصراس وقت بقدر ضرورت بیان کیے دیتا ہوں یہ بات سب کو معلوم ہے کہ خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں تکبر کی سخت ممانعت فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: "**ان الله لایحب کل مختال فخور**[1]" (کہ بے شک اللہ تعالیٰ کسی اکڑنے والے اور فخر کرنے والے کو دوست نہیں رکھتے)

حدیث شریف میں ہے کہ:

لایدخل الجنة من کان فی قلبه مثقال حبة من خردل من کبر.[2]

"جس کے قلب میں رائی برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔"

دوسری حدیث ہے:

من لبس ثوب شهرة البسه الله ثوب الذل یوم القیمة.[3]

"اگر کوئی شہرت کے لیے کپڑا پہنے گا تو قیامت میں خدا تعالیٰ اس کو ذلت کا لباس پہنائیں گے۔"

اس آیت اور احادیث سے معلوم ہوا کہ فخر کے لیے کوئی کام کرنا حرام ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے:

من سمع سمع الله به ومن را ی را ی الله به.[4]

"اس سے معلوم ہوا کہ دکھلاوے اور شہرت کا کام کرنا حرام ہے۔"

اب غور کر کے دیکھئے کہ شادیوں میں جو کام ہم کرتے ہیں اور جن کے لیے ہم نے نہایت خوبصورت الفاظ تراش رکھے ہیں کہ بھات دیا ہے اور بھائیوں کو کھلایا ہے اور بیٹی کو دیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان میں نیت ہماری کیا ہوتی ہے۔ صاحبو! محض الفاظ کے خوبصورت ہونے سے کسی چیز کی حقیقت نہیں بدل جاتی۔ سب سے بڑی چیز نیت ہے لہٰذا نیت کو دیکھنا چاہیے کیا ہم لوگ

---

[1] مسند الامام احمد۳: ۴۸۲، المستدرک للحاکم۴: ۱۸٦، تفسیر ابن کثیر ٦: ۳۴۲

[2] الصحیح لمسلم کتاب الایمان باب: ۳۹، رقم: ۱۴۷، ۱۴۹، سنن الترمذی: ۱۹۹۸، ۱۹۹۹، سنن ابی داؤد: ۴۰۹۱، سنن ابن ماجه: ۵۹، ۴۱۷۳، مشکوٰة المصابیح: ۵۱۰۸

[3] سنن ابی داؤد: ۴۰۲۹، الترغیب والترهیب للمنذری ۳: ۱۱٦، کنز العمال: ۴۱۱۲۹

[4] الصحیح للبخاری۸: ۱۳۰، ۹: ۸۰، الصحیح لمسلم کتاب الزهد: ۴۷، مسند الامام احمد۵: ۴۵

یہ تمام رسمیں محض رسم اور نمود کے لیے نہیں کرتے، بہنوں کو بڑا بڑا بھات دیا جاتا ہے اور اس کو صلہ رحمی کہا جاتا ہے۔ کیوں صاحبو! آج سے آٹھ دن پہلے بھی تو یہ بہن آپ کی بہن تھی، پھر کیا آپ نے کبھی اس کی خبر لی ہے کبھی بہن کے فقر و فاقہ پر آپ کو رحم آیا ہے۔ نیز اگر یہ صلہ رحمی ہے تو تمام برادری کو اس کا معائنہ کرانے کی کیا ضرورت ہے، کیا کبھی اپنی لڑکی کے لیے کپڑا خریدتے وقت یا اس کو کھلاتے پلاتے وقت بھی آپ نے برادری کو جمع کیا ہے۔ اگر نہیں کیا تو بھات اور جہیز دیتے وقت برادری کو کیوں جمع کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ محض فخر اور نمود کے لیے ایسا کیا جاتا ہے۔ بس یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ یہ سب رسوم محض شہرت کے لیے ہیں اور شہرت کے لیے جو کام کیا جاتا ہے وہ بروئے حدیث حرام ہوتا ہے۔ تو یہ سب رسوم بھی حرام ہی ہوئیں۔

نیوتہ کی رسم

بالخصوص ایک رسم تو ایسی گندی ہے کہ وہ توبہ سے بھی معاف ہونا مشکل ہے کیونکہ اس کی توبہ بھی مشکل ہے اور لطف یہ ہے کہ بظاہر عبادت سمجھا جاتا ہے اور اس پر فخر کیا جاتا ہے اور وہ رسم نیوتہ لینا دینا ہے، لوگ اس کو قرض حسنہ سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھائی بھائی کی مدد کرتا ہے اور مدد کرنا عبادت ہے تو گویا نیوتہ دینا عبادت ہوا۔ حالانکہ نیوتہ دینا اس قدر بری رسم ہے کہ سب رسوموں میں گندی ہے۔ اس کو شاید آپ نے آج تک نہ سنا ہوگا مگر میں اس وقت ان شاء اللہ تعالیٰ اس کی حقیقت بیان کروں گا اور وہ کوئی نئی اور عجیب بات نہ ہوگی بلکہ پرانی بات ہے لیکن آپ نے عدم توجہ کے سبب اس میں غلطی کر رکھی ہے، مقدمات سب آپ کے مسلم ہیں، صرف نتیجہ میں آ کر غلطی ہو رہی ہے جیسے کسی شخص نے تبت کے ہجے کیے تھے، ت زبر ب، ب زبر ت اور رواں پڑھا تھا بطخ، تو آپ نے بھی ہجے تو صحیح کیے ہیں صرف رواں میں غلطی کر رہے ہیں جس کو میں بتلاتا ہوں۔

وہ یہ ہے کہ یہ امر سب کو مسلم ہے اور کوئی شخص اس سے منکر نہیں کہ نیوتہ ایک قرض ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ قرض واجب الادا ہوتا ہے۔ تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ قرض خواہ کی موت کے بعد اس کا کل ترکہ اس کے ورثاء کی ملک ہوتا ہے خواہ وہ ترکہ عین ہو یا کسی کے ذمہ دین ہو۔

مثلاً اگر کوئی شخص مرے اور سو روپے اس کے گھر میں موجود ہوں اور سو روپے ادھار میں تو اس کا کل ترکہ دو سو روپیہ سمجھا جائے گا اور یہ دو سو روپیہ ملا کر سب ورثاء کو تقسیم کیے جائیں گے۔

ان تینوں مسئلوں کے معلوم ہونے کے بعد دیکھئے کہ نیوتہ میں کیا ہوتا ہے۔ سو نیوتہ میں یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص نے پچیس جگہ دو دو روپے دیئے اور اس طرح پچاس روپے اس کے قرض میں پھیل گئے اور اس کے بعد یہ شخص مرا اور دو بیٹے اس نے وارث چھوڑے جن میں ایک بالغ دوسرا نابالغ۔ تو موجود ترکے میں سے تو ان دونوں نے نصفا نصف لے لیا وہ بھی جبکہ بڑا بھائی ایماندار ہو لیکن جو نیوتہ میں قرض ہے اس کو کوئی بھی تقسیم نہیں کرتا۔ چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ اگر چند روز کے بعد اس بالغ لڑکے کی کسی اولاد کی شادی ہونے لگی تو لوگ وہ نیوتہ اسی کو لا کر دیں گے اور یہ بلا تامل سارا نیوتہ خود ہی خرچ کرے گا اور اپنے کو ہی اس کا مالک سمجھے گا۔ حالانکہ ان پچاس میں سے پچیس روپے اس کا حق ہے اور پچیس روپے اس کے چھوٹے بھائی نابالغ کا حق ہے۔ اسی طرح علی العموم تمام نیوتوں میں یہی کیا جاتا ہے، کیا کوئی شخص بتلا سکتا ہے کہ کسی نیوتہ کو فرائض کی رو سے تقسیم کیا گیا ہو، میرے خیال میں ایک جزئی بھی اس کی نہیں بتلائی جا سکتی تو اس میں ایک گناہ تو اس بالغ کو ہوا کہ اس نے یتیم کا مال کھایا۔ قرآن شریف میں ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتَامٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا۔

''اور ایک گناہ نیوتہ واپس کرنے والوں پر ہوا کہ انہوں نے مشترک مال ایک شریک کو دے دیا اور لطف یہ ہے کہ نیوتہ دینے والے سمجھتے ہیں کہ ہم قرض سے سبکدوش ہو گئے حالانکہ ابھی پچیس روپے یتیم کے ان کے ذمہ باقی ہیں۔''

درمختار میں روایت لکھی ہے کہ اگر کسی کے ذمہ کسی کے تین پیسے قرض کے رہ جائیں گے تو قیامت میں اس کی سات سو نماز قرض خواہ کو دلائی جائیں گی اور یہ اس وقت ہے کہ جب مالک کے بیٹے ہی کو وصول ہو گیا ہو اور اگر دو تین پشتیں گزر گئیں اور مناسخہ جاری ہو گیا، پھر تو خدا جانے دور تک کس کس کا حق اس میں متعلق ہو گیا جس کا پہنچانا سخت ہی دشوار ہے اور اگر کوئی کہے کہ یہ تو باپ دادا کے وقت سے چلا آتا ہے تو میں کہوں گا کہ یہ عذر ہرگز قابل سماعت نہیں کیونکہ اگر اس پر عمل کیا جاتا تو آج ہم لوگ مسلمان نہ ہوتے۔ آخر ہم کو اسلام تو اسی لیے نصیب ہوا کہ ہمارے باپ دادا نے اپنے آباؤ اجداد کے رسم و رواج کو ترک کر دیا۔ لہٰذا یہ عذر نہایت بارد ہے اس کا علاج اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ پچھلے قرض کو تحقیق کر کے ادا کیا جائے اور آئندہ کو یہ رسم بالکل چھوڑ دی جائے یا کوئی عربی خواں یا انگریزی خواں اس کے سوا کوئی دوسرا علاج مجھے بتلائیں۔

غرض نیوتہ کی رسم نہایت گندگی اور خراب ہے۔ اگرچہ بظاہر یہ ثواب کا کام نظر آتا ہے اور جب یہ اس قدر خراب رسم ہے۔ جس میں ایک گونہ اعانت غریب کی مصلحت بھی ہے تو دوسری رسوم تو جس میں کوئی مصلحت بھی نہیں بالکل ہی قابل ترک ہوں گی۔ اسی طرح ہم نے ہر ہر قدم پر ایک ایک رسم ایجاد کی ہے جب تک وہ نہ ہو، گویا شادی ہی نہیں ہوسکتی۔

رسوم کی مضرتیں

ان رسوم میں جو دنیا کی مضرتیں ہیں ان کا بیان کرنا گو میرا منصب نہیں ہے لیکن ایک مختصر سے جملہ میں جن میں ایک گونہ رعایت غریب کی مصلحت بھی ہے تبرعاً ان کو بھی بیان کیے دیتا ہوں۔ وہ یہ کہ مسلمانوں پر جس قدر تباہی آئی ہے زیادہ تر انہی رسموں کی بدولت آئی ہے کیونکہ آمدنی ہر مسلمان کی جتنی ہے سب پر ظاہر ہے اور خرچ ان رسموں کی بدولت جیسا کچھ ہوتا ہے۔ وہ بھی سب کو معلوم ہے کمال اس مجموعہ کا اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ آج زمین رہن ہو رہی ہے اور کل مکان پر قرقی ہے، پرسوں زیور اور اثاث البیت نیلام ہو رہا ہے، چوتھا دن نہیں آیا کہ میاں پابند رسوم بہ یک بنی دو گوش رہ گئے۔

بعض لوگ اس کا یہ جواب دیا کرتے ہیں کہ ہم میں گنجائش ہے اور ہم کو قرض نہیں لینا پڑتا۔ سو اول تو یہ جواب مسلم نہیں کیونکہ ہر حیثیت کا آدمی اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرنا چاہتا ہے اور اس میں قرض لینا لازمی ہے۔ دوسرے اگر مان بھی لیا جائے کہ ان کو قرض لینا نہ پڑے گا تو کم از کم ان کو اپنے غریب بھائیوں کا خیال تو ضرور ہی کرنا چاہیے اور سمجھنا چاہیے کہ ہم کریں گے تو حرص کے مارے وہ بھی کریں گے اور تباہ ہوں گے تو اس سے ہم بھی نہ کریں۔ تیسرے جب یہ گناہ ہے اس لیے بھی اس کو چھوڑ دینا چاہیے۔ گو دنیوی مضرت بھی نہ ہو۔

اسی طرح غمی کی رسمیں ہیں کہ ان میں بھی جو کچھ کیا جاتا ہے وہ محض شہرت کے لیے کیا جاتا ہے نہ کہ خدا کے لیے کیونکہ اگر خدا کے لیے کیا جاتا تو پوشیدہ طور پر کرنا بھی گوارہ کیا جاتا اس دکھلانے اور سب پر ظاہر کرنے کا اہتمام کیوں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ محض شہرت ہی مقصود ہے۔

امتحان اس کا یہ ہے کہ اگر کسی پابند رسوم سے یہ کہا جائے کہ بجائے اس ڈھونگ کے تم پچاس روپے دس مساکین کو دے دو اور کسی کو خبر نہ کرو تو وہ ہرگز راضی نہ ہوگا۔ بلکہ یوں سمجھے گا کہ اس طرح کرنے سے یہ پچاس روپے ضائع ہی ہو جائیں گے اور کہے گا کہ اچھی مولوی

صاحب نے رائے دی کہ پچاس روپیہ بھی خرچ کروں اور کسی کو خبر بھی نہ ہو۔

صاحبو! یہ تو آپ لوگوں کی حالتیں ہیں اور پھر کہا جاتا ہے کہ مولوی صاحب بخشنے سے روکتے ہیں۔ یہ بتلاؤ کہ خود آپ ہی کو کب ثواب ہوا تھا کہ دوسرے کو بخشتے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ مولوی تو آپ کو ثواب ملنے اور ثواب بخشنے کی ترکیب بتلاتے ہیں، ثواب سے منع نہیں کرتے اور وہ ثواب بخشنے کی ترکیب یہ ہے کہ داہنے ہاتھ سے دو اور بائیں کو خبر نہ ہو۔ نیز اپنے خاص حصے سے دو مردے کے کپڑے جن میں تمام ورثاء بالغ اور نابالغ کا حق متعلق ہو گیا ہے وہ نہ دو اگر دو تو ان کو تقسیم کر لو اور جو تمہارے حصے میں آئیں وہ دو مشترک ہرگز نہ دو تو ثواب کا طریقہ یہ ہے کہ نہ وہ جو آپ نے تراش رکھا ہے لوگ چاہتے ہیں کہ نام بھی ہو اور ثواب بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ سوریاء میں ثواب کہاں اور اُلٹا عذاب ہے۔ شیخ علیہ الرحمتہ اس کی بابت فرماتے ہیں:

کلید در دوزخ ست آں نماز   کہ در چشم مردم گزاری دراز

یہ نمونہ کے طور پر میں نے بیان کر دیا ہے۔ دوسری رسموں کو بھی اسی پر قیاس کر لینا چاہیے یہ تو دلائل قولیہ تھے۔

فعلی بھی سنو۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شادی کر کے دکھلا دیا کہ شادی اس طرح کرنی چاہیے۔ علیٰ ہذا اپنے صاحبزادے ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی غمی کر کے بتلا دیا ہے کہ غمی یوں کرنی چاہیے۔ پھر جب ہم نے اس کے موافق نہ کیا اور ہر امر میں اپنی ٹانگ اڑا لی اور اس کا خلاف گراں ہوا تو سہولت اطاعت کہاں ہوئی، پھر محبت مطلوبہ کہاں ہوئی۔ اس محبت کا اثر تو یہ ہے کہ اطاعت میں سہولت پیدا ہو اور جب کہ ہم نے بالکل شریعت کے خلاف کیا کہ وضع وہ اختیار کی جو شریعت کے بالکل خلاف معاشرت وہ پسند ہوئی جس کو شریعت سے کچھ بھی لگاؤ نہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ ہم کو کامل محبت خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

محبت کاملہ کے اسباب واثرات

خلاصہ یہ ہے کہ کامل محبت کے دو اثر ہیں ایک دوام ذکر اور دوسرے سہولت اطاعت اور یہی علامت کامل ایمان کی ہے۔ اگر ہم میں یہ دونوں باتیں نہیں پائی جاتیں تو ہم کو اپنی حالت پر افسوس کرنا چاہیے۔ صاحبو! یہ تو بفضلہ تعالیٰ بلا غبار ثابت ہو گیا کہ خدا تعالیٰ کی محبت کاملہ کا دعویٰ بدون ذکر دائم وسہولت اطاعت کے غلط ہے۔

اب یہ بات باقی رہی کہ آیا خدا تعالیٰ اس محبت کاملہ کے مستحق بھی ہیں یا نہیں، سو اس کو بھی سمجھ لو کہ درحقیقت خدا تعالیٰ ہی مستحق محبت ہیں اور یہ ایسی ظاہر بات ہے کہ شریعت کے علاوہ عقل بھی اس کا فتویٰ دیتی ہے اس لیے کہ محبت کے تین اسباب ہوا کرتے ہیں۔

یا یہ کہ کوئی شخص ہم پر احسان کرتا ہو اور اس کے احسان کی وجہ سے ہم کو اس سے محبت ہے۔

یا یہ کہ وہ خود نہایت حسین وجمیل ہو اور اس کے حسن و جمال کی وجہ سے اس کی طرف میلان خاطر ہو۔

یا یہ کہ اس میں کوئی کمال پایا جاتا ہو اور وہ کمال باعث محبت ہو، جیسے حاتم طائی سے اس کی سخاوت کے سبب اور رستم سے اس کی قوت کے سبب اور کسی عالم فاضل سے اس کے علم و فضل کے سبب سے محبت ہے۔

اب غور کیجئے کہ ان تینوں وجوہ محبت میں سے کوئی وجہ بھی ہے کہ خدا تعالیٰ میں نہ پائی جاتی ہو، منعم وہ اتنے بڑے ہیں کہ کوئی ان کے برابر ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ سب ان کی مخلوق و مملوک ومحتاج ہیں۔ جمال ان کا اس حد تک ہے کہ کسی کو حاصل ہونا ممکن ہی نہیں۔ بڑے بڑے حسین وجمیل ان ہی کے حسن و جمال کے فیض سے حسین جمیل بنے بیٹھے ہیں۔

چہ باشد آں نگار خود کہ بندد ایں نگارہا

(جس نے ایسے خوب صورت نقش و نگار بنائے ہیں وہ خود کتنا حسین وجمیل ہوگا)

علیٰ ہذا صاحب کمال اتنے بڑے ہیں کہ علم کامل انہیں کو ہے۔ نیز ہر صفت کمال علیٰ وجہ الکمال ان ہی میں پائی جاتی ہے تو انعام ونوال اور حسن و جمال اور فضل وکمال ہر طرح سے عقلاً ونقلاً ان ہی میں ہے۔ پس وہی مستحق محبت ہیں، بس اب اپنے قلب کو ٹٹولو کہ خدا تعالیٰ سے محبت کاملہ ہے یا نہیں، اگر نہیں ہے۔

طریق تحصیل محبت

تو اس کی تحصیل کی تدبیر کرو اور تدبیر بھی میں بتلاتا ہوں اور اسی پر ان شاء اللہ بیان کو ختم کردوں گا، لیکن یہ نہ سمجھ لیجیو کہ محبت امر غیر اختیاری ہے اس کا پیدا کرنا ہمارے اختیار میں نہیں ہے پھر اس کی تدبیر کیا ہو تو کیونکہ یہ گمان غلط ہے، محبت گو خود غیر اختیاری ہو مگر اس کے اسباب اختیاری ہیں جن پر ترتب محبت کا عادۃً ضروری ہے اور ایسے امور میں خدا تعالیٰ نے ہر امر کی تدبیر بتلائی ہے۔

سو وہ تدبیر یہ ہے کہ تم چند باتوں کا التزام کرلو، ایک تو یہ کہ تھوڑی دیر خلوت میں بیٹھ کر

اللہ اللہ کرلیا کرو۔ اگرچہ پندرہ بیس منٹ ہی ہو لیکن اس نیت سے ہو کہ اس کے ذریعے سے خدا تعالیٰ کی محبت پیدا ہو۔

دوسرے یہ کیا کرو کہ کسی وقت تنہائی میں بیٹھ کر خدا تعالیٰ کی نعمتوں کو سوچا کرو اور پھر اپنے برتاؤ کو غور کیا کرو کہ ان انعامات پر خدا تعالیٰ کے ساتھ ہم کیا معاملہ کر رہے ہیں اور ہمارے اس معاملے کے باوجود بھی خدا تعالیٰ ہم سے کس طرح پیش آ رہے ہیں۔

تیسرے یہ کرو کہ جو لوگ محبان خدا ہیں ان سے علاقہ پیدا کرلو، اگر ان کے پاس آنا جانا دشوار ہو تو خط و کتابت ہی جاری رکھو لیکن اس خیال کا رکھنا ضروری ہے کہ اہل اللہ کے پاس اپنے دنیا کے جھگڑے نہ لے جاؤ نہ دنیا پوری ہونے کی نیت سے ان سے ملو بلکہ خدا کا راستہ ان سے دریافت کرو، اپنے باطنی امراض کا علاج کراؤ اور ان سے دعا کراؤ۔

چوتھے یہ کرو کہ خدا تعالیٰ کے احکام کی پوری پوری اطاعت کیا کرو کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جس کا کہنا مانا جاتا ہے اس سے محبت بڑھ جاتی ہے، وقت میں گنجائش نہیں ہے ورنہ میں اس کو مفصل طور پر بتلاتا۔

پانچویں یہ کہ خدا تعالیٰ سے دعا کیا کرو کہ وہ اپنی محبت عطا فرما دیں۔

یہ پانچ جز کا نسخہ اس کو استعمال کر کے دیکھئے، انشاء اللہ تعالیٰ بہت تھوڑے دنوں میں خدا تعالیٰ سے کامل محبت ہو جائے گی اور تمام امراض باطنی سے نجات حاصل ہو جائے گی اور آپ ”وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ“ (اور ایمان والے سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت رکھتے ہیں) کے پورے مصداق ہو جائیں گے مگر ان پانچ اجزاء میں جو ایک جزو ہے اطاعت وہ اس وقت ہو سکتی ہے کہ جب احکام کا علم ہو اور احکام کا علم اس وقت ہو سکتا ہے کہ جب ان کو سیکھا جائے۔ لہٰذا ایک چھٹے جزو کی اور ضرورت ہو گی۔

وہ یہ ہے کہ علم دین سیکھا جائے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر شخص مولوی عالم بنے۔ عالم بننے کے لیے تو صرف وہ لوگ مناسب ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے فراغ اور وقت دیا ہے۔ آپ صرف اتنا کریں کہ اردو کے چھوٹے چھوٹے رسائل دینیہ جو اسی غرض سے لکھے گئے ہیں کسی سے پڑھ لیں اور اگر پڑھنے کیلئے وقت نہ ہو یا عمر زیادہ ہو جانے کی وجہ سے یہ دشوار معلوم ہو تو کسی سے سن لیں۔ سو اس کے لیے اس کی ضرورت ہے کہ ہر شہر میں ایک دو عالم ایسے رہیں کہ جن سے یہ دو کام یعنی ان سے پڑھنے اور سننے کے لیے جائیں اور ان دونوں کاموں کے لینے کی چار صورتیں ہوں گی۔

اول تو یہ کہ اگر ان سے کوئی شخص پڑھنے جائے تو پڑھائیں۔
دوم یہ کہ اگر ان سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے تو وہ بتلاسکیں۔
تیسرے ہر ہفتے میں ایک دن ایسا نکالیں کہ لوگوں کو جمع کر کے کوئی کتاب مسئلوں کی لے کر خود اس کے مسائل پڑھا کریں اور عام لوگ ان کو سنا کریں اور مسائل میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، معاشرت، معاملات وغیرہ سب کے احکام داخل ہیں۔ سب سنائیں۔
چوتھا کام ان کا یہ ہو کہ ہر ہفتہ یا پندرہویں دن ترغیب وترہیب کا وعظ کہا کریں۔
وعظ کی مجلس کو بیان مسائل کی مجلس سے علیحدہ کرنے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ یہ تجربے سے ثابت ہو گیا ہے کہ وعظ میں مسائل فقہیہ کا زیادہ بیان نہیں ہوسکتا۔ اکثر یاد میں بھی غلط ہو جاتا ہے اور بالخصوص اس لیے بھی کہ وعظ میں اکثر لوگ مزیدار مضامین سننے کی غرض سے آتے ہیں۔ اس لیے وعظ میں زیادہ ترغیب وترہیب کے مضامین ہوں۔
یہ چار کام ان کے سپرد ہوں اور ان کی تنخواہ اہل شہر خود اپنے ذمہ لیں اور یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ دیکھئے جس مقام پر طبیب نہیں ہوتا اہل شہر چندہ کر کے کسی طبیب کو بلاتے ہیں اور تنخواہ دیتے ہیں تو کیا باطنی امراض کا ازالہ بدنی امراض کے برابر بھی ضروری نہیں ہے۔

عورتوں کا دستور العمل

یہ دستور العمل تو مردوں کے لیے ہے، رہیں عورتیں ان کے لیے آسان یہ ہے کہ جو عورتیں پڑھی لکھی ہیں وہ اپنے گھر میں بیٹھ کر بہشتی زیور وغیرہ پڑھا کریں اور جو پڑھی ہوئی نہیں ہیں وہ اپنے لڑکوں، بچوں سے کسی وقت بہشتی زیور کے مسائل سن لیا کریں اور یہ بھی نہ ہو تو لڑکیوں کو پڑھوا کر تیار کرلیں اور ان سے اسی سلسلے کو جاری کریں۔ یہ ہے مختصر دستور العمل اس سے ان شاء اللہ ہر شخص کو علم دین حاصل ہوگا اور محبت بھی بڑھے گی اور دین کی تکمیل ہوگی۔
خلاصہ سارے بیان کا یہ ہوا کہ ایمان والوں کے لیے محبت کاملہ لازم ہے اور محبت کاملہ کے لیے سہولت اطاعت لازم اور اس کی اطاعت کے لیے کچھ وقت ذکر اللہ کے لیے مقرر کرنا بھی مناسب اور پھر طاعت کے لیے ضروری ہے، واقفیت اور واقفیت حاصل کرنے کے سہل طریقے یہ ہیں تو ان طریقوں پر عمل کیا جائے کہ علم حاصل ہو اور اس سے اطاعت میں سہولت ہو اور اس سے محبت بڑھے اور ایمان کی تکمیل ہو اور یہ تدابیر اختیار کر کے سب

سے بڑی بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کیونکہ ہر امر اس کی مشیت پر موقوف ہے اس کی مشیت نہ ہو تو یہ سب تدابیر بے سود ہیں لیکن نری دعا پر بھی نہ رہنا چاہیے جیسے بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ بزرگوں سے دعا کی التجا کرتے ہیں لیکن خود کچھ نہیں کرتے۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہ سے ایک تاجر نے بمبئی میں کہا کہ حضرت دعا کیجئے کہ خدا تعالیٰ مجھے حج نصیب کریں۔ آپ نے فرمایا کہ اس شرط سے دعا کروں گا کہ جس روز جہاز چلے اس روز کامل اختیار تم مجھے اپنے اوپر دے دینا، کہنے لگے حضرت اس میں کیا مصلحت ہے، آپ نے فرمایا کہ مصلحت یہ ہے کہ تمہارا ہاتھ پکڑ کر جہاز میں بٹھلا دوں گا اور پھر خدا تعالیٰ سے دعا کروں گا کہ تمہیں صحیح وسالم پہنچا کر حج کرا دے ورنہ میری خالی دعا کرنے سے کیا ہوگا جبکہ تم بمبئی سے باہر نکلنے کا قصد ہی نہ کرو۔

غرض محض دعا کرانے سے کام نہیں چلتا۔ ضرورت اس کی ہے کہ اول کوشش کی جاوے اور اس کے ساتھ خدا سے دعا کی جائے۔ البتہ جو کام ایسے ہیں کہ ان میں تدبیر کو بالکل دخل نہیں ہے وہاں نری دعا ہی کافی ہے۔ مثلاً بارش کا ہونا کہ وہ محض خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے ہم اس کے لیے کوئی تدبیر کر ہی نہیں سکتے لیکن جو کام ہمارے اختیار میں ہیں۔ جیسے خدا تعالیٰ سے محبت پیدا کرنا، ان میں نہ تو نری تدبیر پر اکتفا کیا جائے کہ وہ بسا اوقات ناز اور عجب کا باعث ہو جاتی ہے اور نہ نری دعا پر بس کیا جائے کہ وہ کچھ مفید نہیں۔

اب خدا تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ ہماری تدابیر میں برکت عطا فرمائیں اور ہم کو موانع سے محفوظ رکھیں اور اپنی اطاعت کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یارب العالمین!

فرمایا کہ نماز کی ایک برکت یہ ہے کہ اس سے صحت اچھی رہتی ہے۔
اطباء بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ اخلاق حمیدہ اور افعال حسنہ کا اثر
صحت پر بہت اچھا پڑتا ہے۔ (کمالات اشرفیہ)

شبعان فی شعبان

یہ وعظ جامع مسجد تھانہ بھون ضلع مظفرنگر میں ۵ شعبان ۱۳۳۶ھ کو بیان فرمایا۔ جو پونے دو گھنٹے تک جاری رہا۔اس کو حکیم محمد یوسف صاحب مرحوم نے قلمبند کیا۔

خطبہ ماثورہ

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمدلله نحمده و نستعينه ونستغفره ونومن به ونتوكل عليه و نعوذ بالله من شرور انفسنا ومن سيئات اعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادى له ونشهدان لااله الاالله وحده لاشريک له ونشهدان سيدنا ومولانا محمدا عبده ورسوله صلى الله تعالى عليه وعلى اله واصحابه و بارک وسلم.

امابعد فاعوذ بالله من الشيطن الرجيم بسم. الله الرحمن الرحيم،
فَقَدْ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا انْتَصَفَ شَعْبَانُ فَلَا تَصُوْمُوْا[1].

ترجمہ: ''جب نصف شعبان ہو جائے تو (پندرہ شعبان کے بعد) روزہ مت رکھو۔

تمہید: یہ ایک حدیث مختصر ہے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حکم بیان فرمایا ہے ظاہراً تو اس کا تعلق شعبان سے ہے مگر واقع میں مقصود اس میں رمضان شریف کا ایک حکم ہے چونکہ شعبان کا وقت رمضان شریف کے متصل ہے اس لیے بیان کے لیے اس حدیث کو اختیار کیا ہے۔ آج کے وعظ میں بعض احکام شعبان کے متعلق اور بعض احکام رمضان کے متعلق مذکور ہوں گے۔ لفظ کے اعتبار سے تو اس حدیث کا مضمون شعبان کے متعلق ہے اور معنی میں غور کیا جاوے تو یہ حدیث رمضان سے بھی تعلق رکھتی ہے۔

اس میں طالبین کے لیے ایک نہایت کارآمد دستور العمل بیان ہوا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ طالب تمام مومنین ہیں اس لیے وہ دستور العمل تمام مومنین کے لیے ہوگا کیونکہ ایمان کے حقوق میں سے یہ ہے کہ آدمی ہمیشہ اللہ کی طلب میں لگا رہے اس لیے سب ہی مومنین

---

[1] (سنن ابی داؤد: ۲۳۳۷، مشکوۃ المصابیح: ۱۹۷۴، کنز العمال: ۲۴۸۵۷).. ابوداؤد وابن ماجه والدارمی ترمذی كذا فی المشكوة

طالب ہیں سو جو حکم یہاں سے مستنبط ہوتا ہے وہ باعتبار حکمت کے ایک دستور العمل ہے۔ مومنین طالبین کا سو حاصل حدیث کا دو مضمون ہیں۔ ایک تو لفظوں کا مدلول ہے، دوسرا معنی میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے میں دونوں کو مختصراً عرض کروں گا۔

نصف شعبان کے روزے

ظاہری لفظوں کا مطلب تو یہ ہے کہ جب آدھا شعبان ہو جایا کرے تو روزہ مت رکھا کرو، یہ تو الفاظ سے اچھی طرح سمجھ میں آتا ہے اور ترجمہ کا یہ حکم تو متعلق شعبان کے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نصف شعبان کے بعد روزہ رکھنا مناسب نہیں اور اس لاتصوموا میں فقہاء کا اتفاق ہے کہ یہ نہی تحریمی نہیں ہے بلکہ ارشادی ہے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم مشورہ دیتے ہیں کہ نصف شعبان کے بعد روزہ رکھنا مناسب نہیں اور ساتھ ہی ساتھ غور سے دیکھا جائے تو اس میں نصف شعبان کے روزہ کے جواز کی طرف اشارہ ہے کیونکہ فرما رہے ہیں کہ **"اذا انتصف شعبان فلا تصوموا"**[1] مطلب یہ ہوا کہ جب نصف شعبان ہو چکے تو روزہ مت رکھو اور نصف شعبان ہو چکنے کا تحقق یوم وسط کے گزرنے سے ہوتا ہے نہ کہ اس سے پہلے تو آگے کو روزہ رکھنے سے نہی ہوئی اور اس سے پہلے کی نہی نہیں اور نصف سے پہلے میں خود یوم نصف شعبان بھی داخل ہے تو اس میں اشارہ ہو گیا، **عدم النہی عن صوم یوم النصف** کی طرف رہا یہ کہ جب اس سے نہی نہیں تو وہ جائز ہے یا مستحب سو جواز اور استحباب فی نفسہ دونوں محتمل ہو سکتے ہیں اس کے لیے دوسری دلیل کی ضرورت ہے سو دوسرے دلائل سے معلوم ہوا ہے کہ نصف شعبان کا روزہ مستحب ہے۔

تو اب شعبان میں تین جزو ہیں ایک خاص یوم نصف شعبان دوسرا اس کے قبل تیسرا اس کے بعد تینوں کا حکم جدا جدا ہے، نصف سے قبل کا روزہ تو جائز ہے یعنی بلا استحباب خاص او بلا کراہت جیسے اور ایام کے روزے ہیں ویسے ہی قبل نصف شعبان کے روزے ہیں۔ ان میں تخصیص کوئی نہیں، ہاں روزہ رکھنے سے ثواب ملے گا اور نفس روزہ کی فضیلت حاصل ہوگی کیونکہ سوائے ایام مہینہ کے سب دنوں میں روزہ رکھنا جائز ہے۔ دوسرا جزو خاص نصف شعبان جس کو

---

[1] سنن ابی داؤد: ۲۳۳۷، مشکوٰۃ المصابیح: ۱۹۷۴، کنز العمال ۲۳۸۵۷

پندرہ تاریخ کہتے ہیں اس کا روزہ مستحب ہے تیسرا بعد نصف اس میں روزہ کی نہی ہے۔ گوارشادی حدیث میں نصف شعبان کے روزہ کی فضیلت کے ساتھ پندرہویں رات کی بھی فضیلت آئی ہے اور پندرھویں رات سے مراد وہ رات ہے جو چودہ تاریخ گزر کر رات آتی ہے۔

چاند کا حساب

وجہ اس کے پندرھویں ہونے کی یہ ہے کہ شریعت میں رات کو مقدم سمجھا گیا ہے دن پر اس لیے جب رویت ہلال شعبان ہو جاوے تو وہ رات شعبان ہی میں شمار ہوگی اس لیے جو رات ۱۴ تاریخ کے ختم ہونے پر ہوگی وہ پندرھویں رات ہوگی۔ راز اس کا یہ ہے کہ شریعت میں حساب مقرر ہے، چاند سے اس لیے رات تاریخ کا جزو سابق ہے۔

اب رہی یہ بات کہ حساب چاند سے کیوں لیا گیا ہے سورج سے کس واسطے نہیں رکھا گیا۔ جیسا کہ اور لوگوں نے سورج سے حساب رکھا ہے تو راز اس کا یہ ہے کہ چاند سے حساب رکھنے میں سہولت ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم شریعت سہلہ دے کر بھیجے گئے ہیں۔ یہ تو ایک ظاہر حکمت ہے، باقی اس شریعت میں جو برکات و اسرار ہیں وہ غامض بھی ایسے ہیں جو افلاطون کی سمجھ میں بھی نہیں آسکتے اور ظاہری آثار سہل بھی ایسے ہیں کہ اتنی سہولت کسی اور طریق میں نہیں ہوسکتی۔ دونوں پہلوؤں پر نظر کر کے یہ شعر یاد آتا ہے۔

برنگ اصحاب صورت را بوار باب معنی را بہار عالم حسنش دل وجاں تازہ میدارد

(اس کے عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل و جان کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے دل و جان کو بُو سے تازہ رکھتی ہے)

جیسے بعض حسین کہ ان میں ظاہری آب وتاب اور دلکشی بھی ہوتی ہے گو سرسری نظر سے دیکھا جائے اور اگر تدقیق کی جائے تو باطنا بھی بے حد اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ شریعت کی ایسی ہی مثال ہے کہ ظاہری حسن بھی ہے اور باطنی حسن بھی اور بعض وہ حسین ہیں کہ ظاہری آب وتاب تو ان میں ہے مگر تدقیق کی جائے تو ان میں حسن باطنی نہیں ہوتا، پختگی نہیں ہوتی، ایک وہ ہیں کہ جوں جوں ان میں تدقیق کی نظر کی جائے دقائق حسن کے بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے دلربا ہے اور باطن بھی ایسا جانفزا ہے کہ حد وحساب ہی نہیں،

شریعت غرا کے سارے احکام ایسے ہی ہیں۔

چنانچہ میں جس کا ذکر کر رہا ہوں وہ بھی ایسا ہی ہے کہ مولانا محمد یعقوب صاحب فرمایا کرتے تھے کہ شریعت میں جو چاند سے حساب رکھا ہے اس میں یہ بھی راز ہے کہ اگر تمام لوگوں پر کبھی سہو مسلط ہو جائے یعنی کسی کو بھی تاریخ یاد نہ رہے تو آفتاب سے کوئی ذریعہ تاریخ معلوم کرنے کا نہیں ہوسکتا۔ اس سے عام شورش پھیل جائے اور چاند ایسی چیز ہے کہ اول تو اس کی کمی اور زیادتی کو دیکھ کر روزانہ تاریخ کا بھی اندازہ ممکن ہے اور اگر پریشانی بھی ہوگی تو ختم ماہ تک ہوگی۔ چاند ہو جانے پر پھر حساب جاری ہوسکتا ہے بخلاف سورج کے کہ اس میں یہ صورت نہیں ہوسکتی۔ پس چاند کا حساب سہل ہے عامی تک حساب لگا سکتا ہے جو اس اُمت کے مناسب ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: **"نحن امة امية لانكتب ولا نحسب"** جو امر کہ دوسروں کے نزدیک عیب ہے وہ اس امت کے لیے ہنر شمار کیا گیا ہے وہاں گھڑیوں، جنتریوں، آلات رصد کی ضرورت ہے یہاں ان بکھیڑوں کی حاجت نہیں یہاں افلاطون اور دیہاتی سب برابر ہیں۔ یعنی سب آسانی سے حساب کر سکتے ہیں کوئی دقت ہی نہیں۔

ایک اور دقیق حکمت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خدائی احکام ہیں وہ یہ کہ اس میں تمام عالم کی رعایت ہے اور جس قانون میں رعایت تمام عالم کی ہو وہی خدائی قانون ہوسکتا ہے، شریعت ہی ایسا قانون ہے جس میں تمام عالم کی رعایت ہے۔

مثلاً روزہ ہی ہے اگر اس کا حساب سورج سے ہوتا مثلاً مئی یا جون میں سے کوئی مہینہ اس کے لیے معین ہوتا تو جس موقع پر مئی جون میں گرمی ہوتی ہے اس جگہ روزے ہمیشہ گرمی میں رہا کرتے اور جہاں سردی ہوتی ہے وہاں سردی ہی میں ہمیشہ رہتے، پس کسی جگہ کے باشندوں پر تو روزے ہمیشہ گرمی میں ہوتے ہیں اور کسی جگہ کے لوگوں کے لیے سردی ہی میں رہتے، تمام عالم کے لیے سہولت تو اس میں ہے کہ جہاں اب گرمی میں تھے بھی آئندہ ان کے لیے سردی میں ہو جائیں اور جس جگہ اب سردی میں تھے وہاں آئندہ گرمی میں ہو جائیں تا کہ ہر موسم کی حالت پیش نظر رہے اور یہ چاند کے حساب میں ہوسکتا ہے، سورج کے حساب میں یہ صورت ممکن نہیں، تمام عالم کے لیے سہولت ہونا یہ برکت باطنی ہے، باقی تمام اسرار کا احاطہ کون کر سکتا ہے۔ غرض پندرہویں شب وہ ہے جس کی صبح کو تاریخ ہو اس

رات کو قیام کرو اور دن کو روزہ رکھو، حدیث میں اس کو تصریحاً بیان کیا گیا ہے۔

پندرہویں شعبان کی عبادت

اب رہی یہ بات کہ اس شب میں کون سی عبادت کرنا چاہیے تو اس کی بابت حدیث میں کوئی عبادت خاص منقول نہیں کہ نوافل ہی پڑھے یا قرآن شریف ہی کی تلاوت کرے، وغیرہ وغیرہ۔ جونسی عبادت میں سہولت معلوم ہو اس کو اختیار کر لے باقی بزرگوں سے جو کوئی خاص عبادت منقول ہے۔ مثلاً بعض کا اپنے مریدین کو نوافل معین کر کے بتلانا تو اس میں انہوں نے بعض کے اعتبار سے سہولت کا لحاظ رکھا ہے اور ان مریدین کے مناسب وہی عبادت ہوگی کیونکہ بعض اوقات اگر معین کر کے نہ بتلایا جائے تو کام بسہولت نہیں ہوسکتا۔ اس لیے بزرگوں نے ایک مناسب حال طریقہ تجویز کر کے بتلا دیا، تعلیم تو اس بنا پر ہوئی تھی مگر مریدوں میں جاہل زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ عالم اول تو بہ نسبت جہلا کے ہیں ہی بہت کم دوسرے وہ مرید بھی بہت کم ہوتے ہیں گو اب ہونے لگے ہیں اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ مولوی درویشی کے خلاف ہیں، مولوی درویشی کے خلاف نہیں ہیں مگر وہ کسی کو درویش کم سمجھتے ہیں اس لیے مرید بھی کم ہوتے ہیں۔

غرض جہلاء نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اس رات میں یہی عبادت متعین ہے دوسری نہیں۔ سو یہ غلط ہے جو بات قرآن وحدیث سے ثابت نہ ہو وہ بدعت یا زندقہ ہے، باقی بزرگوں کی طرف ہمیں حسن ظن ہے کہ انہوں نے قرآن اور حدیث کے خلاف نہیں بتلایا بلکہ انہوں نے کسی شخص کی مناسبت کے لحاظ سے اس کے لیے خاص طور پر اس طریق کو مناسب سمجھ کر بتلا دیا ہوگا، خوب سمجھ لو کہ اس رات میں کوئی عبادت خاص منقول نہیں، خواہ وعظ سنو، خواہ نوافل پڑھو، خواہ تلاوت کرو، اختیار ہے اور یہ جو ارشاد فرمایا کہ "**صوموا نهارها** تو یہ امر بھی استحبابی" ہے یعنی روزہ پندرہویں کا مستحب ہے' فرض وواجب نہیں غرض **قوموا ليلها** سے اس رات کی فضیلت معلوم ہوگئی اور حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس رات میں آسمان دنیا پر نزول فرماتے ہیں (جس قسم کا نزول ان کی شان کے موافق ہو ہمارے جیسا نزول مراد نہیں) اور فرماتے ہیں۔ "**هل من داع فاستجيب له هل من مستغفر فاغفر له**[1]"، صبح تک یہی کیفیت رہتی ہے۔

---

[1] اتحاف السادة المتقين ۵: ۱۳۱، الدر المنثور ۴: ۲۶

اب ایک اور مدعا کی طرف متوجہ کرتا ہوں جس کا ایک مقدمہ تو یہ ہے کہ اس رات میں فضیلت ہے، ایک دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جس میں فضیلت ہوگی اس میں معصیت بہ نسبت دوسرے اوقات کے بہت بڑی ہوگی جیسے مکان کا حکم ہے اسی طرح زمان کا حکم ہے۔ مثلاً ایک تو گناہ معمولی جگہ پر کرنا اور ایک مسجد میں کرنا مسجد میں گناہ کرنا زیادہ برا ہے۔ اسی طرح ایک تو گناہ کرنا دوسرے اوقات میں اور ایک متبرک اوقات مثلاً رمضان شریف میں گناہ کرنا یہ بہ نسبت دیگر ایام کے بہت برا ہے اور یہ رات بھی متبرک ہے تو اس میں بھی گناہ اور اوقات سے اشد ہوگا اور جو گناہ اس رات میں کیے جاتے ہیں وہ دو قسم کے ہیں ایک وہ جو کہ برنگ عبادت نہیں ہیں اس کا برا ہونا بالکل ظاہر ہے۔ جیسے اس رات میں آتش بازی چھوڑی جاتی ہے جس کی وہی مثل ہے کہ گھر پھونک تماشا دیکھ، اس میں کبھی ہاتھ جل جاتے ہیں اور مال اور جان دونوں کا نقصان ہوتا ہے۔ پس علاوہ معصیت ہونے کے اس میں دنیا کا بھی تو نقصان ہے۔

دوسری قسم معصیت جو کہ برنگ عبادت ہے وہ کیا ہے بدعت چنانچہ اس رات میں ایک بدعت بھی عوام میں جاری ہے اگرچہ ہمارے یہاں نہیں ہے مگر بعض بوڑھیاں اب بھی جاری کیے ہوئے ہیں جیسے حلوہ اور چونکہ بدعت میں مزہ بہت ہے اس لیے تاویلیں کر کر کے اس کو جائز کرنا چاہتے ہیں اور منع کرنے سے نہیں مانتے۔ غرض چونکہ اس کے اندر لطف ہے اور شیوع ہے اور چونکہ بدعت بھی ایک معصیت ہے اس شب بابرکت میں ان معاصی کا ارتکاب اشنع ہوگا۔ یہ اس ماہ کا دوسرا جزو ہے۔

علل وحکم پوچھنے کا مرض

اس ماہ میں تیسرا جزو اور ہے یعنی نصف شعبان کے بعد کا جو زمانہ ہے جس کا ذکر اس حدیث میں ہوا ہے اس میں روزہ کی ممانعت ہے جس کی وجہ معلوم کرنے کا شاید سامعین کو انتظار ہو کیونکہ آج کل اسرار کی تفتیش کا بہت زور ہے، ہر حکم کے متعلق لوگ پوچھتے ہیں کہ اس حکم کی کیا وجہ ہے اور اس کی کیا علت ہے۔ بعض لوگ تو یہاں تک پوچھتے ہیں کہ سور کیوں حرام ہے اس کی کیا وجہ ہے غرض ہر چیز کی علت پوچھتے ہیں۔

میں نے ایک شخص کو لطیفہ کا جواب دیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ فلاں حکم میں کیا حکمت

ہے، میں نے جواب لکھا کہ آپ کے سوال عن الحکمۃ میں کیا حکمت ہے، بتلایئے بس ختم ہو گئے تو میں ایسے سوالات کا جواب نہیں دیا کرتا اور علماء کو بھی اس سے منع کرتا ہوں۔ بعض لوگوں کو ایسے سوالات کے جواب نہ ملنے پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ ہم اگر علت دریافت کریں یا علماء خود ہی وجہ بیان کر دیں تو کیا قباحت ہے۔ آخر مجتہدین نے بھی تو احکام کی علتیں بیان کی ہیں تو بات یہ ہے کہ جب بندر آدمی کی نقل کرے گا تو اسی کا کچلا ہو جائے گا۔

چنانچہ ایک قصہ ہے کہ کسی جگہ بڑھئی لکڑی چیر رہے تھے، قریب ہی ایک بندر بیٹھا ہوا تھا، وہ اتفاق سے ایک کام کو چلے گئے، بندر کو نقل کی عادت ہوتی ہے وہ اس لکڑی پر آ کر بیٹھ گیا اور اس نے ان کی نقل کرنی چاہی۔ اس لکڑی میں لکڑی کی میخ ٹھکی ہوئی تھی تاکہ آرہ چلنے کی جگہ رہے اس کے بعض اعضاء (یعنی فوطے) اس لکڑی کے اندر آ گئے، اب جو بندر نے اس پر بیٹھ کر زور کر کے میخ نکالی تو لکڑی کے دونوں پٹ آپس میں مل گئے، اب یہ رہ گئے تڑپتے ہوئے اتنے میں بڑھی آ گئے، انہوں نے یہ حال دیکھ کر خوب خبر لی، سر کا کچلا ہو گیا۔

کار بوزینہ نیست نجاری

(بندر کا کام ترکھان کا نہیں)

تو صاحبو! اسی طرح آپ مجتہدین کی نقل کرتے ہیں یہ کیا ضرور ہے کہ جس نوع کا کام مجتہدین کرتے وہ آپ سے بھی بن سکے۔

کار پاکان راقیاس از خود مگیر گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر
جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد کم کسے ز ابدال حق آگاہ شد
ہمسری با انبیاء برداشتند اولیاء راہم چو خود پنداشتند

بزرگوں کے افعال کو اپنے اوپر قیاس مت کرو اگرچہ ظاہر میں دونوں کے فعل یکساں ہیں جس طرح لکھنے میں شیر اور شیر یکساں ہیں۔ تمام دنیا اسی خام خیالی کی وجہ سے گمراہ ہو گئی کہ اپنوں نے اولیاء اللہ کو نہیں پہنچانا خدا کے پیغمبروں کی برابر اور ہمسری کا دعویٰ کیا اور اولیاء اللہ کو اپنے جیسا گمان کیا۔

قولی تقلید کی ضرورت

صاحبو! اجمالاً اتنا سمجھ لو کہ بزرگوں کے قول کی تقلید کرنا چاہیے ان کے افعال کی نہیں

کرنا چاہیے باقی مولانا کے کلام میں جو یہ شعر ہے۔

خلق راتقلید شاں برباد داد   کہ دو صد لعنت بریں تقلید باد

''مخلوق ایسوں کی تقلید سے برباد ہوئی ایسوں کوتقلید پر دوسولعنت''

جس سے ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ تقلید بالکل نہیں ہونی چاہیے نہ قول میں نہ فعل میں۔ چنانچہ بعضے غیر مقلدین اس کو استدلال میں پیش کیا کرتے ہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ مولانا تقلید قولی پر لعنت نہیں کرتے بلکہ تقلید فعلی پر ہی کرتے ہیں۔ چنانچہ اس قصہ میں تقلید فعلی ہی کا ذکر ہے اس کے بعد یہ شعر لائے ہیں تو لعنت بھی اسی پر ہے اور کسی کا تو کیا ذکر ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی تقلید علی الاطلاق نہیں ہے الا بعد تحقیق عدم الاختصاص تو اوروں کے فعل میں تو کہاں گنجائش ہوگی کیونکہ ممکن ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل آپ کی ذات مبارک کے ساتھ خصوصیت رکھتا ہو۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک طبیب سنکھیا کھا رہا ہو اور ایک جاہل شخص اس کو دیکھ کر سنکھیا کھانے لگے۔ اگر کوئی اس سے کہے کہ تو سنکھیا کیوں کھاتا ہے وہ اس پر یہ جواب دے کہ فلاں طبیب کو میں نے سنکھیا کھاتے ہوئے دیکھا ہے اس لیے میں بھی کھاتا ہوں تو اس کو یوں کہا جائے گا کہ تجھ کو اس کے فعل کی تقلید ہرگز درست نہیں کیونکہ طبیب سنکھیا کھائے گا تو اس کو ضرر نہ کرے گا کیونکہ وہ اس کے کھانے کی تدبیر سے واقف ہے اور جاہل کھا کر تباہ ہوگا۔ یہ مثال ہے تقلید فعلی کی۔

اب یہ کہنا غلط ہے کہ ہم تو بزرگوں کے فعل کی تقلید کرتے ہیں کہ انہوں نے بھی احکام کی علل اور حکمتیں بیان کی ہیں اسی طرح ہم بھی بیان کرتے ہیں۔ یہ تو اجمالی جواب ہے اور تفصیلی جواب یہ ہے کہ انہوں نے بضرورت تعدیہ حکم مسکوت عنہ کے حکم منطوق کی تعلیل کی ہے نہ کہ بلاضرورت مصالح تراش کر ان کو احکام کی بناء قرار دیا ہے۔

پھر جو لوگ احکام کی علل اور حکمتوں کے درپے رہتے ہیں وہ دو قسم کے ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو علماء سے علل اور حکمتیں دریافت کرتے ہیں، دوسرے وہ ہیں کہ خود علل اور حکم بیان کرتے ہیں ان کی حالت ان سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔

مجھے ایک لطیفہ یاد آیا کہ ایک صاحب نے سور کی حرمت کی علت بیان کی تھی کہ یہ اصل میں سوء ار ہے اور سوء کہتے ہیں برائی کو چونکہ اس میں برائی ہے اس لیے حرام کیا گیا۔ آج کل ایسی علل بیان کی جاتی ہیں جس پر ہنسی آتی ہے ان صاحب سے پوچھئے کہ اس کا یہ نام ہی کیوں رکھا گیا۔ اگر احکام تابع نام کے ہیں تو کوئی شراب کا نام شراب الصالحین رکھ دے تو کیا وہ حلال ہو جائے گی۔ اور تعجب یہ ہے کہ ایسی باتوں کی کتابیں جمع ہونے لگیں اور اول تو زیادہ لوگوں کی یہی حالت ہے کہ خود علل وحکم بیان کرتے ہیں اور جو ان میں محتاط ہیں وہ خیر پوچھ ہی لیتے ہیں۔

اجتہاد کی ضرورت

اب رہا یہ اعتراض کہ فقہاء نے ایسا کیوں کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کو ضرورت پیش آئی تھی۔ جیسا اوپر مذکور ہوا چنانچہ اسی حدیث میں جو حکم لاتصوموا ہے اس کی علت فقہاء نے تلاش کر کے سمجھی کہ ضعف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نصف اخیر شعبان میں روزہ سے نہی فرمائی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت روزہ رکھنے سے کہیں ضعف نہ ہو جائے۔ پھر اس سے رمضان کے روزہ میں خلل واقع ہو۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نصف شعبان کے بعد روزہ سے نہی فرما دی۔ اب اس علت کے معلوم ہو جانے سے اس کا درجہ بھی متعین ہو گیا۔ وہ یہ کہ فی نفسہ روزہ حرام نہیں ایک عارض کی وجہ سے ممانعت ہے۔ اگر وہ عارض نہ پایا جاوے تو روزہ رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔ مثلاً کسی کو ضعف نہ ہوتا ہو اور وہ عادی ہو ان ایام میں روزہ رکھنے کا اور روزہ رکھنے سے کوئی اثر معتد بہ رمضان میں واقع نہ ہو تو اس کو روزہ رکھنا جائز ہوگا۔

چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ رمضان شریف سے دو تین روز قبل روزہ نہ رکھے مگر جس کی عادت ہو سو حاصل یہ کہ ایک تو مجتہدین کو ضرورت تھی درجہ معین کرنے کی اس لیے علل بیان کی ہیں اور ایک ضرورت حکم کے تعدیہ کرنے کی پیش آتی تھی۔ تعدیہ کی وجہ یہ ہوئی کہ قرآن وحدیث میں کلیات بیان ہوئے ہیں اور بہت سے جزئیات کی تصریح نہیں ہے۔ اب ان جزئیات کا حکم کس طرح معلوم ہو۔ اس لیے فقہاء نے احکام کی علل بیان کیں کہ جس جگہ وہ علل پائی جائیں گی حکم بھی پایا جاوے گا۔ اس طریقہ سے جزئیات کا حکم نکل آئے

گا اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اجتہاد کی اجازت قرآن وحدیث سے ثابت ہے کیونکہ اگر اجتہاد کی اجازت نہ ہوتی تو قرآن وحدیث میں کلیات مذکور نہ ہوتے بلکہ جزئیات مذکور ہوتے۔ پس کلیات کا مذکور ہونا اور جزئیات کا زیادہ مذکور نہ ہونا اجازت اجتہاد کی دلیل ہے ورنہ بتلاؤ پھر اس صورت میں جزئیات کا حکم کیسے معلوم کیا جائے گا۔ یہ دلیل منکرین پر بڑی حجت ہے تعجب ہے کہ وہ ایسے صریح مقدمات کے نتیجہ سے انکار کرتے ہیں اور اس اجتہاد کی صورت یہ ہے کہ غیر منصوص پر منصوص کا حکم جاری کیا جاتا ہے بوجہ اس تشابہ کے جو دونوں میں پایا جاتا ہے جو اشتراک ہوتا ہے کسی وصف میں جس غیر منصوص میں وہ وصف پایا جائے گا۔ منصوص کا حکم وہاں بھی متعدی کیا جاوے گا، اس طرح سے جزئیات غیر منصوصہ کا حکم معلوم ہو جاوے گا۔ یہ صورت ہے تعدیہ کی۔

پس مجتہدین کو تو بیان علل کی یہ ضرورت پیش آئی۔ ہمیں کیا ضرورت ہے کیونکہ اب تو احکام مدون ہو چکے ہیں ہاں ہم اب بھی ان جزئیات میں اجتہاد کی اجازت دیتے ہیں جو مدون نہیں ہیں۔ مگر ان جزئیات غیر مدونہ میں بھی ہر شخص کو اجتہاد کی اجازت نہیں ہو سکتی۔ تاوقتیکہ وہ اس کا محل نہ ہو۔

اس جزئی غیر مدون کی ایک مثال آج کل ہوائی جہاز ہے کہ پہلے یہ تھے ہی نہیں اس کے بارے میں میرے قلب میں یہ خیال آیا تھا کہ اس کو پانی کے جہاز پر قیاس کرنا صحیح نہیں کیونکہ آبی جہاز مستقر ہے زمین پر اگرچہ بواسطہ ہی اس طرح کہ پانی جہاز کو اٹھائے ہوئے ہے اور پانی کو زمین اٹھائے ہوئے ہے تو اس پر نماز گویا زمین پر پڑھنا ہے اور ہوائی جہاز کو ہوا پر استقرار نہیں ہے نہ ہوا کو زمین پر استقرار ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے تو پھر اس پر نماز کیسے جائز ہوگی۔ اب ضرورت ہوگی اجتہاد کی۔

میں نے ایک تحریر میں اس کا جواب لکھا ہے اور ہوائی سفر میں قصر کا مسئلہ بھی لکھا ہے۔ یہ میں نے اس لیے کہا کہ علماء اس جانب توجہ کریں۔ آج کل تو یہ غضب ہے کہ احکام منصوصہ تعبدیہ کی بھی حکمت پوچھتے ہیں اور بزعم خود بزرگوں کی تقلید کرتے ہیں۔ سو یہ اول تو تقلید نہیں۔ دونوں کا فرق اوپر ظاہر کر چکا ہوں اور تقلید ہی فرض کی جاوے تو تقلید قولی چاہیے

فعلی نہیں چاہیے۔ جو شخص کسی ضرورت سے پلاؤ کا پکانا سیکھتا ہو اور پکانا نہ جانتا ہو اس کو تو ضرورت ہو ترکیب سیکھنے کی یہ ضرورت پیش آتی ہے مجتہد کو باقی جسے کھانا ہی ہو اس کو پکانے کی ترکیب پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ حالت ہماری ہے۔ سو ہمیں عمل کے لیے احکام معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔ علت یا حکمت دریافت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

مداومت کی برکات

علاوہ اس کے اس میں ایک ضرر بھی ہے وہ یہ کہ علت حکمت معلوم ہو جانے کے بعد طاعت کی عظمت کا وہ اثر قلب پر نہیں ہوتا جو بدون اس کے معلوم کیے عمل کرنے سے ہوتا ہے، پس تم احکام کی حکمت معلوم کر کے اس عظمت کو کیوں کھوتے ہو اور اگر ایسا ہی علم اسرار کا شوق ہے تو اس کی بھی یہی صورت ہے کہ پہلے بدون معلوم کیے ہی عمل شروع کر دو، کام کرتے کرتے برکات و اسرار خود ہی محسوس ہونے لگتے ہیں۔ ابتداء تو کچھ بھی نہیں ہوتا، اگر تم نماز اس طرح پڑھو جس کا نام نماز ہے تو اکثر اس کے اسرار بھی معلوم ہو جاتے ہیں گو مقصود نہیں۔ مگر یہ ابتداء ہی سے نہیں ہو سکتا۔

دیکھئے، بنیے کا بچہ جس وقت ہوش سنبھالتا ہے تو بنیے اسی وقت سے اس کو کمانا سکھاتے ہیں۔ مثلاً اس کو اول ہی سے حلوہ وغیرہ بیچنا شروع کرا دیتے ہیں۔ مگر اس حالت میں اس کو کچھ بھی مزا نہیں آتا بلکہ اس وقت کلفت معلوم ہوتی ہے مگر یہ سب کچھ اسی خیال سے کراتے ہیں کہ آئندہ اس کو مزہ آوے گا۔ پھر آہستہ آہستہ اور کام اس کے سپرد کرتے ہیں۔ پھر ایک وقت اس پر ایسا آتا ہے کہ اس کو مزہ آنے لگتا ہے اور اس کام کے اسرار خود ہی کھلتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اس کام کو چھوڑنا گوارہ نہیں کرتا۔

صاحبو! اسی طرح تم بھی کام کرتے رہو، کام خود برکات کو نمایاں کر دے گا جس کام پر مداومت مع اس کی شرائط کے کی جاتی ہے خود وہ عمل ہی اپنی حقیقت بتلا دیتا ہے۔ جب تم پر کام کرتے کرتے منکشف ہوں گے تو کام لینے والوں کو دعا دو گے۔ چنانچہ میرے دل سے والد ماجد صاحب کے لیے دعا نکلتی ہے کہ وہ ہمیں دین پڑھا گئے تھے۔ اب اس کے برکات محسوس ہوئے حالانکہ جس وقت ہم نے عربی شروع کی تھی اور قال قالا قالوا کی گردان

کرتے تھے تو بڑی تنگی اور کلفت ہوتی تھی اب اس کی قدر معلوم ہوتی ہے۔

چنانچہ میری تائی صاحبہ کہ انہوں نے مجھ کو پرورش کیا تھا ایک روز کہنے لگیں کہ تجھے یاد بھی ہے کہ تو یوں کہا کرتا تھا کہ تائی! عربی نکالے چربی، تو واقعی ایک وہ وقت بھی تھا اور اس وقت اس کی قدر و منزلت معلوم نہ تھی مگر والد صاحب کے حکم سے اس میں لگے رہے تو خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ اب کتابوں کے پڑھنے کا نام ہو گیا۔ گو جسے علم کہتے ہیں وہ اب بھی حاصل نہیں ہوا مگر اس ناتمام ہی علم پر بے انتہا خوشی ہوتی ہے اور والد صاحب کے لیے دعا نکلتی ہے۔

حضرت یہی حالت ہر عمل کی ہے کہ ابتداء میں تو تنگی پیش آتی ہے اس وقت نہ اسرار و برکات منکشف ہیں نہ معلمین کی قدر دل میں ہوتی ہے۔ پھر جب مداومت کی جاتی ہے اور اسرار و برکات کھلتے ہیں تو راہ پر لگانے والوں کے حق میں دعا نکلتی ہے۔ بس کام کرنا حکمتوں کے معلوم ہونے پر موقوف نہیں بلکہ حکمتیں معلوم کرنا عمل پر موقوف ہے۔ حکمتیں تو مداومت سے خود معلوم ہو جاویں گی۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے نابالغ بچہ سے کہا جائے کہ شادی کر لے تو وہ اس کو مصیبت سمجھے گا اور کہے گا کہ کون گلے میں طوق ڈالے۔ اگر اس کی شادی کر بھی دی جائے تو بی بی کی صورت دیکھ کر ہی گھبرائے گا مگر جب ذرا جوانی کا سرسراہٹ اٹھے گا اور شادی کے اسرار معلوم ہوں گے تو شادی کرنے والوں کو دعا دے گا۔ حضرت نماز روزہ کرنے والے بھی بالغ نہیں ہوئے، ابھی تو یہ حالت ہے۔

خلق اطفالند جز مست خدا　　　نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

(ساری مخلوق سوائے مست خدا کے بچوں کے مانند ہے، بالغ وہ ہے جو خواہشات نفسانی سے بچ جائے)

بزرگوں نے ایک لطیفہ لکھا ہے کہ بالغ طبی وہ ہے کہ جس میں سے منی نکلنے لگے اور طریق کا بالغ وہ ہے جس میں سے منی نکل جاوے (یعنی خودی) یہ معنی ہیں "نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا" کے۔ پھر تو یہ حالت ہوتی ہے کہ بی بی کے لیے محنت مشقت سے کمانا بھی لذت ہے حتیٰ کہ اس کے لیے جہنم میں بھی جانا لذت ہے۔ اس طرح کہ اس کی خوشی کے واسطے خدا تعالیٰ کو ناراض

کرتے ہیں کہ بلا سے فلاں کام سے خدا ناراض ہوگا۔ بی بی تو خوش ہوگی، اب بھی تو یہ وہی بی بی ہے جس کو یہ پہلے ڈائن خیال کرتا تھا۔ پس معلوم ہوا کہ آدمی دین کا کام کرتا رہے، پھر لذت بھی آنے لگتی ہے پھر تو ایسی دلچسپی پیدا ہوتی ہے کہ اس کے سامنے سلطنت کی بھی پروانہیں کرتا۔

دولت نماز وروزہ

یہاں ایک نکتہ قابل بیان ہے وہ یہ کہ شاید اس مضمون کو سن کر حسرت ہوتی ہوگی کہ یہ درجہ ہم کو نصیب ہونے کی کیا امید ہے۔ سو میں بشارت دیتا ہوں کہ بحمداللہ یہ درجہ ہر مسلمان پابند نماز کو حاصل ہے۔ خیر سلطنت تو کون دیتا ہے، کس کے قبضہ میں ہے جس کے ملنے نہ ملنے کے وقت اس درجہ کا موازانہ نہ ہو سکے مگر یہ صورت تو ممکن ہے کہ کوئی یوں کہے کہ تم ایک وقت کی نماز چھوڑ دو ہم تمہیں دس ہزار روپیہ دیں گے تو واللہ نمازی آدمی ان پر پیشاب کردے گا جس کو نماز کی عادت ہے وہ کبھی اس پر راضی نہ ہوگا۔ پھر بھی لوگ کہتے ہیں کہ ہم کو نماز میں مزہ نہیں آتا تو اس مثال نے تمہارے قول کو غلط کردیا کیونکہ اگر مزہ نہیں آتا تو دس ہزار روپیہ پر اس کو کیوں ترجیح دی گئی، کچھ تو مزہ ہے جس نے اپنی طرف کھینچ لیا۔

اگر کہو کہ خدا کا خوف اس کا باعث ہوا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر صرف خدا کا خوف ہی اس کا باعث ہوتا تو ایسا نمازی زنا میں کیوں مبتلا ہوجاتا ہے، غیبت کیوں کرتا ہے، وہاں خوف کہاں چلا گیا۔ معلوم ہوا کہ یہاں صرف لذت مانع ہوئی ہے نماز کے عدم ترک کی۔ یہ تو ہم جیسوں کی نماز کا حال ہے باقی حقیقی نماز کا تو کیا کہنا ہے اس کی تو یہ حالت ہے۔

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند   صاف گر باشد ندانم چوں کند

(جب شراب کا ایک مٹی ملا گھونٹ مست کردیتا ہے تو خالص شراب کیا کچھ نہ کرے گی)

جب ہی تو خدا تعالیٰ نے عام مومنین کے لئے یہ فتویٰ دیا ہے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ (اور ایمان والوں کو سب سے زیادہ اللہ سے محبت ہے) شدت حب عشق ہے اس میں سب مومنین کو عاشق فرمایا ہے۔

ایک رئیس کی حکایت ہے کہ انہوں نے مولانا ظفر حسین صاحب سے سوال کیا کہ مولانا حدیث میں ہے کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ماں باپ اور سب سے زیادہ

نہ ہوتو مومن نہیں ہوتا۔ سو یہ درجہ محبت کا ہم اپنے دل میں نہیں پاتے۔ مولوی صاحب نے اس کا عملی جواب دیا۔ وہ اس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات کا تذکرہ شروع کیا، پھر اس کو بند کر کے یہ کہنے لگے کہ آپ کے والد صاحب بھی بہت اچھے آدمی تھے اور ان کی خوبیوں کا ذکر شروع کر دیا۔ رئیس صاحب جھلا کے کہنے لگے کہ حضرت میرے والد کا ذکر کہاں داخل کر دیا۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ میں نے آپ کی بات کا جواب دیا ہے کہ اگر آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ باپ سے زیادہ محبت نہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات کے درمیان میں باپ کا ذکر کیوں ناپسند ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت باپ سے زیادہ ہے۔ رئیس صاحب کی آنکھیں کھل گئیں، شبہ رفع ہوگیا۔

میں کہتا ہوں کہ عامی سے عامی کو بھی محبت شدیدہ ہے اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مگر اس کا اظہار موقع پر ہوتا ہے۔ صاحبو! تمہارے اندر سب مادے موجود ہیں مگر ان کے صاف کرنے کی ضرورت ہے۔ جیسے سونا زمین ہی سے نکلتا ہے مگر سونے کے ٹکڑے نہیں ہوتے بلکہ اس کے ذرے مٹی میں ملے ہوتے ہیں۔ ان ذروں کو مٹی سے صاف کر کے اور پگھلا کر سونے کے ڈھیلے بناتے ہیں، ایسے ہی اپنے کو صاف کرو، کندن نکل آوے گا، اپنے کو بے دولت مت سمجھو تم دولت مند ہو، اس لیے تمہیں دریوزہ گری کی ضرورت نہیں، تمہارے اندر سب کچھ موجود ہے اور تمہاری وہ حالت ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں:

یک سبد پرناں ترا برفرق سر تو ہمی جوئی لب ناں دربدر

(تیرے سر پر روٹیوں کا ایک ٹوکرا موجود ہے اور تو روٹی کے ایک ٹکڑے کے لیے دربدر پھر رہا ہے)

تمہاری ایسی مثال ہے جیسے ایک حکایت لکھی ہے کہ کسی نے ایک گھر خریدا۔ اس کی دیوار میں ایک گھڑا سونے کا گڑا ہوا تھا۔ مگر اس شخص نے اس کو کھودا نہیں۔ اس وجہ سے کہ دیوار میں ایک گڑھا ہو جائے گا۔ حالانکہ اس کو چاہیے تھا کہ گھڑے کو نکال لیتا کیونکہ اس کے مل جانے سے ویسے ویسے دس گھر بن جاتے اور گھڑا ہونے کا خیال لغو تھا۔ اسی طرح یہ جسم ایک دیوار ہے اور اس کے اندر سونا ہے اس کو نکال کر پھر جسم کو ویسا ہی بنا لینا اور اس کی یہ

صورت ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں:

صحت ایں حسن معموری تن   صحت آں حسن تخریب بدن

(اس حسن کی صحت بدن کے لیے عمدہ غذاؤں کا استعمال ہے اور اس حسن کی صحت بدن کو مجاہدات میں ڈھالنا ہے)

پہلے اپنے جسم میں گڑھا کرو، اس کو مجاہدات سے دبلا کرو، اس کے بعد سونا نکلے گا مگر اس تخریب کی بھی ایک حد ہے جس کو جاننے والے بتا سکتے ہیں۔ بہرحال انسان کے اندر سب خزانے موجود ہیں ان کو ظاہر کرنے اور صاف کرنے کی ضرورت ہے۔ بس یہی نماز اور یہی روزہ جس کو ہم بے کار سمجھتے ہیں بڑی دولت ہے۔

تواضع میں غلو

بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ کیا ہماری نماز اور کیا ہمارا روزہ، یہ کہنا واہیات بات ہے، بہت تواضع اچھی نہیں ہوتی ناشکری ہو جاتی ہے۔

حد سے زیادہ تواضع پر ایک حکایت یاد آئی۔ میں الہ آباد سے کان پور کا سفر کر رہا تھا۔ اسی درجہ میں چند جنٹلمین بیٹھے تھے۔ ان میں بے چارے منصف بھی جو اس مجمع کے نہ تھے، آ بیٹھے جو کہ بہت سیدھے سادھے تھے۔ انہوں نے خواہ مخواہ ان لوگوں کی کمیٹی میں داخل ہونا چاہا چونکہ سیدھے تھے ان جنٹلمینوں نے ان کو کمیٹی میں داخل کر کے ان کی خوب گت بنائی۔ (خوب مذاق اڑایا) چنانچہ کھانا کھاتے میں ایک شخص نے ان سے کہا کہ آیئے آپ بھی گوہ موت کھا لیجئے۔ دوسرے جنٹلمین نے اس کو ٹوکا اور کہا کہ آپ کھانے کو گوہ موت سے تعبیر کرتے ہیں۔ جنٹلمین صاحب بولے کہ حضرت ہمارا کھانا اس حیثیت سے کہ ہمارا ہے اس کو کھانا نہ کہنا چاہیے، یہ تکبر ہے۔ بھلا ہم میں کہاں لیاقت ہے آپ کو کھانا کھلانے کی۔ بس تواضعاً اسے گوہ موت ہی کہنا چاہیے۔

تو جیسی یہ تواضع تھی ایسی ہی ہماری تواضع ہے جو کہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہمارا نماز اور روزہ کیا ہے کچھ نہیں۔ بات یہ ہے کہ حد سے بڑھی ہوئی تواضع بھی اچھی نہیں ہوتی۔ پس اپنے نماز روزہ کو یہ خیال کرنا کہ ہمارا نماز روزہ کس قابل ہے گو تواضعاً ہی ہو اچھا نہیں ہے۔

حضرت یہ نماز روزہ عطا ہے حق تعالیٰ کی۔ ہم میں قابلیت اتنی بھی نہیں کہ ایمان بھی نصیب ہو۔ یہ سب چیزیں خدا تعالیٰ کی نعمت ہیں۔ خدا کے ذمہ آپ کا چاہنا ہی کیا تھا کہ جو یہ عطا ہوئی۔ یہ سب حقیقت ناشناسی ہے۔ بس یہ سب نعمتیں بھی ہیں اور واقعی ان چیزوں میں لذت بھی ہے، کرکے دیکھو، حکمت معلوم ہونے کے درپے نہ ہونا چاہیے۔ وجہ اس کی وہی ہے جو ابھی مذکور ہوئی تھی کہ عام لوگوں کو حکمت معلوم نہ ہونے سے احکام کی عظمت زیادہ ہوتی ہے۔ یعنی جو محض خدا کا حکم سمجھ کر کرتا ہے اس کے قلب میں وقعت ہوتی ہے اعمال کی۔ مولانا فرماتے ہیں:

گرچہ تفسیر زباں روشن گرست　　　لیک عشق بے زباں روشن ترست

(اگرچہ زبان کا بیان روشن گر ہے لیکن عشق بے زبان زیادہ روشن ہے کیونکہ وہ امور ذوقیہ سے جس کو زبان سے اچھی طرح نہیں کیا جاسکتا)

وہی سچا عاشق ہے جو علل وحکم کے درپے نہ ہو، باقی مجتہدین اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ وہ عمل شروع کرنے کی حکمت تلاش نہیں کرتے، نہ علت پر عمل کو موقوف رکھتے ہیں بلکہ تعدیہ واستنباط احکام کے لیے علل دریافت کرتے ہیں۔ بہرحال فرق معلوم ہوگیا مجتہدین میں اور ہم میں۔

پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نہی فرمائی بعد نصف شعبان کے روزہ رکھنے سے۔ گو اس کی حکمت معلوم کرنے کی ضرورت نہیں۔ جیسا مفصلاً مذکور ہوا لیکن اگر تبرعاً بزرگوں کے قول کو نقل کردیا جائے اس طرح سے کہ عمل کا موقوف علیہ نہ ہو تو مضائقہ بھی نہیں۔

شریعت کی رعایت

سو وہ حکمت یہ ہے کہ نصف شعبان کے بعد روزہ نہ رکھنے سے قوت حاصل ہوگی، رمضان پر اور اس حکمت سے اس کا درجہ بھی متعین ہوگیا کہ نہی ارشادی ہے۔ دوسرے اس حکمت پر نظر کرکے اس سے ایک عام مسئلہ مستنبط ہوگیا۔ وہ یہ کہ رمضان کے لیے پہلے سے آمادہ ہوجانا چاہیے اور ظاہر ہے کہ تیاری عظیم الشان کی عظیم الشان ہی ہوتی ہے تو اس کے لیے بہت ہی اہتمام کرنا چاہیے اور یہی مطلب تھا اس کا جو میں نے پہلے بیان کیا تھا کہ

ظاہری تعلق حدیث مذکور الصدر کا شعبان سے ہے مگر حقیقت میں چونکہ اسکا تعلق رمضان سے بھی ہے اس لیے اس کو بھی بیان کروں گا۔ سو اب میں اس وعدہ کو پورا کرتا ہوں۔

حاصل یہ ہے کہ بعد نصف شعبان کے روزہ نہ رکھنے میں تقویت ہے رمضان پر۔ ذرا غور کیا جاوے تو معلوم ہوتا ہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ نے احکام میں بہت ہی سہولت کی ہے۔ مثلاً یہ کہ رمضان شریف کے روزوں میں صعوبت ہوتی ہے تو فرماتے ہیں کہ اس سے پہلے کھا پی لو تا کہ رمضان میں آسانی ہو اور اس کے لیے تیار رہو اور یہ آسانی اسی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ تمام احکام میں سہولت کی رعایت کی گئی ہے۔

دیکھئے خاص رمضان شریف میں بھی یہی حکم ہے کہ افطار میں تعجیل کرو اور سحری تاخیر سے کھاؤ تا کہ بھوکا رہنے کا زمانہ کم ہو جاوے۔ ظاہر ہے کہ جب افطار میں جلدی ہوگی اور سحری دیر کر کے کھائی جائے گی تو ترک غذا کا زمانہ کم ہوگا، بخلاف اس کے کہ افطار میں دیر کا حکم ہوتا اور سحری میں تعجیل ہوتی تو زمانہ بھوکے رہنے کا طویل ہو جاتا۔ سو ایسا نہیں ہوا بلکہ سہولت کی رعایت فرمائی گئی۔ اور دیکھئے کہ ہمارے لیے صوم وصال سے نہی فرمائی، اس میں بھی کتنی سہولت ہے ورنہ کیسی دقت پیش آتی تو دیکھئے سہولت کی کیسی دقیق رعایت کی ہے۔

غرض شریعت میں ظاہری و باطنی دونوں حکمتیں ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے حفظ حدود کا بڑا ہی اہتمام کیا ہے اور تصوف کا حاصل بھی یہی حفظ حدود ہے۔

گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

(اگر مراتب کی حفاظت نہ کرو تو یہ زندیقی ہے)

چنانچہ گو روزہ ایک عبادت مقصودہ ہے اس میں جتنا امتداد ہوتا بعید نہ تھا مگر اس کی بھی ایک حد ہے۔ میں اس کو کہاں تک بیان کروں۔ شریعت کے ہر حکم میں حکمت ہی حکمت ہے۔

دیکھئے حدیث میں ہے کہ اگر اوراد میں نیند آ جائے تو سو رہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فلیرقد ارشاد فرمایا ہے: یہ نہیں کہ اگر نیند آ جاوے تو آنکھوں میں مرچیں بھر لو تا کہ نیند جاتی رہے اور ایسی عبادت کس کام کی جس میں نفس کو بے حد مشقت میں ڈالا جاوے۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار مسجد میں تشریف لائے، دیکھا کہ وہاں دو ستونوں

کے درمیان ایک رسی بندھی ہوئی ہے، دریافت فرمایا کہ یہ رسی کیسی ہے، لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت زینب نے باندھ رکھی ہے۔ جب ان کو عبادت کرتے کرتے نیند آنے لگتی ہے تو اس سے سہارا لگا لیتی ہیں، آپؐ نے فرمایا کہ اس کو توڑ دو۔

حضرت مولانا گنگوہیؒ سے کسی نے پوچھا کہ ورد پڑھتے پڑھتے نیند آنے لگے تو کیا کرنا چاہیے۔ فرمایا کہ تکیہ پر سر رکھ کر سو رہو۔ جب طبیعت ہلکی ہو جاوے پھر پڑھنے لگو اور اگر نیند کو زبردستی دفع کیا جاوے تو اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ دماغ میں خشکی پیدا ہو جاتی ہے، صفرا میں اشتعال بڑھ جاتا ہے۔ سودا میں ترقی ہو جاتی ہے، خیالات فاسدہ آنے لگتے ہیں اور بعض اوقات وہ ان کو الہام سمجھ کر اپنے کو بزرگ جاننے لگتا ہے۔ آخر یہ ہوتا ہے کہ جنون ہو جاتا ہے۔

خود حضرت مولانا گنگوہیؒ نے ایک ذاکر شخص کو تقلیل منام وطعام سے منع فرمایا تھا اور وہی اس کے لیے مصلحت تھی مگر اس نے کہنا نہ مانا، آخر جنون ہو گیا۔ ان ہی شخص کو اخلاط میں اشتعال ہونے سے سنہری حروف میں کچھ عبارتیں نظر آنے لگی تھیں اور وہ اس کو کمال خیال کرتا تھا۔ مولانا نے فرمایا کہ ان کو جنون ہونے والا ہے آخر ایسا ہی ہوا۔ اس راہ میں بدون رفیق کے کام نہیں چلتا۔

بے رفیقے ہر کہ شد درراہ عشق　　عمر بگذشت ونشد آگاہ عشق

یار باید راہ راتنہا مرو　　بے قلاوز زاندریں صحرا مرو

ہر کہ تنہا دریں رہ را برید　　ہم بہ عون ہمت مرداں رسید

بلا مرشد کے طریق عشق میں جس نے قدم رکھا اس نے عمر ضائع کی۔ اور عشق سے آگاہ نہ ہوا راہ سلوک میں مددگار ہونا چاہئے اس میں تنہا قدم مت رکھو بلا مرشد کے اس عشق کی وادی میں مت چلو۔ اتفاقاً جس شخص نے اس راہ سلوک کو دیکھے اکیلے خود طے کیا ہے وہ مردان خدا (اللہ والوں) کی توجہ سے کیا ہے۔

اکثر نہ سونے کا انجام خشکی ہوتی ہے اور اس سے انسان کو ایسے امراض گھیر لیتے ہیں کہ آدمی پھر کسی کام کا نہیں رہتا۔ جو شخص مجھ سے شکایت کرتا ہے کہ نیند بہت آتی ہے تو میں کہہ دیتا ہوں کہ سو رہو۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نیند کی بہت رعایت کی ہے ہاں قصداً غفلت نہ کرو، باقی نیند کے بارے میں تو ارشاد ہے ''لاتفریط فی النوم'' ہاں جاگنے کے

بعد اٹھ کھڑا ہونا چاہیے پھر اس میں زیادہ مرد کھپو مت، ورنہ یہ کیفیت ہو جائے گی۔

چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات ہے

یعنی چند دن ذکر و شغل کر کے عمر بھر کو بیٹھ جاؤ گے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب فرمایا کرتے تھے کہ سبق اتنا یاد کرو کہ تھوڑا شوق باقی رہ جائے مگر یہ مطلب نہیں کہ غافل ہو جاؤ۔

حضور قلب

حج میں دیکھو کیسی سہولت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: "وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا" استطاعت کی قید لگا دی یہ نہیں کہ استطاعت نہ ہو جب بھی حج فرض ہے غرض شریعت کے حکم میں سہولت ہے۔ میں دعویٰ کر کے کہتا ہوں کہ کسی نے اتنی سہولت نہیں کی جتنی اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے اور جہاں بظاہر دشواری معلوم ہوتی ہے اس کی غرض بھی سہولت ہی ہے۔ غرض ہر حکم میں سہولت ہی کی رعایت ہے۔

چنانچہ اسی اصل پر فرماتے ہیں: "اذا انتصف شعبان فلا تصوموا"[1]

(جب نصف شعبان ہو جائے تو روزہ نہ رکھو) مطلب یہ ہے کہ مجاہدہ میں سہولت کی رعایت رکھو تاکہ اس سے نفرت نہ ہونے لگے۔

ایک شخص نماز پڑھتے تھے اور حضور قلب کا اہتمام کرتے تھے مگر اس کی حقیقت نہ سمجھتے تھے۔ اس لیے اس میں بہت مشقت اٹھاتے تھے۔ اس کا یہ نتیجہ تھا کہ بجائے اس کے کہ نماز کے وقت فرحت ہو، ان کو بڑی کلفت پیش آتی تھی کہ مصیبت آئی۔ میں نے ان کو حضور قلب کی حقیقت بتلائی جس سے اس کی سہولت ثابت ہوئی۔ تب ان کی وہ حالت موقوف ہوئی۔

میں اس وقت بھی فائدہ عامہ کے لیے اس کا اعادہ کرتا ہوں وہ کیا ہے ایک مثال سے سمجھ میں آ جائے گی۔ فرض کرو کہ دو شخص حافظ قرآن ہیں۔ ایک کا قرآن شریف تو ایسا پکا ہے کہ اس کو متشابہ ہی نہیں لگتا، بے سوچے فر فر پڑھتا ہوا چلا جاتا ہے جیسے گھڑی میں کنجی لگا دی اور وہ چل رہی ہے، رکتی ہی نہیں یا جیسے پیشل چھوڑ دیا۔ ایسے شخص کو خیال کرنے اور سوچنے کی

---

[1] سنن ابی داؤد: ۲۳۳۷، مشکوٰۃ المصابیح: ۱۹۷۴، کنز العمال ۲۳۸۵۷

ضرورت نہیں ہوگی اور دوسرا وہ ہے جو اٹک اٹک کر پڑھتا ہے اور اس کو خوب متشابہ لگتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس شخص کو سوچنے کی اور الفاظ قرآن پر نظر رکھنے کی خاص ضرورت ہوگی تو بحالت موجودہ اس کچے حافظ کی جس قدر توجہ الفاظ قرآن کی طرف ہے وہی حقیقت ہے حضور قلب کی۔ جس قدر توجہ اس کو الفاظ کی طرف ہے نمازی کو اتنی توجہ نماز کی طرف ہونا کافی ہے۔ یعنی رکعات کی طرف توجہ ہو کہ کتنی ہوئیں اور کیا ان میں کیا ہے۔ کیونکہ رکعت مرکب ہے چند اعمال سے، جب ہر عمل کو سوچ سوچ کر کیا اور الفاظ قرآن کو اس طرح پڑھا کہ اس کے بعد یہ لفظ ہے اور اس کے بعد یہ بس حضور قلب ہو گیا۔ چاہے اس کے ساتھ بے اختیار وسوسے کتنے ہی آتے ہوں، وہ حضور قلب کے منافی نہیں ہیں۔ اب اس مشہور شعر کی حقیقت معلوم ہوگئی ہوگی۔

بر زباں تسبیح و در دل گاؤخر — ایں چنیں تسبیح کے دار و اثر

(زبان پر تسبیح اور دل میں گاؤخر کا خیال ایسی تسبیح کیا اثر رکھتی ہے)

یہ شعر مولانا رومی کا نہیں ہے۔ سو معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ مضمون صحیح نہیں ہے بلکہ اس قسم کی تسبیح بھی نفع سے خالی نہیں، میں نے اس شعر کا رد کیا ہے کہ

ایں چنیں تسبیح ہم دار و اثر

(ایسی تسبیح بھی اثر رکھتی ہے)

البتہ اگر بقصد تصور گاؤخر کا مراد ہو تو اصل شعر بھی صحیح ہے۔

نشاط پیدا کرنے کی ضرورت

صاحبو! حدیث میں ہے کہ ''الدین یسر'' کہ دین آسان ہے اور قرآن شریف میں ہے:

مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ

''کہ دین میں اللہ تعالیٰ نے کوئی تنگی نہیں رکھی''

اگر دین اسی کا نام ہے جیسا متشددین نے کیا ہے تو کیا ساری احادیث قرآن غلط ہو جائے گا۔ بات یہ ہے کہ نہ تو دین اتنا سہل ہے جیسا کہ بعض نے سمجھ لیا ہے کہ آسانی تو جب

ہو جب کہ دین کو بالکل چھوڑ دے اور سانڈ کی طرح آزاد پھرے۔ بطلان اس کا ظاہر ہے کیونکہ آسانی ایسی چیز کے ساتھ متعلق ہوتی ہے جس کا وجود بھی ہو۔ اس واسطے کہ جب یوں کہتے ہیں کہ یہ چیز آسان ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس چیز کا وجود تو ہے اور باوجود موجود ہونے کے پھر اس میں سہولت ہے اور جو شے معدوم ہو تو اس کو نہیں کہہ سکتے کہ یہ شے آسان ہے اس لیے جب دین ہی نہ رہے گا تو آسان کس کو کہیں گے اور بعض نے تشدد اتنا کیا کہ اس کو ڈراؤنا دیو بنا دیا۔ دین کا تو جمال ہے جس پر بے ساختہ یہ شعر صادق آتا ہے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم　　کرشمہ دامن دل مے کشد کہ جا ایں جاست

(از سر تا پا جدھر بھی نگاہ ڈالتا ہوں کرشمہ دامن دل کو کھینچتا ہے کہ یہی جگہ ہے)

تشدد ین نے دین کو ایسا دشوار بنایا ہے جیسے شاعروں کا معشوق کہ پلکیں ایسی جیسے تیر، ابرو ایسے جیسے کمان، منہ ایسا جیسے نقطہ، زلفیں ایسی جیسے سانپ اور کمر تھی نہیں یہ شاعروں کا معشوق ہے جس کا وجود ہی نہیں اور اگر اس شکل کا کوئی آدمی سامنے آ جاوے سب سے اول بھاگنے والے یہی عاشق ہوں۔

صاحبو! دین میں نہایت سہولت ہے، کام اس طرح کرو کہ نشاط رہے، اگر نشاط نہ ہو اس کی تدبیر کرو، اگر خلاف سہولت وعوارض نشاط خود پیش آ جائیں تو عمل کو مت چھوڑو بلکہ عوارض کے دور کرنے کی تدبیر کرو۔ یہ حاصل ہے اس حدیث کا یہ تو عاملین کا علاج ہے۔ نصف شعبان کے بعد پس ان کا علاج یہ بتایا کہ "**اذا انتصف شعبان فلا تصوموا**" کہ نصف شعبان کے بعد روزہ مت رکھو تاکہ نشاط باقی رہے، نفس پر زیادہ تشدد مت کرو بلکہ رمضان سے پہلے اس کو راحت سے رکھو اور تشدد کے متعلق ایک دقیق اور مفید بات یہ ہے کہ جو عقل میں زیادہ کاوش کرتا ہے وہ خاص ثمرات کا منتظر رہتا ہے۔ اگر اس میں دیر ہوتی ہے تو وسوسہ پیدا ہوتا ہے کہ باوجود ایسے مجاہدات کے مجھ کو اب تک ثمرات کیوں نہیں ملے۔ حالانکہ میں اتنا مجاہدہ کرتا ہوں گویا اپنی عبادت پر ناز ہو جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں بھی کچھ ہوں اور اپنے آپ کو ثمرات کا مستحق سمجھنے لگتا ہے کہ میری عبادت پر ثمرات کا دینا گویا خدا

کے ذمہ ہو گیا اور یہ عین کبر ہے اور جو شخص اعتدال سے کرتا ہے تو وہ یہ خیال ہی نہیں رکھتا بلکہ یہ سمجھتا ہے کہ میں کرتا ہی کیا ہوں جس پر ثمرات مرتب ہوتے، وہ تو ثمرات کا خیال کرتے ہوئے بھی شرماتا ہے ایسا شخص صرف فضل کا امیدوار رہتا ہے۔ یہ تو کام کرنے والوں کے متعلق علاج تھا اور کاہلوں کے لیے یہ بیان نہیں تھا۔

کاہلوں کا علاج

اب کاہلوں کا علاج بتاتا ہوں اور اسی حدیث سے بتاتا ہوں۔ طب کامل وہ ہے جو ایک دواء سے دو متضاد مریضوں کا علاج کر دے۔ حدیث ایسی ہی طب کامل ہے سو جو لوگ بالکل غفلت میں ہیں کہ کام ہی نہیں کرتے اور اگر کرتے بھی ہیں تو اس وجہ سے کہ اگر نہ کروں گا تو لوگ یوں کہیں گے کہ کچھ کرتے ہی نہیں جس قدر فرض ہو چکا ہے اس پر اکتفا کرتے ہیں اس سے زیادہ کرنا ان پر وبال ہوتا ہے ان کا علاج جو اسی حدیث میں مذکور ہے یہ ہے کہ وہ کام کرنے کی عادت ڈالیں۔ عادت سے کام آسان ہو جاتا ہے وہ صرف رمضان شریف کے روزہ پر اکتفا نہ کریں بلکہ گاہ بگاہ نفل روزہ بھی رکھتے رہیں تاکہ رمضان شریف میں روزہ رکھنا ان پر آسان ہو کیونکہ اگر عادت نہ ہو تو پھر وقت پر سخت دشواری پیش آتی ہے، کہیں تمباکو کا تقاضا ہے کہیں دودھ کا، ان کی روزہ میں یہ حالت ہوتی ہے کہ گویا ساری دنیا سے لڑ رہے ہیں ان کا روزہ ایسا ہوتا ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں:

چوں گرسنہ میشوی سگ میشوی   چونکہ خوردی تند و بدرگ میشوی

(جب بھوکا ہوتا ہے تو کتا بن جاتا ہے اور جب شکم سیر ہوتا ہے تو بداخلاق اور ظالم بن جاتا ہے)

سو شریعت نے ایسوں کے لیے سہولت کا طریقہ بتلا دیا کہ کبھی نفل روزہ بھی رکھ لینا چاہیے اور یہ بھی اسی حدیث سے معلوم ہوا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں نصف شعبان کے بعد صوم سے منع کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس سے پہلے روزے کا محل ہے اور محل میں روزہ کی فضیلت پر دلیل قائم ہے۔ پس اس اشارہ میں کاہلوں کا علاج بتلا دیا اور شریعت نے اس علاج میں اتنی اور آسانی کی کہ ان نفل روزوں کے دن بھی بتلا دیئے کہ رمضان کے علاوہ

محرم کا روزہ رکھوتو اتنا ثواب ہے، ذی الحجہ میں اس قدر ہے پھر سب روزوں کی سرحد شعبان میں مل گئی کہ ایک روزہ پندرہویں کا بھی رکھ لو۔ اس میں بتلا دیا کہ شعبان میں ایک دن روزہ رکھ کر دیکھو تو سہی پھر رمضان کے روزہ سے نہیں ڈرو گے کیونکہ پندرہویں شعبان کا زمانہ رمضان کے بالکل قریب ہے اس کے بعد رمضان تک مقدار ایام اور کیفیت موسم میں زیادہ فرق نہیں ہوتا تو اس روزہ سے رمضان کا نمونہ معلوم ہو جائے گا کہ بس رمضان کے روزے بھی ایسے ہی ہوں گے جیسا یہ ہے کہ پھر یہ بھی بتلا دیا کہ اس کے بعد پندرہ دن کھاتے پیتے رہو تو اس میں بھی سہولت کا سامان بتلا دیا۔

بتلائیے کہ اس روزہ کے رکھنے میں تشدد ہوا یا سہولت جو لوگ کبھی روزہ نہیں رکھتے رمضان شریف میں ان پر آفت آتی ہے۔ جیسا جو حافظ قرآن کبھی نہیں پڑھتے، تراویح میں ان کی عجیب کیفیت ہوتی ہے اور جو پڑھتے رہتے ہیں ان کو بالکل دقت پیش نہیں آتی۔ اس سے اس امر کی بھی حکمت معلوم ہوگئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مروا صبیانکم بالصلٰوۃ بلغوا سبع سنین واذا بلغوا عشرا فاضربوھم[1]

"یعنی جب بچے سات برس کو پہنچیں تو ان کو نماز کا حکم کرو اور جب دس برس کے ہوں اور نہ پڑھیں تو مارو۔"

حالانکہ بچے اس عمر میں مکلف نہیں ہوتے کیونکہ بالغ نہیں ہوتے، بارہ برس سے کم میں لڑکا بالغ نہیں ہوتا۔ البتہ لڑکی تو کم میں بالغ ہو جاتی ہے۔ تو یہ کیا بات ہے کہ ابھی بالغ بھی نہیں ہوئے اور حکم ہو رہا ہے نماز کا اور وہ بھی مار کر۔ میں کہتا ہوں واللہ! اس میں نہایت سہولت کی رعایت ہے کیونکہ بالغ ہونے پر اگر دفعۃً ہجوم ہو جاتا سب احکام کا تو اک دم سے بیچارہ مصیبت میں پڑ جاتا۔ تعجب نہیں تھا کہ ایک دم سے ہجوم ہونے پر خودکشی کر لیتا یا شریعت کو چھوڑ بیٹھتا۔

اگر شریعت بھی نہ ہوتی تو میں پوچھتا ہوں کہ عقلاء اس بارے میں کیا تجویز کرتے۔ یہی تجویز کرتے کہ پہلے سے اس کو تھوڑا تھوڑا احکام کا عادی بنایا جاوے مگر شریعت نے تم کو

---

[1] مسند احمد بن حنبل ۲: ۱۸۰، حلیۃ الاولیاء ۱۰: ۲۶

یہ دولت مفت دی ہے اسی لیے تو قدر نہیں ہوئی۔ شریعت کی خوبی مصیبت پڑنے کے بعد معلوم ہوتی ہے۔ صحابہ کو شریعت کی قدر تھی ہمیں قدر نہیں کیونکہ بلا مشقت کے ہمیں سب کچھ مل گیا ہے۔ چنانچہ اسی حدیث کو دیکھ لیجئے۔

"اذا انتصف شعبان فلا تصوموا"[1]

(جب نصف شعبان گزر جائے تو روزہ مت رکھو) جس میں سبحان اللہ! روزہ رکھنے میں بھی سہولت کی رعایت ہے اور نہ رکھنے میں بھی۔ دونوں حکموں میں سہولت ہے۔ گویا دو متضادین کو جمع کر دیا، ایسا جمع تکوین میں ہوا ہے۔

چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ بعض فرشتے حق سبحانہ تعالیٰ نے ایسے پیدا فرمائے کہ آدھا جسم ان کا برف کا ہے اور آدھا آگ کا اور تسبیح ان کی یہ ہے "سبحان الذی جمع بین الثلج والنار" (اللہ تعالیٰ کی ذات ہر عیب سے پاک ہے جس نے برف اور آگ کو جمع کیا)۔ اسی طرح یہاں پر متضادین کو جمع کر دیا۔ بڑا کمال یہی ہے کہ متضادین کو جمع کر دے اور ساتھ ہی "بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ" مولانا فرماتے ہیں:

بحر تلخ و بحر شیریں بمعناں　　درمیاں شاں برزخ لا یبغیان

(بحر تلخ اور بحر شیریں دونوں برابر جاری ہیں مگر ان کے درمیان ایسا پردہ حائل ہے جس کی وجہ سے باہم مختلط اور مشترک نہیں ہوتے)

اگر سہولت کا قصہ عقلاء کے سپرد کیا جاتا تو وہ یا تو اس پہلو پر نظر کرتے کہ اس طرح عادت پہلے سے ڈالیں کہ کبھی فرصت ہی نہیں دیتے اور یا بالکل آزاد چھوڑ دیتے اور دونوں میں دشواری تھی، آسانی اسی میں ہے کہ عادت بھی رکھو اور ترک بھی کر دو۔

عادت پر یاد آیا کہ قاری عبداللہ صاحب مکی نے جو کہ فن تجوید میں میرے استاد ہیں جب ہندوستان آنے لگا تو مجھ سے فرمایا تھا کہ ہندوستان جاتے ہو لیکن اتنا خیال رکھنا کہ جو کچھ سیکھا ہے وہ ضائع نہ ہو جائے جس کی صورت یہ ہے کہ پاؤ پارہ روزانہ اسی طرز سے پڑھ

---

[1] سنن ابی داؤد: ۲۳۳۷، مشکوٰۃ المصابیح: ۱۹۷۴، کنز العمال ۲۳۸۵۷

لیا کرنا ایسا کرتے رہو گے تو فن سے مناسبت عملی باقی رہے گی ورنہ اجنبیت ہو جائے گی۔ واقعی کیسی آسان تدبیر فرمائی جس میں مشقت بھی نہیں، اسی طرح آدمی جس کام کو کبھی تھوڑا تھوڑا کرتا رہتا ہے تو سب کچھ ہو جاتا ہے۔

نماز کی اہمیت وفضیلت

ہمیں تو سب عبادتوں کی عادت اور مشق کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک بڑی جامع عبادت مرحمت فرمادی ہے جس میں تھوڑی تھوڑی سب عبادتیں ہو جاتی ہیں وہ کیا ہے نماز کہ اس میں ہر قسم کی عبادت موجود ہے اور پھر زیادہ مشقت نہیں۔

دیکھئے تکبیر تحریمہ سے سلام تک فاقہ کو لازم کر دیا، یہ روزہ کا نمونہ ہے۔ حج کے بھی معنی موجود ہیں کیونکہ حج میں احرام کے بعد بہت سی چیزیں ممنوع ہو جاتی ہیں۔ یہاں بھی بعد تکبیر تحریمہ بہت سے امور ناجائز ہو جاتے ہیں، حج میں تلبیہ ہے۔ یہاں بھی تکبیریں ہیں حج میں بدن کو تعب ہوتا ہے یہاں بھی موجود ہے، حج میں احرام سے نکلنے کے لیے حلق ہے، یہاں بھی نماز سے نکلنے کے لیے سلام ہے۔ حج میں قصد بیت ہے، یہاں بھی توجہ الی البیت ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس نماز میں زکوٰۃ کے معنی بھی پائے جاتے ہیں، زکوٰۃ میں مال خرچ ہوتا ہے یہاں جان بھی خرچ ہوتی ہے اور مال بھی کیونکہ نماز بدوں لباس کے درست نہیں۔ اعتکاف کے معنی کا پایا جانا ظاہر ہی ہے۔ دیر تک انسان مسجد میں محبوس رہتا ہے۔ محققین نے کہا ہے کہ نماز میں قربانی بھی ہے وہ اس طرح کہ ذبح کے وقت اللہ اکبر کہتے ہو اور جانور کو ذبح کرتے ہو۔ یہاں اللہ اکبر کہہ کر اپنے نفس کو اللہ کے راستہ میں قربان کرتے ہیں۔ مولانا اسی کو فرماتے ہیں:

معنی تکبیر این است اے امیم　　کاے خدا پیش تو ما قرباں شدیم

وقت ذبح اللہ اکبر میکنی　　ہم چنیں در ذبح نفس کشتنی

گوے اللہ اکبر وایں شوم را　　سر بہ برتا وارہد جاں از غنا

تن چوں اسمٰعیل و جاں ہمچوں خلیل ‏ ‏ ‏ کرد جاں تکبیر بر جسم نبیل

''اللہ اکبر کے معنی یہ ہیں کہ اے اللہ ہم تیرے سامنے قربان ہوتے ہیں جیسے ذبح کے وقت اللہ اکبر کہتے ہیں اسی طرح ذبح میں جان قتل کرتے ہیں اسی طرح اللہ اکبر کہتے ہیں سرتاپا اپنی جان پیش کردے اللہ اکبر کہتے ہی جسم حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرح اور جان حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح قربان کردے''

غرض نماز میں خاص جامعیت ہے۔ تمام عبادت کے نمونے اس میں موجود ہیں اس میں تھوڑی عادت روزمرہ فاقہ کی بھی ڈالی گئی اور دیکھئے سہولت کہ حق تعالیٰ نے ہم کو زیادہ فاقہ بھی نہیں دیا۔ ہمارے فاقے کا بھی لحاظ کیا ہے۔ چنانچہ مسئلہ ہے: ''اذا جتمع اعشاء والعشاء فابدوا بالعشاء''

''یعنی جب کھانا اور عشاء کی نماز جمع ہوجاویں تو پہلے کھانا کھالو تاکہ نماز میں طبیعت منتشر نہ ہو''

امام ابوحنیفہ سے اس کی حکمت منقول ہے۔ آپ نے فرمایا ''لان یکون اکلی کلہ صلوٰۃ احب الی من ان یکون صلاتی کلھا اکلا'' (یعنی کہ میرا سارا کھانا نماز ہوجائے یہ اس سے اچھا ہے کہ ساری نماز کھانا ہوجاوے) مطلب یہ تھا کہ کھانا کھاتے ہوئے جب نماز کا خیال رہے گا تو سارا وقت مراقبہ نماز میں گزرے گا اور انتظار صلوٰۃ بحکم صلوٰۃ ہے تو اس کا کھانا نماز ہوگا پھر اس کے بعد نماز بھی فراغت سے پڑھے گا تو اعلیٰ درجہ کی ہوگی اور جو بھوکا رہ کر نماز ادا کرے گا تو نیت کھانے میں پڑی رہے گی تو وہ نماز بھی کھانا ہوجاوے گی۔ غرض جو شخص کھانا کھا رہا ہے اور دل نماز میں ہے تو نماز ہی میں ہے بخلاف اس شخص کے جو بھوکا نماز پڑھ رہا ہے اور دل پڑا ہوا ہے کھانے میں تو اس کی نماز بھی کھانا ہورہی ہے۔ عارفین نے ہر موقع پر ان اصولوں کی رعایت کی ہے۔

حضرت حاجی صاحب سے جو شخص مکہ شریف میں قیام کی بابت عرض کرتا تو آپ

فرماتے کہ دل رہے مکہ میں اور جسم ہندوستان میں، وہ اس سے اچھا ہے کہ دل رہے ہندوستان میں اور دھڑ ہو مکہ میں کیونکہ مکہ میں رہ کر کسی اور جگہ کا اشتیاق ہونا بیت اللہ سے اعراض کی صورت ہے۔

ایک شخص کا قصہ ہے کہ وہ مکہ میں مستقلاً مقیم تھے۔ وہ بیمار ہوئے اور بیماری میں ان کے منہ سے بار بار نکل رہا تھا کہ مجھ کو ہندوستان لے چلو۔ لوگ ان کا پلنگ اٹھا کر دوسری جگہ رکھ دیتے اور کہتے کہ ہندوستان پہنچا دیا۔ بس اسی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس لیے مکہ میں رہنا ہر شخص کا کام نہیں۔ اس کے لیے بڑے دل کی ضرورت ہے اور وہاں کے بہت آداب ہیں۔ آج کل تو لوگ مکہ میں بھی سیر و تفریح کے لیے جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک نواب سے نظر بندی کے بعد پوچھا گیا تھا کہ تم کہاں رہنا چاہتے ہو، انہوں نے مکہ کو منتخب کیا ہے۔ چنانچہ وہاں پہنچا دیئے گئے مگر وہاں ان کی عادت یہ تھی کہ راستہ پر بیٹھ جاتے اور عورتوں کو تا کا کرتے تھے۔ بھلا ایسے جانے سے کیا نتیجہ اس لیے بعض کو ہندوستان ہی رہنا اچھا ہے ایسے لوگوں کے بارے میں حضرت مسعود بیک فرماتے ہیں کہ

اے قوم بہ حج رفتہ کجائید کجائید — معشوق دریں جاست بیائید بیائید

اس میں ایسے ہی لوگ مخاطب ہیں جن کے دلوں میں ہنوز بیت اللہ کی محبت و عظمت پیدا نہیں ہوئی۔ چونکہ اہل اللہ کی نظر حقائق پر ہوتی ہے اس لیے ان کو یہ مشورہ دیا گیا۔

غرض شریعت میں ہر قدم پر سہولت مقصود یہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی طرح کہ کام ہو اسی لیے قدم قدم پر سہولت کی رعایت ہے اور اس سہولت کی روح اور خلاصہ یہی ہے کہ کام ہو اور انسان سہولت سے کام کرتے رہے۔ اسی لئے **"اذا انتصف شعبان فلا تصوموا[1]"** (جب نصف شعبان گزر جائے تو روزہ مت رکھو) دونوں قسموں کو محیط ہے، عاملین کو بھی اور کاہلین کو بھی، دونوں کو سہولت کا طریقہ بتلا دیا۔

---

[1] سنن ابی داؤد: ۲۳۳۷، مشکوۃ المصابیح: ۱۹۷۴، کنز العمال ۲۳۸۵۷

روزہ میں آسانی

جب اس حد سے تعدی ہوگی تو کام نہ ہو سکے گا، بعض لوگ تشدد کریں گے اور نصف شعبان سے رمضان تک روزے رکھیں گے ان کو رمضان میں مصیبت نظر آئے گی اور بعض لوگ نصف شعبان کا روزہ بھی نہ رکھیں گے ان کو بھی رمضان کے روزے آنے سے جاڑہ چڑھے گا۔ غرض ہر صورت میں کام نہ ہو سکے گا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ ہے کہ کام ہو جائے۔ مگر آج کل قال زیادہ ہے کام نہیں۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں:

کارکن کار بگذر از گفتار　　　اندریں راہ کار باید کار

(عمل کرو اور دعویٰ کو ترک کرو، اس طریق میں عمل اور کام ہی کی ضرورت ہے)

اور اگر کام کرنے کے اصول کا خود احاطہ نہ ہو سکے تو سب سے اچھی صورت کام کرنے کی یہ ہے کہ محققین سے کوئی اپنا قائد بنالے وہ قائد اتباع شریعت اور سہولت کے ساتھ تدریجاً مقصود کی طرف لے جائے گا۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک بیل سے آہستہ آہستہ روزانہ تدریجا کام لیا جاتا ہے تو اس کو سو کوس بھی لے جا سکتے ہیں اور ایک وہ بیل ہے کہ جس پر کبھی سواری نہیں ہوتی اور سال بھر کے بعد اس سے کام لینا چاہو تو وہ کچھ بھی کر کے نہ دے گا۔ اب اس کے لیے ایک ہوشیار گاڑی بان کی ضرورت ہے جو اس کو تھوڑا تھوڑا روز جوڑا کرے، دو تین میل کا روزمرہ چکر دیا کرے اور شام کو راتب کھلایا کرے، کچھ عرصہ میں وہ بیل خوب کام دے گا۔

لہٰذا عادی بنانے کے لیے دو چیز کی ضرورت ہے، کام لینا اور آرام دینا، نفس کی بھی یہی کیفیت ہے کہ بدوں کسی ایسے رہبر کے ٹھیک نہیں ہوتا جو کام بھی لے اور آرام بھی دے اور میں مرید ہونے کو نہیں کہتا ہوں کہ اس سے مرید ہو جاؤ میں کام کا طریقہ پوچھنے کو کہتا ہوں کہ کسی محقق سے پوچھ پوچھ کر کام کیا کرو اور

بحمد اللہ میں نے بہت آسان طریقہ حدیث سے آپ کو بتلا دیا ہے۔ ان احکام کو یاد رکھئے اور رمضان شریف کے لیے شگفتہ ہو جایئے۔ بعض لوگ رمضان شریف میں بہت پژمردہ رہا کرتے ہیں اور ہمت توڑے رہتے ہیں۔ میں اس کے متعلق ایک تجربہ کی بات بتاتا ہوں جس میں روزہ ایسا سہل ہو جاوے کہ نہ برف کی ضرورت رہے نہ شربت کی نہ بالائی کی۔ وہ یہ کہ روزہ میں یہ کبھی مت کہو کہ آج گرمی ہے، آج خشکی ہے آج تو دل گرا جاتا ہے، بھوک کے مارے دم نکلا جاتا ہے۔ اس قسم کا تذکرہ اور خیال بھی مت کرو بلکہ کسی ایسے کام میں لگ جاؤ جس میں انہماک زیادہ ہو جیسے تلاوت قرآن یا کوئی کمانے کھانے کا وسیلہ تا کہ خیال بٹا رہے اور روزہ کی طرف دھیان ہی نہ جائے کیونکہ خیال کو بڑا دخل ہے اس کو کر کے دیکھو۔ ان شاء اللہ تعالیٰ روزہ معلوم بھی نہ ہوگا۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ توفیق عمل کی مرحمت فرمائیں۔
آمین یارب العالمین۔